بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۱	بابتہ ماہ ستمبر - اکتوبر - نومبر ۱۹۲۸ء	نمبر ۳-۴-۵

فہرست مضامین

قرون وسطیٰ کے یورپین مصنفین اور بانیٔ اسلام

ہمارے کرم فرما ڈاکٹر برکت علی صاحب ایم اے (علیگ) پی ایچ ۔ ڈی (برلن) نے کوئی تین سال سے زائد ہوئے انجمن اردو، برلن میں اپنے احباب کے سامنے مندرجہ بالا موضوع پر تقریر فرمائی تھی سامعین میں سے ایک صاحب نے اس کے نوٹ لئے تھے اور کچھ نوٹ فاضل مقرر نے تقریر میں مدد کے لئے خود لکھ لئے تھے۔ اول الذکر تو ہمارے قبضہ میں عرصہ سے تھے اب خوش قسمتی سے موخرالذکر نوٹ بھی مل گئے اور ان دونوں سے ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر کی تقریباً پوری رپورٹ تیار ہوگئی۔ ہم نہایت خوشی کے ساتھ اسے صفحات جامعہ میں طبع کرتے ہیں اور متوقع ہیں ہمارے فاضل دوست آئندہ رسالہ جامعہ کو اپنے گرانقدر علمی مضامین سے مزین فرماتے رہیں گے۔

جب ہم ان گہرے تعلقات اور روابط پر نظر کرتے ہیں جو قرون وسطیٰ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تھے تو بظاہر یہ امر مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسلام کے متعلق ان عجیب و غریب خیالات اور افکار کی وجوہ بتا سکیں جو قرون مظلمہ کے مصنفین اپنی بد دیانتی سے اختراع کرتے اور انتہائی جوش کے ساتھ جن کی نشر و اشاعت کرتے تھے لیکن اس عجیب منظر کی حقیقت تحقیق اور تلاش کے سامنے بے نقاب ہوجاتی ہے۔

ابتدا میں جب کہ اسلام نے حدود عرب سے باہر قدم نکالا تو ہمیں اسلام اور نصرانیت دست و گریباں نظر آتے ہیں لیکن اسلام کی فتوحات کے بعد ہی صلیب و ہلال کی آویزش کم ہوگئی اور اچھے تعلقات قائم ہوگئے۔ یہاں میں ان اجتماعی تعلقات کا ذکر نہیں کروں گا جو عرب اور رومیوں میں تھے اور نہ ان گہرے اثرات کا جو اسلام اور نصرانیت نے ایک دوسرے پر چھوڑے۔ بنو امیہ کی صلح جویانہ اور روادارانہ حکمت عملی ایسی تھی کہ اس سے برانگیختہ جذبات دب گئے اور تعلقات استوار ہوگئے۔ اسلام عیسائیوں کی نظر میں باستثنائے معدودے چند ایک ناقابل فہم چیز رہا اور محمد صلعم کی ذات موجودہ زمانہ تک

یورپین ادبیات میں ایک بعید از فہم، مبہم اور خیالی درجہ سے زیادہ کوئی رتبہ حاصل نہ کر سکی۔ اسلام اور محمد صلعم سے عدم واقفیت کی وجہ یہ قرار دینا کہ مواقع اور وسائل کی کمی تھی غالباً صحیح نہ ہوگا کیونکہ بازنطینیوں و مسلمانوں سے نہ صرف مڈبھیڑ ہوئی بلکہ دونوں کے درمیان نہایت عمدہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اس کے علاوہ بارہویں صدی کے اول نصف سے عربوں کی تمام اہم تصانیف اور تالیفات جو انہوں نے فلسفہ، طب، ہیئت اور ریاضی میں کی تھیں لاطینی میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نصرانیوں میں ایسے اشخاص ضرور تھے جو عربی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا شخص جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ ریانڈ (Raymond) ٹولیڈو (Toledo) کا آرچ بشپ ہے (۱۱۳۰ - ۱۱۵۰) جس نے مترجمین کی ایک جماعت تنظیم دی اور اُنکا سرپرست گونڈسلاوی (Dominican Gondeslavi) کو مقرر کیا۔ لہٰذا اُدمیوں کے علاوہ "ایک طرف یورپ ہسپانیہ کے ذریعہ اور بالخصوص ٹولیڈو کے ذریعہ مسلمانوں سے روشناس ہوا اور دوسری طرف صقلیہ اور حکومت نیپلز کی وساطت سے" لیکن باوجود ان تمام آسانیوں کے جو قرون وسطیٰ کے عیسائیوں کو اسلام اور اُس کے بانی کے صحیح حالات معلوم کرنے کی حاصل تھیں ہم تعجب کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ وہ لفظ محمدؐ کے نام سے بھی بیگانہ ہیں۔ کیونکہ قرون وسطیٰ کے ادبیات میں کہیں "ماپ ہومت" کہیں "باپ ہومت" اور کہیں "بافوم" نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ صدیوں تک نصرانی رسول اکرمؐ کو مسلمانوں کا خدا سمجھتے رہے جو انسان قربانی سے خوش ہوتا ہے۔ اگر ہم ان تمام آزاد خیالات کا خاکہ پیش کریں جو عیسائی نبی کریمؐ کے متعلق رکھتے تھے تو ایک عرصہ درکار ہوگا۔ ٹرپن (Turpin) کے بیان سے کہ جس نے ایک سنہری بت "ماہم" کی کیڈز (Cadiz) میں پرستش ہوتی ہوئی دیکھی تھی اُس وقت تک جبکہ ناقدین حیات رسولؐ کو ایسی چیزیں نظر آئیں کہ وہ اُنکے دعوے نبوت کے ماننے پر مجبور ہوئے۔ لہٰذا اُن دلچسپ قصص و حکایات کا مختصر خاکہ آپکے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس گروہ میں جیسا کہ بعد میں واضح ہوگا ایسے مصنفین بھی شامل تھے جیسے نکالڈس (Nicoldus) یا جیسے پادری ولیم طرابلسی جو اُس وقت کے عام تعصب سے بالاتر تھے اور جنہوں نے محمد صلعم کی ذات میں ایک "خادع" اور "فریب کار" "دغاباز" (نعوذ باللہ) سے کچھ بہتر دیکھا تھا لیکن قرون وسطیٰ کا بے تعصب

سے بے تعصب مصنف بھی نہایت بُری لغزش کھاتا ہے جب وہ نفس اسلام کے متعلق اپنے آرا۔ کا اظہار کرتا ہے۔

جب ہم محمد صلعم کے متعلق ایک باخبر ہسپانی پادری یولوجیس (Eulogius) ساکن قرطبہ کا بیان پڑھتے ہیں تو ہماری حیرت کی کچھ انتہا نہیں رہتی۔ اس کے بیان کے مطابق نبی کریم نے اپنے تابعین یا صحابہ سے اعلان کیا تھا کہ وہ وفات سے تین دن بعد جی اٹھیں گے اور آسمان پر فرشتوں سے اٹھائے جائیں گے لیکن ہمارا فاضل پادری لکھتا ہے "کہ اس کے بجائے کتے اس کی سڑی ہوئی لاش کو کھا گئے" یہاں اس کا تذکرہ کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ (Eulogius) نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ مسلمانوں میں گذارا تھا اور اُسے حق و صداقت کے معلوم کرنے کی ہر قسم کی سہولت فراہم تھی اگر وہ ایسا کرنا چاہتا لیکن وہ نہایت سادہ لوئی سے اعتراف کرتا ہے کہ اُسکا تمام علم اس موضوع خاص پر ایک لاطینی قلمی نسخہ سے لیا گیا ہے جو اتفاقاً (Pampeluna) میں اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ ہمیں اب اس عجیب وغریب ناواقفیت یا غلط فہمی کے اسباب کی تلاش میں نکلنا چاہیے جو قرون وسطیٰ کے عیسائی اسلام اور اُس کے بانی کے متعلق رکھتے تھے۔ ہماری رائے میں یہ کئی اسباب کا نتیجہ تھی لیکن اصلی علت العلل ہمیں اُس محیط الکل اور ہمہ گیر اثر میں ڈھونڈنی چاہیے جو "کلیسا" قرون مظلمہ کے لوگوں کے قلوب پر رکھتا تھا۔ اسلام کی محیر العقول ترقی نے یورپ کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور عوام الناس اس سے کتنے ہی بے حس کیوں نہوں لیکن دوربین نگاہیں صاف دیکھ رہی تھیں کہ اسلام عیسائیت کا ایک خطرناک حریف ہے۔ اس خطرہ سے کامل آگاہی نے شعلہ بھڑ دیا اور کیتھولک کلیسا ایک حریف کی حیثیت سے مقابلہ میں آ گیا۔ اسلام اپنے ابتدائی دور میں مؤید من اللہ نظر آتا ہے کیونکہ جب کبھی اور جہاں کہیں اسلام کا پھریرا اڑایا گیا فتح وکامرانی مسلمانوں کا قدم چومتی تھی۔

مرور زمانہ کے ساتھ یہ خطرہ عیسائیت کے خلاف اور شدید ہوتا گیا اور ہر طرف سے نگاہیں ایک ایسی قوت کو تلاش کرنے لگیں جو اسلام کی روز افزوں ترقی کو روک سکے۔ رانکے (Ranke) اپنی مخصوص تاریخی بصیرت کے ساتھ اس وقت تک صورت حالات کا نقشہ بدیں الفاظ کھینچتا ہے۔ "ہمیں جرمن کے نصرانیت قبول کرنے کو محض مذہبی اعتقاد اور تعلیم کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ دونوں چیزیں

کتنی ہی اہم کیوں نہوں لیکن دنیا کی تاریخ کے لئے یہ نہایت ضروری بات تھی کہ اسلام کے خلاف ایک حریف قوت پیدا کیجائے کیونکہ اسلام برا عظم یورپ میں برابر پیش قدمی کرتا جا تا ہے ؟"

کلیسا جو اُن خطرات سے باخبر تھا جو عیسائیت کو اسلام کی طرف سے پیش تھے یقیناً اور فطرۃً اسلام کے ساتھ جائز سلوک کرنے پر مشکل ہی سے مائل ہو سکتا تھا۔ اور اگر ہم اس عجیب و غریب اثر کو بھی پیش نظر رکھیں جو کلیسا قرون وسطیٰ کے نصرانیوں کی زندگی اور انکے ادبیات پر رکھتا تھا تو ہمارا تعجب غائب ہو جاتا ہے اور ہم اسلام کے مسخ شدہ مفہوم کو جو قرون وسطیٰ کے نصرانیوں میں عام تھا۔ اُس وقت کے حالات کا ایک فطری اور جائز نتیجہ سمجھنے لگتے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ مغربی یورپ نے اسلام کے متعلق اپنا اصلی اور ابتدائی علم ایک نہایت غیر موثق ذریعہ سے حاصل کیا ہے یعنی کہ بازنطینی رومیوں سے۔ رومیوں کا اسلام کو حقارت اور دشمنی سے دیکھنا نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور فتوحات میں بازنطینیوں کو شام و مصر جیسے زرخیز خطوں سے محروم کر دیا تھا اور اُن کا اقدام برابر جاری تھا لیکن یہ واقعہ بھی انکی نظر میں اتنا نفرت انگیز اور حقارت آفریں نہ تھا جتنی کہ اسلام کی شدید توحید جو بازنطینی شرک کے مقابلہ میں تاباں و درخشاں تھی۔ اسلام انکی نظر میں ایک سخت حریف اور خطرناک دشمن کی حیثیت رکھتا تھا۔ رومی اگرچہ اپنی سیاسی کمزوری کا احساس رکھتے تھے لیکن اسلام کے حملوں کو روکنے کی سکت انہیں باقی نہ تھی جو اسلام اُن کی سرزمین اور عقائد پر برابر کر رہا تھا جبکہ خلافت بغداد ضعیف اور کمزور ہو گئی اور ترک علمبرداران اسلام کی حیثیت سے میدان میں آئے تو نصرانیت اور اسلام کی باہمی جد و جہد میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مغربی کلیسا نے جو "مشرقی سلطنت" کی بقا کے لئے اتنا فکر مند نہ تھا جتنا کیتھولک مذہب اور عقائد کی اشاعت کے لئے۔ بظاہر ان مظالم کا بدلہ لینے کے لئے جو ترکوں نے نصرانیت پر کئے تھے لیکن درحقیقت اسلام کی روزافزوں قوت کو روکنے کے لئے حروب صلیبیہ کو ترتیب دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ گرگیری ہفتم Gregory کے زمانہ سے یورپ کو مشرق کی طرف دھکیلنے اور اسکا فرد ...

کو آغوش کلیسا میں لانکی تدبیر نہایت خاموشی سے صورت پکڑ رہی تھی لیکن گرگیری اُن مخالف قوتوں کی وجہ سے جو کلیسا میں موجود تھیں اپنی کوششوں میں کامیاب نہو سکا اور یہ شرف وجلال اربن ثانی کے لئے مقدر تھا کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنائے اور ارض مقدس کی فتح کے لئے جنگ جوؤں اور محاربین کا ایک غیر مختتم سلسلہ جاری کردے۔ تاکہ ارض مقدس پر جان دینے کے لئے سر بکف سپاہیوں کی ایک فوج کثیر ہمیشہ کلیسا کے پاس موجود ہے۔ ارکان کلیسا اور اسکے پیروان اسلام کے خلاف نہایت دریدہ دہنی اور بے باکی سے دروغ بیانی اور تہمتیں تراشتے تھے۔ وہ تصویر جو (Theophanes) نے محمد صلعم کی کھینچی ہے۔ حروب صلیبیہ کے واعظین کے لئے برے خط وخال رکھتی تھی لہذا اب خاص آب ورنگ اور زیادہ گہرے خطوط میں تصویر کھینچی گئی۔ مسلمانوں پر نہایت بے بنیاد الزامات لگائے گئے اور کہا گیا کہ مسلمان نصرانی معبدوں کی نہایت بے حرمتی کرتے ہیں اور اس طرح سے حروب صلیبیہ کے مؤلفین نے اسلام و نصرانیت کی جد وجہد کو زندہ رکھا۔ ایک چھوٹے حادثہ کو جو انطاکیہ پر قبضہ کرتے وقت واقع ہوا (Raymond of Agiles) ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جن سے اُن نفرت آمیز جذبات کا پتہ چلتا ہے جو عیسائی مسلمانوں کے خلاف رکھتے تھے۔

متقی اور پرہیزگار (Raymond) رقمطراز ہے "ہماری طویل تکالیف ومصائب کے بعد ایک مسرت انگیز اور فرحت بخش واقعہ ظہور پذیر ہوا یعنی ترکی سواروں کا ایک دستے کو جو تعداد میں تین سو سے زائد تھا صلیبی محاربین نے گھیر لیا اور ایک چٹان پر سے گرا دیا۔ کیا ہی خوش کن نظارہ تھا اگرچہ گھوڑوں کے نقصان کا ضرور افسوس ہے۔"

پیشتر اس کے کہ ہم نبی کریم کی اُس زندگی کیطرف متوجہ ہوں جس کو قرون وسطیٰ کے عیسائی مصنفین نے پیش کیا ہے یہ نہایت دلچسپ ہوگا کہ بحیرا کے واقعہ کو بے نقاب کیا جائے اور اسکی اصلی حقیقت واضح کیجائے۔ کیونکہ تمام عیسائی مصنفین اس حقیقی یا خیالی بحیرا کا ذکر بڑی خوشی سے کرتے ہیں۔ واحدی کی کتاب "اسباب النزول" میں یہ حکایت بالکل اپنی سادی شان میں نظر آتی ہے۔

"جب ابوبکر اٹھارہ اور محمد صلعم بیس برس کے ہوئے تو محمد شام کی طرف ابوبکر کے ساتھ تجارتی سفر پر گئے اور راستہ میں ایک درخت کے سایہ میں اترے۔ ابوبکر ایک راہب کے پاس گئے اور ایک بیچ

مذہب کی بابت دریافت کیا۔ راہب نے اُس شخص کا حال دریافت کیا جو درخت کے سایہ میں بیٹھا تھا ابو بکر نے جواب دیا۔ محمد بن عبداللہ۔ راہب نے اس پر جواب دیا کہ خدا کی قسم وہ نبی ہے۔ کیونکہ لکھا ہے کہ کوئی دوسرا شخص سوائے ایک نبی کے حضرت عیسیٰ کے بعد اس درخت کے نیچے نہیں بیٹھے گا۔ اسکا ابو بکر پر بہت اثر ہوا اور وہ حق کے قائل ہو گئے اور واپسی پر محمد صلعم کو کبھی اکیلا نہ چھوڑا۔

یہ روایت "مواہب" اور "حلبی" میں بھی ملتی ہے اور ابن عباس تک جو حدیث گھڑنے میں مشہور ہیں اور جن کا سال وفات ۶۸ھ ہے مرفوع ہوتی ہے۔ "اصابہ" میں بھی اسکا ذکر موجود ہے لیکن وہ عبدالغنی الثقفی کی تفسیر سے ماخوذ ہے۔

ان تینوں تصانیف میں جن کا ابھی ذکر ہوا ہے ہم راہب کے نام بحیرا یا بُحیرا دیکھتے ہیں۔ یہ پہلا حاشیہ ہے جو اس پر چڑھایا گیا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ابن اسحاق اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اور کیونکر رنگ آمیزی کرتے ہیں۔

ابوطالب ایک قافلہ کے ساتھ شام جانیوالے تھے۔ جب وہ چلنے لگے تو محمد صلعم انکو چمٹ گئے اور ابوطالب کا دل بھر آیا۔ ابوطالب نے کہا بخدا میں انکو اپنے ساتھ لے چلوں گا اور ان سے کبھی جدا نہ ہوں گا۔ چنانچہ وہ روانہ ہوئے اور ایک راہب کی خانقاہ کے پاس سے گزرے جس کا نام بحیرا تھا۔ وہ پہلے بھی اس راستے گزرے تھے مگر راہب نے کبھی التفات نہ کیا لیکن اس مرتبہ اُس نے انکی دعوت کی کیونکہ اُس نے اپنی خانقاہ سے دیکھ لیا تھا کہ ایک بادل نبی کریم کے سر پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ اور جب وہ درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے تو درخت کی ٹہنیاں انکی حفاظت کے لئے جھک گئی تھیں۔ کھانے کے وقت محمد صلعم تشریف نہ لائے لیکن بحیرا نے باصرار کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد بحیرا نے کہا کہ لات و عزیٰ کا واسطہ میرے چند سوالوں کا جواب دو جس پر محمد صلعم نے کہا کہ لات و عزیٰ کی قسم نہ کھاؤ کیونکہ خدا کی قسم ان بتوں سے زیادہ میری نگاہ میں کوئی چیز نفرت انگیز نہیں ہے۔ پھر اس نے خدا کا واسطہ دیکر کئی چیزوں کے متعلق دریافت کیا اور مہر نبوت دیکھی اور وہ سب ٹھیک نکلیں۔ پھر وہ ابوطالب کیطرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ اس بچہ سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔ انہوں نے جواب دیا یہ میرا لڑکا ہے۔ اس پر بحیرا نے جواب دیا تمہارا لڑکا نہیں۔ کیونکہ بچہ کا باپ زندہ نہیں ہو سکتا۔ پھر ابوطالب

نے کہا یہ میرا بھتیجہ ہے۔ اور اس کے باپ کا کیا ہوا؟ اسکا انتقال ہوگیا جبکہ محمد صلعم کی والدہ حاملہ تھیں " اسپر بحیرا نے جواب دیا کہ اب تم نے سچ بولا ہے۔ لہذا تم اس بچہ کو لیکر گھر جاؤ اور یہودیوں سے اس کو بچاؤ کیونکہ اگر وہ اس کو میری طرح پہچان لیں گے تو نقصان پہنچائیں گے کیونکہ تیرا بھتیجہ کسی دن ایک بلند مرتبہ حاصل کرے گا "

طبری کے بیان کے مطابق محمد صلعم کی عمر اس وقت ۹ سال کی تھی۔ دوسری بات قابل غور ہے کہ ہم طبری میں پڑھتے ہیں کہ راہب نے ابوطالب سے یہ کہا کہ انکو رومیوں سے بچاؤ کہ یہودیوں سے جیسا کہ ابن اسحاق کا بیان ہے۔

مسعودی میں یہ قصہ اس طرح سے ہے کہ بحیرا فترۃ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔ وہ نصرانی تھا اسکا نام نصرانی کتابوں میں سرجس یا Sergius ہے۔ جب محمد صلعم ابوطالب۔ ابوبکر اور بلال کیساتھ شام گئے تو انکی عمر تیرہ سال کی تھی۔ بحیرا نے چلتے وقت کہا کہ اس بچہ کو اہل کتاب سے بچانا۔ یہ سنکر ابوطالب انکو لیکر مکہ واپس چلے آئے "

ابن الاثیر میں تمام قصہ اسی طرح پر درج ہے جس طرح طبری میں۔ حقیقت میں یہ تمام قصہ ابن عباس کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ یہ پہلی صدی ہجری میں تاریخ کے اوراق پر آیا ہے لیکن نصف صدی پہلے سے یہ قصہ مسلمانوں میں مشہور تھا کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سب سے اول بیان راہب کے نام کے متعلق خاموش ہے پہلے بیان میں راہب نے ابوطالب سے یہ کہا کہ اس بچہ کو یہودیوں سے بچانا۔ دوسرے بیان کے مطابق عیسائیوں سے بچانے کی فرمائش ہے۔ ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد صلعم کی عمر اس وقت ۹ سال تھی ایک میں تیرہ اور ایک میں انیس بیان کیجاتی ہے۔

قرون وسطیٰ کے مصنفین کے نقطہ نظر سے محمد صلعم نہ صرف ایک جھوٹے نبی نوجوانوں کے بہکانے والے تھے بلکہ ایک نہایت دغاباز شخص تھے جو کمزوروں کو دنیاوی لذائذ میں پھنسا کر حق وصداقت سے منحرف کردیتے تھے۔ اسکا ذکر پہلے ہوچکا ہے کہ اپنے ذاتی فوائد کی خاطر کیسی کیسی تہمتیں اسلام کے خلاف تراشتے تھے لیکن وہ اسلام کے ساتھ عجیب وغریب اصول منسوب کرنے میں کتنے ہی بےباک کیوں نہوں انکو اتنی جرأت نہ تھی

کہ وہ اسلام اور نصرانیت کے مشترک مسائل سے انکار کر سکیں لہٰذا اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ ایک بے بنیاد دعوے تیار کیا گیا کہ محمد صلعم از روئے پیدائش نصرانی تھے۔ ہمیں اب (Theophanes) کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جس نے اسلام اور اسکی تعلیمات کے متعلق سب سے پہلے لکھا ہے اور جس کی تحریرات کو (Anastasius) نے اپنی "تاریخ کلیسا" میں بعینہٖ نقل کیا ہے۔ اس میں محمد صلعم کے متعلق جو فسانے قرون وسطیٰ میں تیار کئے گئے تھے انکی تمام امتیازی خصوصیات آجاتی ہے۔ تاریخ، روایت فسانہ، ظن وتخمین اور رجماً بالغیب کا ایک نہایت اچھا مجموعہ ہے۔ ہمیں اس میں محمد صلعم کی مسکنت وغربت۔ خدیجہ سے شادی اور تجارتی سفروں کا حال ملتا ہے جو سب تاریخی واقعات ہیں لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بے بنیاد بیان بھی ملتے ہیں کہ یہودیت اور نصرانیت کا مطالعہ نبی کریم نے انکی مذہبی کتابوں سے کیا تھا۔ اس مقام پر ہم اس فسانے سے بھی روشناس ہوتے ہیں جن کا ذکر عیسائی مصنفین نہایت ذوق وشوق سے کرتے رہے ہیں کہ محمد صلعم نے جبریل سے تعلق کا قصہ اس لئے گھڑا تاکہ حضرت خدیجہ کا شک اس بارے میں رفع ہوجائے کہ انکے خاوند کو مرگی کے دورے آتے ہیں Theophanes کے بیان کے مطابق ایک پادری جو بداعتقادی کی وجہ سے کلیسا سے خارج کردیا گیا تھا خدیجہ کے عاشق کے لباس میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ مگر بعد میں دونوں میں راضی نامہ ہوگیا اور پادری نے ازراہ کرم محمدؐ کے دعوے نبوت کو تسلیم کرلیا اور بہت کارآمد ثابت ہوا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ گیارہویں صدی سے اسلام اور اس کے متعلقہ مسائل پر برابر کتابیں لکھی جارہی ہیں لیکن وہ تمام مجادلانہ اور مناظرانہ حیثیت رکھتی ہیں لہٰذا اس نوعیت سے تمام کتابیں عجیب وغریب اکاذیب اور اباطیل کا مجموعہ ہیں اور غالباً محمد صلعم کی زندگی یا اسلام کے سمجھنے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں یہ بتادینا بے موقع نہ ہوگا کہ عین اس وقت جبکہ Raymond. (Archbishop of Toledo) عربی تصانیف کا جو فلسفہ پر تھیں ترجمہ کروا رہا تھا Peter the Venerable of Cluni قرآن اور اسلامی دینیات کے تراجم حاصل کرنے میں مصروف تھا۔

Peter the Venerable of Cluni جو کیتھولک کلیسا کا نہایت زبردست حامی تھا وہ شکایت کرتا ہے کہ تغیر کافی حد تک ہے کہ ہم اسلام کے خلاف جدوجہد جاری نہیں رکھ سکتے اور عیسائیوں کی ملامت کرتا ہے

مطلوبہ مواد اسلام کے خلاف اتنک جمع کرنے سے قاصر رہے ہیں لہٰذا وہ اب باقاعدہ کوشش کرتا ہے اور اس غرض سے وہ قران کا ترجمہ لاطینی میں کرواتا ہے۔ اس اول ترجمہ کی تاریخ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے شاید اس کو ترجمہ کے لفظ سے تعبیر کرنا موزوں نہوگا کیونکہ (Robert) نے حامل المتن ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ "عربی متن کا لب لباب اپنے الفاظ میں دیدیا ہے"۔ (Robert) کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس نے فرانس، اٹلی، دلماشیا اور یونان سے ایشیا کا سفر کیا جہاں اس نے عربی زبان کی تحصیل کی۔ ۱۱۳۶ء میں وہ بارسیلونا میں مقیم تھا جہاں اُسے (Plato of Trivoli) کی سرپرستی حاصل تھی اور ۱۱۴۱ء سے ۱۱۴۳ء تک وہ عربی کی تحصیل میں مصروف رہا۔ بعد میں وہ Pampe (Archdeacon of luna) ہوگیا۔ ۱۱۴۱ء میں Peter theVenerable نے Robert and Hermann کی خدمات حاصل کیں تاکہ چند عربی کتب کا ترجمہ کرائے بالآخر چار کتابیں شائع کی گئیں جن کی پیٹر نے خود اپنے قلم سے ایک دیباچہ لکھا۔ ان چاروں ترجموں کی مدد سے Robert نے اسلام کے خلاف ایک تصنیف تیار کی "Chronica mendosa et ridiculsa Saracenorum" جس میں حضرت صلعم کے حالات زندگی خلفاء اربعہ کی تاریخ اور واقعہ کربلا قلبند کئے قرآن کا ترجمہ۔ مترجم کے دیباچہ کے ساتھ Peter the Venerable کے نام کے ساتھ معنون کر دیا۔

Robert خود کہتا ہے کہ اس نے قرآن کا ترجمہ ۱۶ جولائی اور ۳۱ دسمبر ۱۱۴۳ء کے درمیان ختم کیا۔

Peter the Venerable کی تصانیف کے شائع ہوتے ہی اسلام کے خلاف مجادلہ اور مناظرہ کا دروازہ کھل گیا۔ اور یہی ایک ماخذ اور سرچشمہ ہے جس سے قرون وسطیٰ کے نصرانیوں نے اسلام کے خلاف مواد حاصل کیا اور اسلام کے متعلق رائے قائم کی۔ اس کی تصانیف کے بعد سے یورپ کی تمام زبانوں میں اسلام کے خلاف سب وشتم کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ بعض مصنفین نے نبی کریم اور اسلام کے خلاف نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے مثلاً Walter of Sens نبی کریم کے خلاف لاطینی نظم میں اور

Alexander Du Pont نے فرانسیسی نظم میں گلفشانی کی ہے۔ قرآن کا وہ ترجمہ جس کو رابرٹ نے کیا تھا قرون وسطیٰ میں متداول اور معروف تھا۔ Alberich (of Irois Fontaines) جو تیرہویں صدی میں تھا اس ترجمہ سے واقف تھا لیکن اسلام کی مخالفت میں اُس نے اُس ترجمہ سے بہت کم مدد لی ہے۔ اسلام کے خلاف اکثر رسالے مباحثے کی صورت میں ملتے ہیں جو عیسائی اور نصرانی علما میں ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مباحثے ہوئے تھے اور اکثر ہوتے تھے مثلاً ایک مذہبی مناظرہ ۱۲۰۷ء میں حلب میں ہوا جس میں سلطان صلاح الدین کا ایک لڑکا بھی موجود تھا۔ عیسائیوں کی طرف سے جارج نامی راہب مباحث تھا۔ Raymond Lullus بھی ایک مذہبی مناظرہ کی خبر دیتا ہے جو Bngia مقام پر ۱۳۰۷ء میں ہوا۔ اس مباحثہ میں ایک یہودی، ایک عیسائی اور ایک مسلمان یکے بعد دیگرے ایک لا مذہب شخص کے سامنے اپنے اپنے مذاہب کی تلقین کرتے ہیں لیکن وہ لا مذہب تمام شواہد پر غور و خوض کرنے کے بعد نصرانیت قبول کر لیتا ہے۔

لیکن سب سے زیادہ گندہ اور بے بنیاد الزام جو قرون وسطیٰ کے مصنفین مسلمانوں پر لگاتے ہیں وہ بت پرستی کا ہے۔

کیسی عجیب و غریب بات ہے کہ ہم سے بار بار کہا جاتا ہے کہ مسلمان محمد صلعم کو خدا سمجھتے ہیں اور اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ حروب صلیبیہ کا ایک مشہور مصنف ایک مسلمان کے منہ سے یہ کہلواتا ہے کہ "Belief in Mohd & our other Gods" چند مصنفین محمد صلعم کو ملاحدین کا خدا کہتے ہیں جس کی روزانہ پرستش کی جاتی ہے۔ (Arnold of Lubeck) میں جنگ Hittin کے بعد سلطان صلاح الدین اسیر شدہ شہزادے سے یوں خطاب کرتا ہے "کہ تو نے میرے زور بازو کو میرے خدا محمد کی بدولت محسوس کیا" اور ایک نصرانی Knight اُس کا جواب ان الفاظ میں دیتا ہے "کہ اُس محمد کو جس کو تو خدا کہتا ہے ہم حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اُس کی تکذیب کرتے ہیں اور اُس پر لعنت بھیجتے ہیں" The Sum of False Turpin کے بیان کے مطابق چارلس اعظم Charles the Great کے اسپانیہ پر حملہ کے وقت محمد صلعم مسلمانوں کا خدا سمجھا جاتا تھا اور Mathew Paris (

کے خیال کے مطابق مسلمان محمدؐ کی اسی طرح پرستش کرتے تھے جیسے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کی جب inored یروشلم کی فتح کے بعد اُس مسجد میں داخل ہوا ہے جو گرجا کی جگہ بنائی گئی تھی تو اُس نے محمدؐ کا اتنا ذرنی نقرئی بت دیکھا کہ چند آدمی اُس کو مشکل سے اٹھا سکتے تھے ۔ اس کے علاوہ Jacob of Nitroy تو یہاں تک کہتا ہے کہ بیت المقدس پر جب کبھی بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو محمدؐ کا بت گرجا میں لاکر رکھا گیا اور عیسائیوں کا داخلہ روک دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ مسلمان عیسائیوں کے خلاف جنگ کرنے سے پہلے اپنے ایک بت محمدؐ نامی سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ بہرحال اس قسم کی بیہودہ روایتیں قرون وسطیٰ میں عام طور سے رائج تھیں اور انکے اسباب کے متعلق گذشتہ اوراق میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

Ginbert of Nogenl نے پہلی مرتبہ ان تمام منتشر روایتوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے لیکن وہ نہایت دیانتداری سے اعتراف کرتا ہے کہ اُس کی تمام تصانیف زبانی روایتوں پر مبنی ہے۔ اُس غریب کو اس کا بھی علم نہ تھا کہ نبی کریمؐ کونسی صدی میں تھے مگر (Ginbert) خود لکھتا ہے کہ "محمدؐ کسی بعید ماضی میں نہ ہونگے کیونکہ ایک پادری نے اُس کی بداعمالیوں کے خلاف لکھا ہے"(Ginbert) کے بیان کے مطابق محمدؐ کی زندگی کے خاص خاص واقعات یہ ہیں:۔

ایک راہب نے جس کی دیانت مشکوک اور جس کا ایمان متزلزل تھا اسکندریہ کی قسیسیت کے لئے کوشش کی اور ناکام رہا۔ اُس پر اُس نے کلیسا سے بدلہ لینا چاہا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ شیطان نے اُس کے کان میں یہ پھونک دیا کہ اس شیطانی ارادہ کی تکمیل کے لئے اس نوجوان کا انتظار کرو جو تمہارے پاس عنقریب آئے گا۔ راہب نے جو خوب جانتا تھا کہ اس کام کے لئے کیونکر اس نوجوان کو اپنے ساتھ ملائے اس کی خدیجہ سے شادی کرادی اور خدیجہ نے راہب کے یہ کہنے سے کہ محمدؐ ایک پیغمبر ہو ایک غریب نیچ ذات کے خاوند کو قبول کر لیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد محمدؐ کو مرگی کے دورے آنے لگے اور خدیجہ سہمی ہوئی راہب کے پاس گئی لیکن راہب نے خدیجہ کو سمجھا دیا کہ یہ مرگی نہیں ہے بلکہ نزول وحی کے وقت محمدؐ کی یہ حالت ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ محمدؐ کی شہرت پھیل گئی اور نبی کا درجہ حاصل کر لیا۔ راہب نے اب محمدؐ کو یہ صلاح دی کہ اپنی تعلیمات کے اصول ایک ضابطہ کی صورت میں پیش کرو اور انکی تصدیق ایک معجزہ کے ذریعہ کرو۔ چنانچہ محمدؐ نے

تین دن روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا اور تب محمد نے ایک نہایت سنجیدہ جماعت کے سامنے اعلان کیا کہ عنقریب وحی نازل ہونیوالا ہے خبردار رہو۔ لوگ ہمہ تن منتظر تھے کہ اچانک ایک گائے جس کو محمد نے پہلے سے خوب سدھا رکھا تھا۔ مع ایک کتاب کے جو اس کے سینگوں کے درمیان رکھی ہوئی تھی ظاہر ہوئی اور محمد کے سامنے دوزانو بیٹھ گئی۔ اس واقعہ کے بعد سے ہمارا فاضل (Ginbert) کہتا ہے محمد کی رسالت اور نبوت کے متعلق کسی کو شک و شبہ باقی نہ تھا۔ اور نئی تعلیم جس کی تمام بنیاد کذب و فریب پر تھی لوگوں میں بہت جلد پھیل گئی۔ کتاب مذکور کے مضامین کے متعلق ہمارا مصنف اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ اس کتاب سے لذائذ دنیوی، شہوت رانی اور خبائث و رذائل کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھول دیا۔ محمد کا انجام بھی اس تمام فسانہ کے مطابق ہی ہوا ہے کیونکہ ہم پڑھتے ہیں کہ ایک دن محمد تنہا جا رہا تھا کہ مرگی کا دورہ پڑا اور وہ زمین پر بیہوش گر پڑا۔ اتنے میں سوروں کا ایک غول آیا اور اسکی بوٹی بوٹی کر کے کھا گیا صرف ایڑیاں بچی رہیں۔

قرون وسطیٰ کے مصنفین کی رائے کے مطابق یہی واقعہ ہے جس کی بنا پر مسلمانوں پر سور کا گوشت حرام کیا گیا۔ (Gimbert) کی "سیرۃ محمد" کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے۔

اب ہمیں (Heldeben) کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جو (Lemons) کا عالم و فاضل پادری ہے۔ اور جو بعد میں Tours کا Archbishop سنہ ۱۱۳۳ء میں ہو جاتا ہے اس نے بھی محمد کی سیرۃ لکھی ہے اور اس میں فسانہ کا رنگ پایا جاتا ہے اپنے معاصرین کی طرح وہ بھی محمد کو گالیاں دیتا ہے لیکن محمد کی کامیابی کو ایک جادوگر کی مدد کیطرف منسوب کرتا ہے۔ وہ بھی متفق ہے کہ محمد کی لاش کو سور کھا گئے۔

بارھویں صدی کے اول نصف میں (Walter of Sens) نے ایک ایسی ہی نظم لکھی جس کا عنوان " Otia Walter, de Mohometa " تھا اس نے اسلام کی ترقی کا حال ایک مسلمان کے حوالے سے لکھا ہے جس نے مذہب نصرانیت قبول کر لیا تھا اور مشرقی فرانس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

اس مقام پر راہب کے فسانہ میں ترمیم شروع ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا ضمیر اس قصہ سے مطمئن نہیں ہوتا تھا کہ اسلام کا حقیقی بانی ایک باغی پادری ہو اور جس کے ہاتھ میں محمد ایک آلہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہو۔ لہذا قرون وسطیٰ کی تصانیف کی یہ مشترک خصوصیت اب نظر انداز کر دی جاتی ہے (۵)

Idebert of Lemons میں راہب کی جگہ ایک جادوگر لے لیتا ہے۔ Walter of Sens میں راہب اب محمد کا روحانی مرشد نہیں رہتا بلکہ ایک منجم اور معبر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

علاوہ ازیں ہم والٹر میں ایک نئی خصوصیت کا اضافہ دیکھتے ہیں۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ محمد کے پیرؤں اور ایرانیوں میں ایک لڑائی ہوئی تھی۔ محمد نے لڑائی کے روکنے کی بے انتہا کوشش کی لیکن جب اس نے دیکھا اس کے روکے لڑائی نہیں رکتی تو نہایت بزدلانہ میدان سے بھاگ گیا اور جنگل میں چھپ گیا۔ محمد اور خدیجہ کی شادی کو ایک نہایت گہری چال کا نتیجہ بتلاتا ہے۔

عیسائی مصنفین کی تصانیف میں محمد کو اکثر ایک پیدائشی غلام کہہ کر حق و انصاف کے گلے پر چھری پھیر دی گئی ہے۔ Heldebert of Lemons میں ہم پڑھتے ہیں کہ محمد نے اپنی رسالت کو ایک بیل کے ذریعہ ثابت کیا تھا۔ جس کو محمد نے پوشیدہ طریقے سے سدھایا تھا۔ یہ بیل اُنکے حکم کا تابع تھا جب وہ کہتے تب اٹھتا تھا اور جب بیٹھنے کا حکم دیتے تھے تب بیٹھ جاتا تھا۔ دوسرے مصنفین نے یہ کام ایک اونٹ سے لیا ہے جس کی گردن میں ایک کتاب بندھی ہوئی تھی لیکن Andrea Dandolo (Venice) میں ہم پڑھتے ہیں کہ نے ایک سفید کبوتر کو اس طرح سدھایا تھا کہ وہ اُنکے شانے پر آکر بیٹھ جاتا تھا اور اُن کے کان میں سے دانے چن چن کر کھاتا تھا۔ خدیجہ اُس کے بیان کے مطابق عرب کی ایک شہزادی تھی جس سے شادی کرنے کی وجہ سے محمد کو دنیاوی جاہ و جلال اور مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ محمد کا دست راست ایک راہب (Sergius نامی تھا جو محمد کی مدد سے کلیسا کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا) Dandolo کہتا ہے کہ محمد کے ایک دشمن نے اُن کو زہر دے کر مار ڈالا۔ اور اس کے بعد اُسکا قلم اس طرح گوہر ریز ہوتا ہے: "چونکہ محمد کو یقین تھا کہ وہ تین دن کے بعد آسمان پر اٹھا لیا جائیگا لہذا اُس نے اپنے متبعین اور پیروان اسلام کو تاکید کر دی تھی کہ اُن کی لاش کو تین دن تک دفن نہ کیا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی لیکن متوقع معجزہ ظہور پذیر نہ ہوا بلکہ بارہ دن

فضول انتظار کے بعد اسکی متعفن اور سڑی ہوئی لاش دفن کرنی پڑی۔"

Gesta Imperatorum et Pontificum میں جس کو ٹامس باشندہ ٹسکنی نے ۱۲۷۸ء میں تصنیف کیا ہے ایک بہت بڑا مجموعہ ان افسانوں کا ملتا ہے۔ اس میں راہب، کبوتر، گائے الغرض سب کچھ موجود ہے۔ اور مصنف نے اُسکو دلچسپ بنانے کی غیر معمولی کوشش کی ہے۔ اس میں ایک پادری کو روشناس کرایا گیا ہے جو ایک کنوئیں میں بیٹھ کر لوگوں کو اسلام کی طرف ترغیب و تحریص دیتا تھا۔ محمد اس سے بدگمان ہو گیا اور اب اُس کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ اس خطرناک دوست سے کیونکر رہائی حاصل کیجائے لہذا اُس نے ایک دن موقع پاکر کنوئیں کو بھروا دیا اور اپنے حریف سے چھٹکارا پایا۔ لیکن ان روایات، افسانوں، اور حکایات کا بہترین اور کامل ترین مجموعہ (Prince of Beauvais) کی تصنیف Speculum Historiale کے اُس حصہ میں ملتا ہے جو محمد کے بارے میں ہے۔ اسمیں محمد ایک تاجر بتلایا جاتا ہے جس نے اپنے تجارتی سفروں کے دوران میں نصرانیت اور یہودیت کے متعلق سطحی معلومات حاصل کر لی تھیں مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ایک ہوشیار جادوگر تھا جس نے اپنے جادو کے ذریعہ خدیجہ جیسی مالدار عورت سے شادی کر لی۔ مصنف مذکور ہماری اطلاع کے لئے یہ بھی کہتا ہے کہ محمد نے اپنے تئیں مسیح موعود مشہور کر کے بہت سے لوگوں کو اپنا پیرو بنا لیا۔ اس کے بعد عام حکایات شروع ہو جاتی ہیں۔ کبوتر جو محمد کے کان میں بات کرتا تھا۔ سدھی ہوئی گائے جس کے سینگوں کے درمیان قرآن رکھا تھا۔ اور ایک گھڑا جس میں دودھ اور شہد بھرا تھا۔ علاوہ ازیں (Prince) اس مکالمہ کا ایک اقتباس دیتا ہے جو ایک عیسائی اور مسلمان کے درمیان ہوا تھا اور جسکو (Peter the Venerable of Cluni) نے اپنے لاطینی ترجمہ کے ساتھ یورپ میں شائع کرایا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق محمد ایک غارت گر، قزاق، قاتل اور ہر انسانی اور خدائی قانون کا توڑنے والا ہے۔

(Prince of Beauvais) کی تصنیف کے اوراق پر کبھی کبھی حق و صداقت کی شعاعیں بھی نظر آجاتی ہیں لیکن اس موقع پر ہماری توجہ کا مستحق William of Tripoli ہے (Heldebert, Ginbert) اور Prince of Beauvais کے مقابلہ میں اسکا پایۂ علم کہیں بلند ہے۔ وہ اسلام اور اس کے بانی کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ محمد کو فریب کار

اور دغاباز شخص نہیں سمجھتا اور نہ اُس کی تصنیف بے بنیاد الزاموں اور تہمتوں کا ایک طومار ہی لیکن وہ بحیرا راہب کے افسانے سے بے خبر نہیں ہے۔ اُس کو چند صحابہ کے نام بھی معلوم ہیں اور اسلام کے ابتدائی حالات نسبتہً معقول طریقے سے قلمبند کئے ہیں۔ لہذا ہمیں سننا چاہئے کہ ولیم اس بارے میں کیا کہتا ہے۔

"اُس سڑک پر جو شام سے مکہ کو جاتی ہے۔ سینا کے قریب ایک نصرانی راہب بحیرا رہتا تھا جس کے حجرہ میں اس سڑک سے گذرنے والے تاجر ٹہرا کرتے تھے۔ بحیرا نے ایک خواب میں دیکھا کہ تاجروں میں ایک عرب لڑکا آئے گا جس کو فطرت اور قسمت نے کلیسا کو نقصان پہنچانے کے لئے چن لیا ہے۔ بحیرا نے قرائن وعلائم سے معلوم کیا کہ وہ لڑکا محمدؐ ہے۔ بحیرا نے اُس پیشین گوئی کے خیال سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کیا محمدؐ کی تربیت ایک عیسائی لڑکے کی حیثیت سے کیجائے۔ چنانچہ جب محمدؐ راہب کے گھر کے صحن میں آیا تو اس کے نیچے اور بیت دروازے نہایت عالیشان ہوگئے جس سے محمدؐ کی آئندہ عظمت کا پتہ چلتا تھا۔ چونکہ محمدؐ کی پرداخت اور تربیت ایک عیسائی کی طرح ہوئی تھی لہذا محمدؐ کو اپنے قبیلہ کے لوگوں کی بت پرستی سے سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ ایک نوجوان کی حیثیت سے محمدؐ نے تجارت کی غرض سے بہت سے سفر کئے اور اپنا کار متعلقہ نہایت دیانتداری سے انجام دیا۔ اُس کے آقا کی موت نے اور خدیجہ سے اُسکی شادی کے واقعہ نے اُس کو ایک بڑا آدمی بنا دیا۔ عرب کے بہت سے لوگ اُس کے گرد جمع ہوگئے لیکن دس اشخاص اور سب سے زیادہ ابوبکر اس سے گہرا رشتہ رکھتے تھے۔ لیکن اُس کے دوست بحیرا کی دوستی کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے چنانچہ اُسکے دوستوں نے راہب کو مار ڈالا جبکہ محمدؐ ایک سفر کی تکان سے چور اور شراب کے نشہ میں بدمست ہو کر سو رہا تھا۔ جاگنے پر محمدؐ نے یقین کر لیا کہ وہ خود اُس کا قتل کرنے والا اور شراب کے نشہ میں اُس حرکت کا ارتکاب ہوا ہے۔ چنانچہ اُس دن سے آج تک مسلمانوں میں شراب ممنوع چلی آتی ہے۔ بحیرا کے قتل کے بعد محمدؐ کے تمام جذبات رذیلہ اور سافلہ مشتعل ہوگئے اور فتوحات، مار اور غارتگری کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ شان و شوکت کی گیارہ سالہ زندگی کے بعد محمدؐ کا انتقال ہوگیا اور ایک لڑکی فاطمہ چھوڑی "

Niccidlis of Montechristo کی جو رائے قرآن کے متعلق ہے وہ اس قدر دلچسپ ہے کہ اُس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ولیم کہتا ہے کہ محمدؐ کو ۴۰ سال کی زندگی کے بعد یقین ہے

کہ اُس کو منصب نبوت عطا ہوا ہے اور جبریل وحی لاتے ہیں۔ اس وحی کو اُنکے دوست جمع کرتے جاتے تھے اور یہی قرآن کی ابتدا ہے۔ لیکن نصرانی مصنفین کی رائے اس معاملہ میں دوسری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد کی وفات کے پندرہ سال بعد محمد کے باقیماندہ صحابہ نے اپنے نبی کی تعلیمات قلمبند کرنیکی تجویز کی لیکن جن لوگوں کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا وہ اس کام کے ناقابل نکلے لہٰذا انہوں نے اس کام کے لئے اُن عیسائی اور یہودیوں کو منتخب کیا جو مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ اُنہوں نے پرانے اور نئے عہدناموں سے مواد حاصل کیا اور تھوڑی سی ترمیم کے بعد ایک کتاب کی صورت میں پیش کر دیا۔ اور اس طرح سے قرآن عالم وجود میں آیا۔ وہ نہایت زور سے اعلان کرتا ہے کہ مسلمان نہایت پکے موحد ہیں اور نہ صرف حضرت عیسٰی کی عزت کرتے ہیں بلکہ حواریوں کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے خیال کے مطابق اسلام کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ حضرت عیسٰی کو محض انسان جانتے ہیں اور محمدؐ کو نبی مانتے ہیں۔

لیکن واعظ Nicoldlis of Montechristo جو تیرہویں صدی کے اختتام اور چودہویں صدی کے آغاز میں تھا اپنے معاصرین سے وسعت نظر اور بے تعصبی میں کہیں بالاتر نظر آتا ہے۔ ایک واعظ کی حیثیت سے وہ سالہا سال تک مسلمانوں میں رہا تھا اور قرآن سے نہایت اچھی واقفیت رکھتا تھا اگرچہ اُس نے اپنی زندگی کا مقصد مذہب اسلام کا رد قرار دیا تھا۔ لیکن محاسن اسلام سے چشم پوشی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اپنے ہم مذہبوں سے کہتا تھا کہ چند باتوں میں ہمیں اسلام اور مسلمانوں کو اپنا نمونہ سمجھنا چاہئے۔ وہ تعجب آمیز مسرت کے ساتھ اسکا ذکر کرتا ہے کہ بغداد کی درسگاہوں میں قرآن کی تعلیم نہایت احتیاط سے دیجاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تین مہینے سے زیادہ عرصہ تک وہ ریگستان کے شتربانوں کے ساتھ رہا لیکن تنگی اور مصیبت کے وقت بھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے مقررہ نماز فراموش کی ہو۔ (Nicoldlis) نماز سے پہلے وضو کو جس کی اسلام نے تاکید کی ہے عیسائیوں کے لئے قابل اتباع سمجھتا ہے۔ وہ زکوٰۃ کی بہت تعریف کرتا ہے اور قانون خمس کو نہایت مفید چیز بتاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی خدا ترسی اور احترام خدا کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام تصانیف اللہ کے نام سے شروع کرتے ہیں اور اکثر الحمد للہ کہتے ہیں۔ اور اپنی مسجدوں میں جوتیاں اتار کر داخل ہوتے ہیں۔ الغرض اُس کی تصنیف اُس وقت کی عام تصانیف سے بالکل مختلف چیز ہے وہ اسلام اور اس کے

اصولوں کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ حقیقت اس کی تمام تصنیف میں نمایاں ہے۔ وہ اسلام اور بانی اسلام کو گالیاں نہیں دیتا بلکہ اپنے خیال کے مطابق اُس کے غلط اصولوں کی تردید منطقی دلائل سے کرنا چاہتا ہے اسلام اور نصرانیت میں جو نقاط مشابہت ہیں اُنکی تردید یا توجیہ اس طرح کی گئی ہے کہ یہودیوں اور بحیرا نے محمد کو نئے اور پرانے عہدناموں کی تعلیم دی تھی اور اگر کوئی نیک کلمہ William of Tripoli یا Gerhard of Strasburg Nicoldlis of Montechristo کی زبان سے اسلام کے متعلق نکل جاتا ہے تو وہ "صدا بصحرا" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اُس وقت کا کلیسائی شور و شغب۔ اسلام و نصرانیت کی حریفانہ حیثیت۔ باہمی بغض و عناد اس بات کی کب اجازت دیتا تھا کہ یورپ کے نقارخانہ میں (Nicoldlis) کی طوطی کی آواز کبھی سنائی دے۔ نہ صرف قرون وسطیٰ میں نبی کریم کی تصویر میں قصص و فسانے کا رنگ غالب ہے بلکہ ۱۸۲۹ء تک جبکہ Charles Foster کی Mohametanism Unveiled" شائع ہوتی ہے یہی کیفیت نظر آتی ہے لیکن انیسویں صدی کے آخر نصف سے نبی کریم کی زندگی اور عقائد و اصول اسلام تاریخی روشنی میں آنا شروع ہوئے ہیں۔ ہمیں

Weil, Caussin de Perceval, P. Caetrani, Th. Noldeke, Krehl, A Springer, Sir W Muir, von Kremer.

کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اُنکی کدوکاوش کی بدولت ہم یورپ میں نبی کریم کی حیات طیبہ و اسلام کے عقائد و اصول تاریخی شان میں دیکھتے ہیں۔

حالات حج

(گزشتہ سے پیوستہ)

اہل بمبئی حجاج کی خوب امداد اور خدمت کرتے ہیں۔ بعض تجار مسافر خانہ سے جہاز تک انکو پہنچانیکے لئے لاریاں مفت بھیجدیتے ہیں۔ کھانے بھی کھلاتے ہیں اور چائے اور شربت بھی پلاتے ہیں۔ یہی حال اسوقت ہوتا ہے جب حاجی حج کرکے واپس آتے ہیں اور بمبئی اترتے ہیں۔ انجمن خدام النبی خصوصیت کے ساتھ اس میں حصہ لیتی ہے۔ اس انجمن کی طرف سے چند آدمی ہمارے جہاز پر بھی تھے جنہوں نے قمران میں پہنچکر برف اور شربت کی سبیل لگائی پھر مکہ اور منا میں اور شاید عرفات میں بھی۔

جہاز پر سوار ہونے سے ایک دن پہلے سامان رکھا جاتا ہے۔ حجاج کو میں نے دیکھا کہ اجازت ملنے پر وہ اچھی جگہ لینے کے لئے عجلت کے ساتھ سیڑھی پر ایک دوسرے کو دھکا دیتے اور گراتے ہوئے آگے بڑھے۔ کمزور بوڑھوں اور بچوں کی عجیب حالت تھی۔ کئی زخمی ہوئے اور کئی کچل گئے۔ میں سوچنے لگا کہ یہ قوم جو اس قدر بے نظام اور خود غرض ہے وہ دنیا میں کسی کو وحشی کہنے کا حق نہیں رکھتی۔

اس جہاز میں فرسٹ کلاس کا ڈک بہت بڑا اور وسیع تھا۔ اس وجہ سے ہم لوگوں کو ہر قسم کا آرام تھا۔ کھانے پینے کی ایسی آسائش تھی کہ حضر میں بھی مشکل سے ہوسکتی ہے اور یہ مولانا عبدالقادر صاحب کا فیض اور انتظام تھا۔

مولانائے موصوف سے پیشتر سے مجھے شناسائی تھی لیکن اس سفر کی رفاقت میں انکے عقلی اور علمی اور ظاہری اور باطنی اوصاف کو دیکھکر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اسلامی پنجاب کے تاج ہیں۔

حجاج کے جہازوں میں جو ہندوستان سے جاتے ہیں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کو کھانا

اپنے ہاتھ سے پکانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے جہاز میں دھواں، گرمی اور فی الجملہ گندگی بھی رہتی ہے حالانکہ یہی جہاز دوسرے ممالک مثلاً جاوا، ساترا اور سنگاپور وغیرہ سے جب حاجیوں کو لیجاتے ہیں تو انکے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں کمپنیوں سے گفتگو کیجائے تو آسانی سے یہ دقت رفع ہوسکتی ہے کیونکہ حجاج کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور بڑا سامان لادنا پڑتا ہے یہانتک کہ لکڑی چیرنے کے لئے کلہاڑیاں بھی ساتھ رکھنی پڑتی ہیں۔

ملاجی[1] یعنی مولوی نثار احمد صاحب کانپوری بھی اس جہاز پر تھے جو روزانہ اپنے مریدوں کو جمع کرکے وعظ فرماتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ بمبئی سے میں کوئی زاد راہ لیکر نہیں چلا تھا مگر اللہ کی مہربانی دیکھئے کہ تورمہ اور پلاؤ دیتا ہے۔ میں نے کہا یہ مواعظ جو آپ کی جھولی میں تھے۔

ملاجی کا یہ آٹھواں حج تھا۔ انکو اس سفر کا اچھا تجربہ ہے۔ اور آدمی نہایت مستعد و جفاکش ہیں۔ ساتھیوں کو خوب آرام دیتے ہیں۔ واپسی میں بھی میرا انکا ساتھ اسی جہاز پر رہا۔ انہوں نے جو آرام پہنچایا میں اسکا شکر گذار ہوں۔

وہابیوں سے نہایت بیزار ہیں۔ یہانتک کہ جدہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ کا سفر پاپیادہ کیا تاکہ کوشان[2]، نہ دینا پڑے اور انکا کوئی پیسہ وہابی حکومت کو نہ ملے۔ میں نے یہ بھی سنا کہ انہوں نے نازی کمپنی سے اپنے جہاز میں سے دہ پندرہ روپے بھی معاف کرالئے تھے جو کمپنیوں کو فی کس حجازی گورنمنٹ کو دینے پڑتے ہیں۔

ایک دن ہماری حقہ نوشی کی محفل میں جو جہاز پر اکثر گرم رہتی تھی ملاجی بیٹھ گئے۔ اور فرمانے لگے کہ مسجد حرم کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ چاہے کتنے ہی آدمی آجائیں وہ پُر نہیں ہوتی

---

[1] مولوی صاحب موصوف اپنے آپ کو ملاجی کہتے ہیں۔ یہ لقب غالباً انہوں نے ملا سیف الدین طاہر کے جواب میں اختیار کیا ہے

[2] کوشان رومنہ کو کہتے ہیں جس کے ساتھ ایک حقیر سی رقم بھی دینی پڑتی ہے۔

دوسرا یہ کہ بدو پہاڑوں سے پتھر لاد کر لاتے ہیں وہ قدرت الٰہی سے تربوز بنجاتے ہیں۔ ان کے اس بیان سے محفل پر جو کیفیت طاری ہوئی تھی اس کے شاہد حافظ علیم صاحب کانپوری ہیں اور غلام کبریا صاحب انجنیر۔

جہاز میں آقائے معتمد الاسلام شیرازی بھی تھے۔ ان سے شعر و شاعری کے سلسلہ سے تعارف ہوا۔ آدمی نہایت وسیع الخیال تھے اور مسلمانوں کی فرقہ بندیوں سے سخت نالاں۔ کہتے تھے کہ ان مذہبی تفریقوں کا اثر ہمارے دنیاوی معاملات نہایت بُرا پڑ رہا ہے۔ انکے ایک بھائی جو مصر اور وجیہ تھے مجتہد تھے۔ اثنائے گفتگو میں وہ بھی آکر بیٹھے۔ فرمانے لگے کہ یہ اختلافات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ دونوں فریق کے اہل علم چاہیں بھی تو اتفاق نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا یہ اختلاف ڈالا کس نے علاوہ بریں فروعی امور میں اتفاق نہ بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ ہم میں اصولی اسباب اتفاق کے اس قدر ہیں کہ اگر چاہیں تو متحد ہو سکتے ہیں۔

بمبئی کے ایک مرشد بھی جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں ہمارے جہاز پر تھے۔ آدمی دلچسپ اور خوش آواز تھے۔ ہر حلقہ کے سیاسیات علیحدہ ہوتی ہیں۔ ان کے کچھ مرید جنوبی افریقہ نٹال وغیرہ میں ہیں۔ وہاں قادیانی مبلغ پہنچ گئے تھے اور خواجہ کمال الدین کا بھی دورہ ہوا تھا۔ پیر صاحب موصوف کو انکا مقابلہ کرنا پڑا۔ آکی تمام تر گفتگو اپنی انہیں فتوحات کے متعلق تھی جو انہوں نے اس جدید مرزائی اثر پر حاصل کی تھیں۔

اثنائے گفتگو میں ایک دن فرمانے لگے کہ ہندوستان میں جہاں سوائے مذہب حنفی کے اور کوئی مذہب نہ تھا۔ کہاں سے وہابی اور قادیانی وغیرہ فرقے پیدا ہوگئے۔ میں نے کہا کہ حالات اور خیالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آپ کے جد امجد شیخ جیلانی حنبلی تھے پھر آپ کیسے حنفی بن گئے؟

جدہ میں جہاز ساحل سے دور کھڑا ہوتا ہے، کیونکہ کنارے پر پہاڑیوں کے چکر ہیں جن میں وہ چلا نہیں سکتا۔ جدہ کی بیچ اور خوشنما منزلہ عمارتیں جو سفید مٹی کی بنی ہوئی ہیں جہاز

پچھے نہایت شاندار معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہاں کے ایک رئیس جو ہم لوگوں کو جہاز پر لینے آئے تھے کہنے لگے کہ دیکھئے یہ ہمارا لندن ہے یہ ہمارا پیرس ہے۔

جدہ میں حاجیوں کے لئے مسافر خانے کم ہیں۔ اور اہل جدہ تھوڑی رقم لے کر محض دو ایک روز کے لئے ان کو اپنے مکانوں میں ٹھہرانا اور اپنے سازوسامان وفروش کو خراب کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے فی الجملہ حجاج کو یہاں ٹھہرنے کی تکلیف ہے۔ بعض ہندوستانی ریاستوں کے رباطیں یہاں ہیں لیکن وہ بالکل دوسرے مصرف میں ہیں۔ حجاج کے کام نہیں آتے۔ کاش وہ ریاستیں اسکی طرف توجہ کرتیں۔ خاصکر رامپور۔

جدہ چھوٹا سا شہر ہے لیکن شاندار ہے۔ وہاں الفلاح نامی ایک مدرسہ ہے جس میں معمولی نوشت وخواند کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس کی عمارت اچھی ہے۔ ایک دوسرا مدرسہ حکومت کی طرف سے بھی قائم ہوا ہے۔

جدہ اور نیز مکہ میں موٹر کمپنیاں حجاج کے لئے کثرت سے ہیں۔ اس وقت حجاز میں ۶۰۰ سے زائد موٹریں اور لاریاں کرایہ پر چل رہی ہیں۔ سب سے بڑی کمپنی شرکت سعودیہ ہے جو امرا حجاز کی ہے۔ النجاح کمپنی میں ہندوستانیوں کا حصہ زیادہ ہے۔ یہی سب سے آرام دہ ہے کیونکہ اس میں پنجابی لڑکے ڈرائیور ہیں جو ہوشیاری کے ساتھ گاڑیوں کو چلاتے ہیں اور حجاج کو آرام پہنچاتے ہیں۔ دوسری کمپنیوں میں زیادہ تر تکروری (سوڈانی حبشی) یا عرب ڈرائیور ہیں جو بے تحاشا چلاتے ہیں اور اپنی ناواقفی سے گاڑیوں کو بھی خراب کرتے ہیں اور حاجیوں کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ مکہ اور جدہ کے درمیان میں تھوڑا سا حصہ ریگ رواں کا پڑتا ہے۔ اس میں ہم نے بہت سی موٹریں اور لاریاں پھنسی پڑی دیکھی جن میں سے کوئی تو ٹوٹ گئی تھی اور کسی کا انجن جل گیا تھا۔ پنجابی ڈرائیور اس ریتے میں سے صفائی کے ساتھ موٹریں نکال لیجاتے ہیں۔

بجز اس چار پانچ میل کے جس میں ریگ رواں ہے بقیہ راستہ موٹر کے لئے برا نہیں ہے

اب حکومت کی طرف سے سڑک بن رہی ہے جو غالباً سال آئندہ تک تیار ہو جائیگی۔ سڑک ہموار کرنے والے دو انجن بھی راستہ میں ہم نے دیکھے لیکن ساری دقت پانی کی ہے۔

ہم خصوصیت خاص کی وجہ سے اپنا موٹر مسجد حرام تک لیجا سکے۔ ورنہ عام طور پر حجاج مکہ سے باہر ہی "کوشان" کی چوکی پر موٹروں سے اتار دیئے جاتے ہیں اور وہاں سے پیدل شہر میں داخل ہوتے ہیں۔

یہ سارا خطہ غیر ذی زرع یعنی باصطلاح پٹواریان "ناممکن" ہے اور کیسا ناممکن جس میں نہ کہیں گھاس ہے نہ سبزی نہ جھاڑی ہے نہ کھجور۔ جدہ سے مکہ تک راہ میں پچاسوں اونٹوں کی لاشیں پڑی دیکھیں مگر پانی کے فقدان سے نہ کوے تھے نہ چیل۔ نہ گدھ نہ گیدڑ۔

مکہ کی عمارتیں جدہ سے بھی زیادہ شاندار اور بڑی ہیں۔ اسکی آبادی کا اندازہ ایک لاکھ ہے مگر گنجایش دو لاکھ سے زائد نفوس کی ہے۔ یہاں عربی گھرانے کم ہیں زیادہ تر سوڈانی اور ہندی و جاوی وغیرہ ہیں۔ بازاری اور مزدوری پیشہ طبقہ بالعموم سوڈانیوں کا ہے۔ قہوہ خانے بہت ہیں۔ جن کے آگے شغدف والی چارپائیاں سیکڑوں کی تعداد میں دور تک پڑی رہتی ہیں۔ اور انہیں پر قہوہ اور چائے نوشوں کا صبح اور شام جمگھٹا رہتا ہے۔

بازاروں میں کھانے پینے اور ضروریات کے سامان بھرے پڑے ہیں لیکن پانی کی قلت ہر جگہ نمایاں ہے نہ بازار کے آدمی صاف ہیں نہ کپڑے نہ بستر نہ برتن۔

باشندے بالعموم مجاورانہ ذہنیت کے ہیں۔ نہ ان میں تمکنت ہے نہ رعونت نہ غصہ نہ جوش انکا سارا کاروبار حجاج کے لئے ہے اور وہی انکی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ ان کو خوش رکھنا اور آرام پہنچانا چاہتے ہیں لیکن تھوڑے نفع کی توقع پر۔ سیدھے اور نیک لوگ ہیں۔ خود معتبر ہیں اور دوسروں پر اعتبار کرتے ہیں۔ اور جب آل سعود کی حکومت قائم ہوگئی ہے بالعموم سب کے سب نماز اور جماعت کے پابند ہوگئے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے اذانیں ہوتی تھیں اور لوگ قہوہ خانوں میں بیٹھے چائے اور سگرٹ پیتے۔ گپ شپ کرتے بلکہ تاش کھیلتے رہتے تھے جواب تقریباً

ناممکن ہوگیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد حرم میں نمازیوں کی کثرت رہتی ہے چنانچہ پہلے ہی دن مغرب کی نماز میں میں نے دیکھا کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی صف بستہ یا ہر سڑک پر کھڑے ہوئے جماعت میں شریک ہیں۔ اس وقت لاجی بہت یاد آئے۔

مسجد میں تقریباً ۸۰ ہزار آدمیوں کی گنجایش ہوگی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کیا سوچکر ترکوں نے اس کی عمارت مربع یا مستطیل بنوائی ہے کیونکہ اسکی وجہ سے ہر چہار سمت کوشوں پر کعبہ کی طرف رخ کرنیکے لیے صفیں گول کرنی پڑتی ہیں جس سے جا بجا سے انکا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور ہر دالان میں جہاں چھ صفوں کی گنجایش ہو سکتی تھی تین صفوں کی بھی نہیں رہتی۔ یہ مسجد بجز مدور شکل کے اور کسی صورت میں نہیں ہونی چاہئے۔

مطاف میں سنگ مرمر ہے اگرچہ ادنی قسم کا ہے۔ اس کی وجہ سے طواف میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ وہ دوپہر کو زیادہ گرم نہیں ہوتا۔

موسم حج میں ۲۴ گھنٹوں میں سے ایک منٹ کے لئے بھی یہ جگہ خالی نہیں رہتی خاصکر صبح اور شام بڑا ہجوم رہتا ہے اور ہزاروں مسلمان پروانوں کی طرح کعبہ کے ارد گرد طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ جب آپ مسجد میں داخل ہونگے دور ہی سے مطوفوں کا شور سنائی دیگا جو ایک ایک ٹولی اپنے پیچھے لئے ہوئے طواف کرا رہے ہیں۔ بلند آواز سے دعائیں پڑھتے جاتے ہیں اور پیچھے پیچھے حجاج انہیں لفظوں کو دہراتے ہیں۔

بڑا ہجوم حجر اسود پر ہوتا ہی کیونکہ ایک وقت میں صرف ایک ہی شخص اسکا بوسہ لے سکتا ہے اور ہر طواف کرنے والا اس تقبیل کا خواہاں رہتا ہے۔ اس وجہسے وہاں خواجہ سرا بید لئے ہوئے کھڑے رہتے ہیں اور جو تقبیل میں ضرورت سے زیادہ دیر لگاتا ہے اس کے مونڈھے پر مارتے ہیں جس سے وہ فوراً آگے بڑھجاتا ہے اور دوسرے کو تقبیل کا موقع ملتا ہے۔

حجاج اس تقبیل کے ایسے عاشق ہوتے ہیں کہ جماعت کے وقت بھی حجر اسود سے لپٹے رہتے ہیں

بڑی مشکلوں سے خواجہ سرا مغرب اور صبح کے وقت مطاف میں صفیں کھڑی کرپاتے ہیں۔
اس پر بھی بعض لوگ صفوں کے آگے سے نکلتے ہوئے جا کر لیٹ جاتے ہیں۔ اور بعض بعض جماعت
میں شریک ہی نہیں ہوتے۔ منتظر بیٹھے رہتے ہیں، سلام پھرتے ہی بلکہ پہلے ہی اچھل کر وہاں
پہنچتے ہیں۔ خواجہ سرا صفوں کی ابتری کے خیال سے فوراً اٹھ کر ایسے لوگوں کو زد کتا ہے اور
ور بزور بید پھر نظام قائم کرتا ہے۔

مولانا فاخر صاحب الہ آبادی نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے یہ وہابی قرآن کی نص صریح ومن
دخلہ کان آمنا کے کس قدر خلاف کرتے ہیں کہ حرم میں حجاج کو بید سے مارتے ہیں۔ میں نے
کہا یہ انتظام وہابیوں سے بہت پہلے سے چلا آتا ہے۔ اور اگر اس آیت کے یہی معنی لئے جائیں کہ
وہ دنیاوی گرفت یا سزا سے محفوظ رہے گا جو میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں تو بھی مسجد کے اندرونی
نظام کو قائم رکھنے کے لئے یہ خواجہ سرا ضروری ہونگے۔ ورنہ طواف اور نماز با جماعت سب
میں مشکل پڑ جائے گی۔

مولانا کو دوسری شکایت یہ تھی کہ عورت اور مرد ساتھ طواف کرتے ہیں۔ کسی مصری عورت
نے انکو دھکا بھی دیدیا تھا جس سے پہلو میں درد بتلاتے تھے۔

میں نے کہا کہ موتمر میں یہ طے ہوا تھا کہ صبح اور شام ایک ایک گھنٹہ عورتوں کے لئے
مخصوص کر دیا جائے۔ لیکن یہ چل نہ سکا کیونکہ انکے ساتھ انکے ذی محرم بھی آنے لگے اور مخلوط
طواف ہونے لگا۔ علاوہ بریں علما نے فتوے دئے کہ زمانہ رسالت سے جو دستور چلا آتا ہے اس
میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ لیکن تاہم سلطان اس زمانہ میں مخلوط طواف کو مصلحت کے خلاف
سمجھتے ہیں۔ اور انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ میں دونوں جنسوں کے طواف الگ الگ
رکھوں گا۔ انشاءاللہ

نجدی اور یمنی قافلہ بالعموم ۵ ذی الحجہ کو آتا ہے۔ وہ لوگ جوق در جوق طواف کے لئے
آتے ہیں جس سے دوسروں کو حجر اسود تک پہنچنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس وقت وہاں نوجی سپاہی

متعین ہو جاتے ہیں جو انتظام ٹھیک رکھتے ہیں۔ نجدیوں کو میں نے اس سے زیادہ بادکھلتے دیکھا جتنی کہ دوسرے حاجیوں پر پڑتی ہے۔ لیکن خصوصیات قومی کا اختلاف اسمیں بھی نمایاں تھا ہندی پرجہاں بید پڑی تو ٹا بھاگا۔ افغانی دو ایک ضرب زیادہ برداشت کرتا تھا مگر ایسی تیز نگاہ سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا تھا کہ بس چلتا تو مارنے والے کو پھاڑ کھاتا۔ نجدی ذہن کا پکا صرف تقبیل سے غرض رکھتا تھا اس سے مطلب نہیں تھا کہ کس نے مارا اور کس قدر مارا۔ جاوی ایسی حالت میں دو ، دو بہی سی استلام پر قناعت کرتا تھا۔

بعض متعصب ہندی جن کے جہاز پر سوار ہونکی وحشت آمیز کیفیت میں لکھ چکا ہوں، نجدیوں اور یمنیوں کے اس ہجوم کو وحشت قرار دیتے تھے حالانکہ انکو صرف دو دن طواف اور سعی کے لئے ملتے ہیں اور تعداد میں ہوتے ہیں ۶۰ - ۷۰ ہزار سے زیادہ پھر ٹوٹ نہ پڑیں تو اور کیا کریں۔

انکے عورتیں اور بچے، جوان اور بوڑھے سب کے سب طواف کی دعاؤں اور جملہ مناسک حج سے اچھی طرح واقف تھے۔ انکو کسی معلم یا مطوف کی حاجت نہیں ہوتی تھی۔

اندرون کعبہ میں لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ شیبی صاحب ایک دوکاندار کی طرح در کعبہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور سیڑھی لگادی گئی تھی جس پر سے لوگ چڑھ رہے تھے۔ مجھ پر یہ نظارہ گراں گذرا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے پاؤں میرے قلب کے اوپر پڑ رہے ہیں کہ دنیا میں یہ ایک جگہ تو ایسی مقدس سمجھی جاتی کہ گنہگار انسانوں کی آلودگی سے پاک رکھی جاتی نبی کا ہر فعل سنت نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے بعض خصوصیت خاص رکھتے ہیں اور سنت سے بالاتر ہوتے ہیں۔

مسجد حرم میں رات کے وقت کم سے کم ۵ - ۶ ہزار آدمی سوتے ہیں۔ مجھے یہ امر بھی اس کے احترام کے منافی معلوم ہوا۔

اگرچہ اہل سنت کی مذہبی تفریق کے مظاہر یعنی چاروں مصلے کعبہ کی چاروں سمتوں

شکل میں قائم ہیں۔ مگر اب جماعت صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ کسی وقت شافعی امام پڑھاتا ہے کسی وقت
کبھی حنبلی اور کبھی مالکی جس کے پیچھے بالعموم ہر فرقہ کے لوگ نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہانتک کہ غیر
سنت بھی۔ یہ اسلامی اخوت کا منظر بہت دلفریب ہے جس سے توقع پیدا ہوتی ہے کہ شاید
مسلمان وحدت اور رواداری کا سبق سیکھیں گے اور فرقہ بندی کو مٹا دینگے۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بیٹھے رہتے تھے اور جماعت میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ حنفیہ
عصر کی نماز میں کم آتے تھے۔ کیونکہ انکے نزدیک دوشل پر وقت ہوتا ہے اور وہاں ایک شل
اول وقت پڑھی جاتی ہے۔

ہندی حجاج کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ کراچی اور بمبئی سے جو لوگ گئے تھے انکا شمار ۲۱ ہزار
تھا۔ جس میں ۴ ہزار کابلی اور ترکستانی تھے۔ بقیہ ۱۷ ہزار ہندی۔ ہندی حاجیوں کی تعداد میں یہ کمی
غالباً ہندوستان میں قلت پیداوار اور قحط کے باعث تھی۔ ورنہ سال گذشتہ اس سے دوچند گنی
تعداد میں یہاں سے لوگ گئے تھے۔

ہندوستانی حاجیوں کی سب سے بڑی تعداد ۲۵ ہزار شریف عون الرفیق کے زمانہ میں
ہوئی تھی جبکہ مکہ کے ترکی حکام بھی بہت نیکدل مشہور تھے۔ لیکن سال گذشتہ ۳۴ ہزار تھی۔ جس کی
بڑی وجہ اس امن و امان کی شہرت تھی جو نجدی حکومت کی بدولت حجاز میں قائم ہوگیا ہے حالانکہ
یہی سال تھا جس میں خدام الحرمین نے التوائے حج کے رزولیوشن پاس کئے تھے اور ہند کے
طول عرض میں اسکا پروپگنڈا کرتے پھرتے تھے۔

جاوی حجاج کی تعداد ۵۰ ہزار تھی اور یہ ہمارے ہندی بھائیوں کی طرح بوڑھے اور سن
رسیدہ لوگ نہ تھے۔ بلکہ بالعموم لڑکے اور نوجوان تھے۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ مسجد حرم میں رات
دن ہزاروں کی تعداد میں موجود رہتے تھے لیکن کبھی انکو ہم نے آپس میں بات چیت کرتے نہ دیکھا۔
نماز، تلاوت، دعا اور ذکر میں مشغول رہتے تھے یا اپنے کسی عالم کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے مناسک
حج سیکھتے تھے بخلاف اس کے ہمارے ہندی حجاج چار بھی جمع ہوجاتے تھے تو دنیا بھر کی گپیں

ہانکتے تھے۔ قبوں کی داستان۔ وہابیوں کی مذمت۔ خلافت کمیٹی کے جھگڑے۔ جہاز کے واقعات اور کھانے پینے کے حالات وغیرہ۔

مصری بھی زیادہ تعداد میں آئے تھے۔ تقریباً دس ہزار۔ انکی عورتوں میں پردہ نہیں، نہ جاویوں میں ہی مگر دیگر اقوام سلف خاصکر عرب کی عورتیں پردہ کی سخت پابند تھیں۔

مطاف میں بجلی کی روشنی ہوتی ہے جس کا انجن حمیدیہ کے متصل ہے اور انجنیر میاں اسمٰعیل ذبیح بدایونی ہیں جو نہایت دلچسپ، ادیب اور متواضع شخص ہیں۔ کہتے تھے کہ سلطان نے اب ایک دوسرا بڑا انجن منگوایا ہے جس سے سارے حرم میں برقی روشنی ہوسکے گی۔ آجکل گیس کی روشنی ہوتی ہے جس کے لئے اہل خیر تبرکاً رقمیں جمع کردیتے ہیں۔

زمزم پر سلطان کیطرف سے سبیل لگی ہوئی ہے اور ہر شخص کو ہر وقت اسکا پانی مل سکتا ہے سبیل کے اخراجات کے لئے حکومت فی حاجی کچھ تھوڑی سی رقم بھی لیتی ہے۔

بعض حجاج کی یہ حرکت بھی عجیب حیرت افزا تھی کہ وہ دامان کعبہ سے لپٹ کر دعائیں کرتے کرتے اندر ہی اندر چاقو یا قینچی سے اس میں سے ایک ٹکڑا تعویذ بنانے کے لئے کاٹ لیتے تھے۔ میں نے ایک دن دیکھا کہ ایک ہندوستانی جو جبہ و دستار سے آراستہ تھے دن کی روشنی میں اس جرم کا ارتکاب کررہے تھے۔ خواجہ سرانے دیکھ پایا اور بید مارتے مارتے انکو دور تک بھگا دیا۔ مجھے ہنسی بھی آتی تھی اور رونا بھی۔

دسویں شب کو مسجد خالی رہتی ہے کیونکہ لوگ حج کو چلے جاتے ہیں اس وجہ سے دستور یہ ہے کہ اسی رات کو جدید غلاف کعبہ کو پہنایا جاتا ہے ہم نے حج سے واپس آکر دیکھا تو اس نئے غلاف میں بھی دو تین جگہ دست درازیاں ہوئی تھیں۔ اور ٹکڑے کاٹے گئے تھے۔

مکہ مکرمہ اکثر برائیوں اور فواحش سے پاک ہے۔ باشندے دیندار اور باعفت ہیں۔ وہاں نہ سینما ہے نہ تھیٹر۔ نہ ہارمونیم نہ فونوگراف نہ جلوس نہ بینڈ۔ نہ لڑائی نہ جھگڑے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اس خطہ سے باہر ہے۔ اتنا بڑا اجتماع تھا لیکن نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ شورش۔ نہ ڈنڈے

سنئے نہ لنترانیاں جو ایسے اژدحاموں میں ہر جگہ عام ہیں۔ بازار میں جائیے تو صفا سے مروہ تک سعی کرنے والوں کی دعائیں سنائی دیں گی اور حرم میں آئیے تو طواف کرنے والوں کی لبیک۔ نہ راگ ہے نہ باجا۔ نہ رقص ہے نہ سرود۔ نہ وجد ہے نہ حال۔ نہ سماع ہے نہ قوال۔ ہمارے مہربان مولانا فاخر صاحب نے غالباً اسی وجہ سے گھبرا کر کہا کہ وہابیوں کی بدولت یہاں مولود بھی تو نہیں ہو سکتا ورنہ حرم میں دھوم دھام سے محفل میلاد اور نعت خوانی ہوتی۔ میں نے کہا کہ اس سے قدیم تر مرثیہ خوانی کی رسم ہے۔ شیعہ بھی اگر کہنے لگیں کہ ہم اس میں مجلس کریں گے تو آپ کس دلیل سے اُن کو روک سکیں گے؟

سلطان کا مسلک یہ ہے کہ ہر شخص خواہ وہ کسی فرقہ کا ہو اپنے خیال کے مطابق حج کرے اور فرائض بجا لا کر واپس چلا جائے۔ تبلیغ کی اجازت نہیں ہے کیونکہ وہ اس مقدس مقام کو مذاہب اسلامی کا دنگل نہیں بنانا چاہتے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایک فرقہ کے لوگوں نے سلطان سے اجازت چاہی کہ ہم اپنی کتابیں یہاں بیچیں اور اپنے رسالے تقسیم کریں انہوں نے کہا کہ اپنے عقیدہ کے مطابق حج کر کے چلے جاؤ اور اگر اس قسم کی حرکت کی تو یاد رکھو بلا سنگسار کئے نہیں رہوں گا۔

جس طرح نجدیوں کو دو سال سے خصوصیت کے ساتھ قبہ شکنی کی تعلیم دی گئی ہے اسی طرح ہندوستانیوں کو بھی وہابیوں کو بد دین اور لا مذہب سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کے دلوں میں وہابیوں کی اس قدر عداوت اور دشمنی تمکن تھی کہ وہ مسجد حرم میں انکے لئے بد دعائیں کرتے تھے۔ حکومت کو ان میں سے بعضوں کے حالات معلوم تھے لیکن اس نے مطلقاً گرفت نہیں کی۔ صرف بمبئی کا ایک زبان دراز واعظ جو علی الاعلان وہابیوں کی برائیاں کرتا تھا پکڑا گیا تھا۔ قاضی عبداللہ بن حسن نے اثبات جرم کے بعد اس پانچ سال قید کی سزا دی مگر میں نے سنا کہ ہمارے بعض ساتھیوں کی سفارش سے سلطان نے معافی عطا کی اور زاد راہ اور سفر خرچ کے لئے پچاس گنی دے کر رخصت کر دیا۔

ان متعصبین میں سے بہت سے لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ حکومت یا نجدیوں کے خلاف جو بات سنتے فوراً قلم بند کرتے اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ کے اخبار ہمدم یا بمبئی کے اخبار خلافت میں بھیجتے۔ ان کو اس سے غرض نہ تھی کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ افترا ہے یا تہمت ہر قسم کی خراب اور نہایت حادر جس سے وہابیوں کی برائی نکلتی ہو تصدیق کی مہر ثبت کر دیتے تھے چنانچہ ہندوستان آنے کے بعد اخبار ہمدم لکھنؤ کا ایک نمبرہ ۱۸ جولائی کا مجھکو ملا۔ اس میں کسی شخص عبدالرزاق نامی کا خط جو ۳ جون کو یعنی حج سے واپسی کے تیسرے دن لکھا گیا ہے۔ چھپا ہے۔ اس میں مندرج ہے کہ نجدیوں نے عرفات میں لوگوں کو پتھروں سے مارا چنانچہ ممبران وفد میں سے اسمٰعیل غزنوی اور داؤد غزنوی اور میرا نام لکھا تھا کہ یہ لوگ پٹے۔ یہ ایسا افترا محض ہے جس کو پڑھ کر مجھے ہنسی آئی۔ کیونکہ اس قبیل کا کوئی واقعہ خواب میں بھی نہیں گزرا چہ جائیکہ بیداری میں۔ اور نہ اس قسم کے واقعہ کا امکان تھا کیونکہ اہل نجد عربی شرافت کے وارث ہیں جن کے یہاں مہمان نوازی انسان کا اولین فرض ہے۔

مولوی اسماعیل غزنوی آج کل غالباً مصر میں ہیں مگر مولوی داؤد غزنوی کے ہاتھ میں ایک اخبار ہے وہ تصدیق کر سکیں گے کہ یہ سارے کا سارا خط کس قدر غلط اور جھوٹ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میدان عرفات میں پانی کا انتظام اچھا تھا لیکن اس کو نظام حیدرآباد کا کارنامہ قرار دیتا ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ وہابیوں نے غلط منا میں مسجد خیف سے حجاج کو نکال دیا اور یہ نہیں ظاہر کرتا کہ اس مقدس مسجد میں جس کا فرش تمام تر ریت کا ہے ان ڈیرے ڈالنے والوں نے کس قدر غلاظت جابجا دبا رکھی تھی۔ اس کا یہ بھی بیان ہے کہ تمام حجازی حکومت سے بیزار ہیں معلوم نہیں کس حجازی سے اس نے گفتگو کی میرا خیال یہ ہے کہ صرف اپنے معلم سے کوئی بات سنی ہو گی جو حکومت کی شدید نگرانی کی وجہ سے اب حجاج کو لوٹ نہیں سکتے اور شکایت کرتے ہیں۔ ہمدم کے اسی نمبر میں ایک خط اور بھی تھا وہ بھی اسی قسم کا تھا۔

بالعموم یہ کہنے والے ایسے لوگ تھے کہ تعصب نے انکی آنکھوں پر پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔
نغمات ان کی آنکھوں کے سامنے سے گذرتے تھے ان کو بھی نہ سمجھتے تھے نہ سمجھنے کی کوشش
تھی۔ صرف وہابیوں کے مظالم اور معائب کی ان کو جستجو تھی اور بس۔

مثل الذباب یراعی موضع العلل

(باقی آئندہ)

اسلم

غزل

از جناب مولوی محمد یوسف صاحب استاد محمدیہ ہائی اسکول دہلی

شوق فزوں ہے کس قدر طوف حریم ناز کا
ذرہ ہر اک ہے مضطرب رہ گذر نیاز کا

باقی رہا نہ امتیاز کچھ بھی نیاز و ناز کا
پردہ کبھی جو اٹھ گیا باب طلسم راز کا

سجدہ کناں ہو ہر نفس باب حریم ناز کا
پایہ بہت بلند ہے شیخ مری نماز کا

گاہ فراق کی تپش گاہ نشاط آرزو
بزم خیال میں مری رنگ ہے سوز و ساز کا

[illegible]ت یوم رستخیز قلب میں جاگزیں ہو گیا
روز قیام سایہ ہے میری شب دراز کا

یاد خدا میں محو تھا سجدہ بتوں کو کر لیا
کس کو میاں بیخودی ہوش ہو امتیاز کا

شعلۂ طور سوز سے پردۂ راز کھل گیا
جلوہ پر عتاب تھا چشم کرشمہ نواز کا

خوگر غم نے ترک کی سعی نشاط زندگی
ہمت بے نیاز پر شکر ہے بے نیاز کا

حد سے زیادہ بڑھ چلیں قلب کی اضطرابیاں
ڈر ہے کہیں الٹ نہ دے پردہ حریم ناز کا

سننے نہ سرگزشت غم دل نہ ہو و تعطفاً
درد فزا ہے ماجرا صدمۂ جاں گداز کا

تجھ سے نہاں نہیں آخر میری حقیقت خیال
تابع دلنواز ہوں بندہ ہوں بے نیاز کا

غزل

مولنا سید شرف الدین صاحب یاسؔ دوٹنکی۔ اُستاذ جامعہ ملیہ

نہ عشرت کی تمنا ہے نہ محفل کی تمنا ہے
فقط ایک خلوتِ محرم آشنا دل کی تمنا ہے

تری دریوزگی میں لطف آتا ہے اسے ورنہ
تجھے معلوم ہے جو تیرے سائل کی تمنا ہے

نہ نکلے کوئی ارماں بس یہی ارمان ہے دیگر
میرے دل کی تمنا ہی میرے دل کی تمنا ہے

شرف حاصل کرے غربت میں میری بے نوائی کا
یہی اک اک قدم پر رنج منزل کی تمنا ہے

یہ مد و جزر سب جذبِ محبت کے کرشمے ہیں
ہم آغوشی باہم بحر و ساحل کی تمنا ہے

کچھ ایسی عافیت میں تیرے دیوانے نظر آئے
کہ اب دیوانگی ہر ایک عاقل کی تمنا ہے

میری تربت بنے یونہی زمینِ کوئے جاناں میں
الٰہی جس طرح دل میں میرے دل کی تمنا ہے

تمہارا تیر دل میں آرزو بن کر جو آیا ہے
نہ نکلنے یہ تمنا اب یہی دل کی تمنا ہے

دل پر آرزو نے زندگی بھر خاک چھنوائی
بس اب اے یاسؔ اک بے آرزو دل کی تمنا ہے

روپیہ کی ماہیت

تمہید | روپیہ ایسی چیز ہے جس سے اجتماعی زندگی میں ہمیں ہر قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ بچہ کی آنکھ اس دنیا میں کھلتی ہے تو روپیہ کی دلنواز آواز کے ساتھ اور جب بوڑھا قبر کے کونے میں ہمیشہ کی نیند سونے کے لئے اُتارا جاتا ہے اسی کی جھنکار اُس کے لئے موت کی گھنٹی ثابت ہوتی ہے۔ روپیہ کی موجودگی کے معنی یہ ہیں کہ اُسکا مالک دنیا کی تمام لذتوں اور مسرتوں کا متمتع ہو۔ ہر جلسہ، تقریباً ہر جماعت میں اُس کی رائے وقعت و احترام کے لائق ہے۔ اُسکا ہر انداز قابل تعریف، اُسکی ہر وضع مستحسن اُسکا ہر فعل جائز و مباح ہے۔ تماشا گاہ عالم میں روپیہ گویا ٹکٹ کا کام انجام دیتا ہے کہ جسے دیکھنے کے بعد منتظمین تماشا کو یہ حق حاصل نہیں رہتا کہ اُس کے مالک سے کسی قسم کا تعرض کرسکیں۔ کاروبار دنیا میں روپیہ والا ایک قرض خواہ کی مانند ہے جس کے پاس دستاویز روپیہ کی شکل میں موجود ہے۔ سارا عالم اُس کا مقروض ہے۔ اور وہ اس نقرئی طلائی، یا کاغذی دستاویز کو لیکر جس فرد واحد یا جماعت کے پاس اُس کا جی چاہے جاتا ہے اور قرض کی ادائگی کا مطالبہ خدمات اور اشیاء کی شکل میں کرتا ہے۔ ایک غلہ والے کے پاس پہنچکر وہ غلہ خریدتا ہے ایک حمال کو بلا کر اُس سے بوجھ لادنے کی فرمائش کرتا ہے۔ تانگے، موٹر، ٹریوے، ریلوے پر لاد کر اُسے پن چکی لیجاتا ہے پن چکی کا منیجر اُس کے حکم کا منتظر رہتا ہے، میدہ، آٹا، دلیہ، سوجی جو چاہتا ہے پسواتا، دلاتا ہے۔ نانبائی سے جس طرح مرضی ہوتی ہے آبی، چپاتی، روغنی، شیرمال تیار کراتا ہے اور جس سالن کیطرف طبیعت مائل ہوئے اُسی طرح مختلف آدمیوں کے ذریعہ اپنی بلا واسطہ یا بالواسطہ نگرانی میں مہیا کرا کے اُنکو اُس کے ساتھ کھاتا ہے۔ اسی طرح لباس، مکان، تفریح و دلبستگی کے نت نئے سامانوں کے لئے وہ ابنائے عالم کو اپنی خدمت کا موقعہ عطا کرتا ہے۔ تمام انسان بطیب خاطر

غلام بن جاتے ہیں اور وہ مخدوم و حکمراں۔ روپیہ کی اس قوت و طاقت، اس عظمت و بلندی کی
ہی یہ نتیجہ ہے کہ ہر شخص روپیہ کمانے میں مصروف نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ واحد مقصد ہے جو
منتشر افراد کو ایک ڈوری میں باندھے ہوئے ہے۔ فلسفی کہتے ہیں جلب منفعت اور دفع مضرت ہر
انسان کی فطری خواہش ہے۔ لیکن ایک راہرو صرف یہ جانتا اور سمجھتا ہے کہ کسب زر اور تحفظ زر
انسان کی زندگی کے نصب العین ہیں۔ فلسفی و عالم، صوفی و یوگی، بھکاری و مفلوک،
صناع و شاعر، تاجر و آجر، مزدور و خواجہ، سرکار و رعایا ہر ایک روپیہ کی طرف ہاتھ پھیلائے
اور آنکھ لگائے ہوئے ہیں۔ اور جلد یا بدیر، کم یا زیادہ مقدار میں اس پر قبضہ کرنا چاہتے
ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روپیہ سے اس قدر شیفتگی و الفت کیوں ہے۔ وہ کون سی
خصوصیت تانبے، چاندی، سونے اور نکل میں ہے، وہ کیا چمک دمک، رنگ و روغن، سلیقہ
و دلآویزی ان دھات کے ٹکڑوں میں ہے جنہوں نے انہیں اس قدر ہر دلعزیز اور مقبول انام
بنا دیا ہے اور پھر اب تو دھات پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا۔ ایک خاص طرز کے چھپے ہوئے کاغذ
کے پرزے بھی اکثر و بیشتر اسی حرص و طمع، اور ہوس کے ساتھ طلب کئے جاتے ہیں جس طرح کبھی
دھات کے بنے ہوئے ٹکڑے طلب کئے جاتے تھے۔ ان کاغذ کے پرزوں اور دھات کے ٹکڑوں
کو یہ شرف کیوں حاصل ہے۔ نہ آدمی کھا سکتا ہے، نہ پہن سکتا ہے، نہ اوڑھ سکتا ہے۔ نہ ان کا
بستر بنا سکتا ہے، نہ ان سے عام طور پر دیگر مفید دل آویز اور دلچسپ کام لے سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ
دھات کا زیور بنایا جاتا ہے، اور اسے لوگ نہایت شوق سے زیب و زینت کے لئے استعمال کرتے
ہیں۔ ممکن ہے ایک زمانہ میں زیور ان دھاتوں کی چمک، خوبصورتی اور قلت آفرینی کی وجہ سے بنائے
گئے ہوں۔ لیکن اب چاندی سونے سے زیادہ چمکدار، حسین اور پرکشش اشیاء دریافت ہو چکی
ہیں جن کے زیور اگر عہد حاضر کا انسان اپنی اس یادگار وحشت کے قائم رکھنے پر مصر نظر آتا ہے،
بنائے اور پہنے جا سکتے ہیں۔ اب جو چاندی اور سونے کی مقبولیت حاصل ہے وہ غالباً زیور کی

وجہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ قرین قیاس یہ امر ہے کہ ان دھاتوں کے زیور بنائے اس لئے جاتے ہیں کہ انہیں قبولیت عام کا اعتبار حاصل ہے۔ اور اگر صرف زیور ہی کے طریق پر استعمال ہی قبولیت عام کا سبب ہوتا تو کاغذ کے نوٹوں کی طرف جو عام میلان ہے۔ اُسکا کیا سبب ہے؟

صفحات مابعد میں ہمارا یہ ارادہ ہے کہ روپیہ کے اسباب مقبولیت کا تجزیہ کریں اور اس کو جو یہ درجہ و مرتبہ، قدر و قیمت حاصل ہے اُن کی وجوہات پر غور کریں۔ روپیہ جن مختلف شکلوں میں ہمارے لئے قابل قبول ہوتا ہے اُسے دریافت کریں اور کن مواقع پر ایک شکل دوسری صورت کے مقابلہ زیادہ قابل ترجیح ہوتی ہے اُسے اور اُسکے وجہ اور باعث کو معلوم کریں یہ کہاوت ہر شخص کی زبان پر رہتی ہے کہ روپیہ چار آنے، پانچ آنے یا چھ آنے کا رہ گیا۔ اس کی حقیقت پر فکر و تامل کریں۔ اشیاء کی قیمتیں جو گھٹتی بڑھتی ہیں اُنکا تعلق روپیہ کی قدر و قیمت سے (اگر اس قسم کا تعلق ممکن نظر آئے) تلاش کریں۔ جن لوگوں کو اتفاق بندرگاہوں یا تجارتی مرکزوں پر رہنے کا ہوا ہے اور جو بیرون ہند کاروبار کرتے رہتے ہیں۔ وہ "شرح مبادلہ" کی اصطلاح اور اس کی تلون پسندیوں سے خوب واقف رہتے ہیں۔ اس "شرح مبادلہ" اور روپیہ کے دوران و گردش میں (جو خرید و فروخت وغیرہ کے ذریعہ سے جاری رہتی ہے) تعلق کی جستجو کریں۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ روپیہ کا بھاؤ مندا ہے۔ روپیہ سستا ہے، روپیہ مہنگا ہے۔ نیک کا نرخ گراں ہے، نیک کا نرخ ارزاں ہے۔ ان تمام اصطلاحوں وغیرہ کے متعلق ایک تشفی بخش جواب فراہم کریں یہ اور اس کے دیگر سوالات کے جواب کی کوشش صفحات مابعد میں کیجائے گی۔

زر کی خدمات انسان کے کاروبار پر جب ہم نظر کرتے ہیں تو جس خصوصیت کو اُس کے ہر قول و فعل میں جاری و ساری پاتے ہیں وہ "اصول افادیت" ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر چاہتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے بقا و تکمیل کے لئے گرد و پیش کی اشیا سے افادہ حاصل کرے اور یہی اس کی وہ خصوصیت ہے جس نے اُس کے اعمال و افعال میں ایک ترتیب معقولیت و شان اتحاد پیدا کر دی

ہے۔ آئیے اس کلیہ کے ماتحت اس حقیقت پر بھی غور کریں کہ روپیہ جو اپنے موجودہ مرتبہ قبولیت پر پہنچا تو وہ اپنی کن خدمات کے صلہ میں ؟ کسی شخص یا چیز کی ضرورت اور اہمیت کے فیصلہ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اس امر کا تصور کریں کہ اگر وہ شخص یا چیز نہ ہوتی تو ہمیں کیا وقت پریشانی اٹھانی پڑتی۔ اور کس قسم کی کمی، محرومی، اور بیچارگی سے ہمیں سابقہ پڑتا۔ فرض کیجئے کل سے روپیہ کا استعمال قانوناً قطعاً ممنوع قرار دیا جائے تو سب اول جس وقت کا ہمیں سامنا کرنا پڑے گا وہ ایک پیمانۂ قدر کی عدم موجودگی ہوگی، لوگ اجتماعی زندگی بالکل اسی طرح بسر کرتے ہوں گے جیسے اب اُن میں تقسیم عمل بعینہ موجودہ صورت کے مطابق ہوگا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو اپنی ضروریات کی اشیا اپنی محنت سے فراہم کرتے ہوں گے۔ دہلی شہر میں اگر کوئی شخص رہ رہا ہوگا تو زندگی کی ابتدائی ضروریات (یعنی کھانا، کپڑا، اور مکان) کے لئے وہ بالکل دوسروں کا دست نگر نظر آئے گا۔ کسان غلہ اور روئی بوئیں، مزدور کان سے لوہا نکالیں اور پہاڑ سے پتھر کاٹیں اور بھٹوں میں اینٹیں بنائیں، گاڑی بان ان چیزوں کو لیکر بازار میں فروخت کریں۔ ریلوے اسٹیشن پر لیجائیں۔ وہاں سے مستقر پر چیزیں پہنچیں۔ پھر وہ اس قابل بنائی جائیں کہ انکا بلا واسطہ طریقہ پر استعمال ہو سکے اور پھر اس شکل میں موجود ہو جائیں کہ قطعاً بلا وساطت غیرے اُن میں فائدہ پہنچانے کی اہلیت پیدا ہو جائے پہلی منزل سے اسی طرح آخری منزل تک پہنچنے میں اشیاء کو سیکڑوں ہاتھوں سے گذرنا پڑتا ہے اور ایک شخص اگر لاکھ ہاتھوں، لاکھ پاؤں، لاکھ آنکھوں، کانوں اور ناکوں کا مالک ہو جائے تو شاید جب ایسی زندگی بسر کر سکے کہ وہ اپنی ضرورت کی تمام وہ اشیا، خود ہی فراہم کر سکے جو موجودہ نظام صنعت اُس کے لئے فراہم کرتا ہے۔ بہرحال چونکہ یہ غیر ممکن ہے اور تقسیم عمل مع تخصیص مشاغل عہد حاضر کی ایک ناگزیر حقیقت ہے اس لئے اشیاء و خدمات کا مبادلہ بالکل لازمی ہے انکا ہاتھوں میں گردش کرتے رہنا۔ ایک شخص کے پاس سے دوسرے کے پاس از دیاد افادہ کی غرض سے جانا یقینی ہے۔ اور چونکہ نظام اقتصادی محض خدمت خلق اور اشیاء خیرات کے

جذبات کے زیر اثر قائم نہیں ہے۔ بلکہ ہر شے جو خریدی جاتی ہے یا ہر خدمت جو کیجاتی ہے اس کے لئے معاوضہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے لازم ہوا کہ ہر لین کے ساتھ ایک دین ہو۔ مگر لین دین میں تناسب قدر کی بھی ضرورت ہے۔ میرے پاس ایک موٹر ہے جو میں نے اپنے کارخانہ میں بنوایا ہے اور اسے میں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے پاس ایک ٹوپی ہے جسے آپنے بھی فروخت کے لئے بنائی ہے۔ آپ کے پاس موٹر نہیں ہے اور اگر ایک ٹوپی کے عوض میں موٹر ملجائے تو آپ کو لینے میں تامل نہ ہوگا۔ مبادلہ کی کیا صورت ہونا چاہئے۔ کیا میں اپنا موٹر دے کر ٹوپی لے لوں؟ ہر شخص کا جواب ہوگا کہ "اگر پاگل ہوگئے ہو تو ایسا کرو" لیکن اس جواب کا کیا سبب ہے۔ میں ایک چیز بیچنا چاہتا ہوں دوسرا ضرورتمند اسے خریدنا چاہتا ہے اس کے معاوضہ میں وہ چیز دینے کو تیار ہے جس کی مجھے ضرورت ہے۔ پھر تامل کی کیا وجہ ہے۔ جواب یہ ہوگا کہ دونوں کی قدر برابر نہیں ہے۔ ایک کے تیار کرنے میں سیکڑوں مزدوروں نے سیکڑوں دن تک نہایت سخت قسم کا کام کیا ہے۔ دوسرے کی تیاری میں صرف ایک یا دو روز صرف ہوئے ہیں اور کام کی نوعیت بہت سہل تھی۔ اب اس امر کا فیصلہ تو ہوگیا کہ دونوں چیزیں ہم قدر نہیں ہیں۔ اس لئے مبادلہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اب قدر کے تناسب کا تعین کس طرح کیا جائے۔ موٹر کے بنانے میں مختلف قسم کی محنت صرف ہوئی ہے۔ کانوں کے دریافت کرنے کی محنت۔ ان سے لوہا اور کوئلہ نکالنے کی محنت لوہا اور کوئلہ نکالنے کی مشین بنانے کی محنت۔ اس لوہے اور کوئلے کے ذریعہ موٹر بنانے کی محنت، موٹر کو امریکہ سے ریل اور جہاز وغیرہ پر لانے کی محنت۔ اس میں دماغی، جسمانی، سخت اور آسان، نمایاں اور غیر نمایاں ہر قسم کی محنت شامل ہے۔ اگر ٹوپی کی محنت فی یوم کو معیار قرار دیا جائے تو موٹر بنانے کی محنت کو ٹوپی بنانے کی یومیہ محنت کا کے گنا قرار دیا جائے۔ فرض کیجئے کہ آپ ایک نتیجہ پر پہنچ گئے کہ ایک ہزار ٹوپیاں برابر ہیں ایک موٹر کے تو یہ تو دن میں کی سیکڑوں ضرورتوں میں سے ایک نہایت ادنیٰ اور حقیر ضرورت کے متعلق آپ نے فیصلہ کیا۔ اب اسی طرح محنت و مزدوری کے مختلف مدارج پر غور و فکر کرنے کے بعد آپ کو کھانے کی تمام چیزوں، پہننے کے تمام اشیا

رہنے کے تمام لوازمات کے لئے ایک باقاعدہ نسبت و تناسب دریافت کرنا پڑیگا اور تناسب کے ان منفرد رشتوں میں ایک مجموعی رشتہ تلاش کرنا جس کے ذریعہ سے بلا دقت و پریشانی ایک شے دوسری شے کے معاوضہ میں تبدیل کیجا سکے۔ یہ وہ پیچیدہ مسئلہ ہوگا جس سے اس کے بعد فوراً ہم دوچار ہو جائیں گے۔ اس تمام گفتگو سے معلوم ہوا کہ زر ہمارے لئے ایک بڑی خدمت انجام دیتا ہے اور وہ خدمت یہ ہے کہ وہ ایک پیمانہ قدر اور مشترک نسب نمائے قیمت کا فرض پورا کرتا ہے جس کے بغیر ہمارے پورے نظام معیشت کے ناممکن ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں۔

دوسری خدمت جو زر انجام دیتا ہے وہ واسطہ و ذریعہ مبادلہ کی خدمت ہے پہلی مثال کو جاری رکھا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جو شخص موٹر بیچنا چاہتا ہے اور ٹوپی خریدنا چاہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اُس کے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ٹوپی بیچنے والوں میں سے کوئی موٹر کا خریدار اُسی روز اور اُسی لمحہ تیار ملے اور اگر تیار بھی ملے تو یہ ضروری نہیں کہ ایک ہزار ٹوپیاں اس کے پاس فوراً ہی تیار ہوں کہ جن کے ذریعہ سے وہ موٹر خریدے اور اگر ایک ہزار ٹوپیاں تیار بھی ہوں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی اور دوسری زیادہ اشد ضرورت کے معاوضہ میں ان ٹوپیوں کے دینے پر مجبور نہ ہو۔ اس لئے موٹر بیچنے والے غریب کو اکثر مہینوں اُسا تلاش میں سرگرداں رہنا پڑے گا کہ کسی طرح ایسا شخص ملجائے جس میں مندرجہ بالا تمام اہلیتیں موٹر خریدنے کی موجود ہوں۔ اس لئے اگرچہ ہم اس پر غور نہ کریں لیکن زر ہماری ایک بڑی دشواری کی جو اتحاد ضرورت کی عدم موجودگی سے پیدا ہوتی ہے ضرور سہل کر دیتا ہے۔ زر کے ہوتے ہوئے ہم اشتہار دیدیں گے اور موٹر کا خریدار ایک ایسا زمیندار پیدا ہو جائے گا جس کے پاس لگان کے منافع کا کثیر روپیہ جمع ہے وہ ہمیں فوراً روپیہ کی شکل میں معاوضہ ادا کر دے گا اور ہم اُس روپیہ کے ذریعہ سے جس قدر چاہیں گے ٹوپی فروخت کرنے والے سے خرید لیں گے اور اس امر پر مجبور نہ ہوں گے کہ پوری ایک ہزار ٹوپیاں لیں اور ایک ٹوپی اپنی ضرورت کی نکال کر پھر ۹۹۹ ٹوپیاں اپنی دیگر ضرورت کی چیزیں لینے کے لئے بیچتے پھریں۔ اس سے ثابت ہوا کہ

زیر ہماری معیشت کی شینسری میں تیل کا کام انجام دیتا ہے جس کے ذریعہ سے تمام پرزے
روانی کے ساتھ چلنے لگتے ہیں۔

تیسری خدمت جو زر انجام دیتا ہے وہ معیار قدر کی خدمت ہے۔ ہماری موجو
ین کاروبار زیادہ تر ایسے معاہدوں کی صورت میں کیا جاتا ہے جن کی تکمیل مستقبل
ہے۔ پیش بینی، پیشین گوئی، اندازہ و تخمینہ ظن و گمان۔ اس پر ہمارے لین دین کا بہت
ہے۔ ہم آج اس امید پر خریدتے رہتے ہیں یا چیزیں بناتے رہتے ہیں کہ کل ان کی قیمت
ہو جائے گی۔ ہمیں امید رہتی ہے۔ اور سرمایہ کی کثرت کی وجہ سے۔ نفع فی صدی کا
بہت حقیر رکھتے ہیں اس لئے قدر و قیمت کی ذراسی کمی بیشی لاکھوں اور کروروں کے
نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔ لوگ ایک دن میں کروڑپتی اور دوسرے دن میں بھکا
ہیں۔ اس تخمین و اسپکولیشن کے علاوہ بھی کاروبار تمام تر قرض کے ذریعہ سے چلتا ہے
کی گرانی و ارزانی باوجود اس کے کہ قرضدار کو سود ملتا ہے بعض اوقات نقصان
ہو جاتی ہیں اور بعض مرتبہ وہ نہایت غیر متناسب منافع سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ گ
چھپر پھاڑ کر اس کے قدموں پر آپڑتی ہے۔ اور کبھی اسے ٹکر گدا بنا جاتی ہے۔ کارو
تیقن اور سخت عبرت خیز صورت رفع کرنے میں زر بہت بڑی حد تک مدد دیتا ہے
ہے کہ گذشتہ جنگ کے تجربہ کے بعد روپیہ کی شرح مبادلہ کی تلون پسندیوں کی مو
یہ خدمت زر کی کچھ بہت مکمل نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن اس بحث کو ہم بعد کے لئے ملتو
زر کی عدم موجودگی کی صورت میں جو شکلیں پیدا ہونے کا احتمال ہے انہیں مثال کے
واضح کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص نے ایک غلہ فروش سے فصل کی کٹائی
پر گیہوں قرض لیا۔ اور اس وعدہ پر کہ گیہوں جب لو جائے گا وہ قرض واپس کر
۔ اوّل الذکر صورت میں گیہوں سستا ہوگا اور موخر الذکر صورت میں مہنگا۔ اس
ہزاروں لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا اور قرضدار کو علاوہ سود کے ہزاروں لاکھ

لیکن اگر یہی قرض زر کے ذریعہ سے لیا جاتا تو زر کی قیمت چونکہ مستقل رہتی ہے۔ اسے کوئی نفع یا نقصان ان اسباب کی وجہ سے نہ ہوتا۔ جن کا کوئی تعلق براہ راست یا بالواسطہ معاہدہ قرض سے نہ تھا یہ تیسری خدمت روپیہ کی ہوئی۔ روپیہ معیار قدر کا کام انجام دیتا ہے۔ چونکہ جب غلہ کا بھاؤ تیز ہوگا تو بھی اسی قدر روپیہ جتنے روپے کہ جب دئے جاتے جب غلہ سستا ہوتا۔ اور یہ روپیہ اگر غلہ سستا ہے تو زیادہ غلہ خرید سکے گا اور اگر مہنگا ہے تو کم غلہ۔

چوتھی خدمت زر کی یہ ہے کہ وہ ذخیرہ قدر کا کام انجام دیتا ہے اگر لوگ زائد از ضرورت اشیا کو انہیں کی شکل میں رکھتے مثلاً گیہوں کو گیہوں کی شکل، گھوڑے کو گھوڑے کی شکل میں، موٹر، ہاتھی، ریل، جہاز وغیرہ اپنی ذاتی شکلوں میں تو اول تو یہ کہ ان کی نگرانی و نگہداشت انکے حجم کی وجہ سے ایسے ذرائع سے کرنا پڑتی جن میں بہت خرچ ہوتا۔ اور دوسرے یہ کہ باوجود اس تمام نگرانی و نگہداشت کے وہ بہت زیادہ عرصہ تک اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہتے وہ جلد یا بدیر فنا ہو جاتے۔ پھر اگر جائداد کے انتقال کی ضرورت ایک مقام سے دوسرے مقام میں پیش آتی تو بہت خرچ کرنا پڑتا اور سخت دقت و پریشانی پڑتی۔ روپیہ کی ایجاد نے یہ دونوں دقتیں آسان کر دیں۔ زر کی وجہ سے دولت کو پائداری نصیب ہوگئی کہ اس کا وجود زمانہ کی فنا کوشیوں سے محفوظ ہوگیا اور بڑی سے بڑی دولت نہایت آسانی سے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچائی جانے لگی۔

زر کی ابتدائی تاریخ زر کی یہ چار نہایت اہم خدمات ہیں۔ اب ہم زر کے ارتقا پر ایک تاریخی نگاہ ڈالتے ہوئے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مختلف اوقات میں کن کن چیزوں نے زر کی خدمات انجام دیں اور پھر بالآخر سونے اور چاندی نے کس طرح تمام دوسری چیزوں کی جگہ لے لی۔ تمدن و تہذیب کے موجودہ دور میں رہنے کی وجہ سے، اور مسکوک قانونی زر کے عادی ہونیکے باعث ہم زر اور سونے چاندی کے سکوں کو بالکل ہم معنی تصور کرنے لگے ہیں۔ اس لئے اس حقیقت کو ہمیں کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ جس قدر اشیا پائی جاتی ہیں ان میں اہلیت

پیمانۂ قدر اور تبادلہ قدر کی پائی جاتی ہے۔ یہ سوال کہ کونسی اشیا، سوسائٹی کی ایک خاص حالت میں مناسب ترین زر کا کام دینے کی لائق ہیں۔ محض موازنہ اور مقابلہ کا سوال رہ جاتا ہے۔ کسی شے میں کسی خاص زمانہ وحالت میں زیادہ اہلیت ہوتی ہے کسی میں کم۔

شاید قدیم ترین حالت صنعت کی وہ ہے جس میں روزی وحشی جانوروں کے شکار سے حاصل کیجاتی ہے۔ اس حالت میں شکار کا ماحصل، نہایت قابل قدر شے ہوتی ہے۔ شکار کا گوشت تو جلد خراب ہو جاتا ہے۔ لیکن کھال زیادہ پائدار ہوتی ہے اور کپڑوں کے لئے استعمال کیجاتی ہے۔ اس لئے ابتدا میں اس نے اپنی عام مقبولیت کیوجہ سے مختلف قدیم اقوام میں زر کی حیثیت اختیار کرلی اور آج کل بھی اُن سے زر کا کام لیا جاتا ہے۔ شکاری زندگی سے ترقی پاکر آدمی گلہ بانی کی حالت میں پہنچے اور اس دور میں مویشی اور بھیڑیں بہت قیمتی اور قابل بیع وشرے ملکیت خیال کیجانے لگیں۔ انہیں آسانی سے منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اپنے پاؤں سے چلتی ہیں اور بہت سالوں تک رکھی جاسکتی ہیں اور اسطرح روپیہ کے بعض خدمات آسانی سے انجام دے سکتی ہیں۔ ان ممالک میں جہاں بردہ فروشی کا رواج تھا غلام ذریعہ مبادلہ بن گئے ذاتی زینت کا جذبہ انسان میں نہایت قدیم اور زبردست ہے اور چونکہ اسی مقصد کے لئے استعمال کی جانے والی اشیا راکثر مقبول عام ہوتی ہیں، آسانی سے منتقل کیجاسکتی ہیں اور عرصہ تک قائم رہتی ہیں۔ اس لئے یہ بھی مثل زر کے گردش کرنا شروع کر دیتی ہیں، کوڑیاں، گھونگھ تسبیح کے دانے، زردعنبر، منقش پتھر، اور ہاتھی دانت وغیرہ گلوبند اور پیٹی کی شکل میں لوگ لئے پھرتے ہیں اور انکے ذریعہ سے اشیار کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔ جب لوگ گلہ بانی سے ترقی پاکر زراعتی زندگی اختیار کرتے ہیں تو غلہ ذریعہ مبادلہ بن جاتا ہے۔ بعض جگہ زیتون کے تیل سے بھی یہ خدمت لیجاتی ہے۔ بادام یورپ کے بعض ممالک میں زر کی حیثیت سے استعمال کئے گئے ہیں اور ۱۶۱۸ء میں ورجینیا میں تمباکو نے یہ خدمت انجام دی ہے اور میری لینڈ میں ۱۷۳۲ء تک تمباکو اور مکا زر قانونی کا مرتبہ رکھتے تھے۔ بعض جگہ خشک کی ہوئی مچھلیاں

اس غرض کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ انکے علاوہ جب ہم مصنوعی اور دیگر اشیاء کی فہرست پر غور کرتے ہیں تو ہمیں مندرجہ ذیل چیزیں نظر آتی ہیں جنہوں نے مختلف مقامات اور زمانوں میں وسیلہ مبادلہ کی خدمت انجام دی ہے۔ مثلاً پارچہ سوتی، چٹائیاں، گوند، موم، چائے لوہے کی کیلیں وغیرہ۔ اور اگر بعض شواہد تاریخی پر اعتبار کیا جائے تو آثار قدیم کے طور پر جو نہایت منقش اور زار پتھر کے بنے ہوئے نکلتے ہیں وہ بھی یہی خدمت انجام دیتے تھے۔ لکڑی کے بنے ہوئے روپیوں کے جاری رہنے کے متعلق بھی ثبوت ملتا ہے۔

زر کے لئے موزوں شے کی خصوصیات ان تمام اشیاء کی فہرست پر نظر کرنیکے بعد ہمیں یہ جستجو ہوتی ہے کہ معلوم کریں کہ جب زر کے طریقہ پر اس قدر مختلف النوع چیزیں استعمال کیجاتی تھیں تو اسکا کیا سبب ہوا کہ موجودہ عہد میں سب ترک کر دی گئیں اور یہ خدمت صرف دھات کے چند ٹکڑوں سے لیجانے لگی۔ زر کی خدمات کا ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے اور اس کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچنا زیادہ دشوار نہیں کہ مختلف حالات اور مقامات میں زر کو مختلف خدمتیں تفویض کی گئیں۔ اور ان خدمات کی نوعیت کے اعتبار سے جس شے کو سب سے زیادہ اہل اس کام کے لئے پایا گیا اس کا اس غرض کے لئے انتخاب کیا گیا اس انتخاب کا یہ کام ہر عہد میں جاری رہا، اور جیسا کہ صفحات آئندہ میں بتلایا جائے گا۔ ابھی تک یہ ختم نہیں ہوا کیونکہ مکمل زر ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ ہر عہد میں روپیہ کی مختلف خدمات میں سے کسی ایک یا دو کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اسی کے مطابق زر کی اصلاح کے لئے تجاویز سوچی اور تجربات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ صنعت کی سادہ حالت میں زر کی ضرورت خریداروں اور فروشندوں کے درمیان چلتے رہنے کے لئے ہوتی ہے اور تب اس کی خصوصیات یہ ہونی چاہئیں کہ وہ آسانی سے لیجایا جا سکے۔ مختلف سائز کے ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکے تاکہ ہر رقم فوراً بن سکے، اور اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے یا ثبت کئے ہوئے چہرے کی وجہ سے شناخت کیجا سکے۔ مگر جب روپیہ، جیسا کہ آئندہ کے متعلق خیال ہے صرف معیار قدر اور پیمانہ

قدر کی خدمات انجام دیگا اور نظام مبادلہ میں اشیائے عوض اشیاء ملیں گی اور زر کی وساطت باقی نہیں رہے گی مندرجہ بالا صفات ایسی ضروری نہیں رہیں گی جتنی اب ہیں۔ اور قدر کا ثبات معہ نقل پذیری نہایت اہم خصوصیات ہو جائیگی لیکن ان پیچیدہ مسائل پر گفتگو کرنے سے قبل ہم زیر بحث خصوصیات کو آنکی اہمیت کے لحاظ سے حسب ذیل ترتیب دینا چاہتے ہیں۔

۱۔ قدر ۲۔ نقل پذیری ۳۔ غیر فنا پذیری ۴۔ یکسانیت ۵۔ سہم پذیری ۶۔ ثبات قدر ۷۔ شناخت پذیری

۱۔ قدر :- چونکہ زر کے ذریعہ قدر دار اشیاء کا لین دین کیا جاتا ہے اس لئے اس میں فی نفسہ قدر ہونا چاہئے، قدر کا کیا سبب ہے یہ ایک معرکۃ الآرا مبحث ہے۔ بعض علماء کے خیال میں افادہ اس کا سبب ہے۔ دوسرے علماء کو قدر کے اس وجہ سے اختلاف ہے۔ یہ عقیدہ صرف ان لوگوں کا ہے جو زر کے جنسی نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں ان میں سے اس کی مخالفت میں زر کا خدمتی نظریہ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ زر مخصوص خدمات انجام دیتا ہے اس سلئے اس میں قدر پیدا ہو جاتی ہے اور عزیز ہو جاتا ہے "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" دیگر علماء کا یہ خیال ہے کہ روپیہ کو قدر اس وجہ سے حاصل ہوتی ہے کہ ریاست اس پر اپنی مہر لگا کر اُسے قانون کے ذریعہ قابل قدر بنا دیتی ہے۔ یہ زر کا ریاستی نظریہ کہلاتا ہے۔ یہ سب نظریئے اپنی اپنی جگہ نامکمل ہیں۔ صحیح نظریہ قدر زر کا غالباً قدر اشیاء کے عام نظریہ سے مختلف نہیں ہے۔ قدر جب ہی پیدا ہوتی ہے جب اُس میں افادہ اور قلت پائی جائے۔ زر کے قدر کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اس کے متعلق ایمانداری کے ساتھ اختلاف رائے کا امکان ہے لیکن زر کے لئے قدر لازمی ہونے میں شبہ کی گنجایش نہیں۔ فی زمانہ جو صورت بھی ہو اور جو نظریہ بھی قابل قبول قرار دیا جائے یہ یقین ہے کہ ابتدا میں زر کی مقبولیت کا سبب نہ ریاست کا حکم تھا نہ زر کی خدمات کا اعتراف بلکہ زر کی قدر ذاتی اس کی مقبولیت کا فیصلہ کرتی تھی علاوہ از یں اپنی خدمات کی مکمل ادائیگی کے لئے خصوصاً خدمت ذخیرہ قدر اور ذریعہ مبادلہ کی ادائیگی کے لئے یہ لازمی

ہے کہ زر ایسی شے کا بنایا جائے جس کی تمام ممالک میں اگر مساوی قدر ممکن نہ ہو سکے تو کم از کم کافی قدر ہو اور اس لحاظ سے سونا اور چاندی کو عام طور پر مقبولیت حاصل ہے۔

۲۔ نقل پذیری :- زر کے لئے جو شے منتخب کی جائے اُسے صرف قدر دار ہی نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کی قدر اس کی حجامت اور وزن سے کچھ اس طرح متناسب ہونا چاہئے کہ ایک طرف تو زر تکلیف دہ حد تک بھاری نہ ہو اور دوسری طرف تکلیف دہ حد تک مختصر نہ ہو۔ یونانیوں میں لوہے کا سکہ استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ عہد میں یہ قطعاً ناممکن ہے۔ گذشتہ صدی میں بہ مدت سوئیڈن میں تانبے سے لیجاتی تھی اور اب بھی غیر ترقی یافتہ اقوام اپنے چھوٹے معاملات میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بڑے کاروبار کے لئے یہ بالکل ناموزوں ہے۔ بیل اور بھیڑیں یہ صحیح ہے خود چلتی ہیں۔ لیکن ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اور انکی نگہداشت ایک مستقل کام ہے۔ اسی طرح گو بعض حیثیتوں سے غلہ، کھالیں، تیل، بادام وغیرہ زر کے لئے زیادہ موزوں ہیں لیکن ان کا حجم قدر کی تناسب کے اعتبار سے بہت زیادہ اور اسی لئے انکی نقل و حرکت سخت دشوار ہوگی۔ نقل پذیری کی خصوصیت زر کے لئے صرف اسی طرح ضروری نہیں ہے کہ آدمی روپیہ جیبوں میں لئے پھر سکیں۔ بلکہ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں نہایت کم خرچ میں جو سودے ہو جاتے ہیں وہ اسی کے ذریعہ سے ممکن ہیں۔ جس طرح اشیا بہت ارزاں ہونیکی وجہ سے نقل پذیری کی اہلیت نہیں رکھتیں اسی طرح بہت گراں ہونے کے باعث بھی انکی نقل پذیری میں دشواری کا امکان ہے۔ چونکہ جہانتک معمولی سودوں کا تعلق ہے انکے لئے خورد بینوں اور کیمیاوی کانٹوں کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً جواہرات وغیرہ معمولی کاروبار میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

۳۔ غیر فنا پذیری :- تجارت میں گردش کرتے رہنے اور سرمایہ محفوظ کے طریقہ پر رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ زر جلد خراب اور ناقص نہ ہو۔ گوشت کی طرح سڑ نہ سکے، کافور کی طرح اڑ نہ جائے، لکڑی کی طرح

گل نہ جائے۔ لوہے کی طرح زنگ آلودنہ ہوجائے۔ فنا پذیر اشیاء مثلاً انڈے، خشک مچھلیاں، مویشی یا تیل وغیرہ۔ اس میں شک نہیں زر کی طرح استعمال کئے گئے ہیں لیکن جس چیز کو آج زر بنایا گیا اُسے دوسرے دن کھالیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اشیاء کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ نہیں رکھا جاسکتا اور اُنکی قدر بہت تغیر پذیر ہوتی ہے۔ فلزِ مختلف نوعیتوں کے ساتھ اس اعتراض کی زد سے بہت بڑی حد تک محفوظ ہیں چونکہ متعدد سال تک ان میں کوئی نمایاں نقص پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ یکسانیت :۔ زر کے لئے جو شے استعمال کیجائے اُس کے تمام اجزا اور صورتوں میں یکسانیت ہونی چاہئے یعنی انہیں ایک ہی میل اور قسم کا ہونا چاہئے تاکہ مساوی اوزان، مساوی قدر کے ٹکڑے بن سکیں۔ کسی پیمانہ کے مطابق قیمت کے شمار کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ پیمانہ مساوی اور یکساں ہو تاکہ دو کا دوگنا چار ہی ہو، کم یا زیادہ نہ ہوجائے اگر ہم شمار کے لئے پیمانہ جواہرات کو بنا دیں تو یہ شاید ہی کبھی ممکن ہو کہ چار جواہر قیمت کے اعتبار سے دو جواہر کے دوگنے ثابت ہوں۔ قیمتی فلزات بھی اپنی اصلی حالت میں قطعی یکساں نہیں کہے جاسکتے مگر اس کی وجہ سے کوئی بڑی دقت نہیں ہوتی کیونکہ طلا و سیم خام میں جس قدر چاندی یا سونا ہے وہ آسانی سے کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے اور صاف و مسکوک ہونیکے بعد تو وہ ایسے کھرے اور خالص ہوجاتے ہیں کہ ایک سکہ اور دوسرے سکہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور مساوی اوزان بالکل مساوی قدر رکھتے ہیں۔

۵۔ سہم پذیری :۔ اس خصوصیت سے آخری خصوصیت کو ایک قریبی رشتہ حاصل ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ہر شے کو بلا کسی انتہا کے تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ سخت ترین جواہرات توڑے جاسکتے ہیں اور لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ لیکن جو شے زر کے لئے استعمال کیجائے اس کے لئے امکان سہم پذیری ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ تقسیم ہونے کے بعد مجموعی قدر شے منقسمہ کی بالکل اسی قدر ہو جتنی کہ ابتداء میں تھی اگر ہم ایک کھال کے ٹکڑے کریں تو اُسکی مجموعی قدر و قیمت ابتدائی قدر و قیمت سے کہیں زیادہ کمتر ہوگی اور یہی صورت چوب عمارتی، سنگ اور دیگر اشیاء کی ہے جن کا دوبارہ اتصال ناممکن ہے لیکن فلزات کے ٹکڑے جب دل چاہے دوبارہ پگھلا کر ایک کئے جاسکتے ہیں اور خرچ اُس کے لئے ضائع شدہ دھات کو

نال کرکے ، بہت ہی حقیر رقم ہوتی ہے مثلاً فی اونس ایک پیسہ یا آدھ آنہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سیم و
ایک کسی ٹکڑے کی قدر بالکل اُس خالص سونے کے تناسب ہوتی ہے جو اُس میں موجود ہوتا ہے۔

۔ ثبات قدر :- یہ امر بدیہی ہے کہ زر کو قدر کی تبدیلیوں سے متاثر نہ ہونا چاہئے۔ وہ مختلف تناسب
نا میں زر کا مبادلہ دیگر اشیاء سے کیا جاتا ہے انہیں جس قدر ممکن ہو سکے غیر مبدل رہنا چاہئے اگر
من پیمانہ قدر اور وسیلہ مبادلہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تو یہ معاملہ نسبتاً معمولی اہمیت رکھتا۔ اگر
تیں اُسی تناسب سے فوراً بدل جایا کرتیں جس تناسب سے زر کی قدر میں اختلاف ہوتا تو کسی شخص کو نفع ہوتا
قصان۔ لیکن عملی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے لوگ زر کو طویل میعاد کے معاہدوں کے لئے معیار قدر
حیثیت سے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ ادائیگی قانون یا رسم کے ذریعہ سے اُسی یکساں غیر مبدل
ح پر قائم رکھتے ہیں درآنحالیکہ لایق ادا رقم کی قدر اصلی بہت کچھ بدل جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ قدر زر کی ہر تبدیلی ہیئت اجتماعی کے لئے تھوڑی بہت مضرت رساں ثابت ہوتی ہے اور
شتہ جنگ کے دوران میں مختلف ممالک کے زروں نے جو قلابازیاں کھائی ہیں اور جو ہیجان و
طراب، بدامنی و انقلاب رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے بڑے بڑے سرمایہ دار، نان شبینہ کو محتاج
کئے۔ اگر اُن پر خیال کیا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ اسکے نتایج بہت دیرپا اور دور رس ہوتے ہیں۔

ہر چند یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر قرض خواہ کو نقصان ہوتا ہے اتنا ہی مقروض
ائدہ ہو جاتا ہے۔ اور جتنا مقروض کو نقصان ہوتا ہے اتنا ہی قرض خواہ نفع میں رہتا ہے اور بصورت
عی جماعت اُسی قدر دولتمند رہتی ہے جتنی کہ ابتدا میں ہوتی ہے۔ مگر یہ حقیقت سے دور ہے چونکہ
اصول ریاضی کے ماتحت تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک رقم کا ایک سے لیکر دوسرے کو
بسا اوقات دہندہ کو یابندہ کے مقابلہ میں زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ ایک شخص جس کی آمدنی سو روپیہ
ہے جب دس روپیہ دینے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے تو اُسے زیادہ تکلیف محسوس ہوتی ہے بہ نسبت
وقت کے کہ جب اُس کی آمدنی میں دس روپیہ کا اضافہ کیا جاتا ہے کیونکہ نوے روپیہ کی آمدنی کو
روپیہ کا افادہ اسکی نگاہ میں زیادہ ہوگا اور ایک سو دس کی آمدنی کے ساتھ کم۔ اس اصول کے

ماتحت، ہر قسم کی قماربازی، سٹہ، خالص تخمین، سپیکولیشن یا دیگر انتقال دولت کے ناگہانی اور اتفاقی طریقے عام طور پر سبب ہوتے ہیں اپنے نقصان افادہ کا جس کا کوئی معاوضہ حاصل نہیں ہوتا۔ صنعت و تجارت اور اجتماع دولت کے تمام محرکات اُن سے پیدا ہونیوالی لزائد کی توقعات پر منحصر ہیں اور رائج الوقت زر کی ہر تبدیلی کسی نہ کسی مقدار میں اس قسم کی توقعات کو تباہ اور سعی کے ان محرکات کو کم کرتی ہے۔ جنگ کے بعد جو یورپ میں کساد بازاری ہے اور بیکاری ترقی پر ہے اس کا بڑا سبب زر کے یکتائے عصر تلون قدر کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں جو کاروبار مندا بتلایا جاتا ہے اُس کا بڑا سبب قدر زر کی غیر ثباتی ہے۔

۷۔ شناخت پذیری:۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اُس خصوصیت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے کہ ایک شے میں اس بات کی اہلیت کا اندازہ ہو سکے کہ وہ آسانی سے پہچانی اور ممتاز کیجا سکتی ہے۔ وسیلہ مبادلہ کی حیثیت سے روپیہ ہاتھوں سے نکلتا رہتا ہے اور اگر ہر شخص کو جو رائج الوقت سکہ قبول کرتا اُسے تولنا، پرکھنا اور جانچنا پڑتا تو اس سے بڑی دقت اور دشواری ہوتی۔ اگر روپیہ کی شناخت میں مہارت اور ذہانت کی ضرورت ہوتی تو غریب اور جاہل لوگوں کو بہت دھوکہ دیا جاتا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ ذریعہ مبادلہ میں ایسے امتیازی نشان ہوں جن کی وجہ سے کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔ جواہرات اگر دوسرے تمام اعتبارات سے اچھا زر قرار بھی دئے جا سکتے تب بھی اس حیثیت سے انہیں زر کے لئے قبول نہ کیا جاتا۔ کیونکہ بڑا ماہر جوہری ہی سچے اور جھوٹے موتی میں امتیاز کر سکتا ہے۔

شناخت پذیری میں ہی ہمیں اثر پذیری کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ یعنی شے کی وہ اہلیت جس سے کہ وہ ایسی صورت، مہر یا نقشہ کے نشان کو قبول کرتی ہے جو اسے ایک خاص قدر کا رائج الوقت زر بنا دیتی ہے۔ ہم اسے اور زیادہ سادہ الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ زر کی شے لائق سکہ سازی ہونا چاہئے تاکہ ایک حصہ جب مناسب قواعد کے ماتحت ریاست کی مہر لئے ہوئے جاری ہو جائے تو ہر شخص اُسے زر صحیح و قانونی باور کر سکے جو وزن، قدر اور جسامت میں اُسی طرح کے دوسرے نشان شدہ زر کے مساوی ہو۔ ایک اچھے سکہ شناخت میں کیا اجزا شامل ہیں اس کا بیان اس مضمون کے کسی دوسرے حصہ میں کیا جائیگا۔

(باقی)

زرتشت اور بُدھ

موازنۂ سیرت و دعوت

بُرے لوگ اپنی پسماندہ قوم کے "فرزندِ رشید" ہوتے ہیں اور اپنی تمام صفات میں اپنے
ین کے خصائص کے حامل ہوتے ہیں جس ماحول میں انہوں نے تربیت پائی ہے اس کے اثرات
سوس نقوش بخطِ جلی اُن کی خاکِ بسر پیشانی پر ثبت ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جس قوم سے وابستۂ دامن
تے ہیں اُس کی رفتارِ زوال میں اپنی ننگِ وجودِ زندگی سے اور بھی سرعت پیدا کر دیتے ہیں اور
یس ہلاکت غارِ فنا کے کنارے بہت جلد پہنچ جاتا ہے!

آن پہنچی سرِ گردابِ فنا کشتیٔ عمر ہر نفس! دمِ مخالف کا ہے جھونکا ہم کو؟

لیکن بڑے لوگ اپنی مادرِ ملت کے گویا "ناخلف لڑکے" ہوتے ہیں جو اپنی ہی قوم کے خلاف
بغاوت بلند کرتے ہیں؟ یہ لوگ اپنے جسمِ قومی کا ایک "عضوِ مقطوع" ہوا کرتے ہیں، لیکن
یقت وہ اس فاسد نظامِ جسمانی کے اندر بمنزلہ ایک "قلبِ صحیح" کے ہوتے ہیں جو اپنے سینہ پر
لئے الگ ہو گیا ہو تاکہ بدن کے ہمہ گیر "زہر باد" سے اپنے کو محفوظ رکھے اور اس "کانِ نمک"
رہ کر خود بھی نمک نہ ہو جائے۔ یہی قلب جسمِ ملت کا اصلی مایۂ حیات اور جوہرِ اصلاح ہوتا ہے اور
وقت میں اپنی قوت افزائی اور صحت بخشی سے بدن کو ایک حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے "اذا فسدت
ت کلّہا، واذا صلحت صلحت کلّہا!"

الغرض قوم کے یہ مصلحین و مجددین گھر آباد کرنے ہی کے لئے گھر سے ہجرت کرتے ہیں اور قوم کی دوستی
جذبہ انہیں قوم کی دشمنی پر مجبور کرتا ہے "نصحت لکم، ولاکن لا تحبون الناصحین"
وہ ایک غیر معمولی طور سے قوی قلب و جگر رکھتے ہیں اور ایک کوہ شکن عزم و استقلال
مالک ہوتے ہیں اور اپنی ان خدا داد قوتوں کی پیہم ضربوں سے اپنی قوم کے سیلابِ زوال کا

منہ پھیر دیتے ہیں اور اس گمراہ خلقت کو ایک نئی شاہراہ حیات پر ڈال دیتے ہیں۔

مگر یہ کام ایک "جوئے شیر" لانے سے کم مشکل نہیں ہوتا جس میں انکا جنون خیز عزم وارا ہی کامیابی کی ناممکنات کو ممکن بنا دیا کرتا ہے۔

پانی میں ہی آگ لگانا دشوار | بہتے دریا کو پھیرانا دشوار
دشوار تو ہے مگر نہ اتنا جتنا | بگڑی ہوئی قوم کا بنانا دشوار

عہد مسیحی سے قبل کے قرون میں اس قسم کے قریبا ۱۲ مردان کار ہم کو افق تاریخ پر نظا آتے ہیں جن کے "بطن ہمت" سے نئی قومیں پیدا ہوئیں اور قریب المرگ قوم کے لئے جن کی دعا اصلاح صدائے "قم باذنی" ثابت ہوئی۔ ان میں سے ایک کے قدوم وجود نے سرزمین ہندستا کو مفتخر فرمایا اور جسکا نام گرامی واسم سامی مہاتما بدھ ہے (پرائیویٹ شخصی نام گوتم سدھارتھ ہے) خطہ ہند کی ساری تاریخی عمر میں ایسا حیرت خیز انقلاب کبھی دیکھنے میں نہیں آیا جیسا گوتم کے اغا مشن کے ساتھ وابستہ ہے! قریبًا اسی عہد کے گرد و پیش میں کوہستان ہمالیہ کے مغربی کنار پر شمالی و مغربی گوشے میں ایک اور اولوالعزم پیغمبر کا پیکر مقدس نیم تاریخی فضا کے سایہ میں کھڑ نظر آتا ہے۔ یہ زرتشت ہے! ایران قدیم کی یہ عظیم المرتبت ہستی جسقدر تاریکی میں ہے، تاریخ عالم کوئی اور آفتاب عظمت ایسے گہن میں نظر نہیں آتا!

ہندوستان اور ایران میں قدیم ترین تعلقات رہے ہیں۔ دونو قومیں ایک ہی آ سرچشمہ کی دو دھاریں ہیں لیکن ایک ہی اصل نسلی کے باوجود بعد میں یہ دونوں شاخیں اسقد ایک دوسرے سے منحرف ہوگئیں کہ ایک واحد مبدء مشترک کی طرف قیاس خیال رجوع ہوسکتا تاریخ قدیم کے یہ دو عظیم الشان ملک دو مستقل شاہراہوں پر گامزن ہوگئے، جو قومیں ایک خاندان کے گویا دو قبیلے تھی اور جن کے نسبی و مذہبی ہر دو قسم کے خصائص مشابہ تھے اُن میں از دو قائدین اعظم نے بعد المشرقین پیدا کردیا!

ان دونوں ہستیوں کی سیرتوں اور اُنکے پیدا کردہ انقلاب کا پہلو بہ پہلو مطالعہ کر

لئے عہد متعلقہ کے تعیین و سال کے تعین کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ میدان تاریخ میں وہ موقع
یب "سنگ میل راہ" کی حیثیت رکھتا ہے جہاں ایران اور آریہ ورت کے دل اور دماغ تخیل
ر عقیدے کی دو الگ دنیائیں بن گئے! امانت داران تاریخ اس واقعہ شگفت کو قریباً ۲ ہزار
سال قبل ولادت مسیح کی ایک واردات بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر میکڈانل، مشہور محقق تاریخ، اس ابہام
اجمال میں ذرا قطعیت پیدا کر کے سنہ ۱۵۰۰ق۔ م کا سن پیش کرتا ہے (ملاحظہ ہو "ادبیات سنسکرت"
مصنفہ میکڈانل، صفحہ ۱۲) مگر روزنامچہ والی صحت و حتمیت کا یہاں خواب بھی نہ دیکھنا چاہئے۔ یہ
یعین و تقرر محض ایک اضافی زاویۂ نگاہ سے صحیح ہے اس لئے کہ افق تاریخ کی بعید تاریکیوں
یں کس کی نظر دوربیں ایک رصدگاہی مشاہدۂ عینی کر سکتی ہے؟ پھر اہل ایران و ہندوستان
"ہذا فراق بینی و بینک" کوئی واحد واقعہ مفارقت نہیں ہے۔ اپنے ابتدائی مرز بوم، ایشیائی
سطح سے ہجرت آریائی کے سیلاب کی بہت سی لہریں ایک دوسرے سے متفرق ہو ہو کر عرصہ
راز تک آتی رہیں جن کا سلسلہ کئی صدیوں تک طویل ہوتا ہے۔ بہرحال اس قیاس نے
تاریخی نظریہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ سنہ ۱۵۰۰ق۔ م تک آرین مہاجرین پورے طور
پنجاب اور دوآبۂ گنگ و جمن میں خیمہ زن ہو گئے تھے اور وید مقدس کے نغمات حمد و ثنا بہت
عاکی تدوین مکمل ہو چکی تھی۔ اس طرح ارض یہود میں حضرت داؤد کی سلطنت کا اختتام بھی
ہمعصر ایک واقعہ ہوگا!

تواریخ میں بدھ اعظم کا دور زندگی عموماً سنہ ۴۸۳ و سنہ ۵۶۳ ق۔ م کے مابین محصور شمار
یا جاتا ہے۔ اس تاریخی حقیقت کے یہ معنی ہوئے کہ کلدانیوں کے ہاتھوں ہیکل سلیمانی کی آتش زنی
کے یادگار واقعہ کے ۲۳ سال بعد بدھ کا جسد اطہر شکم مادر سے باہر آیا اور بیت المقدس کے
عہد ثانی کی تعمیر سے ۱۰ برس قبل اس کا وصال ہوا!

لیکن حیات زرتشت کے متعلق جو تعین ہیں ان کی تاریخی تنقید و تحقیق ایسی آسان نہیں۔ ا
س مسئلہ کے متعلق دو مستقل نظریے ہیں۔ ایک روایاتی عقیدہ پارسیان بمبئی میں مروج ہے اور

یہی اہل تاریخ کی بھی مرجح اور مقبول رائے ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ زرتشت کے عرصۂ حیات کے آغاز و انجام کو ۶۶۰ ق۔م اور ۵۸۳ ق۔م کی تاریخیں متعین کرتی ہیں۔ وہ ۷۷ سال کی عمر میں مرا۔ بالفاظ دیگر ۲۰ سال قبل میلاد بدھ سے اور ٹھیک ایک صدی قبل اس کی وفات سے اپس وہ معاصر ہے جیریمیہ کا، اور دانشوران چین لاوٹزے و کنفیوشیس اور حکمائے یونان سولن و ہرقلیطس سے قریباً ایک صدی قبل وہ ایران کی زمین پر بقید حیات تھا! یہ قیاس کہ ان روایات پر مبنی ہے جو نسلاً بعد نسل چلی آتی ہیں، نیز اُن تاریخی نوشتوں پر جو زرتشت کے اہل وطن اور دنیا کی دوسری قوموں کے ذخیرۂ معلومات میں امانت رہے ہیں۔

تعیین عہد کے بارے میں دوسرا نظریہ زمانۂ زردشتی کو عقب تاریخ میں بہت دور کر لیجاتا ہے جس کی منزل کم و بیش ۱۰۰۰ ق۔م ہے۔ اس قیاس تاریخی کی دو ستونوں پر تعمیر ہوئی ایک ان میں سے یہ دلیل ہے کہ اس خیال کے ذریعہ سے کافی وقت ان تغیرات و تحرفات کے لئے مل جاتا ہے جن میں سے ہو کر یہ مذہب گذرا۔ عہد ظہور دعوتِ زرتشت سے لے کر اس وقت تک کہ اس کا علم ہم کو معصر کتابوں اور تاریخی دستاویزوں سے ہوا! ایک دوسرا معاصرانہ بیان دین زردشتی کے متعلق ہیرو ڈوٹس کی تاریخ سے ملتا ہے جو پانچویں صدی ق۔م کا یونانی سیاح اور مورخ ہے مزید براں ایک شہادت چھٹی صدی قبل مسیح کے دارا کی کندہ دار قع جبل بیستون کی ہے اور قطع نظر ان کے مذہبی لٹریچر بھی اس نقطہ پر معتد بہ روشنی ڈالتا ہے۔

تاریخ کے اس عہد میں مذہب زردشتی کا صحیح تر نام مجوسیت ہونا چاہئے اس لئے کہ یہ قریباً تمام و کمال مغی کی دعوت تھی جس کے اندر دین زردشتی کے بعض سنن کا محض پتہ پایا جاتا تھا۔ تعلیمات زرتشت کا صحیفہ ایک مختصر ضخامت کا مجموعۂ نغمات ہے جو گاتھا کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا سررشتہ تصنیف براہ راست زرتشت تک پہنچتا ہے اور غیر منقطع سلسلۂ روایات کے استناد کی مضبوطی پر اسی چیز کو بانیٔ مذہب کی ذات سے منسوب کر سکتے ہیں۔ اس میں

کوئی دوسرا عنصر ہے بھی تو وہ سرچشمۂ ابتدائی کی قریب ترین شاخیں ہیں یعنی زرتشت اعظم کے حواریین اولین کے ملفوظات ورشحات! زرتشتیت اور مجوسیت کے درمیان اس درجۂ تفاوت راہ" دیکھا جاتا ہے کہ ہر دو کے ظہور کے اوقات کے درمیان ایک بڑا طویل و وسیع تر مدت تسلیم کرنی پڑے گی۔ بمقابلہ اس مدت کے جو عموماً فرض کیجاتی ہے، یعنی کل ۶۲ سال! جو وفات زرتشت (بشرطیکہ وہ ۵۸۳ ق۔م ہی کا واقعہ ہوا) اور دارا کے تخت نشینی کے جلوس اول (۵۲۱ ق۔م) کے مابین حائل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۶۲ سال تو ۶۲ سال، چھ یا سات صدیاں بھی اس یکسر انقلاب کی ارتقائی نشوونما کے لئے کوئی غیر معمولی مہلت نہ ہوگی! ان قیاسات تاریخی اور اصول تنقید کی بنا پر زرتشت کی بعثت ۱۰۰۰ اور ۱۲۰۰ ق۔م کے درمیان رکھنی پڑے گی!

زرتشت کے زمانۂ حیات کو اس قدر ماضی بعید میں لیجانے کی دوسری وجہ فلسفۂ تاریخ کے اصول کی رو سے یہ ہے کہ لسانی نقطۂ نظر سے یہ قیاس زیادہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے زرتشتی گاتھا اور رگ وید کی زبان باہم اس درجہ مشابہ ہے کہ یہ بات بلاشبہ ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ کہ انکے اوقات تدوین کے درمیان اتنا بڑا بعد زمانی واقع ہو جتنا کہ اول الذکر نظریہ کی بناء پر سمجھا جاتا ہے اور جس کی ابتداء وانتہا تراتہائے وید کی تالیف اور ساتویں صدی کا اختتام ہیں۔ بخلاف اس کے قرائن وآثار ایسے ہیں کہ ہر دو صحائف ایک ہی عہد میں عالم وجود میں آئے یا کم از کم انکے اوقات پیدائش ایک دوسرے سے قریباً بالکل پیوستہ ہیں! یہ لسانی تفتیش یقیناً بہت مسلم الثبوت ہوا کرتی ہے اور بعض اوقات وہ تاریخ کے بڑے بڑے رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی کر دیتی ہے جن کا سراغ کسی دوسرے ذریعہ سے لگنا ناممکن ہوتا، کوئی فرضی لسانی خصوصیات کسی مختلف عہد کی تصنیف میں پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ یہاں اصل ونقل باوجود ہر کوشش خفا کے بیشمار شواہد وعلامات سے اپنی حقیقت کی غمازی کر دیتی ہے۔ ذخائر تاریخ میں ایسی بھی کتابیں پائی گئی ہیں جن میں ارادۃً

ایک فرضی قدامت کا رنگ پیدا کیا گیا ہے لیکن اس جعل نے زبان حال سے اپنی مخبری کر دی ہے۔ الغرض گاتھا اور ویدوں کی زبان کی ہم رنگی ان تمام شکوک و امکانات سے علانیہ بری معلوم ہوتی ہے اور اغلب یہ ہے کہ یہ دونوں مقدس نوشتے کم و بیش ہمعصر ہیں۔ لیکن اب اگر یہ خیال صحیح ہے جیسا کہ تمام بیرونی و اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے تو اسکا نتیجہ صریح یہ خیال ہوگا کہ زرتشت اعظم اور موسیٰ علیہ السلام نے دو الگ الگ ملکوں میں بیک وقت "آتش حق" کی تجلیاں دیکھیں! اور جس وقت اول الذکر اہل ایران کو ظلمات ضلالت سے نکالکر نور یزدانی کی طرف لا رہا تھا اسی وقت آخر الذکر نبی اسرائیل کو مصر سے شامی حکومتوں کی بشارتوں کے درمیان نکالے لئے جا رہا تھا! یہ وقت غالباً تیرھویں صدی قبل مسیح ہے! اس لئے کہ بعض فضلائے تاریخ یہود، اسرائیلی ہجرت کی سال ۱۲۳۰ھ ق۔م بتاتے ہیں!

زرتشت اور بدھ کی دعوت اور سیرت کے بیشتر حالات ہم کو کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ ذریعہ معلومات بدھ کے معاملہ میں زیادہ کار آمد ہے۔ ساکیہ منی کے مذہب کی کتابیں روز اول سے غیر معمولی حزم و احتیاط کے ساتھ محفوظ رہیں اور انکو کوئی بیرونی حادثہ پیش نہ آیا۔ خارجی آمیزش کے عناصر اگر ہیں بھی تو وہ بآسانی قابل شناخت ہیں اور یہ بالعموم وہی الحاقی ابواب ہیں جو اصل صحیفہ کی ہر فصل کے بعد بڑھا دیئے گئے ہیں تاکہ "افسانویت کے شیدائی اپنے ذوق کو پورا کرلیں: نیز اس مرشد اعظم کے نیاز کیشوں اور فدائیوں کو عقیدت و ارادت کے بہشتی پھولوں کی جو گلباری کرنی ہے وہ کرلیں۔ مزید برآں ان زوائد میں ایک اور جزو کے طور پر ہم سحر انگیز ترانہائے منقبت اور تسخیری اثرات والے اسمائے اعظم پاتے ہیں لیکن نیاز و نیائش کے اس ہنگامے میں ایک متلاشی حقیقت کی اصلی گوتم تک بلا دقت باریابی ہوسکتی ہے، جو پیپل یا جامن کے شجر مقدس کے نیچے بیٹھا ہوا میخانہ معرفت و فنائیت کی ساقی گری کر رہا ہے

لیکن زرتشت کے متعلق سارا ذخیرہ تاریخی ہمارے خواب تحقیق کو بالکل پریشان کر دیتا ہے۔ بنیادی صحیفے کے ضمیمہ جات کی حیثیت سے نغموں اور ترانوں، افسانوں اور

داستانوں کا ایک بے پایاں دفتر اساطیر و دساتیر موجود ہے جس کی ایجاد قرون قبل التاریخ سے متعلق ہے۔ یا پھر ان صدیوں کی پیدائش ہے جو زمانہ بدعت و تحریف سے شروع ہو کر سکندر اعظم کے حملہ پر ختم ہو جاتے ہیں! ایران کی مذہبی ادبیات پر بڑی بڑی ہولناک افتادیں پڑیں اور دو مرتبہ مختلف اوقات میں تو یہ سارا مقدس ذخیرہ بال بال خطرۂ فنا سے بچا بلکہ اس کے اوراق پریشان کے دلسوز عقیدتمندوں نے طوفان حوادث کے گزر جانے پر بعد میں از سر نو شیرازہ بندی کی۔ کسی وقت میں اس وسیع و ضخیم دفتر کے پورے دو نسخے جو از روئے روایت بارہ ہزار گائے کے چمڑوں پر لکھے ہوئے تھے اور شہر پرسی پولیس میں محفوظ تھے، لیکن سکندر یونانی نے جب ۳۳۰ ق۔م میں شہر مذکور کو فتح کیا تو اس سب کو نذر آتش کر دیا۔ عہد حاضر کے عظیم الشان کتبخانوں کے مہتممین کے لئے یہ امر قابل غور ہے کہ انکی الماریوں کے بار کی کثرت و اہمیت کا کیا حال ہوتا اگر ایران قدیم کی مذہبی دنیا اس قیامت خیز حادثہ فاجعہ سے آشنا نہ ہوئی ہوتی!؟ خیر شاہان ساسانی کے علم کے نیچے جب دوبارہ ایران خاک ذلت سے اٹھا تو دین آتشی کے سوختہ اوراق کے پرزے آتش اسکندری کی خاکستر سے پھر جمع کئے گئے لیکن جب اس دفتر ابتر کی بار دگر شیرازہ بندی ہوئی تو اس سے مذہب مجوسیت کے صحائف کی جلدیں تیار ہو گئیں! زرتشتیت کے اس نقش ثانی کا سکہ ایران میں تیسری صدی عیسوی سے لے کر ساتویں صدی تک چلتا رہا۔ اس وقت مطلع عالم پر اسلام کا طوفان اٹھا اور بہت جلد سارا ایران اس کے آغوش میں تھا۔ موجودہ پارسیوں کے آباؤ اجداد نے اپنی جانوں کی طرح اپنے عزیز از جان مذہب کی کتابوں کو بھی لے کر اپنے وطن محبوب کو خیر باد کہا اور ساحل بمبئی پر ایک بندرگاہ پناہ انکو مل گیا جہاں انکی اولاد آج بھی موجود ہے اور جس جگہ نہایت آتشخانہ پارس کی لائی ہوئی آگ کی طرح اپنی آتشیں شریعت کے باقیماندہ اسفار و کتب کو بھی اس وقت تک امانت رکھا اور دنیا کے تشنۂ ذخیرۂ تاریخ کو تفویض کر دیا۔

اس سارے دفتر کا اصلی مغز سخن گاتھا کا مختصر مجموعہ ہے۔ گاتھا پانچ جلدوں میں ہے جن

میں کل، اترانے ہیں جو یاسن کہلاتے ہیں پہلی جلد میں، یاسن ہیں، دوسری اور تیسری جلدوں میں چار چار اور چوتھی اور پانچویں جلدوں میں سے ہر ایک میں ایک ایک

کیا فلسفۂ تاریخ کا متفحص اور محتسب اس راز کے "درون خانہ" کچھ جستجو کرسکتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جو زرتشت کے لئے "صلائے قم" ثابت ہوئے اور دین زرتشتی نے خاک ایران سے سر نکالا؟ زرتشت ایک ایسے ملک میں رہتا تھا جو قطعاً زراعتی تھا، جہاں کے باشندے ایک سیدھی سادی قوم تھے جس کے افراد کاشتکار تھے یا گوالے اور جو قدیم و اولین آریائی مذہب رکھتے تھے اور اس مذہب کی ہندوستانی امت ہی کی سی ذہنیت و معاشرت یعنی زندگی، سیرابی، اور خوشحالی کے مرکزوں کی تلاش میں ادہر اُدہر نقل مکان کرتے پھرتے اور زمین و آسمان کے مناظر و مظاہر فطرت اُن کو مسحور اور مسرور کرتے! اس مذہب کی تفصیلات سے ہم زیادہ واقف نہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ آریہ ورت کے ویدک مذہب کا ایک ثنی تھا۔ دونوں کی یکسانیت کی محسوس علامات دستیاب ہوتی ہیں۔ ایک خاصی طویل فہرست ان الفاظ کی دیجا سکتی ہے جو ہر دو ملکوں میں مستعمل تھے اور ان کے معلومہ عقائد و مراسم کے آئینہ دار ہیں۔ ایرانی اہورا جس کے معنی پروردگار کے ہیں اور جو مزدہ کا خطاب ہے ہندوستانی لفظ اسورا کا پارسی بھائی ہے جو درونا اور بعض دیگر ویدک دیوتاؤں کا اسم حسنیٰ ہے۔ ایران کا ہوما (شرب مقدس) ہندوستان کے سوما کا "دو نشۂ معنی" رکھتا ہے؟ ہندی آریوں ہی کی طرح ایرانی بھی دیوتاؤں کی قربانگاہوں پر عبادت کے وقت سبزی کا ایک فرش زمردیں بچھایا کرتے تھے۔ ہندوستان کا ایک دیوتا متر ایرانی خدائے متھرا کے لباس میں نظر آتا ہے! مزید براں "مقدس آگ" اور "مقدس بیل" دونوں مذہبوں کی عبادات و رسمیات میں ایک اہم عنصر کی طرح پائے جاتے ہیں!

الغرض زرتشت کی قوم و ملک ایک خاص قسم کے خطرے کی دائمی طور سے آماجگاہ تھے۔ قزاقی پیشہ قبائل کے لوگ آئے دن اُنکی آبادیوں اور کشت زاروں کو تہ و بالا کرتے

رہتے تھے اور وقت مراجعت اُن کی سب سے بڑی متاع یعنی اُنکے مواشی کو ساتھ ہنکا لیجا تے تھے۔ زرتشت نے اس دلخراش منظر کو دیکھا اور اُس کے معرفت آگیں دل و دماغ پر ایک دوگونہ الہام کا القا ہوا۔ اس نے کائنات کو حق و باطل کے ایک معرکہ گاہ کے رنگ میں دیکھا جس کے اندر خالق ہستی برسرِ حق گروہ کی قیادت کرتا ہے۔ زرتشت نے اپنی مظلوم قوم کو اس حیثیت کا مصداق قرار دیا اور اس عقیدے کو اپنے پیرؤوں کے دل میں راسخ کر دیا۔ اس سارے "عقائد نامہ" کی تہ میں یہ غایت کارفرما تھی کہ وہ اپنی قوم کو ایک زبردست مدافعت اغیار پر ابھارے اور انکے قلوب میں کامیابی کا پیشگی یقین نقش کر دے!

عہد مابعد کی کتابوں میں زرتشت کی زندگی کے جو حالات و واقعات ہم کو ملتے ہیں وہ واقعہ اور افسانہ ہر دو کا معجون مرکب ہیں۔ روایات میں ایسا مذکور ہے کہ شروع ہی میں اسکے قلب پر اس حقیقت کا پرتو پڑنے لگا تھا کہ وہ مرتبہ نبوت پر فائز کیا جانے والا ہے۔ اسی کی طرف اُس کی ایک ابتدائی نظم میں بھی کنایہ پایا جاتا ہے جو ایک عالم کشف و حالت انشراح میں لکھی گئی معلوم ہوتی ہے۔ روایت کے دوسرے اجزا اس وقت اس کی عمر کو ۳۰ سال بتاتے ہیں۔ لیکن اس کی دعوت کا ابتدائی دور بہت ہی ہمت شکن اور تھکا دینے والا نظر آتا ہے۔ اولین کشف کے بعد ۱۲ برس تک اُس کو ایک مسلسل سیاحت و ہجرت کی حالت میں رکھا جاتا ہے اور اس اثنا میں وہ چھ اور روحانی مشاہدوں سے نوازا جاتا ہے جس میں اس کو اپنے منصب کا کامل تیقن حاصل ہو جاتا ہے اور اپنے مشن کی بسم اللہ کرنیکے لئے آخری اور ناطق احکام ملجاتے ہیں۔ لیکن اس تمام مدت میں اس کو کوئی مصدق یا رفیق کار نہیں ملتا۔ بالآخر وہ وشتاسپ شاہ بلخ کے دربار میں وارد ہوتا ہے اور تاجدار مذکور اسکا اولین "صحابی" بنتا ہے جس کے ساتھ ہی وہ اپنی حکومت کے سارے وسائل کو نئے مذہب کی اشاعت کی راہ میں وقف کر دیتا ہے۔ بادشاہ کے علاوہ اُس کے سارے اہل خاندان اور ارکان دربار بھی زرتشت کے علم دعوت کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ جب تائید غیبی سے یہ تمام مطلوبہ وسائل

حاصل ہو جاتے ہیں تو شریعت زرتشتی کے مقصد وحید کی طرف فوراً عنان توجہ پھیری جاتی ہے۔ مغلوب و مقہور ایرانیوں سے ایک صف مدافعت تیار کیجاتی ہے اور "خدائے دانشور" کے نام سے حملہ آور قزاقوں پر فوج کشی بول دیجاتی ہے، اور زرتشت کا "دین آتشیں" سچ مچ آگ اور خون کا کھیل کھیلنے لگتا ہے! زرتشت کے پرچم کے نصب کئے جانے کا یہ پہلا دن ہے!

زرتشت کے مذہب کی خاص اہمیت اور دلچسپی کا حامل اُس کا وہ عقیدہ ہے جو ذات ایزدی کے متعلق قائم کیا گیا۔ خدا کو جو نام دیا گیا وہ اہورا مزدہ تھا جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ کم از کم وہ قبیلہ جس سے وہ ہم رشتہ تھا فطرت الٰہی کے متعلق اُس سے زیادہ گہرا تخیل رکھتا تھا جو صرف ایک مظاہر پرست قوم کے دماغ سے مخصوص ہوتا ہے! ان الفاظ کے معنی ہیں "خدائے حکیم" یعنی وہ خالق ہستی کے اندر "حکمت" کا شاہدہ کرتا ہے "حکمت" نہ کہ صرف ایک غیر مدبر "قوت محض" جو عام ملحدانہ و کورانہ نظریہ ہے! زرتشتیت کی ترقی یافتہ ذہنیت کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے اور تاریخ مذاہب میں ایک ایسا "نشان راہ" جو انسانی دماغ کی اس راہ میں ایک اہم منزل طے کر لینے کا سراغ دیتا ہے!

مزدہ کے خط و خال اہل ہند کے کسی دیوتا کی صفات سے نہیں ملتے، بجز ورُونا کے اور یہ استثنا بھی ایک جزوی نوعیت رکھتا ہے۔ ورونا دیوتا کے ساتھ مزدہ کا یہ تشابہ صرف انہیں معدودے چند بھجنوں کی حد تک ہے جو اول الذکر کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ تاہم یونان کے سارے "دارالاصنام" میں اس کی شبیہ کسی سے نہیں ملتی، باستثنائے زئیس کے جو محض اپنی بعض انتہائی صفات عالیہ میں یہ مقام حاصل کر سکا ہے!

اہورا مزدہ کی ہستی مظاہر فطرت کے وجود کے ہم معنی نہیں ہے، برخلاف اس کے وہ اُنکا خالق ہے اور وہ آفتاب و ماہتاب میں جلوہ آرا نہیں ہے بلکہ اُس کی منزل گاہ کسی فضائے قدس کی روحانیت میں واقع ہے۔ عرش و کرسی پر چڑھنے سے اُس تک رسائی نہیں ہوتی بلکہ یہاں نردبان معراج "عمل صالح" اور "فکر صحیح" ہیں! لیکن وہ محض کوئی مجرد صفات

یا روح نہیں ہے بلکہ اُس کی حقیقت کی تعبیر صاف صاف ایک شخصیت سے کی گئی ہے، چنانچہ زرتشت اس سے براہ راست ہم کلام ہوتا ہے، مشورہ لیتا ہے اور یہ استمزاج چھوٹے بڑے ہر قسم کے امور کے متعلق ہوا کرتا ہے، وہ اُس سے وقتاً فوقتاً بکثرت سوالات واستفسارات کرتا رہتا ہے، چنانچہ (ایک گویا "حدیث قدسی" میں) اہورا مزدہ اس سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ "اے زرتشت! تیری التجاؤں اور دعاؤں کی مخاطب ایک بڑی ذات ہے" (یاسن ۴۳-۱۰)

اہورا مزدہ کی کبھی ایسی تصویر نہیں کھینچی گئی جو جسمانیت کے شائبہ سے آلودہ ہو۔ ہم کبھی "پھولوں کے ہار" اس کے زیب گلو نہیں دیکھتے، نہ اس کے موکب شاہی کی "رتھوں" کا جلوس نکلا کرتا ہے جو ہندوستانی اور عہد عتیق کے بعض دیگر ممالک کے خداؤں کے لوازم ہیں؛ وہ انسانی قسم کے علائق سے پاک تر ہے، چنانچہ کبھی اُس کی "حرم محترم" کا ذکر سننے میں نہیں آتا، البتہ کبھی کبھی اس کے فرزندان ارجمند کا حوالہ دیکھا جاتا ہے مگر یقیناً یہ سب اُس کی اولاد معنوی ہیں اور بلاشبہ عبارت ہیں اُس کی صفات سے! زرتشت کے فلسفہ الٰہیات میں خدا کا شخصی وجود جسمانیت کے جملہ لوازم کا مستلزم نہیں ہے، چنانچہ اگرچہ زرتشت کا خدا کوئی آلات حواس نہیں رکھتا لیکن وہ بغیر کان کے سنتا ہے، بدون آنکھ کے دیکھنے پر قادر ہے، اور پوری طرح سمیع وبصیر، علیم وخبیر، اور مجیب الدعوات اور وہاب عطیات ہے! ہر بندے کو بالراست اس تک رسائی حاصل ہے اور عبادت خداوندی میں اس شہر کو خاص دخل ہے۔

زرتشت اپنی امت کے ساتھ عموماً واصولاً چولی دامن کا ساتھ رکھنا چاہتا ہے لیکن بعض اوقات "اللہ سے واصل" ہونے کی تگ ودو مخلوق میں شامل" رہنے میں مانع آتی ہے اور "برزخ کبریٰ میں" حرف مشدد" کی صفات نسبتہً کم ہو جاتی ہیں، چنانچہ ایک موقع پر وہ اپنے کو کھیتی باڑی کے کام سے بالاتر بتاتا ہے لیکن اس کی تعبیر اور توجیہ وہ ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے کرتا ہے اور اُسکو کسی عار یا کسر شان کے خیال سے منسوب

کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہے، پس وہ خود کہتا ہے کہ "میں جو ایک معلم بناکر بھیجا گیا ہوں دوسرے مشاغل میں ضرورت سے زیادہ کیونکر دخل دے سکتا ہوں اور زراعت وفلاحت کے فرائض سے کس طرح عہدہ برا ہوسکتا ہوں؟ صراط مستقیم کا ایک راہرو قلبہ رانی کی حظوظ کشی کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے! (یاسن ۳۳-۶)

اپنے ملفوظات کے دوران میں ایک جگہ اس کی زبان پر قربانی کا لفظ بھی آتا ہے لیکن اس کے خصائص و شرائط کچھ دوسرے ہیں اور یہ پیشکش خدا اور اسکی ایک خاص صفت کو نذر دیا گیا ہے اور اس کی غایت بھی خاص ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "ہم تیری ذات اور تیری صفات "حق" کے سامنے بصد ادب اپنی قربانیاں پیش کرتے ہیں تاکہ اس "دار القرار" یا ملک لایبلی" میں وہ ہم کو "فکر صحیح" کے ذریعہ منزل کمال و تکمیل پر فائز المرام کریں (یاسن ۳۴)

لیکن زرتشت اپنی امت کے سواد اعظم کے فرائض یہی قرار دیتا ہے کہ وہ زمین کا ترددکریں اور اپنے مویشی کی داشت و پرداخت، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے نفوس کے اندر "امیشا اسپینتا" کی نشوونما کرتے رہیں۔

یہ "امیشا اسپینتا" مذہب زرتشتی کا بہت ہی اہم اور غیر معمولی عنصر ہیں۔ اگرچہ ان کی حقیقت و ماہیت بتانا بہت ہی مشکل ہے لیکن زرتشت انہی کی عینک سے تمام حقائق و امور کو دیکھتا ہے اور یہی چیزیں زرتشتیت کی پیشانی پر بخط جلی لکھی ہوئی ہیں۔ اہورآمزدہ اس ملت کا خدا ہے اور اسکی ذات واحد کے سوا کوئی اور ہمسر یا فرد تر قسم کے دوسرے خدا نظر نہیں آتے۔ بخلاف ازیں عہد ویدکے ہندوستان میں، نیز یونان و مصر قدیم میں قوائے فطرت عرصہ دراز تک مستقل اور جداگانہ خداؤں کی حیثیت سے شمار ہوتے رہے۔ انکی باہمی منزلت کے متعلق دوسرا عقیدہ یہ بھی تھا کہ وہ آپس میں ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کی طرح باہم دگر ہمرشتہ و مساوی رتبہ ہیں۔ ایران عتیق کے مذہب کی "بزم خدا و نداں" بھی کم و بیش ایسی ہی تھی تاآنکہ زرتشت نے ایک بالکل دوسری قسم کی الہیات کی بنیاد ڈالی، لیکن تعجب یہ ہے کہ زرتشتیت کے عرش یزدانی

پر بھی ہم کو اہورآمزدہ کے گرد کچھ صورتیں حلقہ زن نظر آتی ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انکو مزدہ ہی نے اپنی ہستی سے وجود بخشا ہے لیکن پھر ان کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے کہ وہ نہ تو منصب الوہیت کی حامل ہیں اور نہ اہورآمزدہ کی خدائی میں شریک و سہیم۔ بعض اوقات ان کو شخصیتوں کے پیکر میں دکھایا جاتا ہے، کبھی وہ صفات الٰہی کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہیں کبھی باہم دگر ایک دوسرے کے قالبوں میں حلول کر جاتی ہیں، اور کبھی انکا مستقر کارفرمائی قلب انسانی ہوتا ہے! انکی تعداد بے شمار ہے جن میں سے بعض بعض کا ظہور شاذ و نادر ہوا کرتا ہے اور بعض کے مظاہر شب و روز مصروف نمود رہتے ہیں۔ انہی ارواح و صفات میں سے چھ کو زرتشتیت کے نقش ثانی مجوسیت میں چھ ملائکہ مسومین و مقربین کا رتبہ دیا گیا ہے۔ گاتھ کے متون میں اس "بزم خاص" کی تعداد قریباً دو چند ہے لیکن سب کی حقیقت اصل پر ایک پردہ سا پڑا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ہم انکے مدارج تقرب و دوری کو متعین کرنے سے بالکل قاصر ہیں۔

ان پر اسرار اور مجہول الکیف ہستیوں میں سے "روح حق" اور "فکر صالح" کا دوسروں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ تکرار کے ساتھ ذکر آتا ہے اور قیاس غالب یہ ہے کہ انہی کو اہورآمزدہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ فوق و تقدم حاصل ہے۔ ان دو کے بعد "جبروت" کا مرتبہ ہے اور بعد ازاں "رحانیت" کا نمبر آتا ہے۔ اس آخر الذکر صفت میں شخصیت و جسمیت کے لوازم بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ رحانیت کے بعد "فلاح" اور "بقا" عموماً دست بدست نظر آتے ہیں! اور پھر یکے بعد دیگرے "تقدیر"، "آتش"، "روح ثور"، "خالق ثور"، "روح القدس"، "اطاعت"، "نجات" اور "حیات اصلح" ملتے ہیں! لیکن "ہستی حق" کی اس سارے مجمع میں بالاتری کا یہ حال ہے کہ اسکا ذکر صحیفہ گاتھ کی نصف سے زیادہ آیات میں آتا ہے بعض اقتباسات:-

"تو نے فی الواقع "حق" کو پیدا کیا" (یاسن ۳۱-۸)

"کون ہے اسے مزدہ: فکر صالح" کا خالق؟" (یاسن ۴۴-۴)
"کس نے "جبروت" کی معیت میں "رحمانیت کے لعل گرانمایہ کو زندگی بخشی؟" (یاسن ۴۴)
کبھی کبھی یہ جماعت شیران مزدہ کے لباس میں نظر آتی ہے۔

اہورامزدہ کے یہ سب آلات کار ہیں چنانچہ وہ اپنی جگہ پر خود مستقل الحال نہیں "رحمانیت" ایک پیامبر کی حیثیت رکھتی ہے اور احکام قضاو قدر کی ارسال و ترسیل کرتی ہے "جبروت" کا کوئی مستقل بالذات وجود نہیں ہے بلکہ وہ دوسری صفات کے متعلقات کی نوعیت رکھتی ہے اور اسم مضاف کے طور پر آتی ہے، مثلاً جبروت حق، جبروت فکر صالح وغیرہ وغیرہ۔ "رحمانیت"، "فلاح" اور "بقا" کی صفات خداوندی مخلوق کے حصے میں بطور عطیے کہ دیدی گئی ہیں، لیکن انسان کی ملوکہ ہو کر وہ اپنی مستقل ہستی کو جداگانہ حیثیت سے بھی قائم رکھتی ہیں اور انسانی وجود میں جزو لاینفک بنکر مدغم نہیں ہوگئی ہیں۔ وہ بمنزلہ ایک داعیۂ عمل کے کام کرتی ہیں اور گویا مزدہ کے کارندے ہیں۔ "روح ثور" تمام جانوروں اور مواشی کی جان جان ہے اور "خالق ثور" انکا محافظ اور نیگا؟ مزدہ میں انکا شفیع و وکیل ہے "آتش" اہورامزدہ کی رسول خاص اور دست راست ہے "روح القدس" خود مزدہ کی روح قلب ہے، اور انسانی قلوب کی مایۂ حیات بھی وہی ہے "طاعت" وہ داعیۂ نفس ہے جو نفوس کو اطاعت حق کا امر و اثر آفرینی کرتا ہے۔ اور "نجات دہندہ" یا "ساؤ شانئیت" کے لقب میں روئے سخن خود زرتشت کی طرف ہے! "حیات اصلح" شاید کوئی نادر الوجود چیز ہے جس کا ذکر ملفوظات زرتشت میں صرف ایک جگہ آیا ہے!

"امیشا سپینتا"، دراصل دوسرے خدا نہیں ہیں بلکہ وہ ذات اور صفات الٰہی کے باہمی فصل و امتیاز کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ نیز بندہ و معبود کے مابین ایک مشترک برزخ کا سامان فراہم کرتی ہیں تاکہ اُس سے ہر دو کے درمیان ایک رشتۂ روحانی کا معنوی تعلق پیدا ہو جائے۔ تخلقوا باخلاق اللہ!

یاسن ۴۱ کی آیات ۱۹ و ۲۰ کا مفہوم یہ ہے:
"جس شخص کے دل میں حق کا پرتو ہے اُس کے کلمات حق کو سننا ہر آدمی کا فرض ہے (ذالک لمن کان لہ قلب او القی السمع) وہ ایک عارف حقیقت ہے اور ایک طبیب حیات (شفاء لما فی الصدور و ہدی ورحمۃ) مزدہ اہورا اپنی قدرت کاملہ سے فلاح، بقا حقانیت، جبروتیت، اور فکر صالح کے ساتھ اُس شخص کو ایک نسبت سرمدی عطا کرے گا جس کے قلب و روح اور جس کے اعضاء و جوارح نے مزدہ کا مقام خلت حاصل کر لیا ہے (اللہ ولی الذین آمنو یخرجہم من الظلمات الی النور)"
یاسن ۵۱ کی آیت ۲۰۔
"اپنی برکات و سعادات آپ ہم کو عطا کرینگی، آپ سب جو کہ ایک ہی وجود کے اندر جذب و حدت ہو گئی ہیں اور جہاں حق، فکر صالح، رحانیت، اور مزدہ میں کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔ یہ وعدہ ہمارے ساتھ پورا ہوگا اور جو شخص پورے خلوص عبودیت کے ساتھ اہورا مزدہ کی پرستش کریگا وہ نصرت غیبی اور تائید ایزدی کا ضرور مورد بنے گا۔"

زمانۂ مابعد کی روایات میں ان صفات کا قوائے فطرت کے ساتھ ایک رشتۂ تعلق پیدا ہو گیا اور ہر صفت ایک خاص مخلوق کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ چنانچہ "حق" آگ کی حفاظت کرنے لگا۔ "فکر صالح" حیوانات کا محافظ بنا۔ "جبروت" نے فلزات کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ "رحانیت" ساری زمین پر سایہ افگن ہو گئی۔ "فلاح" و "بقا" کے توجہات و نوازشات کے ماتحت تمام اشجار و انہار آ گئے۔ لیکن گاتھ کے صفحات کا جہانتک تعلق ہے وہاں یہ تقسیم عمل و تعلقات علوی و سفلی نظر نہیں آتے۔ یہ مظاہر مذاہب قدیم کے کسی صحیفہ کے مطالب سے مشابہت نہیں کہاتے۔ بجز اس کے کہ ہم بائبل کے باب پیدائش کی آیت ۲۶ کے مضمون میں اسکا کچھ توارد فرض کریں یا پھر حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اس واقعہ

اس کو تشبیہ دیں جس میں پیغمبر ممدوح کے سامنے تین آدمی مشل ہو کر آتے ہیں!
گاتھ کے اندر وہ انسانی پیکروں میں نظر نہیں آتے۔ یہ قلب ماہیت بعد کی کتابوں میں ہوئی
ہیں، چنانچہ رحمانیت ایک نسوانی ہستی ہے اور اہور آمزدہ کی دختر نیک اختر بن گئی ہے (یاشت ۲-۴)
لیکن نسائیت کا تخیل کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھتا اور اساطیر کی کسی مکمل عمارت کی بنیاد اس پر
تعمیر نہیں کیجاتی اس عقیدے نے مذہب زرتشتی میں کوئی قابل اعتنا اہمیت یا دخل حاصل
نہیں کیا اور زرتشتیت کی عمومی ذہنیت سے بالکل الگ اس کو ایک استثنائی معاملے سے تعبیر کر سکتے
ہیں، چنانچہ دوسری دو صفات "فلاح" اور "بقا"، جن کے نام بھی نسوانی ہیں اس لئے
تغیر جنسیت سے محفوظ رہی ہیں، اور تین اور جن کے نام تذکیر و تانیث سے بے تعلق ہیں یعنی
"حق"، "فکر صالح"، اور "جبروت" ان میں بھی کسی مخصوص صنف کا اظہار نہیں پایا گیا۔ "آتش"
"طاعت" وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔

(باقی)

مستشرقین کی سترھویں بین الاقوامی کانگریس

اس دفعہ سولہ برس کے بعد مستشرقین کی کانگریس کا اجلاس اگست کے آخری ہفتہ میں آکسفورڈ میں منعقد
ہوا۔ لڑائی اور اس کے بعد صلح کی پریشانیوں نے یورپ والوں کو اب تک اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ اپنے پرانے امن
کے مشغلوں کو از سر نو جاری کر سکیں۔ علمی تحقیق امن کے زمانہ کا ایک بڑا ضروری اور اہم مشغلہ ہے۔ چنانچہ آکسفورڈ
کے اس اجلاس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی پھر آہستہ آہستہ اپنے پرانے مشغلوں اور دلچسپیوں کو پیدا
کر رہی ہے۔ اس اجلاس میں یورپ اور امریکہ کے ان سب اداروں اور تعلیم گاہوں کے نمائندے موجود تھے
جو مشرقی علوم کی تحقیقات سے کسی قسم کی بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انگلستان، امریکہ، اور فرانس کے نمائندوں کے علاوہ
جرمن گورنمنٹ نے، پروفیسر سی۔ ایچ بیکر کو جو آجکل موجودہ گورنمنٹ میں وزیر تعلیمات ہیں اور عربی علوم و
تہذیب سے دلچسپی رکھتے ہیں، بحیثیت نمائندہ بھیجا۔ جرمنی کے اور مشہور لوگوں میں پروفیسر ایچ لوڈرس، ای لٹمان
اے فشر، پی کاہلے اور سی ایف لیہمان ہاپٹ کی شرکت بھی قابل ذکر ہے۔ فرانس کی گورنمنٹ کی طرف سے موسیو
کولان اور پیرس یونیورسٹی کی طرف سے پروفیسر لوئے فنتے شریک اجلاس ہوئے۔ پروفیسر جے بلوک نے
پیرس کی سوسیٹے ایشیاٹک اور مجلس السنہ پیرس کی نمائندگی کی۔ پروفیسر بریسٹڈ نے ممالک متحدہ امریکہ کی نیابت کی۔ ان
سب لوگوں کی موجودگی اور ان کے ساتھ یورپ کے بہت سے ملکوں کے تماشائیوں کے ایک جگہ اکٹھا ہونے سے آکسفورڈ
کی فضا میں ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور پورا ہفتہ ایسا باتوں ہی باتوں میں گذر گیا کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہوا۔
اس ہفتہ میں مضامین پڑھے گئے، دعوتیں اور چائے نوشیاں ہوئیں، تصویریں کھچیں، الگ الگ ملاقاتیں ہوئیں
غرضکہ یہ سب دلچسپیاں ایسی ہیں کہ ہفتہ تو ہفتہ مہینہ گذر جائے اور پتہ نہ لگے۔

مضامین کے لحاظ سے نشستیں الگ الگ روزانہ ہوتی تھیں۔ تقسیم یوں تھی۔ اول تقسیم عامہ جس میں
عام دلچسپی کے مضامین پڑھے گئے۔ دوم اسیریالوجی اور ملحقہ مضامین، سوم مصریات و افریقیات، چہارم وسط
و شمالی ایشیا، پنجم مشرق اقصیٰ، ششم (الف) ہند قدیم، ششم (ب) ہند جدید، جنوبی ہند اور لنکا، ہفتم ایران

ارمینیا اور قاف ۔ ہفتم عبرانیات اور ارمیات ۔ ہشتم اسلامیات اور ترکیات ۔ نہم مشرقی فنون لطیفہ ۔

بعض وقت بڑی دقت یہ ہوتی تھی کہ وہ شخص جس کی وفاداریاں اور دلچسپیاں بٹی ہوتی ہیں اور جو ایک حریص کی طرح ایک ہی وقت میں بہت سی چیزیں چاہتا ہے ایک ہی وقت دو جگہ نہیں شریک ہو سکتا تھا۔ اگرچہ انتہائی کوشش کی گئی تھی کہ اس قسم کا کوئی تصادم نہ واقع ہو لیکن انسانی دلچسپیاں اتنی ہیں اور انکی نوعیتیں اتنی مختلف ہوتی ہیں کہ ان پر حاوی ہونا ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہندوستانی مسلمان کو لیجئے جسے اسلامی مضمونوں سے اس لئے دلچسپی ہوتی ہے کہ اسکی تہذیب و معاشرت کا گذشتہ اسلام سے وابستہ ہے اور ہندی مضمونوں سے اس لئے کہ وہ اس کی موجودہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی منتظمین قابل داد ہیں کہ اس قسم کا تصادم بہت کم واقع ہوا۔

اس اجلاس کی دلچسپی میں ایک مزید اضافہ خود آکسفورڈ اور اسکے نواح کی پرسکون فضا سے بھی ہوا۔ اس مقام کا جائے وقوع بجائے خود پرلطف ہے، دریا اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا منظر، زمین کا نشیب و فراز سبزہ و شادابی نہایت پرفریب ہیں۔ آکسفورڈ انگلستان کی ذہنی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انگلستان میں سب سے پہلے یونیورسٹی کے تخیل کو لوگوں نے نہیں سمجھا۔ ہنری دوم نے بادشاہ فرانس سے کچھ ناچاقی کے باعث اپنے ان طالبعلموں کو جو پیرس میں تعلیم پا رہے تھے واپس انگلستان بلا لیا، کسے معلوم تھا کہ یہ نوجوان پیرس سے ایک نیا تخیل انگلستان لائیں گے، اور آکسفورڈ کی خانقاہ میں ایک یونیورسٹی کی بنیاد رکھیں گے۔ انسانی تاریخ میں اتفاقات اور انکے اثرات کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو انسانی ارادہ و تدبیر پست پڑ جائیں بعض دفعہ باتوں سے ایسی باتیں اور چیزوں سے ایسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں جن کا کسی کو اس وقت وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ یورپ کی ساری تعلیم گاہوں کو دیکھئے۔ یہ سب پہلے خانقاہیں تھیں جہاں لوگوں کا شغل سوائے اللہ اللہ کے اور کچھ نہ تھا بارھویں، تیرھویں صدی عیسوی میں بھلا کون یقین کرتا کہ ساربون کے گرجا کے سامنے آگسٹ کونٹ جیسے شخص کا بت نصب ہوگا۔ انسانی ترقی کی تاریخ انہیں اتفاقات اور غیر متوقع باتوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔

ہندوستان سے بعض یونیورسٹیوں نے اپنے نمائندے نامزد کر دئے تھے اور میں سمجھتا ہوں لوگ محض کانگریس میں شرکت ہی کی غرض سے انگلستان تشریف لائے۔ بھنڈرکار انسٹیٹیوٹ کی طرف سے پروفیسر ایچ آر دا

صاحب نے نمائندگی کی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب گورنمنٹ دہلی کی طرف سے شریک اجلاس ہوئے اور عربی زبان اور اس کے محاوروں پر ایک مضمون بھی پڑھا۔ مسٹر عبدالحق صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے تشریف لائے تھے اور ابو تمام کی شاعری پر ایک مضمون پڑھا۔ مصری گورنمنٹ کی طرف سے موسیو طٰہٰ حسین صاحب نمائندہ تھے اور باوجود اس کے کہ اُنکے کئی مضمونوں کا پروگرام میں اعلان کیا گیا تھا صرف ایک مضمون اجلاس میں قلت وقت نہ ہونیکے باعث پڑھ سکے۔ اُنکے مضمون یہ تھے:۔

(۱) لیبنٹز اور معتزلیوں کی تعلیمات میں بعض مشترک امور۔

(۲) دو ابتدائی ہجریوں کے مذہبی مباحث کا فن بلاغت پر اثر۔

(۳) قرآن میں ضمیر صیغہ غائب کا استعمال اسم اشارہ کی طرح۔

موصوف نابینا ہیں۔ یہ تیسرا مضمون چھپا ہوا تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اپنی تقریر میں لفظ بلفظ وہی کہا جو اس چھپے ہوئے مضمون میں تھا۔ عام طور پر اُنکی تحقیقات یورپ میں نہایت وقعت سے دیکھی جاتی ہیں۔ طٰہٰ حسین صاحب پیرس یونیورسٹی کے ڈی لٹ ہیں، فرانسیسی نہایت عمدہ اور شستہ بولتے ہیں، تقریر بھی فرانسیسی ہی میں کی تھی۔ اُنکی بیوی ایک شریف فرانسیسی خاتون ہیں۔ مجھ سے وہیں اجلاس میں ملاقات ہوئی اس کے بعد انہوں نے سہ پہر کو مجھے اپنے مکان پر بلایا۔ مکان پر جو اُن سے گفتگو ہوئی اس سے اور زیادہ عزت اُنکی میرے دل میں بڑھ گئی۔ مجھ سے کہنے لگے:۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور یہ معلوم کر کے اور بھی خوشی ہوئی کہ آپ اس تعلیم گاہ میں پڑھے ہیں جس سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔"

میں۔ جی ہاں میں نے عرصہ سے آپ کی تعریف سنی تھی خصوصاً اپنے ان نوجوان مصری دوستوں سے جو میرے ساتھ سار بون میں پڑھتے ہیں یہ سب آپ کے گرویدہ ہیں۔

موصوف۔ ہاں میں اچھا خاصا بدنام ہوں۔ قاہرہ میں اپنے بعض ہندوستانی شاگردوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہندوستان کے بعض رسائل نے مجھے کافر ملحد کے لفظوں سے یاد کیا ہے۔

میں نے مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ کیا آپ کے لئے یہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یا اسی قسم کے دیگر

خلاف جوقدر کم ہوسکے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ ابھی ہم یہ نہیں سمجھتے کہ علمی تحقیق کرنے والا مذہب قائم کرنا رسم و رواج اور ان کے مٹانے کا فرق نہیں کرتا۔ وہ کوئی بات اس لئے نہیں کہتا کہ لوگوں کی دل آزاری ہو۔ وہ کسی مسئلہ کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے کا ویسا ہی مجاز ہے جس طرح لوگ بعض رایوں کو اپنا عقیدہ بنانے کا حق رکھتے ہیں۔

موصوف۔ ہر اس زندگی میں جس میں نمو ہے قدیم و جدید کی کشمکش ہونی ضروری ہے۔ اسلامی اور مشرقی ممالک اس کشمکش سے گذر رہے ہیں۔ ہمارا مستقبل اسی قدر روز روشن ہوگا جس قدر ہم اس کشمکش میں اپنا توازن قائم رکھ سکیں گے۔ میں مصر کے نوجوانوں کی ذہنیت کو جانتا ہوں۔ وہ ہر بات میں جدت کے لئے بیتاب ہیں۔ یہ بیتابی بڑی خطرناک ہے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں وہ جماعت ہے جو زندگی کو رسم و مذہب کے آہنی شکنجہ میں جکڑے ہوئے ہے جو ذرا سی بات کو جو ان کے عقیدہ کے خلاف ہو کفر سمجھتی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا میری کتاب "الادب الجاہلی" پر لوگوں نے کس نقطہ نظر سے اعتراض کئے۔ ہر مذہبی عقیدہ یا رسم ہمیشہ معقول دلیل نہیں ہوا کرتی۔ اس ناروا داری کو یہاں تک میرے ساتھ برتا گیا کہ مصر کے عربی رسائل نے میرے مضمون چھاپنے سے انکار کر دیا اور مجبوراً مجھے دمشق کے ایک ماہوار رسالے میں اپنے مضامین بھیجنے پڑتے ہیں۔ اپنے مخالف کو مذہبی لوگوں کو گوارا نہیں۔ اب اس وقت علماء کی جماعت سمجھتی ہے کہ روز بروز موجودہ علوم کے پھیلنے سے ان کا [illegible] زائل ہو رہا ہے۔ انہیں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر روز پبلک کے لئے ایک نیا شگوفہ چھوڑ دیں۔ بڑی دقت یہ ہے کہ ان میں بعض لوگ مخلص ہیں اور سچے محب وطن ہیں۔ ابھی حال میں ان میں سے بعض نے اشتراکیت سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ یہ غریب اپنے خیالات کی پیچیدگیوں اور ان کے لازمی نتیجوں سے بےخبر ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اس بات کو پس انداز کر دیتے ہیں کہ اشتراکیت اپنے منطقی نتیجوں کے لحاظ سے مذہبی اور رسمی عقیدوں کے بالکل خلاف ہے۔ اشتراکیت کسی آسمانی بادشاہت کے وجود کی قائل نہیں۔ اشتراکیت کے نزدیک مذہب و آئین اور رسم و رواج سب انسانی ذہنی ایجادیں ہیں اور ہر وقت انسان کو حق ہے کہ انہیں بدل دے۔ اشتراکیت کو تو پوری لبرل ازم کی برخلاف مذہب و رسم کو بحیثیت "واقعات" نہ کہ بحیثیت "صداقت" تسلیم کرنے سے بھی انکار ہے۔ اب اگر کسی مصری شیخ نے یہ بات [illegible]

ہوگا۔ اس جماعت کا خلوص قابل داد ہے لیکن انکی سادہ لوحی قابل افسوس ہے۔

یمن۔ مشرق میں ہم سب کو تقریباً ایک ہی قسم کے مسائل درپیش ہیں۔ ان مسائل کے حل بھی بڑی حد تک یکساں ہونگے۔ ہندوستان کے مسلمان ترکی اور مصر کی ذہنی پیشقدمی اور معاشرتی ترقی دیکھ کر ممکن ہے جنبش میں آئیں۔ آپ کی پیش قدمیوں سے ہمارا تذبذب اور ڈر ذرا کم ہو گا۔ اچھا یہ فرمائیے اس وقت کے مصری سیاسی حالات پر آپ کی کیا رائے ہے۔

موصوف۔ یہ ایک مستقل کشمکش ہے جس کا ختم ہونا معلوم ہے۔ لیکن مجھے نئی نسل سے بہت امیدیں ہیں۔ ہمارا مقابل بہت زبردست ہے اور بہت عاقل ہے۔ ہمارا اور اس کا مقابلہ کمزور اور زبردست کا مقابلہ ہے۔ ہم اپنی کمزوریاں دور کر رہے ہیں جب وہ دور ہو جائیں گی انگلستان کو مصر میں رہنے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

یمن۔ کیا آپ کے خیال میں خلافت کا نظام ممکن ہے؟

موصوف۔ خلافت کے متعلق تو میری رائے وہی ہے جس کا اظہار مصر کے وزیر تعلیمات نے ایک دفعہ اپنی تقریر میں کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ "خلافت مصر کے قدیم مناروں [illegible] کی طرح ہے کہ جان بوجھ کر انکا توڑنا حماقت اور اگر ٹوٹ جائیں تو پھر بنانا اس سے بڑھ کر حماقت ہے" ترکی نے غلطی کی کہ خلافت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ ڈالا لیکن اب یہ کوشش کہ خلافت قائم کی جائے اس سے زیادہ بڑی غلطی ہوگی۔ اصل میں خلافت کا نظام سلطنت اگر اسے حقیقی معنی میں قرآنی تعلیم کے مطابق رکھا جائے تو موجودہ جمہوری اصول جہانداری کے خلاف ہے۔ جہاں تک اسلامی ممالک میں آپس میں رشتہ قائم کرنے کا تعلق ہے اس کا زیادہ مفید طریقہ یہ ہے کہ مختلف اسلامی ممالک کے علمی ادارے ایک دوسرے سے تعلقات پیدا کریں تاکہ جو علمی و ذہنی ترقیاں ایک جگہ ہوں ان سے دوسرے بھی واقف اور مستفید ہو سکیں۔ سیاسی حیثیت سے خلافت کا قیام اسلامی ممالک کے لئے محض بیکار ہے۔

غرضکہ اس دلچسپ مقالات میں تقریباً دو گھنٹے گفتگو ہوئی میرے ساتھ بشری صاحب تھے میرے

فرانسیسی مطلق نہیں سمجھتے تھے۔ عربی تھوڑی تھوڑی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ گفتگو کا مفہوم میں انہیں اد
دیتا تھا یا طٰہٰ حسین صاحب خود عربی میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ پروفیسر طٰہٰ حسین صا
ایک فرانسیسی خاتون ہیں۔ چونکہ موصوف نابینا ہیں اس لئے یہی ہر جگہ انکی رہبری کرتی ہیں۔ لو
ملاتی ہیں اور لکھنے پڑھنے کا کام بھی سارا یہی کرتی ہیں۔ ایک بچی بھی ہے جو عربی اور فرانسیسی
ہے۔ میاں بیوی دونوں نہایت خلیق اور ملنسار ہیں۔ طٰہٰ حسین صاحب کی گفتگو میں ایک خاص
اور خاکساری ہے جس سے ہر شخص پر عجیب اثر پڑتا ہے۔ اس کے بعد ان سے کانگریس کے
میں روزانہ ملاقات ہوتی رہی اور ہندوستان کے متعلق اکثر گفتگو رہتی تھی۔ موصوف کو
بہت دلچسپی ہے۔

+

اس اجلاس کی اختتامی رسم ایک دعوت تھی۔ اس دعوت کے بعد پروفیسر بیکر نے
کی طرف سے انگلستان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے تقریر کچھ دیر جرمن میں اور پھر انگریزی میں کی
نے فرمایا کہ جب تک مشرق و مغرب ایک دوسرے کو اچھی طرح نہ سمجھیں اس وقت تک انسا
کی بنیادیں مضبوط نہیں کہی جا سکتیں۔ موسیو کولان نے فرانسیسی گورنمنٹ اور مسٹر ہڈسن نے
امریکہ کی گورنمنٹ کی طرف سے شکریے ادا کئے۔

+

میں اکثر اپنے فرانسیسی پروفیسروں کو کہتے سنتا تھا کہ دیکھو آج میں فلاں سے اتنا
بعد اور فلاں سے ۱۰ برس کے بعد ملا۔ لڑائی کے بعد یہ اپنی قسم کا پہلا اجتماع تھا جہاں ی
کے محقق اکٹھا ہوئے اور اپنی پرانی بھولی بسری ملاقاتوں کو تازہ کیا۔ ہم لوگ ذرا مشکل
کا اندازہ کرتے ہیں کہ یورپ کی زندگی کے توازن کو جنگ نے کس بری طرح بگاڑا ہے کہ آج
پیر لڑکھڑاتے ہیں۔

مثنوی

(یہ مثنوی ہمارے محترم استاذ جناب مولٰنا سید شرف الدین صاحب نے ۵ رنومبر ۲۵ء کو جامعہ کے یوم تاسیس کے جلسہ میں پڑھی تھی ۔ مولٰنا کا خیال اردو میں ایک ترکیب بند کہنے کا تھا لیکن چند طلبہ اور اساتذہ کے اس اصرار پر کہ کچھ فارسی میں ہونا چاہئے یہ مثنوی لکھی گئی اور بہت مقبول ہوئی ۔)

بیا ساقیا بادۂ ناب دہ   اگر بادہ نتوانی زہر آب دہ
چہ زہر آب؟ کاں تلخی افزایدم   چہ تلخی؟ کہ در کام خوش آیدم
چہ تلخی؟ کہ جاں در خروش آردم   زبے ہوشیٔ غم بہ ہوش آردم
بسا نوش کاں ہوش را در ربود   بسا نیش کاں ہوش را در فزود
بداں نوش کاں ہوش بربائدت   خوش آں نیش کاں دانش افزائدت
بد آں مایہ شادی کہ رنج آردت   خوش آں مایہ رنجے کہ گنج آردت
چناں گنج را کس خریدار نیست   کہ جز مایۂ رنج و آزار نیست
بجاں شو خریدار آں رنج را   کہ باشد کلید آں دو صد گنج را
نیاگانِ ما کز جہاں آفریں   شب و روز بر جانِ شاں آفریں
ز آسودگی روئے برتافتند   پس از رنجہا گنجہا یافتند
بسے رنج بردند بر روئے خاک   بدلوند در رنج خوش جانِ پاک
چہ غم کار ما شد گر امروز پست   بہ نیروئے یزداں کشائیم دست
کمر بر کمرگاہ بندیم چست   بسازیم یک یک شکستے درست
شد از پیش ما آں مسیحا نفس   کہ بودے بہ ہر رنج فریاد رس

به هر درد ما چاره ساختی — به تدبیر درمان به پرداختی
نبینیم او را درین انجمن — دریغا نه دید او بهار چمن
دریغا چمن را نیامد بهار — که ناگه سرآمد بر او روزگار
دمے پاک شوئیم دل راز غم — نباید که باشیم زین سان دژم
نباشیم زاندوه بر خاک پست — سوئے پاک یزداں برآریم دست
که اے داور دوراں مهر کن — برآریم این کوه غم راز بن
تو یاری ده و کار آساں بکن — که این اندوه ما برآرید زبن
زهر بیم و اندیشه آزاده ایم — که بر خاک راه تو افتاده ایم
زگیتی بریدیم یکسر امید نو — زمهر تو جوئیم هر دم نوید
یکایک به هر کار یار خودیم — همال در تگاپوئے کار خودیم
کنوں در زمیں پائے افشاردیم — همه رنج را شادی انگاردیم
همه ناگوارہ گوارہ کنیم — هنر در جهاں آشکاره کنیم
که این ست نیروی افتادگاں — زبند زر و مال آزادگاں
فشاندیم یک یک به پائے تو جاں — تو اے جامه شاداں زنده ماں
نه مردی تو هم اے مسیحا نفس — که این جامه زنده ها بر تو بس
بگیتی تو همواره پاینده — تو مرده زندهٔ زنده

ماموں جان

(گذشتہ سے پیوستہ)

تیسرا ایکٹ

سربریاکف کے مکان میں ڈرائنگ روم تین دروازے: داہنی جانب بائیں جانب اور بیچ میں

دن کا وقت

وائنشکی اور سونیا بیٹھے ہیں اور یلینا اینڈریونا کسی خیال میں مو ٹہل رہی ہے۔

وائنشکی۔ پروفیسر صاحب نے کشادہ دلی سے خواہش ظاہر کی ہے کہ ہم سب اس کمرے میں آج ایک بجے جمع ہوں (اپنی گھڑی دیکھتا ہے) پندرہ منٹ باقی ہیں۔ وہ دنیا کو کوئی پیام پہنچانا چاہتے ہیں۔

یلینا۔ غالباً کچھ کاروبار کی نسبت کہیں گے۔

وائنشکی۔ کاروبار سے انہیں کوئی نسبت نہیں۔ سوا مہملات لکھنے یا بڑبڑانے اور حسد کرنے کے انہیں کسی کام سے نسبت نہیں۔

سونیا۔ (عاجزی کے ساتھ) ماموں جان، پھر وہی!

وائنشکی۔ اچھا، اچھا، مجھے معاف کرو سونیا، توبہ۔ (یلینا اینڈریونا کی طرف اشارہ کر کے) انہیں دیکھتی ہو، کاہلی اور بے کاری نے انہیں ایسا کمزور کر دیا ہے کہ چلنے میں ان کے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ میری حسین، میری نازک عورت!

یلینا۔ تم دن بھر بک بک کرتے ہو۔ تم تھکتے نہیں؟ (غمزدہ ہو کر) ناک میں دم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

سونیا۔ (کاندھے ہلا کر) کرنے کو تمام کام ہے۔ کوئی کام کرنے پر آئے تو کام ہی کام ہے۔

ملنا۔ مثلاً ؟

سونیا۔ تم زمین کے کام میں میری مدد دے سکتی ہو۔ یہ نہیں تو بچوں کی تعلیم، مریضوں کی تیمارداری بیسیوں کام ہیں جب یہ ابھی نہیں آئے تھے اور تم یہاں نہیں تھیں تو میں اور ماموں جان خود بازار جاتے تھے اور آٹا فروخت کرتے تھے۔

ملنا۔ مجھے یہ کام نہیں آتے۔ نہ یہ دلچسپ کام ہے۔ صرف ناولوں میں وہ بھی ایک خاص مقصد کی غرض سے لوگ بچوں کو پڑھاتے یا کسانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ میں ناتجربہ کار کیسے ایکدم انہیں پڑھانے لگوں یا تیمارداری کروں ؟

سونیا۔ میں نہیں سمجھتی کوئی کیسے ان کاموں سے احتراز کر سکتا ہے۔ کچھ دن ٹھہرو تمہیں خود بخود یہ کام آ جائیں گے۔ (اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتی ہے) بے دل کیوں ہوتی ہو (ہنستی ہے) جی کڑھا جانے سے فائدہ ؟ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرو اور تم بیکاری اور پریشانی کے شکار ہو۔ ماموں جان کو دیکھو۔ انہیں کوئی کام نہیں بس تمہارے پیچھے سایہ کی طرح رہتے ہیں۔ میں اپنا کام چھوڑ کر تم سے باتیں کرنے دوڑ آئی ہوں۔ میں کاہل ہو گئی ہوں۔ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر مہائل استروف ہمیں دیکھنے کبھی کبھی آتے تھے، مہینہ میں ایک بار وہ بڑی مشکل سے یہاں آنے کو راضی ہوئے تھے اور اب جب دیکھو وہ آ جاتے ہیں۔ وہ اپنے جنگل کا کام بھول گئے اور مریضوں کو انہوں نے تج دیا۔ بڑی ساحرہ ہو۔

وانشکی۔ بے دل کیوں ہوتی ہو ؟ کیوں صدمے اٹھاتی ہو ؟ (جوش میں) آؤ ! میری جان میری پیاری ہوش میں آؤ ! تمہاری رگوں میں جوانی کا خون ہے۔ جوانی تمہارا حق ہے۔ زندگی میں ایک دفعہ تمام بندشوں کو توڑ دو ! جلدی کرو اور بے تابانہ کسی آبی روح سے محبت کرنے لگو۔ زلال جیسی پاک و صاف روح کے ساتھ تعلق پیدا کر لو۔ محبت کے آبنائے میں غوطہ لگاؤ اور تمہارا بڈھا پروفیسر اور ہم سب تمہیں دیکھیں اور حیرت کریں۔

ملنا۔ (خفگی سے) خدا کے لئے بس کرو ! مجھ پر رحم کرو ! (باہر جانے کو ہوتی ہے)

وانشکی۔ (اسے روکتا ہے) اچھا اچھا مجھے معاف کرو۔ توبہ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں (ہاتھ

نوحہ تباہی! صلح! صلح!

ملینا۔ تم فرشتوں کا محل توڑ سکتے ہو۔

ناشکی۔ صلح کی! دیں تمہارے لئے ایک گلاب کی ڈالی لاتا ہوں! میں نے آج صبح یہ پھول تمہارے لئے جمع کئے تھے۔ خزاں کے گلاب۔ خوبصورت، غم انگیز گلاب۔ . . . (باہر جاتا ہے)

سونیا۔ خزاں کے گلاب۔ خوبصورت، غم انگیز گلاب . . . . (دونوں کھڑکی کے باہر جھانکتی ہیں)

ملینا۔ بالکل ستمبر کا موسم ہے۔ یہاں جاڑے کیسے گذار سکوں گی؟ (ایک وقفہ) ڈاکٹر کہاں ہے؟

سونیا۔ ماموں جان کے کمرے میں۔ وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ ماموں جان گئے۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

ملینا۔ کاہے کی بات؟

سونیا۔ کاہے کی بات! (اپنا سر ملینا کے سینہ پر رکھ دیتی ہے)

ملینا۔ کیا؟ کیا؟ صوفی پیاری کوئی بات؟ (اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے)

سونیا۔ میں حسین نہیں ہوں۔

ملینا۔ تمہارے بال خوبصورت ہیں۔

سونیا۔ نہیں! (گھومتی ہے تاکہ اپنے کو آئینہ میں دیکھے) نہیں! جب کوئی عورت سادہ ہوتی ہے تو ہمیشہ اسے یہی کہتے ہیں "تمہاری آنکھیں خوبصورت ہیں، تمہارے بال خوب ہیں"۔ . . . چھ سال سے میں اس پر جان دیتی ہوں۔ اپنی ماں سے زیادہ اسے چاہتی ہوں۔ ہر لمحہ اُس کے وجود سے باخبر رہتی ہوں میں اُسکو ہاتھ کی آہٹ کو پہچانتی ہوں اور دروازہ تکتی ہوں۔ میں انتظار کرتی ہوں۔ ہر لمحہ خیال کرتی ہوں اب آیا۔ اب آیا اور سمجھتی ہو؟ ملینا میں تم سے بتاتی ہوں میں تمہارے پاس اُس کی ہی باتیں کرنے آتی ہوں، اب وہ روز یہاں رہتا ہے لیکن مجھ پر نظر بھی نہیں ڈالتا۔ مجھے نہیں دیکھتا۔ . . کیسا ظلم ہے! مجھے مطلق امید نہیں۔ کوئی امید نہیں، کوئی نہیں! (مایوسانہ) ارے اللہ مجھے موت دے۔ میں رات رات بھر دعائیں مانگتی ہوں۔ . . . اکثر اس کے پاس جاتی ہوں۔ اُس سے بات کرنا شروع کرتی ہوں، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوں۔

تمام افتخار جاتا رہا میری قوت ختم ہوگئی۔ مجھے خود پر قابو نہیں ہے۔ میں ضبط نہ کرسکی، اور میں نے کل ماموں جان سے کہہ دیا کہ اسے چاہتی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ اور سب نوکروں کو خبر ہوگئی ہے کہ میری اس پر جان جاتی ہے۔ ہر شخص اسے جانتا ہے۔

یلنا۔ اور وہ ؟

سونیا۔ نہیں۔ وہ مجھے خاطر میں نہیں لاتا۔

یلنا۔ (غور کرتے ہوئے) وہ عجیب آدمی ہے۔ ۔ ۔ سمجھتی ہو کیا؟ میں اس سے بات کروں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں سلیقہ اور طریقہ سے اس معاملہ کو چھیڑوں گی۔ ۔ ۔ ۔ اشاروں میں اسے سمجھاؤں گی۔ ۔ (ایک وقفہ) ہاں، واقعی۔ کب تک آخر تم بیچاری اس تذبذب میں رہو گی ؟ میں جاؤں ؟

(سونیا اپنا سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کرتی ہے)

یلنا۔ ٹھیک، یہ معلوم کرلینا مشکل نہیں کہ وہ تمہیں چاہتا ہے یا نہیں، میری جان ازردہ نہ ہو پریشان نہ ہو۔ میں اس سے ایسے سلیقہ سے بات کروں گی کہ اسے خیال بھی نہ ہوگا۔ ہمیں جو کچھ معلوم کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہاں یا نہیں۔ (ایک وقفہ) اگر نہیں تو بہتر ہے کہ وہ یہاں آنا ترک کردے، ایں ؟

(سونیا رضامندی کے طور پر سر ہلاتی ہے)

یلنا۔ صبر اور برداشت اس وقت آسان ہے جب کوئی معشوق کو نہ دیکھے۔ دیر نہ کرنا چاہئے۔ فوراً دریافت کرنا چاہئے۔ وہ مجھے کچھ نقشے دکھانے کو کہتے تھے۔ جاؤ ان سے کہو میں ان سے ملنے آتی ہوں۔

سونیا۔ (کشمکش اور اضطراب میں) مجھ سے سب حال سچ سچ بتادو گی ؟

یلنا۔ کیوں نہیں میرے نزدیک حقیقت، خواہ وہ کیسی ہی زہر آلود اور مہلک کیوں نہ ہو اتنی خوفناک اور مضر نہیں جیسا تذبذب۔ میری جان مجھ پر اعتبار کرو۔

سونیا۔ بیشک، بیشک! میں اس سے جاکے کہتی ہوں تم اس کے نقشے دیکھنا چاہتی ہو (جاتی ہے مگر دروازہ پر رکتی ہے) نہیں تذبذب اچھا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس میں کم از کم آس تو ہے۔ ۔ ۔ ۔

یلنا۔ کیا کہا۔

سونیا۔ کچھ نہیں۔ (جاتی ہے)

لینا۔ کسی کے بارے باخبر ہو جانا اور اُس کے لئے کچھ نہ کر سکنا اس سے زیادہ قابلِ افسوس کوئی بات نہیں (سوچتے ہوئے) وہ اسے نہیں چاہتا۔ یہ ظاہر ہے۔ لیکن وہ اس سے کیوں شادی نہیں کر لیتا۔ وہ خوبصورت نہیں ہے لیکن ڈاکٹر جیسے شخص کی عمر کیلئے وہ بہترین بیوی ہوگی۔ کیسی سمجھدار کیسی نیک اور بھولی . . . . (ایک وقفہ) بیچاری کی تکلیف کا میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ شروع سے آخر تک ایک ناقابلِ قیاس بے تکے پن میں زندگی گذارنا جی میں کوئی روشن پہلو نہیں، انسانوں کے بجائے صرف خشک اور مردہ سایوں، بے روح گوشت اور ہڈی کے ڈھانچوں کے درمیان جن کی گفتگو بعدی ہے اور جو گنوار ہیں، اُن لوگوں کے درمیان جو سور کھانے اور سونے کے سوا کچھ نہیں جانتے وہ، فیاالکزنڈریونا بیچاری افق پر کبھی کبھی ان سب سے مختلف ان سب سے خوبصورت، دلچسپ، دلربا، اس چاند کے مشابہ نظر آتی ہے جو تاریکی میں یکدم نکل آئے . . . . ایسے آدمی کے سحر سے مغلوب ہونا . . . . اپنی ہستی اُس پر وارنا . . . . میں یقین کرتی ہوں کہ میں خود اس سے متاثر ہوں۔ ہاں جب وہ نہیں آتا تو میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اور میں اسوقت بھی اُس کے خیال سے مسرور ہو رہی ہوں . . . . وہ ماموں جان کہتا ہے کہ میری رگوں میں جوانی کا خون ہے" زندگی میں ایک دفعہ تمام بندشوں کو توڑ دو" بے شک۔ شاید یہی مجھے کرنا چاہئے . . . . اے کاش ملے کاش میں تم لوگوں کے پاس سے بھاگ جا سکتی، آزاد و مسرور چڑیا کی طرح اڑ سکتی ملے لوگو، تم سب کے پاس سے، تم سب کے سوئے ہوئے چہروں سے، تم سب کی بے معنی گفتگو سے آزاد ہو سکتی، تم سب کو بھلا سکتی . . . . لیکن میں بزدل ہوں . . . . میرا ضمیر مر گیا ہے، میرا ضمیر مجھے تکلیف دیتا ہے . . . . وہ یہاں روز آتا ہے۔ میں سب جانتی ہوں وہ یہاں کس کے پاس آتا ہے۔ ایک مجروح و مجرم احساس پہلے ہی سے میرے دل میں موجود ہے۔ میں سونیا کے قدموں پر گرنے کو تیار ہوں۔ اُس سے معافی مانگنے کے لئے، رونے کے لئے . . . . .

استروف۔ (ایک نقشہ لئے داخل ہوتا ہے) تسلیم! (اُس سے ہاتھ ملاتا ہے) آپ میرا دستی کام دیکھنا چاہتی تھیں۔

ما۔ آپ نے کل مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے دکھائیں گے . . . . اس وقت آپ کو فرصت ہے ؟

ستروف۔ ہاں ہاں کیوں نہیں (تاش کی میز پر نقشہ کھول کر پھیلاتا ہے اور ڈرائنگ کی کیلوں سے اسے تختے پر گاڑتا ہے) کہاں پیدا ہوئی تھیں آپ ؟

ینا۔ پیٹرس برگ میں۔

ستروف۔ اور تعلیم کہاں حاصل کی ؟

ملینا۔ مدرسہ موسیقی میں۔

استروف۔ میں جانتا ہوں آپ کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔

ملینا۔ کیوں نہیں ؟ یہ سچ ہے کہ میں دیہات اور گاؤں وغیرہ سے واقف نہیں لیکن میں نے پڑھا بہت کافی ہے

استروف۔ میری اپنی میز یہاں ہے۔ اس گھر میں . . . . آئوان پیترووچ کے کمرے میں۔ جب میں کام سے تھک جاتا ہوں یا پریشان یا اداس ہوتا ہوں میں سب کام چھوڑ کر یہاں آتا ہوں اور گھنٹہ دو گھنٹہ تک اس سے جی بہلاتا ہوں . . . . آئوان پیترووچ اور صوفیا الکزنڈرنا اپنی تسبیحوں کے دانے کھٹکاتی ہیں اور میں اُن کے پاس بیٹھتا ہوں اور اپنے نقشہ میں رنگ بھرتا ہوں —— اور مجھے سرور اور آرام محسوس ہوتا ہے اور جھینگر چرچر کرتا ہے۔ لیکن اس قسم کی عیاشی میں بہت نہیں کرتا۔ صرف مہینے میں ایک بار . . . . (نقشہ کو دکھلاکے) اب اسے دیکھو ! یہ ہمارے ضلع کا اب سے پچاس برس پہلے کا نقشہ ہے۔ سیاہ اور ہلکا سبز رنگ جنگلوں کو ظاہر کرتا ہے، آدھا رقبہ جنگلوں سے بھرا ہوا تھا۔ سبز رنگ پر جا بجا سُرخ رنگ کی دھاریاں ہیں یہاں بارہ سنگھے اور جنگلی بکرے بکثرت پائے جاتے تھے۔ میں نے نباتات اور حیوانات ساتھ ساتھ دکھائے ہیں۔ اس جھیل کے کنارے ہنس، بطخ اور مرغابیاں پائی جاتی تھیں اور پرانے لوگ کہتے ہیں کہ یہاں ہر طرح کی چڑیوں کی "ایک سلطنت" تھی ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔ انکے غول کے غول اُڑتے تھے۔ گاؤں اور دیہاتوں کے آس پاس تم دیکھتی ہو ادھر اُدھر ہر طرح کی آبادیاں ہیں۔ پرانی خانقاہیں، ہوائی تیلی گھر اور دوسرے کارخانے . . . . یہاں سینگ والے جانور اور گھوڑے بکثرت تھے۔ انہیں نیلے رنگ سے دکھایا ہے۔ مثلاً یہاں دیکھو نیلا رنگ گہرا دکھایا ہے یہاں گھوڑوں

کے مستقل گلے تھے اور ہر گھر میں کم از کم تین گھوڑوں کا اوسط تھا۔ (ایک وقفہ) اچھا ذرا نیچے دیکھو۔ یہ پچیس برس پہلے کی تصویر ہے۔ تم نے دیکھا اب صرف ایک تہائی رقبہ میں جنگل ہیں۔ بکرے اب یہاں نہیں رہے مگر بارہ سنگھے ہیں . . . . . . اب تیسرے حصہ کو دیکھو۔ یہ اس ضلع کی موجودہ حالت ہے۔ کہیں کہیں ہرا ہے وہ بھی ذرا ذرا سے دھبے کی شکل میں تمام بارہ سنگھے غائب ہوگئے اور ہنس بھی . . . . پرانی آبادیات، خانقاہوں اور کارخانوں میں سے کسی کا نشان نہیں رہا۔ اصل میں یہ اُس تدریجی ابتری کا نقشہ ہے جو ہمارے ضلع میں دس پندرہ برس کے اندر تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ تم کہوگی یہ تہذیب کا اثر ہے کہ۔ پرانی زندگی خود بخود نئی زندگی سے بدل جاتی ہے۔ بیشک۔ میں اسے سمجھتا ہوں اگر ان تباہ شدہ جنگلوں کی جگہ شاہراہیں یا ریلیں ہوتیں، اگر کارخانے، اسکول اور دوسرے تجارتی سامان ہوتے تو دہقان زیادہ تندرست، زیادہ ذہین اور زیادہ فارغ البال ہوتے لیکن تم دیکھتی ہو۔ یہاں اس قسم کی چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں۔ آج تک دلدلیں اور مچھر باقی ہیں، وہی راستوں کی کمی، مفلسی، ناداری، میعادی فصلی بخار اور ضلع میں آگ لگنا . . . یہ ابتری ہماری معمولی سے زیادہ سخت کشمکش حیات کا نتیجہ ہے یہ ابتری جہالت، بے علمی اور رواداری کے فقدان کے باعث ہے۔ اس وجہ سے ہے کہ بے بس بھوکا اور بیمار انسان اپنی بقیہ زندگی کے تحفظ اور بقا کے لئے، اپنے بچوں کی زندگی برقرار رکھنے کے لئے غیر محسوس طور پر ہر اُس چیز پر جو اُس کی بھوک کو مار سکے ہاتھ ڈالتا ہے اور بغیر اندیشۂ فردا اُسے مسمار کر کے تباہ کرتا ہے . . . . اب تو قریب قریب ہر چیز مسمار ہو چکی لیکن اس کی جگہ پر کرنے کے لئے اب تک کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی۔ (سرد مہری سے) تمہارے چہرے سے ہویدا ہے کہ تمہیں میری باتوں میں دلکشی نہیں معلوم ہوتی۔

ییلنا۔ لیکن یہ سب میری سمجھ سے باہر ہو تو . . . .

استروف۔ اس میں سمجھ سے باہر بات ہی کیا ہے۔ تمہارا جی ہی نہیں لگتا۔

ییلنا۔ صاف بات یہ ہے کہ میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ معاف کرنا میں ذرا سا امتحان لینا چاہتی ہوں مگر بڑی مشکل ہے کہ سوال کیسے شروع کروں۔

استروف ۔ امتحان؟

ملینا ۔ ہاں ایک امتحان . . . لیکن کوئی بڑا مشکل امتحان نہیں۔ تشریف رکھئے (دونوں بیٹھ جاتے ہیں) ایک نوجوان خاتون کی بات ہو۔ اس وقت بالکل صاف صاف بے لاگ گفتگو کروں گی، نہ کوئی تکلف نہ کوئی حجاب، کہوں؟

استروف ۔ ہاں

ملینا ۔ میری سوتیلی لڑکی کی بات ہے۔ اُسے پسند کرتے ہو؟ کیوں؟

استروف ۔ ہاں اس کی بڑی عزت کرتا ہوں۔

ملینا ۔ بہ حیثیت ایک عورت کے تمہیں اس میں کوئی دلکشی نظر آتی ہے؟

استروف ۔ (ایک دفعہ کے بعد) نہیں۔

ملینا ۔ ایک بات اور، تم نے کچھ محسوس نہیں کیا؟

استروف ۔ کچھ نہیں۔

ملینا ۔ (اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر) تمہیں اُس سے محبت نہیں . . . . تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں . . . . وہ خوش نہیں ہے . . . . سمجھتے ہو . . . . تم یہاں آنا ترک کردو۔

استروف ۔ (اُٹھ بیٹھتا ہو) میرے دن گذر گئے۔ علاوہ اس کے مجھے اس سے زیادہ ضروری کام کرنے ہیں (اپنے کاندھے ہلاتا ہے) ان چیزوں کے لئے کہاں سے وقت لاؤں؟ (گھبرا جاتا ہے)

ملینا ۔ بس بس! کیسی ناخوشگوار، کیسی دل خراش گفتگو ہے! میں یوں کانپ رہی ہوں گویا میرے کاندھوں پر دس من بوجھ ہو۔ خیر . . . . اللہ تیرا شکر ہے، اب کچھ نہیں ہے ہمیں اسے بھول جانا چاہئے۔ سمجھو اس وقت کوئی بات نہیں ہوئی . . . . مگر یہاں سے چلے جاؤ۔ تم سمجھدار آدمی ہو . . . . تم سب سمجھتے ہو۔ (ایک وقفہ) مجھے حرارت ہو۔

استروف ۔ اگر تم نے ایک دو ماہ قبل کہا ہوتا تو، شاید، میں نے اس پر غور کیا ہوتا، لیکن اب . . . . (اپنے کاندھے ہلاتا ہو) اور اگر وہ پریشان ہے تو بے شک . . . . مگر ایک بات ہو جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر

تمہیں اسمیں دخل دینے کی کیا پڑی تھی ؟ (اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور اسپرا نگلی اُٹھاتا ہے) شریر عورت! جلتی ہوئی بنی ہوئی عورت!

یلنا۔ کیا مطلب ؟

استروف۔ (ہنستا ہے) شریر عورت! مانتا ہوں، سونیا خوش نہیں ہے اور رنجیدہ ہے۔ درست ہے۔ مگر تمہیں اس میں دلچسپی کی کیا وجہ ؟ (اُسے بات نہیں کرنے دیتا اور جوش سے) براہ مہربانی متحیر ظاہر ہونے کی کوشش نہ کیجئے۔ تم خوب سمجھتی ہو روز یہاں کس کے لئے آتا ہوں . . . . بتاؤ کس کے لئے ؟ بولو . . . . تم سب جانتی ہو۔ اسے خوبصورت شکاری، اے حسین صیاد، مجھے یوں نہ ستاؤ، مجھ پر یوں نظر نہ ڈال میں ایک صید ضعیف ہوں۔ . . . .

یلنا۔ (گھبرا جاتی ہے) حسین صیاد! میں سمجھی نہیں۔

استروف۔ اے خوبصورت بازوؤں والی چکنی مچھلی! . . . . تمہیں شکار ضرور ملنا چاہئے! اس مہینہ بھر میں یہاں کچھ نہ کر سکا۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ میں تمہاری تلاش میں، تمہارے حصول میں سرگرداں و سرگرم ہوں۔ اور تم اس سے خوب لطف اٹھاتی ہو، خوب . . . . اچھا میں ہارا، تم اس امتحان سے پہلے ہی یہ جانتی تھیں۔ (اپنے ہاتھ جوڑ کر اور اپنا سر جھکا کر) میں سر تسلیم خم کرتا ہوں، آؤ اور مجھے نگل جاؤ!

یلنا۔ تم دیوانے ہو!

استروف۔ (اپنے دانت بند کر کے ہنستا ہے) ارے۔ پُر فریب عورت . . .

یلنا۔ سچ کہتی ہوں میں اتنی خراب اور کمینی نہیں ہوں جتنا تم سمجھتے ہو! میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نہیں ہوں! (باہر جانے کی کوشش کرتی ہے)

استروف۔ (راستہ روک کر) میں آج جا رہا ہوں۔ میں یہاں پھر نہیں آؤں گا لیکن . . . (اُس کا ہاتھ لیتا ہے اور ادھر اُدھر دیکھتا ہے) ہماری ملاقات کہاں ہو گی ؟ جلدی بولو، کہاں ؟ کوئی آنہ جائے جلد کہو . . . (جوش میں) کیسی خوبصورت ہو، کتنی حسین ہو! ایک بوسہ . . . بس میں تمہارے ان شانوں دا تھوں کی چمک والے بالوں کا بوسہ لے سکتا . . . .

یلنا۔ میں یقین دلاتی ہوں ۔۔۔۔

استروف۔ (اُسے بولنے سے روکتے ہوئے) یقین کیوں دلاتی ہو؟ کوئی ضرورت نہیں۔ بیجا اور غیر ضروری الفاظ کی ضرورت نہیں ۔۔۔۔ اُف تم کیسی خوبصورت ہو! تمہارے ہاتھ کتنے گورے ہیں! (اُس کے ہاتھ چومتا ہے)

یلنا۔ بس بس ۔۔۔۔ مجھے چھوڑو ۔۔۔ (اپنے ہاتھ چھڑا لیتی ہے) تم اپنے کو بھولے جارہے ہو۔

استروف۔ کہو، کہو! ہم کل کس مقام پر ملیں گے؟ (اپنے ہاتھ اس کی کمر میں ڈالتا ہے) تم دیکھتی ہو نا گزیر ہے! ملاقات ضرور ہوگی (اُسے چومتا ہے)، اسی وقت وائنشکی گلاب کا ایک گچھا لئے ہوئے آتا ہے اور خاموشی سے دروازے پر رک جاتا ہے)

یلنا۔ (وائنشکی کو نہ دیکھکر) مجھے چھوڑو ۔۔۔۔ مجھے جانے دو ۔۔۔۔ (اپنا سر استروف کے سینہ پر رکھ دیتی ہے) نہیں! (باہر نکل جانے کی کوشش کرتی ہے)

استروف۔ (اُسے کمرے سے پکڑ کر) کل جنگلات کے علاقہ میں آنا ۔۔۔۔ دو بجے ۔۔۔ کیوں؟ کیوں؟ آؤگی نہ؟

یلنا۔ (وائنشکی کو دیکھکر) مجھے جانے دو، (بے حد تنگ آکر بدحواس ہوجاتی ہے اور کھڑکی کے پاس جاتی ہے) یہ بھی کوئی بات ہے! واہ

وائنشکی۔ (گلاب ایک کرسی پر رکھ دیتا ہے۔ گھبراہٹ میں اپنا چہرہ اور اپنی گردن رومال سے پونچھتا ہے) کچھ حرج نہیں ۔۔۔۔ کوئی ۔۔۔۔ کوئی حرج نہیں ۔۔۔۔

استروف۔ (بات کو ٹالتے ہوئے) جناب والا آج تو موسم برا نہیں ہے۔ صبح بادل گھرے ہوئے تھے اور خیال تھا بارش ہوگی، مگر اب دھوپ نکل آئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اب کے خزاں کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ ۔۔۔۔ اور جاڑوں کی فصل نہایت امید افزا (نقشہ تہ کرتا ہے) صرف دن چھوٹے ہوتے جارہے ہیں ۔۔۔۔ (باہر جاتا ہے)

یلنا۔ (جلدی سے وائنشکی کے پاس جاتی ہے) کوشش کرو۔ اپنی امکانی کوشش کرو کہ میں اور میرا

شوہر آج یہاں سے چلے جائیں! سنتے ہو؟ آج ہی!

وانشلکی۔ (اپنا چہرہ پونچھتا ہے) کیا؟ ہاں ہاں ... بہت خوب ... میں نے سب دیکھ لیا، ملینا۔ سب .....

ملینا۔ (مرعوب ہوکر) سنتے ہو؟ میں آج یہاں سے ضرور چلی جاؤں!

(سربریاکف، تلی گن اور ماریناداخل ہوتے ہیں)

تلی گن۔ حضور والا، میری طبیعت خود بخود کچھ گری سی جارہی ہے۔ گذشتہ دو دن سے میرا جی الٹ رہا ہے میرا سر مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے .....

سربریاکف۔ اور سب لوگ کہاں ہیں؟ مجھے یہ مکان پسند نہیں بالکل آسیبی گھر معلوم ہوتا ہے ۲۶ بڑے بڑے کمرے، لوگ جس کا جدبرجی میں آتا ہے جاتے ہیں اور پکارتے پکارتے حیران ہو جاؤ کوئی بولتا ہی نہیں (گھنٹی بجاتا ہے) ماریا وسیلیونا اور ملینا اینڈریونا سے کہو یہاں آئیں۔

ملینا۔ میں موجود ہوں

سربریاکف۔ دوستو میں التجا کرتا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔

سونیا۔ (ملینا اینڈریونا کے پاس جاکر بے صبری سے) کیا کہا انہوں نے؟

ملینا۔ سنو سنو۔

سونیا۔ تم کانپ رہی ہو! تم سرخ ہو رہی ہو! (اُس کے چہرہ کو متجسس نظروں سے دیکھ کر) میں سمجھتی ہوں.... شاید ابا نے کہا کہ اب نہیں آئیں گے .... کیوں؟ (ایک وقفہ) کہو، ہاں؟

(ملینا اینڈریونا سر ہلاتی ہے)

سربریاکف۔ (تلی گن سے) آدمی بیمار ہوکر بھی کسی نہ کسی طرح رہ سکتا ہے لیکن اگر میں نہیں برداشت کرسکتا تو گاؤں میں رہنے کے طریقے کو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے اٹھاکے مجھے کسی دوسرے سیارہ میں پھینک دیا گیا ہے۔ بیٹھ جائیے صاحبان میں کہتا ہوں تشریف رکھئے! سونیا! (سونیا اُسے نہیں سنتی ہے وہ اپنا سر جھکائے رنجیدہ کھڑی ہے) سونیا! (ایک وقفہ (وہ سنتی نہیں) (ماریناسے) تم بھی بیٹھ جاؤ،

اناجانی (انا بیٹھ جاتی ہے اور موزہ بنتی ہے) صاحبان میں عرض کرتا ہوں جیسی کہ مثل ہے اپنے کان توجہ کی کھونٹی پر کھڑے کر دیجئے (ہنستا ہے)

وائنٹسکی۔ (غصہ میں) شاید میری ضرورت نہیں ہے؟ میں جا سکتا ہوں؟

سریریاکف۔ نہیں تمہاری سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

وائنٹسکی۔ کس مقصد سے؟

سریریاکف۔ مقصد . . . تم خفا کیوں ہو؟ (ایک وقفہ) اگر مجھ سے کوئی قصور ہوا تو براہ کرم معاف کیجئے۔

وائنٹسکی۔ یہ لہجہ چھوڑئے۔ ہمیں اصل کام سے غرض ہے۔ میرے ٹھہرانے کی کیا وجہ ہے؟

(ماریا واسلیوونا داخل ہوتی ہے)

سریریاکف۔ یہ لو اماں بھی آگئیں۔ صاحبان میں شروع کرتا ہوں (ایک وقفہ) حضرات، میں نے آپ کو اکٹھا جمع کیا ہے کہ میں اعلان کردوں کہ جناب انسپکٹر جنرل بہادر تشریف لانے والے ہیں۔ خیر مذاق سے کیا فائدہ۔ ایک نہایت اہم بات ہے۔ میں نے آپ سب کو زحمت دی ہے تاکہ میں آپ سے مشورہ کر سکوں اور مجھے آپ سب کی عنایتوں سے امید ہے کہ آپ اس امداد سے دریغ نہ کریں گے۔ میں ایک جفاکش کتابی آدمی ہوں اور عملی زندگی اور واقعات کی دنیا سے مجھے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ میں ان لوگوں کی امداد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا جو ان مسائل کو سمجھتے ہیں اور ان کا تجربہ رکھتے ہیں اور میں آئیوان پیٹرووچ تم سے اور الیا ایلیچ تم سے اور اماں آپ سے درخواست کرتا ہوں . . . تو بات یہ ہے کہ کل من علیہا فان۔ یعنی ہم سب فانی ہیں۔ میں بڈھا اور بیمار ہوں اور اس لئے میں سمجھتا ہوں یہ وقت ہے کہ دنیا کے کم از کم وہ معاملات جو میرے خاندان سے متعلق ہیں طے کر دوں۔ میری زندگی ختم ہو چکی مجھے اپنا کچھ خیال نہیں ہے مگر میری جوان بیوی ہے اور ایک ناکتخدا لڑکی ہے (ایک وقفہ) میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ گاؤں میں زندگی گذاروں۔ ہم گاؤں کی زندگی کے لئے نہیں بنے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ شہر کی زندگی کے لئے اس تھوڑی سی جائداد کی آمدنی کافی نہیں۔ مثلاً اگر ہم جنگل فروخت کر ڈالیں تو یہ ایک مستثنیٰ امر ہے جسے ہر سال نہیں دہرایا جا سکتا۔ ہمیں ایسے ذرائع اور وسیلے تلاش کرنا چاہئیں جن سے کم و بیش مستقل آمدنی

کی صورت نکل آئے۔ میں نے ایک ایسی صورت سوچی ہے اور اسے آپ صاحبان کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ تفصیلات کو چھوڑ کر میں اسے اجمالی طور پر آپ سے بیان کرتا ہوں۔ ہماری جائداد کی آمدنی کا اوسط اصل روپیہ پر دو فیصدی سے زیادہ نہیں ہے میں اسے بیچنا چاہتا ہوں اگر ہم تمام روپیہ بنک میں جمع کردیں تو ہمیں چار سے پانچ فیصدی تک منافع ہوسکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ خرچ وغیرہ نکالنے کے بعد ہم اس سے کچھ کم ہزار روپیہ بچا بھی لیں گے جس سے ہم فن لینڈ میں ایک چھوٹا سا مکان خرید سکتے ہیں

وائنسکی۔ معاف کیجئے گا . . . . یقیناً میرے سننے میں غلطی ہوئی! پھر سے فرمائیے۔

سربریاکف۔ روپیہ بنک میں جمع کردیں اور اس کے سود کی آمدنی کی بچت سے فن لینڈ میں ایک مکان خریدیں۔

وائنسکی۔ فن لینڈ نہیں تم نے اور کچھ کہا تھا۔

سربریاکف۔ میں جائداد فروخت کرنا چاہتا ہوں

وائنسکی۔ کیوں نہیں۔ آپ جائداد فروخت کریں گے، کیا خوب خیال ہے . . . . اور یہاں ہمارے لئے اور اپنی بڑھی اماں کے لئے اور سونیا کے لئے کیا فکر کی ہے؟

سربریاکف۔ یہ سب ہم بعد میں طے کریں گے، ہم ہر چیز ایک ساتھ تو طے نہیں کرسکتے۔

وائنسکی۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ یہ ظاہر ہے کہ اب تک میں بے وقوف ہی رہا۔ اب تک میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ جائداد کی مالک سونیا ہے۔ میرے باپ نے یہ جائداد میری بہن کے جہیز کے لئے خریدی تھی۔ اب تک میں خاموش رہا میں نے ایک ترک کی طرح قانون میں معنی نہیں پہنائے بلکہ سوچتا رہا کہ میری بہن کی جائداد کی وارث اس کی بیٹی سونیا ہوگی۔

سربریاکف۔ بیشک جائداد کی وارث سونیا ہے۔ اس سے کون اختلاف کرتا ہے؟ سونیا کی مرضی کے بغیر جائداد فروخت کرنے کی میں جرأت نہیں کرسکتا۔ علاوہ اس کے یہ تو میں سونیا کے فائدہ ہی کے خیال سے کر رہا ہوں۔

وائنسکی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، سمجھ میں نہیں آتی! یا تو میرا دماغ بیکار ہوگیا ہے یا . . . یا . . . . .

ماریا۔ الگزنڈر سے بحث نہ کرو۔ یاد رکھو وہ ہم سب سے زیادہ سمجھتا ہے کہ کس بات میں فائدہ ہے۔

وائنشکی۔ نہیں مجھے تھوڑا سا پانی دینا (پانی پیتا ہے) جو جی میں آئے کہو۔ جو جی میں آئے کہو!

سربریاکف۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم اس قدر برافروختہ کیوں ہو۔ میں نہیں کہتا کہ میری تجویز بہترین ہے اگر تم سب کی رائے میں یہ ناموزوں ہے تو میں اصرار نہیں کرتا۔

(ایک وقفہ)

تلی گن۔ (بدحواسی میں) حضور والا علم بڑی چیز ہے۔ میں علم کو صرف عزت ہی کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ اسے ایک اپنی ذاتی وراثتی چیز سمجھتا ہوں۔ میرے بھائی گرگیوری ایلچ کی بیوی کا بھائی۔ شاید حضور والا جانتے ہوں گے کنستنتن ٹروفی یچ لیکیڈینوف ایم اے تھا.....

وائنشکی۔ چپ رہو مفت خورے ہم کام کی باتیں کر رہے ہیں..... ٹھہر کر۔ کچھ دیر کے بعد..... (سربریاکف سے) ہاں اس سے پوچھو۔ جائداد اس کے چچا سے خریدی گئی تھی۔

سربریاکف۔ اوہ! میں اُس سے کیوں پوچھوں؟ کس لئے؟

وائنشکی۔ اُس وقت جائداد پچانوے ہزار روبل میں خریدی گئی تھی۔ میرے باپ نے صرف ستر ہزار ادا کئے اور پچیس ہزار قرض رہا۔ اب سنو..... جائداد ہرگز نہ خریدی گئی ہوتی اگر میں اپنا حصہ وراثت اپنی بہن کو جسے میں بیحد چاہتا تھا نہ دیدیتا۔ اس سے زیادہ یہ کہ میں نے دس سال تک ایک غلام کی طرح اس جائداد پر کام کیا اور تمام قرضہ ادا کر دیا....

سربریاکف۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیوں یہ تذکرہ چھیڑا۔

وائنشکی۔ جائداد قرضہ سے پاک اور اچھی حالت میں صرف میری ذاتی محنت کی وجہ سے ہے اور اب جب میں بڈھا ہو چلا تو مجھے ٹھکرایا جاتا ہے۔

سربریاکف۔ میں نہیں سمجھتا تمہارا مطلب کیا ہے۔

وائنشکی۔ میں اس جائداد کا انتظام پچیس سال سے کر رہا ہوں۔ میں نے انتہائی جانفشانی اور محنت سے

اکٹھا کر کے تمہیں روپیہ بھیجا اور ان تمام سالوں میں تم نے ایک مرتبہ میرا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس تمام مدت میں۔ جب میں جوان تھا جب بھی اور اب بھی۔ تم نے مجھے پانچسو روبل سالانہ تنخواہ دی۔ ایک حقیر ذلیل رقم! اور تم سے اتنا نہ ہوا کہ ایک روبل کا بھی اضافہ کرتے۔

سریریاکف۔ آئوان پیٹرووچ، مجھے اسکی شکایت بیکار ہے؟ میں عملی آدمی نہیں ہوں اور ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔ تم اس میں جس قدر چاہتے اضافہ کر سکتے تھے

وانشکی۔ میں نے چوری کیوں نہیں کی؟ کیسے تعجب کی بات ہے کہ تم لوگ مجھے ملامت نہیں کرتے کہ میں نے چوری کیوں نہیں کی؟ ایسا کیا ہوتا تو میں آج یوں مفلس اور بے زر نہ ہوتا۔

ماریا۔ (سختی سے) وانشکی!

تلی گن۔ (غصہ میں) وانیا، میرے پیارے میاں، بس کرو ۔ ۔ ۔ میں تو کانپا جاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تعلقات میں کیوں فرق ڈالتے ہو؟ دل صاف رہنے چاہئیں (اس کا بوسہ لیتا ہے) بس کرو

وانشکی۔ پچیس برس تک میں اس چار دیواری کے اندر ان کے ساتھ بند رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے خیالات اور احساسات صرف تمہارے لئے تھے، تمہارے تھے۔ دن کو ہم تمہارا اور تمہارا اور تمہارے کاموں کا ذکر کرتے تھے۔ ہمیں تم پر ناز تھا۔ تمہارا نام ہم عزت کے ساتھ لیتے تھے، راتیں ہم کتابیں اور رسالے پڑھ پڑھ کے ضائع کرتے تھے، افسوس، افسوس۔

تلی گن۔ بس، وانیا بس ۔ ۔ ۔ ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سریریاکف۔ (غصہ میں) میری سمجھ میں نہیں آتا تم کیا چاہتے ہو۔

وانشکی۔ ہمارے لئے تم ایک بلند تر ہستی تھے اور ہمیں تمہارے مضامین زبانی یاد ہو گئے تھے۔ لیکن اب میری آنکھیں کھلی ہیں! میں اب سمجھا! تم آرٹ پر مضمون لکھتے ہو اور تم آرٹ کی بابت ایک حرف نہیں سمجھتے! تمہاری جن تصانیف کو میں اس قدر پسند کرتا تھا وہ کوڑی کی بھی نہیں ہیں! تم نے ہمیں فریب دیا!

سریریاکف۔ اسے روکو! میں جاتا ہوں!

یلینا۔ آئوان پیٹرووچ، میں تم سے کہتی ہوں کہ چپ رہو! سنتے ہو؟

وائنشکی۔ نہیں چپ ہوں گا۔ (سربریاکف کو جانے سے روک کر) ٹھہرو! مجھے ابھی بہت کہنا ہے، تم نے میری زندگی تباہ کی! میں زندہ نہیں رہا، میں زندہ نہیں رہا، تمہارے طفیل میں نے اپنی عمر کے بہترین ایام برباد کر دئے۔ تم میرے سب سے بڑے دشمن ہو۔

تلی گن۔ میں سن نہیں سکتا . . . . میں سن نہیں سکتا . . . میں جاتا ہوں (بڑے غصے میں باہر چلا جاتا ہے)

سربریاکف۔ تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟ اور تمہیں مجھ سے اس طرح گفتگو کرنے کا کیا حق ہے؟ بے وقوف کہیں کے اگر جائداد تمہاری ہے تو لے جاؤ۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے!

یلنا۔ میں اس کال کوٹھری سے اسی وقت جاتی ہوں (رونی آواز میں کہتی ہے) میں ان حالات میں ایک منٹ یہاں نہیں ٹھہر سکتی!

وائنشکی۔ میری زندگی تباہ ہوگئی! مجھ میں ہنر، ہمت، ذہانت تھی! اگر مجھے معمولی اوسط قسم کی زندگی ملی ہوتی تو آج میں ایک شوپن ہار، ایک دستیفسکی ہوتا . . . . . میں دیوانوں کی طرح بک رہا ہوں؛ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں . . . . اماں، میں بڑی مصیبت میں ہوں! اماں!

ماریا۔ (ڈانٹ کر) جو الکزنڈر کہے اس پر عمل کرو۔

سونیا۔ (اناکے پیروں پر گر کر اور سراسیمہ ہو کے) ناجانی! ناجانی!

وائنشکی۔ اماں! میں کیا کروں؟ کچھ نہ بولو، بولنے کی ضرورت نہیں میں جانتا ہوں کیا کروں! (سربریاکف سے) تم بھی یاد کروگے! (بیچ کے دروازے سے نکل جاتا ہے)

(ماریا واسلیو دینا اس کے پیچھے جاتی ہے)

سربریاکف۔ کوئی حد ہے! اس پاگل آدمی کو یہاں سے لیجاؤ۔ میں اس کے ساتھ ایک مکان میں نہیں رہ سکتا جب دیکھو لڑنے کو موجود (بیچ کے دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے)۔ ہر وقت میری جان کے پیچھے . . . . اسے گاؤں بھجوا دو ورنہ میں یہاں سے جاتا ہوں؛ لیکن اس کے ساتھ ایک مکان میں رہوں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا . . . .

یلنا۔ (اپنے شوہر سے) ہم یہ جگہ آج ہی چھوڑ دیں گے! ہمیں اسی وقت اسباب باندھنا چاہئے!

سربریاکف - پاگل ذلیل آدمی!

سونیا - (پیروں پر جھکی ہوئی اپنا سر باپ کی طرف موڑتی ہے۔ روتے ہوئے سسکیاں بھر بھر کے) ابا جان رحم رحم۔ ماموں جان اور میں رنجوں کے مارے ہیں! (اپنی کمزوری پر غالب آکے) ابا جان رحم کیجئے! یاد کیجئے جب آپ اس سے زیادہ کم عمر تھے ماموں جان اور نانا کیسے تمہارے لئے رات رات بھر بیٹھ کے مسودے صاف کرتے تھے اور ترجمے کرتے تھے . . . . رات رات بھر . . . . رات رات بھر . . .

ماموں جان اور میں آرام نہیں کرتے تھے اور کام کرتے تھے — ہم اپنے اوپر ایک پیسہ خرچ کرتے ڈرتے تھے اور سب آپ کو بھیجتے تھے . . . . ہم نے بیکاری کی روٹی نہیں کھائی۔ میں یہ سب غلط کہہ رہی ہوں - غلط کہہ رہی ہوں لیکن ابا جان آپ کو سمجھنا چاہئے، سب سمجھنا چاہئے۔ آپ ترس کھائے!

یلنا - (غصہ میں اپنے شوہر سے) الکزنڈر خدا کے لئے اسے منا لو . . . . میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں!

سربریاکف - بہت اچھا میں اس سے بولونگا، میں اس کو کوئی الزام نہیں دیتا میں اس سے خفا نہیں ہوں لیکن یہ تم بھی مانو گی کہ اس کا طرزِ عمل عجیب ہے۔ بہت خوب، میں اس کے پاس جاتا ہوں (بیچ کے دروازے سے باہر جاتا ہے)

یلنا - اس سے نرمی سے بات کرنا، اسے دلاسا دینا . . . . (اس کے ساتھ باہر جاتی ہے)

سونیا - (انا سے لپٹ کے) ارے انا جانی! انا جانی!

مارینا - کیوں گھبراتی ہے، لڑکی مرغے چیخیں گے اور چپ ہو جائیں گے . . . چیخیں گے اور چپ ہو جائیں گے . . . .

سونیا - انا جانی!

مارینا - (اس کا سر سہلا کر) تم تو ایسی کانپ رہی ہو جیسے سردی لگ گئی! بس، بس، بن ماں کے بچے، اللہ رحم کرے! ایک چائے کی پیالی یا چونے کا پانی پینے سے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی . . . . رنج نہ کرو، بیٹی (غصہ میں بیچ کے دروازے کو دیکھ کر) اچھے خاصے انسان سے پاگل ہو گئے ہیں! اللہ ان سے سمجھے!

(منظر کے پیچھے ایک ریوالور کے فیر کی آواز آتی ہے، یلنا اینڈریونا کی ایک چیخ سنائی دیتی ہے سونیا

کانپتی ہے)

مارنیا۔ ہائے یہ کیا! خدا غارت کرے!

سربریاکف۔ (دوڑتا ہوا آتا ہے، خوف سے پیر ڈگمگاتے ہیں) اسے پکڑ لو! اسے پکڑ لو! وہ پاگل ہو گیا ہے

(ییلنا اینڈریوناا اور وانتسکی دروازے پر جھگڑتے ہیں)

ییلنا۔ (اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے) اسے چھوڑ دو! میں کہتی ہوں اسے چھوڑ دو!

وانتسکی۔ مجھے جانے دو، ہیلن! مجھے جانے دو! (اس سے اپنے کو چھڑا کر وہ اندر آتا ہے اور سربریاکف کو تلاش کرتا ہے) کہاں گیا؟ یہ ہے! (اس پر پستول چلاتا ہے) لیتے جاؤ (ایک وقفہ) خالی گیا پھر خالی گیا! (وحشیانہ لہجہ میں) خدا غارت کرے۔ خدا اسے غارت کرے.... (پستول زمین پر پھینک دیتا ہے اور تھک کر ایک کرسی پر گر جاتا ہے۔ سربریاکف بدحواس ہے۔ ییلنا دیوار کا سہارا لیتی ہے جیسے بیہوش ہونے کو ہے)

ییلنا۔ مجھے یہاں سے لے چلو! مجھے یہاں سے لے چلو! مجھے مار ڈالو..... میں یہاں نہیں رہ سکتی نہیں رہ سکتی۔

وانتسکی۔ (مایوسانہ) ارے! میں کیا کر رہا ہوں! میں کیا کر رہا ہوں!

سونیا۔ (آہستہ سے) انا جانی! انا جانی!

پردہ

(باقی)

شذرات

ہر آدمی جسے بچوں سے سابقہ پڑا ہو جانتا ہے کہ انکے ہاتھوں کے لئے ہمیشہ کچھ کام ہونا چاہئے۔ بچوں کو بیکار رکھنا انہیں شرارت پر مجبور کرنا ہے۔ اجتماعی زندگی کی نفسی کیفیتیں انفرادی بچپن سے بہت کچھ ملتی ہیں۔ چنانچہ جماعتوں کے پاس بھی جب کوئی معقول شغل نہیں ہوتا تو وہ اپنی قوت کو فتنہ وفساد میں صرف کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہندوستان کے غلاموں نے ترک موالات کی تحریک میں آزادی حاصل کرنے کی ایک زبردست کوشش کی۔ اس مقصد کو حاصل کرنیکے لئے اپنی سمجھ کے موافق ذرائع بھی تجویز کئے اور ان پر کاربند بھی ہوئے۔ اور اسمیں کچھ عرصہ تک ایسے منہمک رہے کہ کسی فتنہ وفساد کے لئے وقت ہی نہ ملا۔ یہ تحریک سوائے اپنے بالواسطہ نتائج کے بعض اندرونی کمزوریوں کیوجہ سے چند سال کے بعد آگے نہ چل سکی۔ قوم کے ہاتھ خالی ہوئے تو بھائیوں نے سنگٹھن اور تنظیم، شدھی اور تبلیغ کے نام سے بھائیوں کے گلے کاٹنے شروع کئے۔ تاکہ ہاتھوں کے لئے کچھ تو کام ہو! "لیڈروں" نے قوم کو بہت کچھ سمجھایا لیکن قوم نے جو "درس عمل" انکی تھی انکی کسی بات پر کان نہ دھرا۔ اور اپنے نئے شغل میں خاصے انہماک سے مصروف رہی۔ لیڈروں نے کانفرنسیں کیں۔ تجویزیں منظور کیں، اپیلیں شائع کئے، لیکن صورت حال میں ذرا تبدیلی نہ ہوئی۔ "قوم" سے گذر کر معاملہ "اکابر قوم" تک پہنچا۔ انہیں سے اکثر چونکہ میدان عمل سے دور رہ کر قوم کو ہدایات دینے کے عادی ہوتے ہیں اس لئے میدان کارزار کی اطلاعوں نے انکے لئے ایک ذہنی مسئلہ کی شکل اختیار کر لی اور یہ سمجھنے لگے کہ متحارب جماعتیں ایسے تخیلات ومقاصد کے لئے برسرپیکار ہیں جن میں باہمی سمجھوتہ ممکن ہی نہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندو مسلمان "لیڈروں" میں اچھی خاصی تعداد اس خیال کی قائل ہوگئی کہ ایک ہی آسمان تلے اور ایک ہی زمین کے ٹکڑے پر بسنے والی یہ دو قومیں ہندو اور مسلمان کبھی باہمی مفاہمت سے کسی مفید سیاسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتیں۔

انہیں "لیڈروں" میں کچھ لوگ تھے جنکے قوائے عمل اگرچہ اس مسموم فضا میں تقریباً دوسروں کی طرح

ہی شل تھے تاہم دماغ ابھی کام کرتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ہرچند اس وقت کام کچھ نہیں بن پڑتا لیکن کم سے کم اس ذہنی مرض کا علاج تو کرنا چاہئے جس نے اچھے اچھے قوم پرستوں" کو "فرقہ پرست" بنادیا ہے۔ اس کوشش میں بھی بہت سی ناکامیاں ہوئیں لیکن بالآخر مسلمانوں کی ایک باا ثر جماعت نے یہ تسلیم کرکے کہ ہندو مسلمانوں کا جھگڑا دراصل آنے والی آزادی میں اپنے اپنے حصہ کا جھگڑا ہے۔ آئندہ سیاست ملکی کے بعض اہم مسائل کے متعلق وہ تجاویز ملک کے سامنے پیش کیں جو" تجاویز دہلی" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان تجاویز نے گفت وشنید کا دروازہ کھولا۔ اور کانگریس نے اس موقع کو غنیمت جانکر کوشش شروع کی کہ مختلف جماعتیں کس طرح اپنے باہمی مطالبات میں کچھ لیکر کچھ دیکر ہم آہنگی پیدا کرلیں۔ تاکہ اس روز افزوں ذہنی خطرہ سے نجات کی صورت ہو کہ ہندو مسلمان کسی طرح ایک آزاد ہندوستان میں ایک دوسرے کا حق غصب کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

ادھر ہندوستانیوں کی باہمی نااتفاقی کو دیکھکر بعض کم ظرف برطانوی مدبرین نے طعنے دینے شروع کئے کہ اچھا تم آزادی چاہتے ہو، اپنے باہمی مسائل کا تو کوئی تصفیہ کرلو۔ کوئی ایسا دستور ہی بنا لو جس میں مختلف الخیال سیاسی جماعتیں ہم آہنگ ہوجائیں۔

کانگریس نے مختلف جماعتوں کو دعوت دی۔ اور پنڈت نہرو کی صدارت میں ایک نہایت ممتاز کمیٹی نے دستور اساسی بنا ڈالا۔

سچ پوچھئے تو یہ دستور سازی بیکاری کا شغل ہے۔ دستور اساسی مرتب ہوتا ہے اس وقت جب قوم اپنی آزادی حاصل کرچکتی ہے یا اسے حاصل کرنیکی قوت اپنے اندر پیدا کرلیتی ہے اور اس حقیقت کے یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہم اس وقت غلام ہیں اور ہم میں سے بہت سے غلام رہنے پر قانع ہیں۔ ہندوستان کے حقیقی دستور اساسی میں تو قوموں، اور علاقوں کے حقوق کی تقسیم میں خود اس حصہ کو بہت دخل ہوگا، جو یہ قومیں یا علاقے حصول آزادی کی دشوار کشمکش میں لیں گے۔ کاغذ پر اگر ہندو دونوں مسلمانوں کو سب حقوق دے دئے جائیں اور جنگ آزادی میں ہندو تنہا لڑیں یا مسلمان تنہا تو کیا دستور کے

اندرانکی اعتباری حیثیت وہی رہ سکتی ہے یا رہنی چاہئے جو کاغذ پر پہلے سے لکھدی گئی ہے۔ ہندوستان کا دستور اساسی اس کے ہندو مسلمان فرزندوں کے خون سے اور شاید اس سے زیادہ اس کے محنتی اور جفاکش، صابر، مستقل مزاج اور گمنام فرزندوں کے پسینہ کی بوندوں سے لکھا جائیگا۔ قصر حریت کی مکین نہیں لوگوں کی آئندہ نسلیں ہوسکتی ہیں جو اس کی تعمیر میں اپنا خون پسینہ ایک کرینگے۔ اور باغ آزادی کی ترنگیں انہیں کے جانشینوں کے حصہ میں آئیں گی جو اپنے خون سے اس چمن کی آبیاری کرینگے۔

لیکن خیر۔ یہ دستورسازی بیکاری کا شغل ہی سہی۔ اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ بیکاری کے اس کام کو ہندوستانیوں نے کس طرح انجام دیا۔ ہم نہرو رپورٹ کی خامیوں سے بیخبر نہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے اور یقین کرتے ہیں کہ ترمیمیں ہو بھی جائیں گی۔ لیکن باوجود ان خامیوں کے علم کے، اور کونسا انسانی کام ہے جس میں خامیاں نہ ہوں۔ ہم اس رپورٹ کے مرتب کرنے والوں کو مبارکباد دئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے اپنے مشکل کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔

افسوس یہ ہے کہ کام کی خوبی کو شخصیتوں کے تصادم نے نظروں سے بہت کچھ چھپا دیا ہے۔ اس وقت مسلمانان ہند کیطرف سے جو بڑے وسیع پیمانہ پر اس دستاویز کی مخالفت ہو رہی ہے اس میں بے شک مسلمانوں کے سیاسی خیالات اکثریت کیطرف سے بعض صورتوں میں بجا بے اعتمادی کا حصہ بھی ہے لیکن کوئی شخص جو حالات کو قریب سے دیکھ رہا ہو اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ یہ اصولوں کی لڑائی نہیں شخصیتوں کے جھگڑے ہیں۔ اشخاص کے متعلق رائے دینا بہت ہی مشکل اور پرخطر کام ہے لیکن یہ خواہش ظاہر کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ کاش ان میں سے کوئی شخصیت تو اتنی بڑی ہوتی جو محض ذاتی اقتدار کے خیال سے ارفع ہوکر ان گتھیوں کو سلجھا سکتی۔ کیا اس بات میں مولانا محمد علی اور محمد علی جناح ان توقعات کو پورا کرسکیں گے جو قوم کے ہر بہی خواہ کو اسوقت ان سے ہیں؟

ہم جامعہ کے اس پرچہ کے ساتھ نہرو رپورٹ کا مکمل اردو ترجمہ اس وجہ سے دیتے ہیں کہ ناظرین کرام ہیں کہ وہ اپنی مخالفت یا موافقت کو رپورٹ کی سفارشات کے برے یا اچھے ہونے پر یا اس کے دلائل کے غلط یا صحیح ہونے پر منحصر رکھیں اور اگر ہوسکے تو شخصیتوں کے جھگڑوں سے الگ ہوکر رائے قائم کریں۔

رپورٹ کے مطالعہ اور فہم میں سہولت کے لئے ہم چند سطریں اس کے مطالب کی تقسیم کے متعلق بھی لکھنا چاہتے ہیں۔ اس رپورٹ میں ۴ مباحث خاص توجہ کے مستحق ہیں یعنی ذمہ دار حکومت کا مسئلہ، نوآبادی طرز کی حکومت کا مسئلہ، دیسی ریاستوں کا سوال، اور ہندو مسلم مسئلہ انپر علیحدہ علیحدہ تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں۔ لیکن ناظرین کی سہولت کے لئے چاروں مسائل پر ایک ایک مختصر نوٹ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ انشاءاللہ "جامعہ" کے صفحات میں ان مباحث پر آئندہ مفصل مضامین بھی شائع ہوں گے۔

"اپنی حکومت، اپنے ہاتھوں، اپنے لئے" یہ ذمہ دار حکومت کی تعریف ہے۔ مگر اس طرز حکومت کی تاریخ اگر دیکھی جائے تو وہ کچھ اور ہے۔ اور قومی حکومت کا نصب العین جو امریکہ کے مشہور پریزیڈنٹ لنکن کے مقولہ سے ظاہر ہوتا ہے کچھ اور۔ قرون وسطیٰ میں اکثر بڑے شہروں کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنے شہر میں نمائندوں کے ذریعہ سے حکومت کریں اور انکی منتخب کی ہوئی مجلسوں کو کافی اقتدار بھی تھا لیکن رفتہ رفتہ ان مجلسوں میں نمائندگی کھنچ کر صرف چند رئیس خاندانوں کا حق رہ گیا۔ اور شہر کے باقی باشندوں کی حیثیت صرف رعایا کی سی ہوگئی جس کا آخر میں یہ نتیجہ ہوا کہ شہروں کی آزادی اور ذمہ دار حکومت داپا انقلاب یا بغاوت یا بیرونی حملوں یا شاہی اثر کے ہاتھوں تباہ ہوئیں۔ صرف وینس کی ایسی ریاست تھی جو متعدد صدیوں تک قائم رہ سکی۔

انگلستان میں بھی قرون وسطیٰ میں شہروں کا یہ حق تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن اس کی حیثیت چند

جو ہے بالکل بدل گئی۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بادشاہت کو امراء پر اس وجہ سے فتح حاصل
ہو دی تھی کہ ملک کی حفاظت صرف بادشاہ کر سکتا تھا۔ جزیرہ ہونیکی وجہ سے انگلستان میں بیرونی حملوں کا
یادہ خوف نہ تھا، اور اسی لئے امراء بادشاہ کا بہتر مقابلہ کر سکے۔ کئی بار انہوں نے بادشاہ کو اپنے
حقوق منظور کرنے پر مجبور کیا۔ اور اس پر دباؤ ڈالنے کے لئے اکثر اپنی جماعت میں سے چند نمائندے
مقرر کردیے جو بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے اور تمام مجلسوں اور درباروں میں شریک ہوتے تھے۔
را ء کے خلاف بادشاہوں نے تاجروں اور چھوٹے زمینداروں کو ابھارا۔ اور آخر میں یہ نتیجہ ہوا
ہ بادشاہ۔ امراء اور "عوام کے نمائندے تینوں حاکم بن گئے، اور حکومت کرنے کا حق قانوناً اپنے ذمہ
لے لیا۔ مگر یہ حکومت کسی طرح سے ذمہ وارانہ نہیں تھی اور نہ امراء اور "عوام" کے نمائندے صحیح معنوں
ں "منتخب" ہوتے تھے۔

سترہویں صدی کی civil War نے بادشاہ کے ہاتھ سے حکومت کی باگ چھین
،۔ ۱۶۸۸ کے انقلاب نے جو کچھ حقوق اس کے پاس رہ گئے تھے "عوام" کو بخش دئے، اور اس کے
بعد سے پارلیمنٹری حکومت کا دور شروع ہوگیا۔ مگر پارلیمنٹ کے انتخاب میں عوام کو رائے دینے کا کوئی
موقعہ نہ تھا۔ یہ فخر صرف ایک خاص حیثیت کے زمینداروں اور شہر کے رئیسوں کو حاصل تھا، اور جائداد
ہ کے ساتھ وراثت میں باپ سے بیٹے کو ملتا تھا۔ حکومت بھی صرف اس لحاظ سے ذمہ وار تھی کہ
ینٹ کے اراکین کو وزارتیں بنانے اور بگاڑنے کا حق تھا۔ اس لحاظ سے نہیں کہ عوام کی رائے
ر خواہش کے مطابق حکومت ہوتی تھی۔ ۱۸۳۲ اور ۱۸۶۷ میں رائے دینے والوں کے حلقہ میں
ت توسیع کی گئی، اور تب ہی سے سمجھنا چاہئے کہ حکومت دراصل ذمہ وار بھی ہوئی

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب امریکہ کی نوآبادیوں نے انگلستان کے خلاف بغاوت
تو انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بغیر نمائندگی کا حق دئے کسی قسم کا ٹکس وصول کرنا سیاسی اخلاق کے خلاف
۔ اور انہوں نے لڑ کر انگلستان سے اپنی آزادی حاصل کی۔ نوآبادیوں کی کامیابی اور اسی کے فوراً

بعد فرانسیسی انقلاب نے یورپ کی قوموں کو بیدار کر دیا۔ اور ۱۸۴۸ء تک علاوہ ہسپانیہ اور اطالیہ کے تقریباً تمام ملک ذمہ دار حکومت کسی نہ کسی شکل میں حاصل کر چکے تھے۔

یہ تو ہر جگہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ حکومت کو قوم کی مرضی کے خلاف نہ چلنا چاہئے۔ لیکن یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ حکومت کو کس کے روبرو ذمہ دار ہونا چاہئے۔ اگر انتخاب اکثریت کے مطابق ہوتا ہے تو اقلیت کے حقوق بالکل مارے جاتے ہیں۔ اور اگر اقلیت کا پورا لحاظ کیا جائے تو انتخاب کا مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے انگلستان میں انتخاب بہت سادے اور سلجھے طریقہ پر ہوتا ہے۔ لیکن وہاں اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ جو پارٹی پارلیمنٹ میں اکثریت میں ہوتی ہے اس کے ملک میں موافقین دراصل اقلیت میں ہوتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں نمائندگی صحیح ہوتی ہے مگر ایوانوں میں فریقوں کی تقسیم ایسی بے ڈھنگی ہو جاتی ہے کہ وزارت قائم کرنا دشوار ہوتا ہے، وزارتیں زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتیں اور اگر رہیں بھی تو اپنے ہیئت ترکیبی کی وجہ سے کوئی مستقل پالیسی اختیار نہیں کر سکتیں۔

پھر بھی صبر اور استقلال نے بڑی حد تک ذمہ دار حکومت کی مشکلیں آسان کر دی ہیں۔ لیکن روسی انقلاب نے اس مسئلہ کی ایک اور شکل پیش کی ہے جو موجودہ ذمہ دار حکومتوں کے اصول کے تو بالکل موافق ہے لیکن عملی صورت میں بالکل نہیں بنھ سکتی۔ اگر ذمہ دار حکومت کی بنیاد اکثریت کی رائے پر ہے تو قوم کے اس طبقہ کو جو تعداد میں سب سے زیادہ ہے۔ یعنی مزدور اور کسان حکومت پر بالکل حاوی ہونا چاہئے مزدوروں اور کسانوں کی اکثریت تو ہر ملک میں ہے، اور اگر وہ سب اسی طرح سے ہم آہنگ ہو جائیں جیسے روس کے مزدور اور کسان تو موجودہ ذمہ دار حکومت بالکل ناممکن ہو جائے۔ سرمایہ دار طبقوں کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے، اور وہ اطالیہ کا انقلاب اور Mussolini کی حکومت ہے۔ لیکن وہ اسی قدر کم ذمہ دار ہے جیسے روس میں پرولے تاریات کی حکومت!

نوآبادی درجہ کی حکومت برطانوی سلطنت کی خصوصیت امتیازی ہے اور تاریخ سلطنت برطانیہ کی عظیم الشان کارگزاری ہے۔ حکومت کو تضاد مقاصد پر قائم رکھنے کے بجائے اشتراک اغراض پر قائم کرکے کم و بیش خود مختار قوموں کا ایک جتھا بنا لینا جو دنیا کی تمام طاقتوں پر فرداً فرداً اور اکثر مجموعی حیثیت سے بھی بھاری ہو تدبر برطانوی کا وہ کارنامہ ہے جس پر برطانیہ بجا فخر کرسکتا ہے۔ ایک تمدن رکھنے والے لوگ، اکثر نسلی رشتوں سے وابستہ، مختلف ممالک کے رہنے والے اپنے معاشی اور سیاسی اغراض میں باہمی ایسی ہم آہنگی پیدا کرلیں کہ ایک کے فائدہ میں دوسرے کا فائدہ اور ایک کے نقصان میں دوسرے کا نقصان ہو یا اگر کبھی ایک کو نقصان اٹھانا پڑے تو کبھی دوسرا اس کی خاطر نقصان اٹھالے، ایسا سیاسی تجربہ ہے جس سے انسانیت کے مستقبل کے لئے اچھی راہوں کا تخیل قائم ہوسکتا ہے۔ اور یہی صورت فی الواقع برطانوی سلطنت کے ان اجزائے ترکیبی نے پیدا کرلی ہے جو نوآبادی طرز، کی حکومت رکھتے ہیں۔ نوآبادی طرز کی حکومت رکھنے والے ممالک سلطنت برطانوی کے اندر خود مختار جماعتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سب کا درجہ برابر ہے۔ تاج برطانیہ کی مشترک وفاداری انہیں باہم متحد کرتی ہے۔ اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں یہ ایک دوسرے کے ماتحت نہیں اور آزادی کے ساتھ بحیثیت رکن برطانوی دولت مشترکہ میں شریک ہیں۔

نہرو رپورٹ نے ہندوستان کا دستور اساسی اسی نوآبادی طرز کی حکومت کا نمونہ پر لکھا ہے۔ خود نہرو کمیٹی کے اراکین میں بعض اور ان کے علاوہ انڈین نیشنل کانگریس میں ایک بڑی جماعت اس خیال کی ہے کہ ہندوستان کے لئے نوآبادی طرز حکومت مناسب نہیں۔ ہندوستان اس وقت تک صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہوسکتا جب تک کہ سلطنت برطانیہ سے اس کا تعلق بالکل منقطع نہ ہوجائے۔ دونوں خیال کے حامی اپنی طرف وزنی دلائل رکھتے ہیں۔ ایک طرف نوآبادی طرز کی حکومت اگر دنیا کے آئندہ سیاسی مناقشات کو رفع کرنے اور بین الاقوامی تعاون کی امید دلاتی ہے تو وہاں مختلف تمدنوں کے وجود سے دنیا کی رنگارنگی بھی قائم رہتی ہے [illegible] ممالک کی رونق کا خیال یکسانیت کے خلاف لوگوں کو اکساتا ہے اور ہر قوم بھی مجموعہ دنیا کی فلاح میں بہترین حصہ اسی طرح لے سکتی ہے کہ ان چیزوں کو جن [illegible]

[illegible] جمہوریت اس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ غیر اہل سیاست کو یہ خیالات بہت دور تک [illegible] پہنچا [illegible] سیاست کے مرد اپنی نظر کو بہت دور نہیں جانے دیتے۔ لیکن اس مسئلہ میں اگر یہ دور [illegible] معلوم ہو جائے تو بھی اس کا حل بہت آسان نہیں۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں با [illegible] [illegible] چھوڑ کر بڑا حصہ ایسا ہی ہے جو نوآبادی طرز کی حکومت کو ہندوستان کا مقصود قرار دیتے ہیں۔ تو جہاں برطانوی سیاست کے تلخ تجربوں کے باعث برطانیہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے

سچ یہ ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت ایک علمی سی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ نہ ہم میں اس وقت نوآبادی طرز کی [illegible] لینے کی قوت ہے۔ نہ خود مختاری حاصل کر لینے کی۔ اور نہ یہ کسی دوسرے سے مل سکتی ہے نہ وہ۔ ہاں جب ہندوستان کے لوگ اپنے اندر یہ قوت پیدا کر لیں گے کہ وہ نوآبادی طرز کی حکومت حاصل کر لیں تو اس وقت ان میں وہ قوت بھی ہو گی جو انہیں خود مختاری کا مل لینے کے قابل بنا دے۔ اس وقت سلطنت برطانیہ کے اندر رہنے یا اس سے باہر جانے کا مسئلہ حقیقی سیاست کا ایک مسئلہ ہو گا اور تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان فیصلہ کریگا۔ یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کو اپنی آزادی حاصل کرنے میں برطانوی [illegible] کا جس طرح مقابلہ کرنا ہو گا اور جنگ آزادی کی ابتدائی منزلوں میں ہی جو جو دشواریاں اس پر ڈالی گئی ہیں سب آزاد ہندوستان کو برطانوی تعلق کے توڑنے پر آمادہ کرینگی۔ اور اس وقت غالباً جمہوریت ہند اسی گروہ کے خیالات پر کاربند ہو گی جو اسی وقت سے برطانیہ اور ہندوستان کے اغراض و مقاصد کے [illegible] اور تمدن، مذہب، نسل، سب کے تباین کی بنیاد پر برطانیہ سے علحدگی کو ضروری قرار دیتے ہیں اس کے علاوہ ممکن جانتا ہے کہ خود انگلستان کے اغراض بھی اس کی اجازت دے سکیں کہ وہ ہندوستان [illegible] خاندان سیاسی میں برابر کا رکن بنا لے، ہندوستان کی وسعت، اس کی آبادی، اس کی تجارت صنعت کے غیر محدود امکانات ایسی چیزیں ہیں کہ برطانوی سلطنت میں اس کا [illegible] مساوی ہونا شاید انگلستان اور دوسری نوآبادیوں کو خوشگوار نہ ہو۔ اور جب ہندوستان واقعی [illegible] کی حکومت اور خود مختاری میں انتخاب کرنے کا اہل ہو اس وقت انگلستان [illegible] اس کی [illegible]

اسے خود مختار کر دینا زیادہ پسند کریں لیکن فی الحال اس انقلاب کی صلاحیت پیدا کرنا خود مختاری اور آزادی طرز کی حکومت کے عملی مطالبے سے زیادہ ضروری ہے۔ لیکن زیادہ مشکل بھی!

دیسی ریاستوں کا مسئلہ بھی اپنی نوعیت میں ایک نرالا مسئلہ ہے۔ ہندوستان کی سڑکوں، نہروں ریلوں کے نقشے اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جسم اجتماعی کی یہ رگیں بلا امتیاز برطانوی اور دیسی ریاستوں کے علاقہ میں ہو کر گذرتی ہیں اور صحیح احساس سیاسی رکھنے والے کو اس دن کی خبر دیتی ہیں جب یہ جسم اجتماعی اپنی وحدت کو محسوس کرے گا اور اس کے مختلف علاقے جس میں دیسی ریاستیں بھی شامل ہیں اعضا کی طرح اپنے اپنے وظائف کو پورا کریں گے۔ اُدھر سیاسی اور اخلاقی تخیلات کی رو صاف بتلا رہی ہے کہ اس پر نظم کا نظم کن اصولوں کا پابند ہوگا۔ جہاں ذمہ دار اور نیابتی حکومت کا مطالبہ دنیا کی سب سے زبردست حکومت سے قبول کر سکنے کا حوصلہ ہو اور اخلاقی عالم کی عدالت کے سامنے اس حکومت کو بھی اصولاً اس سے انکار کی مجال نہ ہو اور وہ بطور منزل مقصود اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو۔ وہاں غیر ذمہ دار شخصی حکومت کو یہ امید کہ وہ اپنے کو اسی غیر ذمہ دار حیثیت میں قائم رکھ سکے گی۔ ایک موہوم امید ثابت ہوگی جس میں قانونی موشگافیاں کچھ بہت زیادہ تبدیلی پیدا نہیں کر سکتیں۔ ہاں، قانونی موشگافیاں ایک لازمی نتیجہ کے پیدا ہونے میں رکاوٹ ڈال سکتی ہیں اور تاخیر کا باعث ہو سکتی ہیں، اس لئے کہ رکاوٹ اور تاخیر میں فریق غالب کا فائدہ ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس تاخیر اور رکاوٹ سے برطانوی ہند کے آزادی حاصل کرنے والے عناصر میں تلخی بھی پیدا ہوگی۔ اور دیسی ریاستیں ہندوستان میں ہیں انگلستان میں نہیں۔ برطانیہ کے لئے بیشک یہ نہایت مفید دلیل ہے کہ دیسی ریاستیں اس پر اصرار کریں کہ انکے معاہدے ملک معظم سے ہیں حکومت ہند سے نہیں اور ملک معظم کی حکومت پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنے ان حلیفوں کی حفاظت کے لئے ہندوستان میں تمام ان افواج بری و بحری کے ساتھ مسلط رہے جو اس تحفظ و "ایفاء عہد" کے لئے ضروری ہیں۔ برطانیہ کی پابندی عہد کے متعلق دینا تو زیادہ دھوکہ میں نہیں

البتہ اس موقع پر عہدنامے مقدس اور ناقابل تحریف و تبدیل ہونے کا احساس اختلال پیدا کر سکتا
اور حیلہ قانونی کی آڑ لیکر جائز ہندوستانی مطالبات کے پورا کرنے میں تاخیر کرے گا تو وہ بھی انتہا
کوتاہ اندیشی سے کام لیگا جتنا کہ وہ ہندوستانی جو ہندوستان کی آئندہ حکومت کو اپنے لئے محفوظ رکھنے کی
کوششیں ابھی سے کر رہے ہیں۔

دیسی ریاستوں کیطرف عام ہندوستانی ارباب سیاست کا جو رویہ ہے اس سے بہتر کی خواہش
دیسی ریاستیں نہیں کر سکتیں۔ برطانوی ہند کے ممتاز لوگوں کی پرورش اور مختلف تعلیمی اور خیراتی کاموں
میں ان والیان ریاست سے جو مالی مدد وقتاً فوقتاً ملتی رہی ہے اس کا اثر ہمارے سیاسیین پر محسوس
طریق سے موجود ہے۔ اور قدامت پرستی کا فطری جذبہ یہی چاہتا ہے کہ دیسی ریاستیں قائم رہیں
اور پھلیں پھولیں۔ لیکن قیام اور پھلنے پھولنے کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ایک پردیسی سامراج سے رشتہ
مضبوط کرکے اپنی قوم کے حق آزادی کو بیچ دیا جائے بلکہ اس کی صحیح تدبیر یہ ہے کہ ریاستیں نیا
دنیا کی نئی قوتوں کو سمجھیں۔ اور اپنے نظام میں وہ تبدیلیاں پیدا کریں جنکا پیدا ہونا اس وقت کا سوال
ہے۔ ہم اس موقع پر سر میلکم ہیلی کی اس تقریر سے چند جملے نقل کرتے ہیں جو انہوں نے حال میں
بنارس میں کی تھی۔ والیان ریاست سر میلکم کے مشورہ کو سر لسلی اسکاٹ کی قانونی بحثوں پر ترجیح
دیں تو انکے مستقبل کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

سر میلکم نے ٹھیک کہا کہ "دیسی ریاستوں کی حیثیت کا مدار عہد ناموں کی تاویلوں یا دستور کی
دفعات پر اس قدر نہ ہوگا جتنا کہ اس ترقی پر جو وہ اپنے حکمرانوں کے تحت میں کر سکینگی اور ترقی پذیر
ہندوستان کے ساتھ ملکر کام کر سکنے کی صلاحیت پر۔ یہ لابد ہے۔ کیونکہ قوموں اور ریاستوں کے
معاملات میں واقعات کی منطق اور زندگی کی محرک قوتیں بالآخر زیادہ فیصلہ کن اثر رکھتی ہیں اور معاہدوں
کے الفاظ اور دستور کے دفعات کم!

نہرو رپورٹ میں مندرجہ بالا مباحث اس لئے ہیں کہ دستور بنانے کے سلسلہ میں ...

تھا لیکن یہ وہ مسائل نہیں ہیں کہ پہلے تصفیہ ہندوستان کی آزادی حاصل کرنیکے لئے ضروری ہو۔ اہم مسئلوں کا مسئلہ ہندو مسلم مسئلہ ہے۔ اور دراصل اسی گتھی کے سلجھانے کیلئے کوششوں کا جو سلسلہ عرصے سے جاری تھا فی الحال نہرو رپورٹ اس کی آخری کڑی ہے۔ نہرو رپورٹ کی سب سے بڑی خدمت اس باب میں یہ ہے کہ اس نے ثابت کر دیا ہے اور جہانتک ہمارا علم ہے اس ثبوت کو معقول طریق پر ابتک رد نہیں کیا جا سکا کہ ایک جمہوری نیابتی نظام حکومت کے قیام سے مسلمانوں کو بہ حیثیت ملک کی سب سے زیادہ با اثر اقلیت کے نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہئے۔ انکے لئے جہاں وہ بہت چھوٹی اقلیت میں مجالس قانون ساز میں نشستیں محفوظ ہوں لیکن آبادی کے تناسب سے جہاں وہ اکثریت میں ہیں وہاں اس قسم کے تحفظ نشست کی کوئی ضرورت نہیں۔ سندھ کی علیحدگی کے متعلق مسلمانوں کا مطالبہ کمیٹی نے منظور کیا ہے۔ اور مذہبی معاملات کو اکثریت کی مداخلت سے محفوظ کرنے کے لئے حقوق بنیادی میں یہ دفعہ شامل کر دی ہے کہ ہر ہندوستانی کو ضمیر کی آزادی اور مذہب کی اقرار اور اس پر عمل کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

ہمارا گمان ہے کہ نہرو کمیٹی کے مصنفین اور موافقین نے ہر وقت مسلمان رہنماؤں کو اپنی سفارشات کے غیر جانبدار ہونے کا یقین شخصی تشریح و توضیح سے نہیں دلایا۔ اور اس شخصی تغافل نے اکثر مسلمان رہنماؤں پر وہ اثر ڈالا جو کاش نہ پڑتا لیکن جن کا پڑنا سمجھ میں آتا ہے۔ مسلمان اقلیت میں ہیں اور بدقسمتی سے پچھلے چند سال سے ان میں اپنی مظلومیت کا مرثیہ پڑھنا فیشن ہو گیا ہے۔ وہ اگر بھڑ رہے ہیں تو اکثریت کا فرض ہے کہ انکے بیجا جذبات تک کا پاس کرے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اگر مسلمان رہنماؤں کے سامنے نہرو رپورٹ کی سفارشات کو رکھنے میں زیادہ شخصی اخلاق اور نرمی سے کام لیا جاتا تو مسلمانوں کی طرف سے مخالفت کی یہ نوعیت نہ ہوتی جو اس وقت نظر آ رہی ہے۔ رپورٹ کے مسلمان مخالفین کی تقریروں اور تحریروں کو غور سے پڑھئے تو پنڈت موتی لال کے "غرور" و "تمرد" کا ذکر زیادہ ہوگا اور سفارشات کے غلط یا نامعقول ہونے کا کم۔

بہر حال اس وقت مسلمانوں کی ایک کافی بااثر جماعت نہرو کمیٹی کی سفارشات کی مخالفت کر رہی ہے۔ افسوس کہ یہ مخالفت شخصی بنیاد پر ہونے کی وجہ سے اکثر نامعقول ہو جاتی ہے۔ اور اپنے مطالبات کو صحیح اور موثر طریق پر پیش نہیں کر سکتی اگر حشو و زوائد سے مسلمان مخالفت کو پاک کیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کا یہ طبقہ نہرو رپورٹ میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں چاہتا ہے:-

۱- پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں انکے لئے قانون ساز مجالس میں نشستیں محفوظ ہونی چاہئیں۔

۲- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو کم سے کم ⅓ نشستیں دی جائیں۔

۳- مرکزی حکومت کے اختیارات میں تخفیف اور صوبہ کی حکومتوں کے اختیارات میں اضافہ ہونا چاہئے۔

ان مخالفوں کے علاوہ ہندو مسلمانوں کا ایک طبقہ وہ ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج چاہتا ہے اور وہ ظاہر ہے کہ نہایت شدت سے اس رپورٹ کا مخالف ہے البتہ اس وقت اپنی مخالفت میں مدد مسلمانوں کے اس طبقۂ احرار سے بھی لے رہا ہے جن کے ساتھ اسکا اشتراک عمل اب تک ایک ناممکن سی شے سمجھی جاتی تھی۔

اس آخری طبقہ کے ساتھ دلیل یا بحث بیکار ہے۔ اس لئے کہ وہاں مقاصد کا بنیادی اختلاف ہے۔ البتہ دوسرے گروہ کی مخالفت پر نئی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کو ضرور غور کرنا چاہئے۔

ہماری رائے میں مرکزی حکومت کے اختیارات میں کمی اور صوبہ کی حکومتوں کے اختیارات میں اضافہ کا مطالبہ بالکل صحیح مطالبہ ہے اور کمیٹی کو معقول حد تک اسے ضرور منظور کرنا چاہئے۔

مرکزی جماعت قانون ساز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نشستیں محفوظ ہونے کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ اگر فرض کیا جاتا ہے کہ رائے ہمیشہ فرقہ وارانہ اصولوں پر دی جائیگی تو پھر مسلمانوں کی ایک تہائی کی قلیت بھی اتنی ہی غیر موثر ہوگی جتنی ایک چوتھائی کی اور اچھا ہوتا کہ مسلمان اہل سیاست اس ظاہری لیکن بے سود رعایت کے لئے اتنا زور نہ دیتے۔ لیکن اگر مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دینے سے پنجاب

یہ سکھ صوبہ میں اپنے لئے آبادی کی نسبت سے زیادہ نشستوں کے تحفظ کا مطالبہ نہ کرتے مگر تو ہم سمجھتے ہیں کہ آل پارٹیز کانفرنس کو مسلمانوں کے اس مطالبہ کو بھی اس لئے مان لینا چاہئے کہ ایک ہی جماعت کا مطالبہ ہے جس کے تعاون بغیر ہندوستان میں آزادی کا خیال نہ صرف محال ہی سمجھا جاتا ہے اگر کسی وجہ سے اکثریت پر ابھی پورا بھروسہ نہیں تو قابل معافی ہے۔

پنجاب اور بنگال میں نشستوں کے تحفظ کا مطالبہ بالکل بے معنی اور مسلمانوں کی شان کے منافی ہے۔ نہرو کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کافی وضاحت کے ساتھ یہ بات ظاہر کی ہے کہ تحفظ نشست کے بغیر پنجاب اور بنگال میں مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس امکان اور اس قوی احتمال سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن مسلمان معترضین کہتے ہیں کہ ہم کمزور ہیں، مقروض ہیں، غیر منظم اور پراگندہ ہیں، ہم اپنی آبادی کی نسبت سے مقابلہ میں نشستیں کیسے جیت سکتے ہیں۔ ہمیں وقت دو کہ ہم مضبوط ہو جائیں۔ قرض چکالیں، تنظیم کرلیں۔ پھر ہمیں تحفظ کی ضرورت نہ ہوگی۔ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ہم اس مطالبہ کو بہت مضر سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کو محض انکی کمزوری کے صدقہ میں جو حقوق دئے جاتے رہے ان سے انکی ترقی اور بیداری میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوئی اور یہی حالت اس صورت میں ہوگا۔ اگر کمزور ہونے، مقروض ہونے اور غیر منظم ہونے کے باوجود مسلمانوں کو اپنی نشستیں مل جائیں تو پھر وہ کیوں صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرینگے؟ اپنی کمزوری، عدم تنظیم کے خمیازہ ہمیں اٹھانا چاہئے تاکہ ہم ان سے نجات پانے کی تدبیریں نکالیں۔ اور اگر کچھ عرصہ پنجاب اور بنگال میں مسلمان کچھ نقصان اٹھا کر بھی اپنی قوت کو مجتمع اور منظم کر سکیں تو وہ نقصان فائدہ کی بہت ارزاں قیمت ثابت ہوگا جس کے ادا کرنے کے لئے دور اندیش مسلمانوں کو تیار رہنا چاہئے۔ آخر میں ہم مسلمانوں سے ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ خاص مراعات اور اقلیتی حیثیت کی بنا پر مخصوص حقوق کا مطالبہ نہ کرنا ہی ضروری اور حقیقی اعتبار سے مفید معلوم ہوتا ہے۔ اصل مسلمانوں کے مستقبل کو بگاڑنے کی یقینی تدبیر ہے۔ مسلمانوں کو اگر جمہوری آزاد ہندوستان میں فائدہ جو مقام ملنا ہے تو انہیں آزاد مقابلہ کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔ اقلیت کی حیثیت سے ہونے

مناسب نہیں جانتے یا یہ لحاظ کا ذکر ہی نہ آنا چاہئے۔ ان کا مستقبل اس سے درست نہیں ہو سکتا ... زیادہ سے زیادہ اپنی تعداد کی نسبت سے آزادی کی برکات میں حصہ لے سکیں ... کم ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان اپنی آبادی کی نسبت سے زیادہ آزاد ہندوستان کے لئے مفید ہو سکتے ہیں اور اسلئے آزادی کے برکات میں آبادی کے تناسب سے زیادہ کے مستحق قرار دئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت جب حصول آزادی کی کشمکش میں اپنی تمام صلاحیتوں کو کام ... اور حصول آزادی کے بعد اس کے قیام میں اپنی تمام ذہنی اور جسمانی، جمالی اور جلالی قوتوں کو ... کریں۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہونا چاہئے کہ ہمیں ہماری صلاحیت کے مطابق ملے۔ ہماری خدمت ... زیادہ کی نسبت سے ملے۔ اور انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ملتا قوموں کو وہی ہے جس کی وہ اہل ہوتی ہیں ... کمزور ہیں تو اپنی کمزوری کو رفع کریں۔ جاہل ہیں تو تعلیم کے لئے اوروں سے زیادہ کوشش ... غریب ہیں تو اسراف کو روکیں۔ مقروض ہیں تو اتحادی بنکوں میں اوروں سے زیادہ دلچسپی لیں۔ آزادی کا ملنا کھیل نہیں اور اس کے لئے کوشش کئے بغیر اس میں سانجھی بننا بھی ناممکن ہے۔ کاش مسلمانوں کی قوت اپنی خیالی عظمت کو تسلیم کرانے کی لاحاصل اور بے وزن کوششوں میں صرف ... ہونے کی جگہ اس عظمت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں صرف ہو۔ اس لئے کہ جب تک یہ بنیادیں مضبوط نہ ہوں تب تک دستور اساسی کے مسودہ میں چاہے مسلمانوں کو کچھ بھی ملجائے لیکن حقیقت میں وہ وہی ... رہیں گے جو ہیں۔ اور ہمارے یہ اعلانات کہ وہ ہندوؤں سے بھی رہ کر حق لیں گے اور انگریزوں کو بھی ... سے نکال باہر کریں گے، شیخیاں ہیں جن پر دشمن ہنستے ہیں اور دوست روتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ۔ ڈی

جلد ۱۱	بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

ضیاءُ الدین برنی
مصنف تاریخ فیروز شاہی

سالہا سال سے میں ہندوستان کے سب سے پہلے ہندوستانی مورخ اور اپنے ہم وطن بزرگ
ضیاءُ الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حالات زندگی اور اُسکی کتاب پر تبصرہ۔
کا ارادہ رکھتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اُس کی کتاب کا مطالعہ بہ زمانہ طالب علمی ۱۹۱۴ء ۱۵
میں کیا تھا۔ جبکہ میں نے انگریزی زبان میں علیگڈھ کالج کی "انجمن تاریخی" Historical
Society کے لیے ایک انعامی مضمون "مغلوں سے پہلے مسلمان سلاطین دہلی۔
نظام حکومت" کے متعلق لکھا تھا۔ مطالعہ کے دوران میں کچھ معلومات اس مورخ کے متع
بھی فراہم ہو گئیں۔ اس کے بعد جب میں دفتر مسلم یونیورسٹی دو دفتر کلیات امیر خسرو کا
مواد تو خسرو کی بعض کتابوں پر تنقید لکھنے اور خسرو کی سوانح عمری تیار کرنیکے خیال سے علا
دیگر تصانیف کے تاریخ فیروز شاہی بھی کئی برس زیر مطالعہ اور پیش نظر رہی۔ اس مطالعہ ا
تحقیقات کی بدولت میرے پاس خسرو، اُس کے معاصرین اور اُسکے دور کے متعلق ایک
معلومات اور تاریخی مواد کا انبار فراہم ہو گیا۔ جو ابھی تک زیادہ تر مسودوں کی شکل میں
ہوا ہے۔ بالآخر اُس اسکیم نے اسلامی تاریخ ہند کے اس مخصوص دور کی جامع تاریخ کی شکل
کر لی جسکا سیاسی مرکز علاء الدین خلجی کا عہد اور علمی و ادبی مرکز خسرو کی زندگی ہے۔ جوں جوں
گزرتا جاتا ہے میری آرزو بڑھتی جاتی ہے کہ وہ مواد جو کئی برس کی لگاتار محنت سے
اور غیر مطبوعہ تاریخی و ادبی ماخذ سے حاصل کیا گیا ہے مرتب شکل میں آجائے۔ میں نہیں کہ
کہ میری یہ تمنا کب پوری ہو سکے گی۔ دس گیارہ برس سے وکالت کے مشاغل نے مجھ

بیت اور دماغ کو فرسودہ و درماندہ کر دیا ہے اور قلم بھی بہت کچھ اپنی جولانیوں کو بھول چکا ہے
حال ہی میں میں نے اس اخبار پر نظر ڈالی تو ارادہ ہوا کہ اس سے استفادہ کر کے کوئی
ضمون لکھا جائے۔ غور کرنے کے بعد "ضیاء الدین برنی" کو انتخاب کیا کہ دلی تعلق سے خسرو
کے معاصرین میں مقدم حق اسی مصنف کا ہے۔ ارادہ تو صرف ایک مختصر مضمون لکھنے کا تھا
یکن قلم ہاتھ میں لینے کے بعد یہ گوارا نہ ہوا کہ اپنے معیار کی رو سے مضمون کو تشنہ یا نامکمل چھوڑ دیا
لئے ایک ہی مبحث پر بار بار مطالعہ اور خامہ فرسائی کرنا بالعموم دشوار ہوتا ہے۔ میں نے بھی
ہی چاہا کہ ضیائے برنی کے متعلق جو کچھ لکھنا ہے (بجز اُن مخصوص مباحث کے جو موجودہ
ضمون کے لئے زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوئے اور جنکی تصریح موقع پر کر دی گئی ہے) وہ
ب ایک مرتبہ حوالہ قلم کر دیا جائے تاکہ یہ مطالعہ ایک حد تک مکمل ہو جائے۔

ہندوستان کی تاریخ وسیع اور جامع نقطۂ نظر سے لکھی جانی باقی ہے۔ اسی سلسلہ میں
رے قدیم مورخین کی قدر و قیمت کا منصفانہ اندازہ از سر نو کرنا ناگزیر ہے۔ علمی اور تاریخی تنقید
رقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچی ہے، اگرچہ ہماری نادار زبان اُن میدانوں سے ابھی بہت دور ہے
ضیائے برنی کے لئے میں دلی تعلق سے خاص محبت رکھتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اسکے حالات
ر اسکی کتاب کی تنقید جو عرصہ سے لکھنا چاہتا تھا اس وقت مکمل کر دی ہے۔ اس تعلق خاطر کے باوجود
مجھے اس مصنف سے ہے میں نے اس کی تصنیف کو ایک غیر جانبدار نقاد کی حیثیت
ے جانچنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس کے نقائص کے ظاہر کرنے میں کوئی
س و پیش نہیں کیا ہے نہ اس کے محاسن بتلانے میں کوئی کوتاہی کی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے دیانت
یش نظر رکھا ہے کہ مورخ کا سب سے پہلا اور سب سے آخیر اور سب سے بڑا فرض راستبازی اور
صاف پسندی ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں غلطی کی ہو ناظرین اسے معاف فرما دیں۔

اس مضمون میں اکثر تاریخ فیروز شاہی کے حوالے دیئے گئے ہیں، اختصار کے
ن سے کتاب کا نام بار بار نہیں لکھا گیا ہے حوالجات بلا قید کتاب صرف بقید صفحات

ہیں وہ اسی کتاب ہے ہیں۔

تاریخ فیروز شاہی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے ۱۸۶۲ء میں باہتمام سرسید احمد خاں مرحوم شائع کی تھی۔ اُسکا متن کسی صحیح نسخہ پر مبنی نہیں ہے اور اُس میں بہت زیادہ غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ مختلف نسخوں سے مقابلہ کے بعد ایک مستند متن تمہید تعلیقات اور فہرستہائے اعلام وغیرہ کے ساتھ شائع کیا جائے

(سید حسن برنی)

ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی ہندوستان کا پہلا ہندوستانی مورخ ہے(۱)۔ ہندوستان میں تاریخ کا فن مسلمانوں کے ساتھ آیا۔ ضیائے برنی سے پہلے دو اور مورخ ہوئے ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ لکھی ایسی ہے ایک کا نام صدر الدین محمد بن حسن نظامی نیشاپوری ہے۔ جو قطب الدین ایبک کے زمانہ میں ہندوستان میں آیا اور ۶۰۲ھ کے قریب زمانہ میں اُس نے اپنی کتاب تاج المآثر تصنیف کی جس میں غوریوں اور اُنکے جانشین سلاطین دہلی کے فتوحات التمش کے عہد تک درج ہیں۔ اُس کے بعد ابو عمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین الجوزجانی ہوا، جس نے سلطان ناصر الدین محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ایک عام تاریخ لکھی جس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کا حال بھی ۶۵۸ھ (۱۲۵۹-۶۰ء) تک درج کیا۔ یہ دونوں مورخ جیسا کہ اُنکے ناموں سے بھی ظاہر ہے ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ باہر سے آئے تھے۔

حسن نظامی اور منہاج سے بھی پہلے غزنویوں کے دور میں ہندوستان کے متعلق جن مورخوں نے

---

(۱) برنی سے پہلے بعض مصنفین و شعرا (مثلاً امیر خسرو) نے جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے بعض ایسی کتابیں لکھی تھیں جن سے تاریخی معلومات دستیاب ہوتی ہیں، لیکن ان مصنفین اور شعراء کا نقطہ نظر ادب اور انشاپردازی ہے نہ کہ فی الواقع تاریخ۔ اس لحاظ سے بعض اوقات یہ کتابیں تاریخی تحقیقات کے لئے ناگزیر اور نہایت بیش قیمت ثابت ہوتی ہیں لیکن انہیں باضابطہ کتب تاریخ کہنا جائز نہیں۔ امیر خسرو کی تصانیف نظم و نثر بالخصوص قیمتی تاریخی معلومات سے مملو ہیں لیکن اُنکا انداز بیان بھی شاعرانہ و ادیبانہ ہے۔

یلکھا تھا، وہ بھی ہندوستان کے نہ تھے۔ ابوریحان البیرونی(۱) (متوفی ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء) صاحب کتاب الہند
رابوالفضل بیہقی (متوفی ۴۷۰ھ / ۱۰۷۷ء) صاحب تاریخ بیہقی (یا مجلدات بیہقی) اور ابونصر عتبی (متوفی
۴۲۰ھ / ۱۰۲۹-۳۰ء) صاحب تاریخ یمینی وسط ایشیا کے رہنے والے تھے، اور گو ان مورخین کا تعلق
ہدوستان کی تاریخ سے بھی ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح ہندوستانی مورخ کہلائے جانے کے
تحق نہیں ہیں۔

ضیائے برنی، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے برن میں پیدا ہوا تھا جو ہمارے زمانہ میں
ند شہر کہلاتا ہے اور دوآب میں میرٹھ اور علیگڑھ کے مابین واقع ہے۔ آثار قدیمہ سے جو زمین کے
نیچے سے برآمد ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام اس زمانہ سے جبکہ بودھوں کو ہندوستان میں اقتدار
ر عروج حاصل تھا آباد ہے۔ البیرونی نے کتاب الہند میں برن کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ قرب وجوار
ے بعض مقامات کا ذکر موجود ہے۔ عتبی نے ۴۰۹ھ / ۱۰۱۸-۱۹ء کے واقعات میں محمود غزنوی کے ہاتھوں
ب قلعہ کی فتح کا تذکرہ کیا ہے جس کا تلفظ مشتبہ ہے، لیکن بعض بعض محققین (مثلاً سر ہنری ایلیٹ(۲) Sir ... H. Elliot) نے برز پڑھا ہے اور محل وقوع کے لحاظ سے برن سے مطابق ہوتا ہے۔ عتبی کے بیان سے معلوم
وتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ مقام ایک ہندو ریاست کی راجدھانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعد کے زمانے میں محمد غوری
ی فتوحات کے وقت برن کا قلعہ دوآب کے مضبوط قلعوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور راجہ بھیم سین ڈوڈ کا دار الحکومت
ا۔ یہ قلعہ خود محمد غوری کے ہاتھوں فتح ہوا۔ ہمارے پاس اصلی فرمان، بطغرائے "ابوالمظفر سلطان محمد بن سام
صر امیر المومنین" محفوظ ہے جس میں اس قلعہ کی فتح اور انتظامات مابعد کے حالات درج ہیں۔ انشاء اللہ کسی
فت اس بے نظیر شاہی فرمان کا عکس اور اس پر تبصرہ ناظرین کی خدمت میں پیش کریں گے۔ طبقات ناصری

---

(۱) البیرونی کے حالات اور اس کی تصانیف کی مفصل تنقید کے لئے دیکھو ہماری کتاب "البیرونی" مطبوعہ انجمن ترقی اردو
طبع دوم ۱۹۲۷ء

(۲) دیکھو تاریخ ہند مرتبہ ایلیٹ وڈاوسن جلد دوم صفحہ ۴۲

میں بھی برن کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ سلطان شمس الدین التمش بھی تخت نشینی سے پہلے برن کا عامل رہا تھا، چنانچہ اُس کے زمانہ کے کچھ ٹوٹے پھوٹے کتبے جن کا خط قطب مینار اور مسجد قوۃ الاسلام کے کتبات کے خط سے ملتا ہے ابتک بلندشہر کی عیدگاہ میں نصب ہیں۔

برن کی فتح کے بعد حسب معمول چند شریف خاندان جن سے اُس زمانہ میں زیادہ تر شیوخ و سادات سے مراد ہوتی تھی اس مقام پر آباد ہوئے جنہیں مختلف مناصب اور عہدے دئے گئے۔ ان میں بعض خاندان اور اُنکے نسب نامے ہمارے زمانہ تک محفوظ ہیں۔

ضیائے برنی نے اپنی تاریخ میں کہیں کہیں ضمناً اپنا اور اپنے خاندان کا ذکر کیا ہے۔ گو ان بیانات سے اُس کے اور اُس کے خاندان کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، لیکن اکثر وہ مزید تصریحات کے محتاج ہیں، اُس کے معاصرین میں یا یہ کہنا چاہئے کہ اُن مصنفین میں جو اُسے ذاتی طور پر جانتے تھے سید محمد مبارک العلوی الکرمانی یا میر خورد صاحب سیر الاولیا ہیں جس نے اپنی کتاب میں خواجگان چشت بالخصوص شیخ نظام الدین اور شیخ کے مریدین و معتقدین کے حالات لکھے ہیں۔ اُس نے ضیائے برنی کا بھی تذکرہ بحیثیت شیخ کے یاران اعلیٰ کے درج کتاب کیا ہے جس سے بعض مفید معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ بعد کے مصنفین (مثلاً شیخ عبدالحق صاحب اخبار الاخیار) نے اسی تذکرہ سے ضیائے برنی کے حالات لئے ہیں۔ لیکن امیر خورد بھی اُس کے خاندان کے متعلق بجز اس کے کہ ضیائے برنی کا باپ ایک معزز خاندان (دودمان بزرگ) سے تھا اور کچھ نہیں بتاتا (دیکھو سیر الاولیا مطبوعہ مطبع محب ہند دہلی ۱۳۰۲ھ صفحہ ۳۱۲) ایسی حالت میں باوجود انتہائی کوشش کے ہم اس بات کو ثابت نہیں کر سکتے کہ ضیائے برنی کا اُن شریف خاندانوں میں سے جو محمد غوری کی فتح کے بعد برن میں آباد ہوئے کس خاندان سے تعلق تھا اور اُس کے آبا و اجداد برن میں کہاں سے آئے اور کس سنہ میں آباد ہوئے۔

ایک بات ضیائے برنی کے بیانات سے ثابت ہے کہ اُسکا جدی سلسلہ سادات سے تعلق نہیں رکھتا لیکن اُس کی ماں اور دادی سیدانیاں تھیں۔ یہ بھی ثابت ہے کہ اُسکا خاندان نہایت معزز خاندان تھا اور اگرچہ اس کی تصریح نہیں پائی جاتی، لیکن اس خیال سے کہ ماں اور دادی سیدانیاں تھیں ہمارا یقین ہے کہ وہ

شیخ تھا۔

ضیائے برنی نے اپنے دادا کا نام نہیں لکھا ہے لیکن یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ وزرائے شاہی میں شمار ہوتا
ا۔ ایک موقع پر سلطان علاءالدین خلجی نے ضیائے برنی کے چچا علاءالملک کو اپنے امرا کے سامنے "وزیرزادہ"
یان کیا ہے (صفحہ ۲۵۷) اور خود ضیائے برنی اپنے باپ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"پدر ایں ضعیف شریف بود" (صفحہ ۳۵۰)

ضیائے برنی کے باپ کا نام مویدالملک تھا، جو فی الواقع اصلی نام نہیں بلکہ شاہی خطاب معلوم ہوتا ہے
ی طرح مویدالملک کا ایک بھائی علاءالملک تھا، جس نے علاءالدین خلجی کے زمانہ میں بڑا عروج حاصل کیا۔ مویدالملک
ر علاءالملک کا نانا سپہ سالار حسام الملک تھا، جو بلبن کے عہد میں ابتدائً وکیل دربار یک سلطانی کے عہدہ پر
ز تھا (صفحہ ۴۱) اور بعد میں فتح بنگال کے وقت سلطان بلبن نے بنگال کے دارالسلطنت لکھنوتی کی شحنگی
س کے سپرد کر دی تھی۔ خود بلبن لشکر کشی کے لئے آگے بڑھ گیا اور حسام الملک کو ہدایت کر گیا کہ دہلی کے حالات اور
وک وامرائے دہلی کی عرضداشتیں وصول کر کے بادشاہ کے پاس بھیجتا رہے (صفحہ ۸۷)

ضیائے برنی کی ماں سید جلال الدین کیتھلی کی بیٹی تھی۔ اُس زمانہ میں کیتھل (واقع ضلع کرنال پنجاب)
کے سادات بڑے مستند سمجھے جاتے تھے۔ ضیائے برنی لکھتا ہے:۔

"وبزرگی سادات کیتھل وصحت نسب ایشاں ازشاہیواست۔ وپدر مولف بنیۂ دختری سید
جلال الدین کیتھلی است۔ وسید جلال الدین از عظام وکرام سادات کیتھل بودہ است۔ وپدر ایں
ضعیف شریف بود، وجدۂ ایں ضعیف سیدہ صاحبۂ کشف وکرامت بودہ است، وچندیں کشف
راکرامت در مشاہدہ شدہ" (صفحہ ۳۵۰)

ضیائے برنی کا باپ مویدالملک ابتدائً جلال الدین خلجی کے عہد میں اُس کے منجھلے بیٹے ارکلی خاں کا
ب تھا، اور ضیائے برنی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیائے برنی کی طفولیت کا زمانہ سن شعور سے
ہلی میں گذرا۔ اُس کا باپ کیلوکھری میں، جو شہر نو بھی کہلاتا تھا اور اُس نواح میں واقع تھا جہاں آج کل
یوں کا مقبرہ ہے، ایک عالیشان مکان میں رہتا تھا۔ معزالدین کیقباد نے اپنے زمانہ میں ایک خوشنما محل

تعمیر کیا تھا، جو کیلوکھری میں واقع تھا اور جلال الدین خلجی نے کیلوکھری کو اپنا پایۂ تخت قرار دے رکھا تھا جس کی
وجہ سے وہ روز افزوں آبادی اور رونق پر تھا۔ درباری تعلق کے باعث موید الملک نے بھی اپنا مکان کیلوکھری
میں بنا رکھا تھا۔ ضیائے برنی لکھتا ہے :-

" و چنکہ مولف ام در عہد جلالی پدرم نائب ارکلی خاں بود و خانہ در کلوکھری پس طبند و رفیع بآوردہ
من از انجا با استادان و رفیقاں بزیارت سیدی مولہ می آدم " (صفحہ ۲۰۹)

عہد جلالی میں ضیائے برنی کا چچا علاء الملک، علاء الدین خلجی کے مصاحبین و معتمدین خاص میں سے تھا
چنانچہ جب علاء الدین دکن کی سب سے پہلی مہم فتح دیوگیر کے لئے اپنے صدر مقام کڑہ سے روانہ ہوا، تو کڑہ ا
اودھ کا تمام انتظام علاء الملک کے ہاتھ میں دے گیا۔

" در غیبت خود نیابت کڑہ و اودہ بعم مولف ملک علاء الملک کہ از مختصان او بود تفویض کرد
(صفحہ ۲۲۲)

جلال الدین خلجی کے قتل میں علاء الدین کے ساتھ علاوہ اُس کے چند دیگر مصاحبین خاص کے
بھی شریک تھا۔ تخت نشینی کے بعد علاء الدین نے علاء الملک اور موید الملک کو اعلیٰ مناصب دئے۔ موید ا
کا عامل مقرر ہوا (صفحہ ۲۴۸) اور علاء الملک کو کڑہ سے بلا کر دہلی کا کوتوال مقرر کیا گیا (صفحہ ۲۴۹ - ۵۰
علاء الملک نہایت موٹا تازہ آدمی تھا۔ فربہی کی وجہ سے علاء الدین نے اُسے وزارت نہیں دی لیکن اپنے
ا در مصاحبین میں اُسکی بڑی عزت کرتا اور اس کے مشوروں کو خاص وقعت دیتا تھا۔ بعض اوقات
مشوروں کو اپنے بڑے سے بڑے ارادہ کو تبدیل کر دیتا تھا۔ علاء الملک بھی ہمیشہ صاف گوئی اور جرأت سے
تھا۔ ضیائے برنی نے لکھا ہے کہ اپنے ابتدائے عہد سلطنت میں علاء الدین بعض عجیب و غریب خیالات ا
میں قائم کئے ہوئے تھا، جن کا وہ اپنے امراء و مصاحبین کے روبرو اظہار کیا کرتا تھا لیکن اُس کے خوف
اس کے خیالات کی تردید یا اصلاح کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ وہ نبوت کا دعویٰ کرنے اور سکندر
عالمگیر فتوحات حاصل کرنے کا خیال رکھتا تھا۔ علاء الملک نے نہایت دلیری کے ساتھ متنبہ کر کے اُسے ا
عمل اور فاسد خیالات سے باز رکھا۔ اور اُسکی توجہ ہندوستان کے ملکی اور فوجی انتظامات و اصلاحا

مائل کی (صفحہ ۲۶۲ - ۲۶۷)

علاء الدین اکثر افسوس کیا کرتا تھا کہ فرہی کی وجہ سے علاء الملک کو وزارت نہیں ملی۔ ایک موقع پر جبکہ مغلوں نے ہندوستان پر لشکر کشی کرکے دہلی کو آگھیرا تھا اور بڑا ہنگامہ برپا تھا اور ہندوستان کی اسلامی سلطنت معرض خطر میں تھی، علاء الملک نے علاء الدین کو بذات خود فوج کی سپہ سالاری کرنے سے منع کیا۔ علاء الدین جوکہ اول درجہ کا سپاہی اور بہادری اور سخت دلی میں دنیا کے معدودے چند انسانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، علاء الملک کی اس نصیحت پر عامل نہیں ہوا۔ باوجود اس کے اس نے علاء الملک کی خیرخواہی کا احسان مندی کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے اپنے امرا کو مخاطب کرکے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علاء الملک کی کس قدر عزت کرتا تھا:۔

"شما می دانید کہ علاء الملک وزیر و وزیرزادہ است و مارا بندۂ مخلص و ہواخواہ است و از ایام ملکی الی یومنا ہٰذا پیش ما رائے زنی کردہ است و ما بسبب فرہی او را کوتوالی دادہ ایم والا حق او وزارت است" (صفحہ ۲۵۹)

اخیر میں علاء الملک کو مخاطب کرکے کہا:۔

"تو مرد نویسندہ و نویسندہ زادہ۔ ہر آئینہ در دل تو از نیہا گذرد کہ پیش من گفتی ..... فاما ایں حالتی پیش آمدہ است کہ عقل را در گوشہ می باید نہاد، و جز خونریزی و خون ریختن و از سرِ جان خود برخاستن و تیغہا برہنہ کردن و با خصماں درآویختن کارے و اندیشۂ دیگر نمی باید کرد" (صفحہ ۲۵۹)

اس معارکۂ عظیم کے لئے روانہ ہوتے وقت علاء الدین نے دارالملک دہلی اور اپنے عیال و اطفال کو علاء الملک کے سپرد کیا:۔

"در آن ایام عم صاحب ملک علاء الملک کہ از مختصان و رائے زنان سلطان علاء الدین بود و کوتوالی دارالملک دہلی داشت سلطان شہر و حرم و خزاین با او سپردہ بود و بقصد جنگ از شہر بیرون آمد ..... (صفحہ ۲۵۴)

یہ بات بتحقیق معلوم نہیں ہوتی کہ مویدالملک اور علاءالملک کا انتقال کس سنہ میں ہوا لیکن عہد علائی کے مابعد کے واقعات میں ان دونوں کا ذکر نہیں پایا جاتا، البتہ یہ ثابت ہے کہ علاءالملک کا عہد علائی کے ابتدائی تین چار برس کے اندر ہی انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ ضیائے برنی لکھتا ہے:-

"والغ خاں و نصرت خاں و ظفر خاں و الپ خاں و ملک علاءالملک عم مولف و ملک فخرالدین خوداد و ملک اصغری سردوا ندار و ملک تاج الدین کافوری کہ عمدۂ مملکت علائی بودند و ہریکے در پرداخت امور عظام ملکی نظیر خود نداشتند و از روئے ظاہر بنیش آدمی زاد ایشاں در قتل و فریب سلطان جلال الدین باعث و یار بودند لاجرم از ملک علائی برخورداری نیافتند و برسہ گان و چہارگان سال خرامیدند۔ فاما ایشاں در کارگذاری و کاردانی از آنہا بودند کہ بیک لگام زیر ایشاں ملکے و اقلیمے بدست آید و بیک رائے و رویت ایشاں فتنۂ حادث گشتہ مندفع گردد" (صفحہ ۳۳۶ - ۳۳۷)

ضیاءالدین برنی نے اپنی تاریخ ولادت کسی جگہ بیان نہیں کی، نہ میر خورد یا کسی اور تذکرہ نویس نے لکھی ہے۔ البتہ ضیائے برنی نے فیروز شاہی کی تصنیف کے وقت اپنی عمر ۷۴ سال بتائی ہے (صفحہ ۳، ۵) یہ کتاب ۷۵۸ھ میں لکھی گئی تھی۔ اس طرح ضیائے برنی کا سال ولادت ۶۸۴ھ بعہد سلطان غیاث الدین میں ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اُس کا مقام ولادت برن تھا، لیکن وہ اوائل عمر ہی سے اپنے باپ کے ساتھ جو ملازمت شاہی کا تعلق رکھتا تھا دہلی آ گیا تھا۔

کیقباد کے عہد میں وہ خورد سال تھا، جلال الدین خلجی کے عہد میں وہ سن شعور کو پہنچا اور اسی عہد میں اُس کی تعلیم شروع ہوئی۔ اُس نے اپنی تعلیم کے تفصیلی حالات تو بیان نہیں کیے، نہ یہ بتایا ہے کہ اُس نے کون کون سے علم میں کن کن اساتذہ سے درس لیا، البتہ اپنے اساتذہ کے متعلق اُس نے لکھا ہے کہ وہ علامہ روزگار تھے۔ (صفحہ ۱۲۷)

ضیائے برنی کا یہ لکھنا داخل مبالغہ نہیں معلوم ہوتا مغلوں کی یورش اور تسلط کی وجہ کر بلبن

ہی کے عہد سے وسط ایشیا کے بڑے بڑے فضلا ہندوستان میں آنے لگے تھے اور اکثر دہلی میں مقیم ہونے لگے تھے۔
عہد جلالی میں ضیائے برنی نے قرآن ختم کیا اور خط سیکھا۔

"من کہ مؤلف تاریخ فیروز شاہی ام در عہد جلالی قرآن تمام کردہ بودم واز مفردات گذشتہ و خط آموختہ" (صفحہ ۲۰۵)

بقیہ تعلیم علاء الدین کے عہد میں مکمل ہوئی۔ ضیائے برنی نے عہد علائی کے حالات میں ۴۶-۴۷ اُستاد گنائے ہیں، جن میں سے بعض سے اُس نے تلمذ کیا تھا، بعض کی خدمت میں پہنچا تھا۔ اور بیشتر کو مسند افادت یا مجالس میں دیکھا تھا۔ ہر چند کہ ان اساتذہ کے حالات اُس نے نہیں لکھے لیکن اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام اپنے زمانہ کے نہایت بلند پایہ فضلا تھے:۔

"و در تمامی عصر علائی در دار الملک دہلی علمائے بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت بود در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و سپاہاں و رے و روم و در ربع مسکون نباشند و در ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات و تفسیر و فقہ و اصول فقہ، و معقولات، و اصول دین و نحو و لغت و معانی و بدیع و بیان و کلام و منطق موے می شگافتند و ہر سالے چندیں طالبان علم ازاں استادان سرآمدہ بدرجۂ افادت می رسیدند و مستحق جواب دادن فتوے می شدند و بعضے ازاں استادان در فنون علم و کمالات علوم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند" (صفحہ ۳۵۲-۳۵۳)

"و من در پیش بعضے تلمذ کردہ ام و بخدمت بعضے رسیدہ و بیشترے را در مسند افادت و در مجالس و محافل دیدہ" (صفحہ ۳۵۴)

افسوس ہے کہ ضیائے برنی نے علمی اور ادبی تاریخ کو محفوظ رکھنے کی طرف پوری توجہ نہیں کی اور ہم اُس دور کے اکثر وابستگان علم کے متعلق اُنکے ناموں سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم سب نام نقل کئے دیتے ہیں گو بدقسمتی سے متن کی خرابی کی وجہ سے بعض نام صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ نسبتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کافی تعداد میں ہندوستان ہی کے رہنے والے تھے اور فتح دہلی سے ایک صدی کے

اندر ہندوستان نے اسلامی تعلیم و تعلم میں اچھی ترقی کرلی تھی۔ ان میں سے مولانا افتخار الدین برنی ضیاء برنی کے ہموطن تھے :-

(۱) قاضی فخرالدین ناقلہ (۲) قاضی شرف الدین سرباہی (؟) (۳) مولانا نصیرالدین غنی (۴) مولانا تاج الدین مقدم (۵) مولانا ظہیرالدین لنگ (۶) قاضی مغیث الدین بیانہ (۷) مولانا رکن الدین سنامی (۸) مولانا تاج الدین کلاہی (۹) مولانا ظہیرالدین بھکری (۱۰) قاضی محی الدین کاشانی (۱۱) مولانا کمال الدین کولی (۱۲) مولانا وجیہ الدین پائلی (۱۳) مولانا منہاج الدین قاینی (؟) (۱۴) مولانا نظام الدین کلاہی (۱۵) مولانا نصیہ الدین کڑہ (۱۶) مولانا نصیرالدین صابونی (؟) (۱۷) مولانا علاء الدین تاجر (۱۸) مولانا کریم الدین جوہری (۱۹) مولانا حجت ملتانی قدیم (۲۰) مولانا حمید الدین مخلص (۲۱) مولانا برہان الدین بھکری (۲۲) مولانا افتخار الدین برنی (۲۳) مولانا حسام الدین سرخ (۲۴) مولانا وحید الدین ملصور (۲۵) مولانا علاء الدین کرک (؟) (۲۶) مولانا حسام الدین ابن شادی (۲۷) مولانا حمید الدین بنیانی (۲۸) مولانا شہاب الدین ملتانی (۲۹) مولانا فخرالدین ہانسوی (۳۰) مولانا فخرالدین سناقل (؟) (۳۱) مولانا صلاح الدین ستر کی (؟) (۳۲) قاضی زین الدین ناقلہ (۳۳) مولانا وجیہ الدین رازی (۳۴) مولانا علاء الدین صدر الشریعہ (۳۵) مولانا میران ماریکلہ (۳۶) مولانا نجیب الدین ساوی (۳۷) مولانا شمس الدین ثم (؟) (۳۸) مولانا صدرالدین گندھک (؟) (۳۹) مولانا علاء الدین نوتیوری (۴۰) مولانا شمس الدین یحیٰی (۴۱) قاضی شمس الدین گازرونی (۴۲) مولانا صدرالدین تادی (؟) (۴۳) مولانا معین الدین لونی (۴۴) مولانا افتخار الدین رازی (۴۵) مولانا معزالدین اندہنی (؟) (۴۶) مولانا نجم الدین انتشار (۴۷) مولانا علم الدین نبیرہ شیخ بہاء الدین ذکریا

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ ہندوستان کے سلاطین تیموریہ سے پہلے عہد علائی سے بڑھکر کوئی زمانہ علمی و سیاسی حیثیت سے ممتاز نہیں رہا۔ خدا کی شان ہے ان دونوں دوروں کے دو سب سے بڑے فرمانروا علاء الدین خلجی اور جلال الدین اکبر قطعاً ناخواندہ تھے۔ ان دونوں بادشاہوں کے مزاجوں اور طبیعتوں میں بعد المشرقین ہے، لیکن دونوں جاہل بادشاہوں کے زمانہ میں علمی و ادبی ترقیاں غیر معمولی حیثیت رکھتی ہیں۔

بلاشبہ ضیاء الدین برنی کو تعلیم کے لئے بہت اچھا زمانہ نصیب ہوا، اُس کے خاندان میں پہلے ہی سے لکھنے پڑھنے کا رواج تھا اور اُسکا باپ اور اُسکا چچا دہلی کے سربرآوردہ امراء میں شمار ہوتے تھے۔ اس وجہ سے اُسے ہر قسم کی سہولتیں میسر تھیں۔

اُسکی تعلیم زیادہ تر مذہبی ہوئی اور اُس کے اوپر بچپن ہی سے تصوف کے خیالات کا گہرا اثر پڑا وہ بچپن میں بھی فقیروں سے ملنے کا شائق رہتا تھا۔ سب سے زیادہ اُس پر سلطان المشائخ شیخ نظام الدین کا اثر تھا جن سے اپنے باپ کے توسط سے ابتدائی عمر ہی سے ارادت حاصل ہوگئی تھی۔ یہانتک کہ وہ بالآخر غیاث پور میں جہاں شیخ موصوف رہتے تھے۔ سکونت پذیر ہوگیا اور شیخ موصوف کے مقربین خاص میں شمار ہونے لگا۔ میر خورد لکھتا ہے:۔

"از ابتدائے بواسطہ شفقت پدر بزرگوار کہ از دودمان بزرگی بود، بسعادتِ ارادت سلطان المشائخ مشرف گشت و سر اخلاص بر آستانہ آسمان سائے سلطان المشائخ نہادہ در غیاث پور ساکن شد و بخدمت سلطان المشائخ محلے و قربتے تمام یافت، چنانکہ در حسرت نامۂ خود کنایت کردہ است" (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۲ - ۳۱۳)

اُس نے اپنے عہد کے مشائخ کا خصوصیت اور عقیدت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اخیر عہد جلالی میں ایک فقیر سیدی مولہ تھا جس نے بڑا رسوخ اور اقتدار حاصل کیا تھا۔ عوام الناس کے علاوہ امراء اور اکابر کا اُس کے یہاں مجمع رہتا تھا۔ بادشاہ کو کسی نے اُس کی طرف سے شبہ کر دیا کہ اُسکے یہاں بادشاہ کے خلاف باغیانہ سازشیں ہوتی ہیں۔ اسی شبہ میں اُسے مروا ڈالا۔ ضیائے برنی بھی اس فقیر کو دیکھنے جایا کرتا تھا اور اُس نے اس فقیر کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں (صفحہ ۲۰۸ - ۲۱۲)

"چنانکہ مولف ام در عہد جلالی پدرم نائب ارکلی خاں بود، و خانہ در کیلوکھری بس بلند و رفیع برآوردہ۔ من از انجا با اوستاداں و رفیقاں بزیارت سیدی مولہ می آمدم، و اورا زیارت کردہ ام و ہم لقمہ شدہ ام" (صفحہ ۲۰۹)

اس فقیر کے قتل کے بعد بعض غیر معمولی واقعات پیش آئے اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ جلال الدین

اور آسکا خاندان علاء الدین کے ہاتھوں نیست و نابود ہوگئے ان تمام واقعات کو ضیاء الدین برنی کی ذہنیت سیدی مولہ کے خون ناحق کا نتیجہ قرار دیتی ہے :-

"ومنکہ مولف ام یاد دارم کہ روز قتل سیدی مولہ بادلے سیاہ برخاست، کہ عالم تاریک شد وبعد قتل سیدی مولہ ملک جلالی در فتور گرفت، کہ بزرگان گفتہ اند درویش کشتن شوم باشد وہیچ پادشاہ را نیکو نیامدہ است۔ وہم درآں نزدیکے کہ مولہ کشتہ شد امساک باراں شد وقحط دہلی قحط افتاد وغلہ بیک جیتل سیرے رسید، و در زمین سوالک قطرۂ باراں نچکید ہندواں از آں زمین با زن وبچہ در دہلی می آمدند، وبستگان دسی گان یکجای می شدند و درگرسنگی خود را در آب جون می انداختند وغرق می شدند۔

از سلطان وامرا نفقہ مساکین صدقات بسبیل روزمرہ می یافتند" (صفحہ ۲۱۲)

جہاں ضیاءبرنی کو علوم دینی اور تصوف کی طرف میلان خاص ہے وہیں علوم عقلی (فلسفہ وغیرہ) سے اُسے ایک گونہ نفرت ہے جسکا اظہار اس نے جابجا کیا ہے (صفحہ ۴۲ و ۴۶۵)

باوجود مذہبی اور صوفیانہ اثرات کے جو شروع سے اُس پر پڑے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ جوانی کے زمانہ میں زندگی کی آزادیوں سے ناآشنا رہا۔ خود اس کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ دارالملک کی رنگین صحبتوں اور مجالس عیش وعشرت اور رقص وسرود میں عنفوان شباب ہی سے حصہ لیتا تھا۔ اور بڑھاپے میں اُن کی یاد اُسے بےچین کر دیتی تھی۔ اُس نے عہد کیقباد، عہد جلالی اور عہد علائی کی عیش وعشرت مجالس رقص وسرود، ساقیاں ماہرو اور مطربان خوشنوا کا تذکرہ بڑی دلچسپی کے ساتھ لکھا ہے(۱)۔ ایک موقع پر وہ لکھتا ہے کہ خود اس کے یہاں بہت سے ارباب نشاط نوکر تھے، اور جوانی خوب عیش وعشرت میں گذرتی تھی:-

"درچنیں ہنگامیکہ از پیری وضعیفی یک دنداں در دہنم نماندہ است، وپریشاں خاطر و دشمن کام گشتہ ام و در لگدکوب دشمناں وحاسداں پست شدہ، جوانیہا از سر یادمی آید،

(۱) دیکھو صفحہ ۱۵۶ و ۱۶۵ و ۱۹۹ و ۲۰۱ و ۳۶۵

ومجلسہا و عیشہائے گذشتہ کہ در میانی عالی جہتاں و بزرگ نشاں گذرانیدہ ام و در مجلس من جمعے بالاں و خوب طبعاں و ظریفان بے بدل و خوبرویان طاق و گلعذاران سیمیں ساق و ساقیان سرو قد و امردان شکرلب و مطربان مستثنیٰ و غزلخوانان ممتاز بسیار بودندے در دلم می خلد، و امروز چہ از قحط الطوائف مذکور و چہ از بے سیمی و بے زری در کنج محنت و گوشہ مذلت خوار و زار و بمقدار و بے خریدار ماندہ ام چہ کنم" (صفحہ ۱۶۵)

جلال الدین کی مجلسوں ساقیوں اور مطربوں کا تذکرہ لکھنے کے بعد اخیر میں لکھتا ہے:۔

"و من پیر گمراہ کہ در تیہ ناکامی متحیر گشتہ ام و نفسے و دمے ماندہ، در زمانے کہ وصف مجلس مذکورے نوشتم خواستم کہ بیاد آں جواناں جان نواز و آں مہ پیکراں ناز کہ بعضے از ایشاں را دیدہ بودم و سرود ایشاں شنیدہ و باکوفتن ایشاں مشاہدہ کردہ زنار بربندم و ٹیکہ برہمنان در پیشانی لعنت خود کشم و روئے خود را سیاہ کنم و در تعزیت و مصیبت آں شاہاں جہان حسن و آں آفتابان آسمان خوبی در کوچہ و بازار افتم و فضیحت و رسوا شوم و بعد شصت سال از فقدان ایشاں نوحہ کناں و جامہ دراں و سر و ریش بروم و در زیر پائے گور ایشاں جاں دہم" (صفحہ ۲۰۰)

ضیائے برنی کے حالات زندگی ہمیں بہت کم معلوم ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُس کا باپ کب تک برن میں عامل رہا اور اُس زمانہ میں ضیائے برنی کہاں رہا۔ عہد جلالی کے اختتام پر اس کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ عہد علائی میں اُس کے عنفوان شباب اور جوانی کے ایام گذرے اور اسی زمانہ میں اُس نے تعلیم پائی۔ ہم نہیں بتلا سکتے کہ محمد تغلق کے عہد تک اُسکا کیا شغل رہا، صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ دارالسلطنت کی بہترین صحبتوں میں حصہ لیتا تھا اور اُس عہد کے سربرآوردہ اشخاص سے تعلقات رکھتا تھا اُس نے خصوصیت کے ساتھ امیر خسرو اور حسن علائے سنجری کے ساتھ اپنی دوستی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ امیر خسرو اور حسن کے باہمی ملاقات اور دوستی کا باعث ضیائے برنی ہوا:۔

"و سالہا مرا با امیر خسرو و امیر حسن مذکور توذد و یگانگی بودہ است، و ز ایشاں بے صحبت من

بتوانستندے و نہ من توانستے کہ مجالست ایشاں را گذرانم، و از صحبت من میان ایشاں ہر دو استادو قرابتے شد، و در خانہائے یکدگر آمد و شد کردن گرفتند" (صفحہ ۳۶۰)

علاء الدین کا عہد تاریخ کے اُن زمانوں میں سے ہے جو اپنے حالات کے لحاظ سے عظیم الشان دور" کہلاتے ہیں اور جن کے اندر نامعلوم طریقوں سے بڑے بڑے واقعات رونما ہوتے ہیں اور بڑی بڑی شخصیتیں زندگی کے مختلف شعبوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان شخصیتوں کے اجتماع میں کسی اہتمام وقصد کو دخل نہ تھا نہ انکی اپنے زمانہ میں پوری قدر ہوئی :-

"چندیں استادان و ماہران ہر علمے و ہنرے در عصر علائی جمع شدہ بودند و دارالملک او از چناں بے نظیران عدیم المثال آراستہ و پیراستہ گشتہ' داو را در اجتماع ایشاں ہیچ اہتمامے و قصدے نبودہ است، و حق استحقاق بے نظیری و بے بدلی ہیچ استادے و ماہرے نگذاردہ است" (صفحہ ۳۶۵)

خسرو کا ذکر ضیائے برنی نے جوش اور محبت کے ساتھ کیا ہے لیکن جو کچھ اس عجیب وغریب شخص کے متعلق لکھا ہے مبالغہ نہیں ہے:-

"امیر خسرو کہ خسرو شاعران سلف و خلف بودہ است، و در اختراع معانی و کثرت تصنیفات و کشف رموز غریب نظیر خود نداشت، و اگر استادان نظم و نثر در یک و دو فن بے ہمتا بودند امیر خسرو در جمیع فنون ممتاز و مستثنیٰ بود۔ بحناں ذو فنونے کہ در جمیع منہائے شاعری بسر آمدہ و استاد ما شد در سلف نبود و در خلف تا قیامت پیدا آید یا نیاید۔ و امیر خسرو در نظم و نثر یا بی کتاب خانۂ تصنیف کردہ است و داد سخنوری دادہ۔ و خواجہ سنائی مگر در حق امیر خسرو گفتہ است۔ بیت

بخلاار بزر جسر خ کبود ہمچو او ہست و بود و خواہد بود

و مع ذلک الفضل والکمال والفنون والبلاغ۔ صوفی مستقیم الحال بود و بیشترے عمر او در صیام وقیام وتعبد و قرآن خوانی گذشتہ است، و بطاعات متعدیہ ولازمہ یگانہ شدہ بو

مدام روزہ داشتے، و از مریدان خاصۂ شیخ بود، و آنچناں مریدے معتقد من دیگرے را ندیدہ ام، و از عشق و محبت نصیبے تمام داشت و صاحب سماع و صاحب وجد و صاحب حال بودہ و در علم موسیقی گفتن و ساختن کمالے داشت، و ہر چہ نسبت بطبع لطیف و موزوں کنند باری تعالیٰ او را دراں ہنر سر آمدہ گردانیدہ بود، و دو جوشے عدیم المثال آفریدہ و در قرنہا مناظرہ از نوادر اعصار پیدا آوردہ" (صفحہ ۳۵۹)

اس کے بعد حسن کا تذکرہ اس طرح لکھتا ہے:-

"او را تالیفات نظم بسیار است و سلاستی ترکیب و روانی سخن آیت بودہ است، و از بسکہ غزلہائے وجدانی و رعایت روانی بسیار گفتہ است او را سعدی ہندوستان خطاب شدہ بود، و امیر حسن مذکور باوصاف و اخلاق مرضیہ متصف بودہ است و لعزت خدا وندان مکارم اخلاق کہ در لطائف و ظرائف و مجلسہا و استحضار اخبار سلاطین و اکابر و علمائے بزرگ دہلی و استقامت عقل و زکی و ذلیست صوفیہ و لزوم قناعت، و اعتقاد پاکیزہ و خوش گذرانیدن بے اسباب دنیا تجرد و تفرد از علائق دنیا چوں او کسے را کمتر دیدہ ام..... و از نہایت اعتقادے کہ امیر حسن بخدمت شیخ داشت آنچہ در مدت ارادت خود در مجالس شیخ از الفاظ شیخ شنیدہ است عین ملفوظ شیخ در چند جلد جمع کردہ است و آنرا فوائد الفواد نام نہادہ، و دریں ایام فوائد الفواد دستور صادقاں ارادت شدہ است و امیر حسن را نیز چند دیوان است و مصنف بہ نثر و مثنویات بسیار است و خیال شیریں مجلس ظریف و خوش باش و مزاجدانا محبوب و مہذب بود کہ مار احتے و انسے کہ از مجالست او می شد از مجالست غیر او نیافتم" (صفحہ ۳۵۹-۳۶۰)

آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے، ضیائے برنی اپنے زمانہ کے بہترین اشخاص سے دوستی رکھتا تھا اور اس کی ذہنی تربیت پر انکا بڑا اثر پڑا۔

محمد تغلق ([illegible]) دنیا کے عجیب ترین بادشاہوں میں ہوا ہے، جس کے اوصاف متضاد اس کے معاصرین و دیگر مؤرخین ابعد کی حیرت کا باعث رہیں ضیائے برنی نے اس کا نقشہ اتنا کھینچا ہے اور

مہارت فن ندیمی کی بدولت اس بادشاہ کے مقربین خاص میں داخل ہوا اور سترہ اٹھارہ برس اس کی صحبت و تقرب میں گزارے۔ میر خورد لکھتا ہے :۔

"بواسطۂ لطافت طبع کہ در زمان خویش در فن ندیمی زیر کبودی آسماں مثل نداشت، بخدمت سلطان محمد ... متمکن و مبجل گشت واز دولت او ازیں دنیائے غدار و مکار بیوفا حظ وافر نصیبے کامل گرفت" (صفحہ ۳۱۲ سیر الاولیا)

ضیائے برنی نے کئی موقعوں پر محمد تغلق کے عہد میں اپنا ذکر کیا ہے۔ اس کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد تغلق اس پر بہت زیادہ مہربان تھا اور اُس پر نہایت اعتماد کرتا اور سلطنت کے پیچیدہ معاملات میں مشورہ لیتا تھا۔

"من در دنیا پرورده و برآورده سلطان محمدام و آنچہ از اکرام و انعام و یافتہ بودم نہ پیش ازاں دیده بودم نہ بعد از و بخواب می بینم" (صفحہ ۴۶۷)

ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے :۔

"و من کہ مولف تاریخ فیروز شاہیم ہفدہ سال وسہ ماہ ملازم درگاہ سلطان محمد بودم و انعامات وافرہ و صدقات متواترہ و زر ہا یافتہ از مشاہدۂ اوصاف متضادۂ آں بادشاہ کہ از عجائب عالم آفرینش در وجود آمده بود متحیر می مانم" (صفحہ ۵۰۴)

ایک دفعہ سلطان نے جبکہ اُس کے اخیر عہد میں چاروں طرف سے شورشیں اور بغاوتیں بپا تھیں جن کی وجہ سے نہایت متردد رہتا تھا اور اُس کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہیں آتی تھی۔ ضیائے برنی کو رات کے پچھلے پہر بلا کر مشورہ کیا اور تدبیر دریافت کی۔

"دراں چہار پنج روز ماہ رمضان کہ سلطان محمد در قصبہ سلطان پور وقفہ کرده بود در آخر شب داعی ضعیف ضیائے برنی را طلب شد و بندہ را سلطان فرمود کہ فلاں می بینی کہ چہ فتنہا می زاید ... بعد ازاں سلطان بندہ را فرمود کہ تواریخ بسیار خوانده چہا سے خوانده کہ بادشاہاں در چند جرم سیاست کرده اند" (صفحہ ۵۰۹)

بادشاہ کے دریافت کرنے پر ضیائے برنی نے تاریخ خسروی کے حوالہ سے جمشید کا قول بیان کیا کہ سات موقعوں پر بادشاہوں کے لئے سیاست جائز ہے۔ اس فلسفۂ تعزیرات کو جمشید کیطرف منسوب کیا گیا ہے لیکن ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خود ضیائے برنی کے زمانہ کے فلسفۂ سیاست و تعزیرات کو ظاہر کرتا ہے۔

یکے آنکہ اگر یکے از دین حق بگذرد و براں مصر ماند . . . .

دوم آنکہ ہر کہ یکے را عمداً از مطیعان کشد . . . .

سوم آنکہ ہر کہ را زنے باشد و او با زن دیگرے سفاح کند . . . .

چہارم آنکہ ہر کہ با بادشاہ غدر اندیشیدہ و غدر او تحقیق شود . . . .

پنجم آنکہ ہر کہ سر فتنہ بغی شود و بغی را مباشرت نماید

ششم آنکہ ہر کہ از رعیت بادشاہ یار دشمن و مخالف و ہمسر بادشاہ شود و او را رسانیدن مصر و اسلحہ و جز آں مدد و معونت کند و مدد و معونت او محقق گردد

ہفتم آنکہ ہر کہ بیفرمانی بادشاہ کند، بیفرمانی کہ مضرات بیفرمانی زیان ملک بادشاہ باشد نہ در بیفرمانیہائے دیگر . . . .

"و در یں سیاست زیان ملک شرط است، زیرا چہ بندگان خدائے خدا را بیفرمانی می کنند بادشاہ را کہ نایب اوست بیفرمانی کنند چہ شود، اما در بیفرمانی کہ دراں بیفرمانی زیان ملک و دولت پادشاہ بار آرد، اگر پادشاہ در چنیں بیفرمانی سیاست نکند ملک را بباد دہد"

اس انتخاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظری حیثیت اس دور کے اہل نظر جانتے تھے کہ "مفاد عامہ"

"مصالح خلق اللہ" ہی پر بادشاہ کی تعزیری اختیارات مبنی تھے اور اُن سے تجاوز ہونیکا بادشاہ کو اختیار نہ تھا ولاً اطاعت خدا کے لئے واجب سمجھی جاتی تھی۔ بادشاہ خدا کا نایب مانا جاتا تھا حقیقی اطاعت سوائے خدا کے مسکے لئے جائز نہیں مانی جاتی تھی لیکن بادشاہ کو رعایا سے اطاعت کا حق اس وقت تک حاصل تھا جبتک وہ مصالح کی کوشش نظر رکھے۔ افسوس ہو کہ اس قسم کے نظریوں پر اس زمانہ میں عمل نہیں ہوتا تھا اور مطلق العنان

بادشاہ نہایت غیر ذمہ دارانہ طور پر سلطنت کرتے تھے کوئی چون و چرا کرنے کا مجاز نہ سمجھا جاتا تھا اور اگر چون و چرا کرتا تو گردن زدنی قرار پاتا تھا۔ خود محمد تغلق کی مثال ہمارے سامنے ہے وہ خونریزی اور جباری کا دیو مجسم تھا ضیائے برنی نے اُسے جمشید کے الفاظ میں جتلانا چاہا کہ بعض نافرمانی پر خلق اللہ کو قتل کرڈالنا حق بجانب نہیں ہے مگر اس پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "یہ پہلے زمانے کی باتیں ہیں اب لوگ نہایت شریر اور فتنہ پرداز و مکار رہیں میں اس وقت تک خونریزی سے دست بردار نہ ہوں گا جب تک کہ یا میں نہ رہوں یا لوگ ٹھیک نہ ہو جائیں۔"

"سلطان فرمود سیاستے کہ جمشید فرمودہ است آں در اول ازمنہ بودہ است و دریں عہد مردم شریر و بغیر ماناں بسیار پیدا آمدہ ...... باندک بغیر مانی کہ از خلق صادر می شود ہم ایشاں را می کشم و ہم چنیں سیاست می کنم تا آں دم یا من تلف شدم و یا خلق راست ایستند و ترک بغی و بغیر مانی کنند۔" (صفحہ ۵۱۱)

ضیائے برنی نے اُسے یہ بھی سمجھایا کہ بادشاہ وزیروں کا انتخاب بھی اس غرض سے کرتے ہیں کہ وہ قوانین وضع کر کے بادشاہوں کو خونریزی سے محفوظ رکھیں، لیکن اس کا جواب سلطان محمد نے یہ دیدیا کہ مجھے ایسا وزیر نہیں ملتا جو ضوابط وضع کر سکے۔

"جمشید مذکور گفتہ است کہ بادشاہاں کہ وزیراں را گزیدہ اند ... سبب آں است کہ فدائیاں در ملک پادشاہاں ضابطہا پیدا آوردہ اند و تعمیم گردانیدہ کہ از اعمال آں ضوابط دست پادشاہاں در خون ہیچ آفریدہ آلودہ نگشتہ است سلطان فرمود ...... من آں چناں وزیرے ندارم کہ در ملک من ضوابطے پیدا آرد کہ مرا دست بخون کش نباید بود۔" (صفحہ ۵۱۱)

سچ ہے خوئے بد را بہانہ بسیار۔ ایک دوسرے موقع پر جبکہ ضیائے برنی امرائے سلطنت کی طرف سے فتح دیوگری کی مبارکباد دے کر سلطان محمد تغلق کے پاس گیا ہوا تھا اور بادشاہ کے ہمرکاب بھروچ کی طرف جا رہا تھا اس نے سلطنت کی شوریدہ حالت بیان کر کے اس کے متعلق دریافت کیا لیکن بیچارہ موقع خوف کی وجہ سے بادشاہ کو نہ بتا سکا کہ یہ سب کچھ اُس کی سفاکیوں اور بیجا خونریزیوں کی وجہ سے تھا۔

"درہماں ایام کہ سلطان محمد از گنگی ساکوں فرود آمد و یک دو منزل سمت بھروچ قطع کرد از شہر
دہلی بخدمت سلطان پیوستم و عرضداشت و خدمتی مبارکباد فتح دیوگیر کہ خداوند عالم پادشاہ
عصر و زمان و ملک کبیر و احمد ایاز (وزیر) کہ از شہر بدست من فرستادہ بودند بخدمت سلطان
رسانیدم و سلطان مرا بسیار نوازش فرمود۔

در روزے من در رکاب سلطان می رفتم و سلطان با من حکایت کناں می رفت کہ حکایت بغاۃ
درمیان افتاد و سلطان مرا گفت کہ می بینی امیران صدہ حرامخور چگونہ فتنہای انگیزند و اگر من
یک جانبے فراہم می آرم و شر ایشاں دفع می کنم از طرفے دیگر بلا می انگیزند کہ اگر من در اول
بفرمودے کہ بیکبارگی امیران صدہ دیوگیر و گجرات و بھروچ را از میاں بردارند چندیں درد
ماندگیہا از ایشاں مرا پیش نیامدے و ہمیں طغی حرامخور را کہ غلام من است اگر من سیاست
فرمودے یا او را بیادگار بر بادشاہ علل بفرستادے ایں فتنہ و بغی از و در وجود نیامدے
و من نتوانستم کہ در بندگی سلطان عرضداشت کنم کہ ایں ہمہ بلاہا و فتنہ ہا کہ از ہر چہار طرف میزاید
و تنفر عام بدی نمودہ است از نتیجہ کثرت سیاست سلطانی است کہ اگر سیاست را چندگاہ
توقف دارند باشد کہ فراہمی پیدا آید و از سینہ خواص و عوام تنفر کم شود۔ از تغیر مزاج سلطان
بترسیدم و سخن نکو بعرضداشت کردن نتوانستم و با خود گفتم یا چہ حکمت است کہ چندیں چیزے کہ
واسطہ خرابی و ابتری ملک گشتہ است در سینہ سلطان محمد از برائے فراہمی و التیامی ملک و
دولت جلوہ می کند" (صفحہ ۵۱۶-۵۱۷)

آخر زمانہ میں جب کہ دکن میں حسن کانگو نے دیوگیر کو اپنے قبضہ میں کر کے دکن کی خودمختار اپنی سلطنت کی بنیادیں ڈالدی تھیں سلطان محمد نہایت پریشان و حیران رہتا تھا۔ اس نے پھر ایک مرتبہ ضیاء الدین برنی کو بلا کر مشورہ طلب کیا۔ مورخ نے جو اصل سبب جانتا تھا کنایتہً یہ مشورہ دیا کہ بادشاہ سلطنت سے دست بردار ہو کر گوشہ نشین ہو جائے اور کسی دوسرے کو سلطنت سپرد کر دے۔ لیکن سلطان محمد نے جواب دیا کہ وہ خود بھی اس قسم کا ارادہ رکھتا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ ایسا کرے وہ چاہتا ہے کہ تلوار سے لوگوں کو سیدھا کر لے!۔

"و دراں ایام کہ سلطان محمد از فتنہ دیگیر منقسم خاطر می بود روزے منکہ مولف تاریخ فیروز شاہیم در پیش تخت طلب شدم و سلطان ایں ضعیف را می گفت کہ ملک ما مریض گشت و بہر تداوی مرض نمی رود . . . . . و مرا فرمود کہ بادشاہان مقدم دریں امراض ملکی چہ فرمودہ اند۔ بندہ عرضہ داشت کرد کہ در کتب تواریخ علاجے کہ بادشاہان متقدم امراض ملکی را کردہ اند بانواع نوشتہ اند، بعضے سلاطین چوں دیدہ اند کہ اعتماد رعایائے از ایشاں خاستہ است و تنفر عام بار آوردہ دریں صورت دست از جہانبانے برداشتہ اند و بہ پسرے از پسران شائستہ ہم در حیات خود بادشاہی تفویض فرمودہ . . . . . و از جملہ امراض ملکی یک مرض بزرگ و مہلک تنفر خواص و عوام مملکت و نا اعتمادی عامہ رعایاست۔ سلطان جواب فرمود کہ من می خواستم کہ اگر کارہائے ممالک من چنانچہ خواست دل من است فراہم آید ممالک دہلی را بدیں سہ کس یعنی بادشاہ عہد زماں فیروز شاہ سلطان و ملک کبیر و احمد ایاز بسپارم و من در خانہ کعبہ روم۔ فاما دریں ایام من از خلق آزردہ شدم و خلق از من آزار گرفت . . . . علاج من در باب باغیان و بیفرماناں و مخالفاں و بدخواہاں تیغ است . . . . (صفحہ ۵۲۱-۵۲۲)

اس ظالم مگر فیاض بادشاہ کے ساتھ نبھاؤ کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ ضیائے برنی نے جو اُسے بخوبی جانتا تھا اُس کی سیرت کی مکمل تصویر کھینچی ہے اور اس کے بیانات کی تصدیق ابن بطوطہ کے بیانات سے پورے طور پر ہوتی ہے۔ وہ دنیا کے عجیب ترین اشخاص میں سے ہوا ہے، وہ نہایت عالی ہمت، سیر چشم، پابند مراسم مذہبی، مجتنب از ہمہ قسم فسق و فجور، فنون شہسواری و مردانگی میں طاق۔ اختراعات بدیعہ فراست و درآیت، تقریر و تحریر نیز خوبی خط اور حافظہ میں ممتاز تھا، وہ علوم عقلی کا خاص طور پر دلدادہ تھا اور ضیائے برنی کی رائے میں معقولات کی شیفتگی اُس کی شقاوت و سفاکی کا باعث ہوئی۔ ضیائے برنی لکھتا ہے :-

"باچندیں فضائل و بزرگی و سروری و جلوہت و فراست و درایت و شجاعت و سخاوت و ہنرمندی و خردمندی . . . در عنفوان شباب و ہنگام فہم و ادراک آں . . . . را با سعد منطقی بدمذہب و عبید شاعر بد اعتقاد و نجم انتشار فلسفی صحبت و مجالست افتاد۔ آمد و شد مولنا علیم الدین کہ علم

فلاسفہ بود در خلوت او بسیار شد۔ و آں ناجوانمرداں . . . . در مباحثہ و مکالمہ نشست و خاست علم معقولات را . . . . در خاطر سلطان محمد چناں بنشاندند کہ منقولات کتب سماوی و احادیث انبیا را . . . . چنانچہ باید و شاید جائے نماند۔ و ہر چہ بر خلاف معقول بود نشنیدے و یقین در خاطر مبارک او نہ نشستے . . . . . از جہت آں کہ معقولات فلاسفہ کہ مایہ قساوت و سنگدلی است تمامی دل او را فرا گرفتہ بود و منقولات کتب سماوی و احادیث انبیا را کہ معدن رقت و سکینت و مخوف عقاب گوناگوں عقوبت است و خاطرش مخلے نماندہ بود و سیاست مسلماناں و قتل موحداں خوئی و طبیعت او گشتہ، و چندیں علما، و مشائخ و سادات، و صوفیاں و قلندراں و نویسندگاں و لشکریاں را سیاست فرمودہ و آنکہ روزے و ہفتہ نمی گذشت کہ خون چندیں مسلماناں نمی ریختند و جوئے خون پیش در دخول در سرائی راندند از اثر قساوت علم معقولات و فقدان اعتقاد علم منقولات بود . . . . ." (صفحہ ۴۶۵ - ۴۶۶)

اس نے یہ بھی بتلایا ہے کہ محمد تغلق کے ذہن میں جو باتیں آتی تھیں وہ اس عہد کے لوگوں کی عقل سے باہر تھیں اور وہ اُن پر عمل پیرا ہونے کی طاقت و لیاقت نہیں رکھتے تھے۔ بادشاہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جب اس کے احکام کی تعمیل نہیں ہوتی تھی تو وہ بیدریغ خوں بہا ڈالتا تھا۔

"آنچہ در تصور او گذشتے خلق را بداں فرمان دادے۔ و چوں . . . و قوع متصورات سلطان اندازہ مأموراں نبودے کہ در حیز اظہار آرند و بعض آں را موجود گردانند بر عداوت و بغض بانی و مخالفت و بدخواہی ماموراں حمل می شد . . . . و خلق بسیاست می پیوست" (صفحہ ۴۶۶)

ضیائے برنی نے اعتراف کیا ہے کہ وہ خود اور اس کے اور ساتھی جن کو شاہی تقرب حاصل تھا خوف جان اور طمع کی وجہ سے بادشاہ کو متنبہ نہیں کرتے تھے نہ صاف طور پر اظہار حق کرتے تھے۔

"و ما چنداں کافر نعمت کہ سیہ سپیدی خواندہ بودیم و از علمے کہ داں حرف و ایں چیزے داشتیم و از طمع و حرص دنیا تقاضا پہا درزیدہ و تقرب سلطان شدہ در قضیہ سیاست کہ نامشروع بودے حق پیش سلطان نگفتیم و از خوف جان کہ رفتنی است و درے کہ زائل شدنی است می ترسیدیم

...... " (صفحہ ۴۶۶)

اس حالت میں کہ اس عجیب و غریب بادشاہ سے دنیا عاجز آگئی تھی اور وہ دنیا سے عاجز آگیا، سلطان محمد نے دریائے سندھ کے کنارے ٹھٹھہ سے چودہ میل پر لشکر کے اندر دس گیارہ دن بیمار رہنے کے بعد بتاریخ ۲۱ محرم ۷۵۲ھ انتقال کیا۔ اپنے محسن کی وفات پر ضیائے برنی نے جو ماتم کیا ہے اُس کے فقرات لکھتا ہوں :-

" آں جہاں پناہ جہانگیر از تختگاہ پادشاہی در میان تختہ چوب خفت و از مسند اولوالامری اسیر خاک شد۔ بیت

سر اسپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں | بردا با نخاک اندر تن اسپ ارسلاں بینی
امیرے کہ بر قصرش ہزاراں پاسباں بودے | کنوں بر قبہ گورش کلاغاں پاسباں بینی ...

اے داد از دست چرخ بیوفا، و فریاد از روزگار پر جفا کہ شاہان جہاں پناہ و جہانبانان انجم سپاہ را بر خاک مذلت میان چہار گز گور روا می دارد، و سلطان شرق و غرب را بزیر زحمت خواری می پسندد ....

صبح محشر دمید ما در خواب | بانگ زن خفتگان عالم را
استخیز است خیز باز شگاف | سقف ایوان طاق طارم را
شہ محمد نجیف در دل خاک | نیلگوں کن لباس ماتم را۔" (صفحہ ۵۲۵)

ضیائے برنی کا سلطان محمد تغلق کی وفات پر نوحہ خوانی کرنا بیجا نہیں۔ اُس وقت سے پھر اُسے اطمینان زندگی کبھی حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کی زندگی کے آخری ایام نہایت مصیبت، ناداری حسرت اور یاس میں گذرے۔

محمد تغلق کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اُس کے وزیر احمد ایاز نے ایک چھ سات برس کے لڑکے کو محمد کا بیٹا بنا کر دہلی میں تخت نشین کر دیا۔ لیکن لشکر شاہی سلطان فیروز کو بادشاہ بنا چکا تھا۔ بعد میں جب نوبت آئی تو وزیر کو شکست ہوئی اور سلطان فیروز نے احمد ایاز کو قتل کرا دیا۔ ضیائے برنی کے تعلقات

محمد کی زندگی میں سلطان فیروز اور احمد ایاز دونوں سے اچھے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ محمد تغلق کے انتقال کے وقت وہ دہلی میں تھا۔ اس کے دشمنوں نے نہ معلوم کیا الزامات لگائے اور ان کی کیا اصلیت تھی کہ سلطان فیروز کو اس کی طرف سے سخت برہم کر دیا اور ایسا برافروختہ کیا کہ بادشاہ کا دل اس کی طرف سے کبھی صاف نہیں ہوا ضیاء برنی نے اپنے آپ کو بیگناہ ثابت کرنے کی کوشش کی اور اخیر تک بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی تمنا کرتا رہا اور تاریخ فیروز شاہی کو بھی بادشاہ کے نام سے معنون کر کے وجہ تقرب بنانا چاہا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے دل کا میل کسی طرح نہ نکلا۔ تاریخ فیروز شاہی کے تصنیف کے وقت فیروز شاہ کو تخت نشین ہوئے چھ برس گذر چکے تھے لیکن ضیائے برنی اس وقت تک معتوبین ہی میں تھا اور اخیر تک نہایت نکبت و ناداری کی حالت میں بسر کرتا رہا جس کا اس نے اپنی کتاب میں کئی موقع پر نہایت دردآمیز لہجہ میں ذکر کیا ہے:۔

"بندہ ضیائے برنی مولف تاریخ فیروز شاہی بعد نقل سلطان مغفور در ہلاک گوناگوں افتادم و بدخواہان جانی و دشمنان و حاسدان زبردست و قوی حال در خون من سعی کردند و از زخم چوگان عداوت گوئی ویرانہ ام ساختند و ہزار نوع سخنان زہرآلود از من در رسیدگی خداوند عالم رسانیدند کہ اگر بعد فضل اللہ تعالیٰ علم و حیا و شفقت و مہربانی و حق شناسی و وفاداری سلطان العہد والزمان فیروز شاہ السلطان فریادم نرسیدے و سخنان زہرآمیختہ دشمنان غالب و متولی گشتہ در حق ایں ضعیف شنیدے و بودے کہ من در کنار راہ در خاک خفتمے و اگر مکارم اخلاق ایں بادشاہ بیچارہ نواز دستم نگرفتے تا امروز من کجا زندہ ماندے . . . . (صفحہ ۵۵۶-۵۵۷)

ایک اور موقع پر عہد جلالی کے بعض سرآوردہ امرائے سلطنت کی سخاوت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی درماندہ حالت اس طرح بیان کی ہے:۔

"اگرچہ من دریں ایام سخت درماندہ و عاجز شدہ ام و خواہندگان (سائلان) از در من محروم باز می گردند از آنکہ زادہ و کریم و خلف کرام مردان را ازیں روزہا بہتری دانم۔ و نہ چیزے دارم و نہ از کسے وام می یابم، و شب و روز در حسرت آنکہ ایثارے کنم و درم و دینارے دہم بیکام دمی میرم" (صفحہ ۲۰۴-۲۰۵)

ایک جگہ اپنی کتاب پر فخر کرتے ہوئے اظہار حسرت کیا ہے کہ بادشاہ کو تاریخ سے شوق ہے لیکن دیکھ
رہا ہوں کس طرح فیروزشاہی اسکی نظر سے گذرانی جائے :۔

"چہ کنم کہ دشمنانم از حضرت واز قرب او مراد ور انداختہ اند، میسرم نمی شود کہ ایں تاریخ را در نظر ہمایوں او بگذرانم . . . . بغایت شکستہ ام و دریں شکستگی در حضرت بے نیازی مناجات می کنم و می گویم، آلہی بحرمت شکستگی خاطر من و بحرمت بیچارگی و سکنت حال من لطیفہ ساز کہ ایں تاریخ من در نظر خداوندعالم بادشاہ بنی آدم فیروزشاہ السلطان خلداللہ ملکہ وسلطانہ بگذرد . . . . . ." (صفحہ ۱۲۵)

اخیر میں ملک الامرا ملاں سلطانی نے جو فیروزشاہ کے بندگان خاص میں سے تھا، بادشاہ سے ضیائے برنی کی کچھ سفارش کی تھی لیکن غالباً اُسکا بھی کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا :۔

"و ملک نسکار یک ملاں سلطانی . . . . . در باب من . . . . بسیار مدد فرمود، وچند سخنے کہ از بہوا دے آید درپیش تخت عرضہ داشت کردہ"

ضیائے برنی دنیا کے اُن لوگوں میں تھا، جو سخاوت اور عطا و بخشش کے خاص طور پر دلدادہ ہوتے ہیں اور اپنی سیر چشمی اور فیاضی کی وجہ سے بڑی سے بڑی دولت بھی سنگواکر نہیں رکھ سکتے۔ سلطان محمد تغلق نے اُسے بہت کچھ انعام واکرام دئے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کچھ بچاکر نہیں رکھا۔ میر خورد کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضیائے برنی کے اخیر ایام نہایت عسرت اور ناداری کی حالت میں گذرے اور وہ دنیا سے سکین وار رخصت ہوا۔ بادشاہ نے اخیر زمانہ میں بسراوقات کے لئے تھوڑا سا وظیفہ مقرر کردیا تھا (صفحہ ۲۱۲ سیرالاولیا) لیکن انتقال کے وقت اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے جسم کے کپڑے بھی خیرات کردئے تھے۔ اُس کے جنازے کو اوپر نیچے بوریہ میں لپیٹ کر اُس کے محبوب ترین دوستوں کے قرب میں دفن کردیا گیا۔ اسکا باپ بھی خطیرہ سلطان المشائخ کے جوار میں دفن تھا۔ وہیں اپنے پدر بزرگوار کے پائیں میں اُسے بھی سپردخاک کردیا گیا۔ میر خورد لکھتا ہے :۔

"آخرالامر چند روز زحمت شد واز دنیا بداز عقبی مردانہ رہا خفتانہ فراامید وقت نقل مانگ م

درم بر خود نداشت بلکہ جامہ ہائے تن نیز بداد و در خیابانۂ فرو بالائے او یک تہ دیگر بور یا بود۔
محسب ہر آئینہ اثر صحبت سلطان المشائخ بر صحبت پادشاہاں غالب آمد و عاقبت او بخیر شد
واز جہان سکین وار چنانچہ می بایست بیروں رفت و در جوار حظیرۂ سلطان المشائخ در پائیں
والد بزرگوار خویش مدفن یافت رحمۃ اللہ علیہ" (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۲)

اُس کی قبر کا پتہ اب بھی اُس کے دوست خسرو کے مزار سے جنوب کیطرف دیا جاتا ہے لیکن کوئی لوح یا کتبہ نہیں ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جو موقع اُس کے مدفن کا بتایا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں، اگرچہ اس میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہم نے بارہا اس موقع پر کھڑے ہوکر ہندوستان کے سب سے پہلے ہندوستانی مورخ اور اپنے ہم وطن بزرگ کی فاتحہ پڑھی ہے۔ خدا اُسے غریق رحمت کرے۔

اُس کی زندگی عبرت آموز ہے وہ ایک اونچے اور متمول گھرانے میں پیدا ہوا۔ امیرانہ شان وشوکت میں پرورش پائی ایک طویل عیش وراحت کی زندگی گذارنے کے بعد جس میں اس نے ہندوستان کے بعض اہم واقعات۔ غیر معمولی حوادث اور متعدد انقلابات اور عظیم شخصیتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ بالآخر فقیرانہ زندگی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ ہمیں یقین ہے کہ باوجود ان مصائب کے جو اُس نے اخیر زندگی میں پادشاہ وقت کی بے اعتنائی اور عتاب کی وجہ سے برداشت کئے وہ فی الجملہ اس دنیا سے اطمینان کے ساتھ رخصت ہوا۔

ضیائے برنی کا سنہ وفات تحقیق نہیں۔ فیروز شاہی کی تصنیف کے وقت اس کی عمر ۷۴ برس کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ زیادہ عرصہ تک نہیں جیا۔ میر خورد کے بیاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وفات کے وقت وہ ستر سے کچھ ہی زیادہ عمر رکھتا تھا۔ (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۳)

میر خورد کے بیان سے جس نے تقریبًا اُسے اخیر زمانہ میں دیکھا تھا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا ایک ہر دلعزیز شخص تھا۔ وہ بزرگوں، عالموں، شاعروں، امیروں اور پادشاہوں کا دوست رہ چکا تھا۔ اُس کو ابتدا ہی سے اچھی صحبتیں ملی تھیں۔ وہ زندگی کا ہر قسم کا تجربہ رکھتا تھا۔ وہ طبعًا خوشدل اور ظریف تھا۔ اُس کی باتیں دلچسپ ہوتی تھیں جو لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتی تھیں۔ وہ مجلس میں بیٹھکر لوگوں کو

لطائف روح افزا اور حکایات ہوش ربا سناتا تھا:۔

"آں لطافت طبع بے نظیر و آں بنزدیک اہل دلاں عالم دلپذیر یعنی خواجہ ضیاء الملۃ والدین برنی کہ مقبول خاص و عام بود و لطافتے بحد و ظرافتے بے اندازہ داشت۔ در ہر مجلسے کہ ایں بزرگوار بودے گوش ہوش ہمہ بر لطائف روح افزائے او بودے مجمع اللطائف و جامع الحکایات بود و از صحبت علماء و مشائخ و شعرا نصیبے کامل داشت و ہمتے بلند" (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۲-۳۱۳)

اُس کی تصانیف میں سے ثنائے محمدی۔ صلوٰۃ کبیر۔ عنایت نامہ۔ ماثر سادات۔ حسرت نامہ (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۲) اور تاریخ آل برمک مشہور ہیں اور ان سب سے زیادہ مشہور کتاب تاریخ فیروز شاہی ہے جس کی بدولت اُسکا نام زندہ ہے۔

ضیائے برنی کو تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ اُس نے مختلف علوم و فنون میں بہت سی کتابیں پڑھی تھیں لیکن وہ سب سے زیادہ تاریخ کو عزیز رکھتا تھا جس کا اس نے وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اس کی تاریخ دانی نے ایسی شہرت حاصل کی تھی کہ بادشاہ بھی اُسے ایک باخبر مورخ کی حیثیت سے دیکھتے تھے وہ تاریخ سے اپنی وابستگی خاطر کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"چنیں گوید بندہ گنہگار . . . . . ضیائے برنی کہ عمر بندہ در تصفح کتب گذشتہ است و در ہر علمے بے تصانیف سلف و خلف مطالعہ کردہ ام و بعد از علم تفسیر و حدیث و فقہ و طریقت مشائخ و ہیچ علمے و عملے چنداں منافع مشاہدہ نکردہ کہ در علم تاریخ" (صفحہ ۹)

علم تاریخ کے موضوع اس کے فوائد اور شرائط پر ضیائے برنی نے ایک طویل مقدمہ حمد نعت و منقبت صحابہ کے بعد لکھا ہے۔ تاریخ کا موضوع اس کی نظر میں "انبیاء، خلفاء، سلاطین و بزرگان دین و دولت کے اخبار رہیں:۔

"و دانستن آثار و اخبار انبیاء، و خلفاء، و سلاطین و بزرگان دین و دولت علم تاریخ است.... علم تاریخ اخبار اوصاف بزرگی و ذکر محامد و مناقب و مآثر بزرگان دین و دولت است نہ ذکر رذایل ارذال و اسافل و کم اخلاق و بازاریان" (صفحہ ۹)

آگے چل کر اُس نے تاریخ کے موضوع کو کچھ اور وسعت دیدی ہے اور تاریخ کے دائرہ میں اچھے اور برے حالات کا تذکرہ شامل کرلیا ہے ا۔

"علم تاریخ نقل خیر و شر و عدل و ظلم و استحقاق و غیر استحقاق و محاسن و مقابح و طاعات و معاصی و فضائل و رذائل سلف است، تا خوانندگان خلف ازاں اعتبار گیرند و منافع و مضار جہانداری و نیکوکاری و بدکرداری جہانبانی دریابند و از درون آں نیکوکاری را اتباع نمایند و از بدکرداری پرہیزند" (صفحہ ۱۲-۱۳)

ضیائے برنی کے خیال میں تاریخ کے مطالعہ و تصنیف کرنے کے مجاز و مستحق اور نیز اُس کے مخاطب بھی فی الواقع معزز اور سربرآوردہ لوگ ہیں، جمہور کو اس فن کے مطالعہ کرنے اور اُس سے منتسب ہونے کا کوئی حق نہیں ہے:۔

"و اشتغال علم تاریخ بہ بزرگان دین و دولت کہ بکمالات سمر بودند و بزرگیہا در میان مردم سمر شدہ باشند مختص است، و اراذل و اسافل و ناشائستگان و نا بایستگان و دونان و دون ہمتان و مجہولاں و لئیمان و بے سرو پایان و دا ماندگان و کم اصلان و بازاریان را در علم تاریخ نہ نسبت بود نہ پیشہ و نہ حرفت ایشاں باشد، و طوائف مذکور را دانستن علم تاریخ ہیچ منفعتے نکند و در ہیچ محلے ہیچ کار نیاید" (صفحہ ۹)

ضیائے برنی کی اس ذہنیت سے ہمیں متعجب نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ وہ ہندی نژاد مسلمان تھا اور ایک امیرانہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کے رگ و پے میں اس قسم کے خیالات بھرے تھے اور جس آب و ہوا میں اُس نے پرورش پائی وہ اسی قسم کے خیالات کی مقتضی تھی۔ اُس زمانے کے لوگ دو ممتاز طبقوں میں منقسم تھے ایک وہ طبقہ جو دینی یا دنیوی یا نسلی حیثیت سے اقتدار رکھتا تھا اور دوسرا طبقہ عوام الناس کا جو اپنی جہالت، پست طبعی اور پست خیالی کی وجہ سے بجائے حقوق عامہ سے واقف ہونے اور انکی حفاظت کرنے کے صرف مقتدر جماعتوں کی اطاعت اور وفاداری ہی اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا تھا۔ بادشاہ ظل اللہ تھا، اور اگرچہ نظری حیثیت سے خلق اللہ کے راعی ہونے کی حیثیت سے اُسے

یہ درجہ حاصل تھا لیکن فی الواقع تاج و تخت اکثر جبر و تشدد اور مکر و فریب سے حاصل ہوتے اور تلوار روپیہ اور ہر قسم کی سبھایانیوں سے برقرار رکھے جاتے تھے۔

تاریخ کے موضوع اور مورخ کے افق نظر کو اس طرح محدود کر دینے کی وجہ سے ضیائے برنی نے تاریخ کے دائرہ کو بہت کچھ تنگ کر دیا ہے۔ وہ موضوع تاریخ کے اُس صحیح تصور سے بہت دور ہے جو اس سے کچھ ہی عرصہ بعد ابن خلدون نے قائم کیا اور جس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے وہ بجا طور پر فلسفہ تاریخ کا امام مانا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں ابن خلدون سے بہتر کسی نے موضوع تاریخ کو صحیح طور پر متعین نہیں کیا ہے۔ اس نے تاریخ کی جو تعریف کی ہے اُسے ہم نقل کرتے ہیں اور ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہندی نژاد مورخ کی محدود النظری اور عربی مورخ کی وسیع النظری کا مقابلہ کریں:-

"حقیقۃ التاریخ انہ خبر عن الاجتماع الانسانی الذی ہو عمران العالم، وما یعرض لطبیعۃ ذلک العمران من الاحوال مثل التوحش والتانس والعصبیات واصناف التغلبات للبشر بعضہم علی بعض، وما ینشأ عن ذلک من الملک والدول ومراتبہا وما ینتحلہ البشر باعمالہم ومساعیہم من الکسب والمعاش والعلوم والصنائع وسائر ما یحدث فی ذلک العمران بطبیعتہ من الاحوال"

ابن خلدون کے خیال میں تاریخ کا موضوع اجتماع انسانی و عمران عالم کے حالات ہیں جن کا مطالعہ ارتقائی نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے کہ کس طرح اجتماع انسانی نے وحشت کی حالت سے تمدن کی طرف ترقی کی، کس طرح انسان نے جماعتیں بنائیں، کس طرح ان جماعتوں نے باہمی جنگ و جدل کے بعد ایک دوسرے پر غلبہ پایا، کس طرح مختلف انواع و مدارج کی حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں، کس طرح دوران تمدن میں مختلف قسم کے کاروبار وجود میں آئے اور علوم و صنائع پیدا ہوئے۔ الغرض کس طرح نسل انسانی نے تمدن کے مختلف شعبوں میں قدم رکھا اور ترقیاں کیں۔ ابن خلدون کے نقطہ نظر سے سلطنتوں اور حکومتوں کا قائم ہونا بھی منجملہ تمدن بشری کے دیگر واقعات کے ایک نوع کے واقعات ہیں جو انسان کی تمام زندگی کے تمام حالات پر حاوی نہیں ہیں۔ وہ مورخ کی نظر کو اتنا وسیع کرنا چاہتا ہے کہ اجتماع بشری کے تمام

الات و معاملات اُس کے دائرہ میں آ جائیں اور وہ حیات بشری کے کسی ایک جزیا شعبہ ہی کو تاریخ کا موضوع
رار دینا نہیں چاہتا۔ اُس کے خیال میں محض جنگ و جدل، حوادث، و انقلاباتِ سلاطین و زوال تاج و
نت، اخبار ملوک و وزرا، و اُمرا، زلزلوں، طاعون، قحطوں اور عام مصائب و بلایا اور اہل ظلم و جور
لے مکاید اور اہل طمع کے جرائم استبداد ہی کا نام تاریخ نہیں ہے "

اِنَّ من التاریخ "تعلیل الکائنات و مبادیہا دقیق و علم بکیفیات الوقائع
و اسبابہا عمیق "

ضیائے برنی اور عام مورخین کے اور ابن خلدون کے نقطۂ نظر میں جو اہم فرق ہے وہ یہ ہے کہ
ل الذکر بجائے اجتماع انسانی کے افراد انسانی کو تاریخ کا موضوع قرار دیتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ
اے اجتماع انسانی کی تاریخ کے افراد کے حالات پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ اسی وجہ سے چیزوں کی تہ تک
یں پہنچ سکتے۔ وہ سطح سے آگے نہیں بڑھتے۔ وہ اسباب علل کے پر پیچ سلسلوں کو صحیح طرح نہیں سمجھ سکے
ہ تاریخی واقعات کی صحیح تعبیر نہیں کرسکے۔ وہ اُن مخفی لیکن قوی قوتوں سے بے خبر رہتے ہیں جو پس پردہ
م کرتی اور تبدیلیاں اور انقلاب پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اور جن کے سامنے افراد انسانی اکثر بجائے ذی اختیار
ل ہونے کے محض بساط کے مہرے ہوتے ہیں جن کی حرکتیں فی الواقع بجائے اختیاری ہونے کے
نظراری اور ناگزیر ہوتی ہیں۔

ضیائے برنی پر کیا منحصر ہے تاریخ کا یہ بلند اور صحیح موضوع جو ابن خلدون (متوفی ۸۰۰ھ مطابق ۱۴۰۶ء)
نے قرار دیا ہے، نہ اُس سے پہلے کسی کی نظر میں تھا، نہ کسی نے اس نقطۂ نظر سے تاریخ سے بحث کی تھی۔ اُس
ے بعد بھی دنیا کے بہت ہی کم مورخ ہیں جو تاریخ کا ایسا وسیع اور صحیح موضوع سمجھے اور اُس پر عمل پیرا ہوئے
ل۔ ورنہ عام خیال تو یہی تھا بڑے لوگوں ہی کے حالات اور جنگ و جدل کے واقعات اور خاص قسم کے حوادث
ہ جن سے آگے مورخین قدم نہیں بڑھاتے۔

ہر چند کہ ضیائے برنی کا دائرۂ تاریخ کے صحیح تصور سے بہت بعید اور محدود ہے لیکن اُس دور اور
ہد ما بعد کے اکثر مورخوں کے مقابلہ میں نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے وہ زیادہ وسیع النظر ثابت ہوتا ہے۔

وہ عام حالات کیطرف بہت زیادہ متوجہ ہوا ہے۔ بلاشبہ اُس نے انکا تذکرہ ابن خلدون کے نقطۂ نظر سے نہیں کیا ہے۔ لیکن اُسکی تاریخ سے اُس قسم کی تاریخ مرتب کرنے میں جو عمران عالم اور اجتماع بشری سے بحث کرے قیمتی مدد حاصل ہو سکتی ہے۔ اُس نے انتظامات، طبقات، مشاہیر اور وقائع عامہ کے بیان میں صفحات کے صفحات لکھے ہیں اور ان چیزوں کا تذکرہ تاریخ کے موضوع میں داخل سمجھا ہے۔ ضیائے برنی اس لحاظ سے اپنے پیشرو ہندوستانی مورخوں منہاج اور نظامی سے بدرجہا فائق ہے۔ نظامی زیادہ تر الفاظ کا دلدادہ اور انشاء پردازی میں محو ہے جس نے واقعات کے بیان کرنے میں انشاء دیبانہ کمال دکھانا چاہا ہے۔ اور زیادہ تر ملک گیری کے واقعات تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ منہاج کا بیان سادہ اور بے تصنع لیکن خشک ہے۔ بہ نسبت مورخ کے میں اسے اور نظامی کو وقائع نگار کی حیثیت دیتا ہوں جنہوں نے زیادہ تر بادشاہوں کے حالات وحوادث کے بیان پر اکتفا کی ہے۔ وسعت نظر کے لحاظ سے بعد کے مورخوں میں صرف عالی ظرف اور روشن خیال ابوالفضل مصنف آئین اکبری کو ضیائے برنی پر بین فوقیت حاصل ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابوالفضل بھی ابن خلدون کیطرح ایک غیر معمولی حیثیت کا مصنف ہے اور اُسکی آئین اکبری بھی ابن خلدون کے مقدمہ کی طرح اپنی نوعیت کی ایک ہی چیز ہے، جس کی مثال اس سے پہلے دکھائی نہیں دیتی۔

حدود تاریخ کے مخصوص ومحدود تصور کیوجہ سے ضیائے برنی کے ذہن میں تاریخ کے منافع بھی اُسی نوعیت کے ہیں:۔

(۱) کتب سماوی میں بعض انبیاء وسلاطین کے اخبار وآثار موجود ہیں علم تاریخ کا بھی یہی موضوع ہے اور دونوں کا مقصد اولوالابصار کی عبرت ہے:۔

"وعلم تاریخ ہمیں علم است کہ سرمایۂ اعتبار اولوالابصار می گردد" (صفحہ ۱۰)

(۲) حدیث اور تاریخ کا نہایت قریبی تعلق ہے اور محدث کے لئے مورخ ہونا ضروری ہے۔

(۳) علم تاریخ سے عقل وشعور حاصل ہوتے اور رائے کو تدبیر ومدد ملتی ہے۔

(۴) بادشاہوں کو اس کے مطالعہ سے مفید سبق حاصل ہوتے ہیں اور وہ نازک سے نازک

موقعوں پر ثابت قدم رہنا سیکھتے ہیں۔

(۵) انبیاء کے حالات پڑھکر صبر و رضا کی تعلیم ملتی ہے۔

(۶) علم تاریخ کے مطالعہ سے اچھے لوگوں کے حالات پڑھکر اچھے لوگوں کے خصائل ذہنشین ہوتے اور بُرے لوگوں کی خرابیاں دیکھکر بری باتوں سے نفرت ہوتی ہے۔(۱۱-۱۳)

(۷) مورخ جن لوگوں کے حالات لکھتا ہے انکے ہمیشہ کے لئے نام اور شہرت قائم کردیتا ہے۔ (صفحہ ۱۶-۱۷)

(۸) تاریخ کے مطالعہ سے یہ اخلاقی سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ "بدی کا نتیجہ بدی اور نیکی کا نتیجہ نیکی ہے"!

تاریخ کے موضوع اور فوائد سے بحث کرنیکے بعد وہ تاریخ نگاری کی شرائط سے بحث کرتا ہے۔ وہ مورخ کا سب سے مقدم فرض راستبازی اور راست نگاری قرار دیتا ہے اور اسی وجہ سے ہر شخص کو وہ تاریخ لکھنے کا اہل نہیں سمجھتا۔ اُس کے خیال میں مورخ کے لئے دیندار ہونا بھی ضروری ہے۔ اس بحث پر اُس کے آراء ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:-

"مؤلف تاریخ ہم از اہل اعتبار باید و ہم بصدق و عدالت مشہور و مذکور باید، تا در نوشتہ بے سند او اعتقاد مطالعہ کنندگان راسخ گردد۔ و در میان معتبران اعتبار گیرد (صفحہ ۱۱)

"و نیز مورخ چنانکہ از اکابر و معارف می باید سلامتی دین و مذہب او ہم شرط نوشتن است (صفحہ ۱۴)

"و شرطے کہ از لوازم تاریخ نویسی است آنست کہ بر مورخ از روئے دینداری واجب و لازم است کہ اگر فضائل و خیرات و عدل و احسان بادشاہے و بزرگے نبلیسد بایدکہ قبائح در زایل او را مستور ندارد و طریقۂ مداہنت در نوشتن تاریخ معمول نکند و اگر مصلحت بیند بصریح والا برمز و اشارت و کنایت زیرکان و فہیماں را بیاگاہاند، و اگر از خوفے و ہراسے ساوی ہم عصر و ہم عہد نتواند نوشت در آں معذور بود ولیکن از گذشتگاں باید کہ راستا راست

نویسد۔ واگر مورخ را در عہدے وعصرے از پادشاہے ویا از وزیرے وبزرگے گوشۂ گوشمالے
رسیدہ باشد، یا نوازشے ونواختے ویا زیادتی یافتہ، باید کہ در دوران تالیف تاریخ لطف وقہر و
نوازش وگذارش کسے از بزرگان منظور او نبود تا از نتائج آں برخلاف راستی فضیلتے ورذیلتے
نابودہ ومعاملہ وماجرائے ناگذشتہ در قلم آرد بلکہ منظور مورخ دیناً واعتقاداً وصدقاً ونہ بنا
نوشتن راستی ودرستی باشد۔ وبرمورخ واجب ولازم است کہ از طریق وطریقت کذابان و
مداحان ومبالغہ کنندگان وشاعران دروغ زنان وسمر آرایان احتراز کلی واجب شناسد
کہ طوائف مذکور زہرمہرہ را یاقوت لعل گویند وازطمع خود سنگریزہ را جوہر گرانمایہ نام نہند۔ و
احسن نوشتہا واختراعہائے ایشاں اکذب ایشاں باشد۔ . . . فردائے قیامت مولف
کذاب بہ سخت ترین عذاب وعقاب ماند" (صفحہ ۱۵-۱۶)

اس طویل خطبہ کے اخیر میں جس میں کہ موضوع ومنافع وشرائط تاریخ بیان کئے گئے ہیں ضیائے برنی نے اس طرح اپنی کتاب کی خوبیوں کو سراہا اور اپنی سچائی کا یقین دلایا ہے:۔

"ومن در نوشتن تاریخ مذکور زحمت بسیار دیدہ ام واز منصفان انصافہا توقع می کنم کہ ایں
کتاب بے معانی را جامع است کہ اگر ایں تالیف را تاریخ خوانند اخبار سلاطین دریابند واگر
دریں تالیف احکام وانتظام والتیام جویند از انہم خالی نیابند، واگر دریں تالیف مواعظ
ونصائح جہانبانان وجہانداران طلبند بیشتر وبہتر از تالیفات دیگر مطالعہ فرمایند۔
وازانچہ ہرچہ نوشتہ ام راست ودرست نوشتہ ام ایں تاریخ واجب الاعتبار است
وازانکہ در الفاظ موجز معانی بسیار درج کردہ ام واجب الاقتدا است" (صفحہ ۲۳)

پھر ایک اور جگہ لکھتا ہے:۔

"ومنکہ ضیائے برنی مولف تاریخ فیروزشاہیم دریں تالیف ساحریہا کردہ وانم ودانایان علم
تاریخ نیمرنغ وکیمیا شدہ اندہم دانند کہ ہزار سال باز مثل تاریخ فیروزشاہی کہ جامع اخبار و
احکام جہانبانی است ہیچ مورخ را دست ندادہ است۔ آہ چہ کنم وبیش کہ نالم وداد ہمت

کہ عرضہ دارم کہ تا ایں تاریخ با تواریخ دیگر مقابلہ وموازنہ فرماید و انصاف سخن خوردن من بدہد کہ ہر سطرے بلکہ ہر کلمہ لطائف و غرائب احکام انتظامی در ضمن اخبار و آثار سلاطین درج کردم و منافع و مضار جہانداری جہانداران چہ بصریح و چہ بکنایت و چہ بعبارت و چہ باشارت و چہ کشادہ و چہ برمز آوردہ ۔" (صفحہ ۱۲۳-۱۲۴)

اس کے بعد اس نے نہایت حسرت کے ساتھ اپنے ملک میں تاریخ جاننے والوں اور اس کی قدر و قیمت پہچاننے والوں اور حق شناسوں کے فقدان پر ماتم کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر جمشید و کیخسرو اور نوشیرواں و پرویز زندہ ہوتے اور اس تاریخ کے مقابلہ میں شہر انعام دیتے تو راضی نہ ہوتا اور ناز کرتا پھر کہتا ہے کہ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو کاش ارسطاطالیس اور بزرجمہر ہی اس کتاب پر نظر ڈال سکتے، تاکہ میرے حق میں انصاف و تحسین کرتے اور اگر یہ بھی تمنا نے دیا نہ ہے تو ایسی تاریخ سلطان محمود اور سلطان سنجر کے زمانہ میں تصنیف ہوتی کہ تاریخ اور مورخ کی عزت بلاد و ممالک اسلام میں روشن ہوتی ۔ ان سب حسرتوں سے بڑھکر یہ حسرت ہے کہ بادشاہ عہد (سلطان فیروز) علم تاریخ سے شغف رکھتا ہے، لیکن مورخ معتوبین میں ہونیکی وجہ سے اس کتاب کو اس کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ اخیر میں لکھتا ہے کہ میری سب حسرتیں جاتی رہیں گی اگر بادشاہ ایک نظر اس کتاب کو دیکھ لیگا ۔ (صفحہ ۱۲۴-۱۲۵)

حقیقت یہ ہے کہ ضیاء برنی نے اپنے ملک میں فن تاریخ کی ناقدری کی جو کچھ شکایت کی ہے حق بجانب ہے طبقات ناصری کی تصنیف سے پورے سو برس بعد تاریخ فیروز شاہی لکھی گئی اور اس دوران میں کوئی مصنف ایسا نہیں ہوا جو فی الواقع ہندوستان کی تاریخ بحیثیت تاریخ لکھتا ۔ ضیاء برنی کے بعد بھی برسوں تک ہندوستان میں کوئی مورخ نہیں ہوا اور فیروز شاہ ضیاء برنی کے انتقال کے بعد بھی حسرت میں رہا کہ اس کے عہد کی تاریخ لکھی جائے، لیکن کوئی شخص اس کام کا اہل نہیں ملا شمس سراج عفیف نے جو تاریخ لکھی وہ اس بادشاہ اور تیمور کے حملے کے بعد لکھی جس میں اس نے بعض دیگر سلاطین ماسبق و مابعد کے حالات کے علاوہ سلطان فیروز شاہ کی تاریخ بھی لکھی ہے اور وہ بھی تاریخ فیروز شاہی کے نام سے مشہور ہے یہ کتاب بدقسمتی سے مکمل دستیاب نہیں ہوتی اور یہ خیال جو عام طور پر متداول ہے غلط ہے کہ

اس مورخ نے صرف فیروز شاہ کا حال لکھا تھا عفیف ایک عجیب مورخ ہے اور اس نے اپنی کتاب میں حالات کیطرف بھی توجہ کی ہے۔ شمس سراج عفیف کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان فیروز کو تاریخ سے خاص شغف تھا۔ فیروز شاہ ایک تعلیم یافتہ بادشاہ تھا لیکن ہمارے خیال میں علمی حیثیت سے اس کا عہد چنداں ممتاز نہیں، حالانکہ اس کی نیکدلی کیوجہ سے اس کا عہد زیادہ تر امن وامان میں گزرا جس کی یہ تمنا کہ اس کے عہد کی تاریخ قلمبند ہو جائے پوری نہیں ہوئی تو بالآخر اس نے اپنی زبان سے کچھ قلمبند کرکے پتھر میں کندہ کرا دئے اور فیروزآباد کے اندر منار ہائے سنگین (اشوک بادشاہ کے لاٹھ) اور کوشک شکار اور کوشک نزول کی عمارتوں میں گنبدوں کے گرداگرد لگا دئے جن میں اپنے کچھ حالات بیان کئے تھے:۔

"واندراں ایام کہ خدمت مولنا ضیاءالدین برنی علیہ الرحمۃ والغفران مورخ تاریخ فیروز شاہی برحمت حق پیوستہ حضرت فیروز شاہی برائے کتابت تاریخ خود بر ہر یک عامل اسرار دل خود گفتہ کہ بغیر مورخ موثق این نگارنیں دریں گلزار ہیچ کسے بافضل سے بستن نتوانستہ۔

چوں حضرت شاہ فیروز از کتابت تواریخ عہد دولت خود نا امید گشتہ ضرورۃً از زبان خویش از کثرت ہوس و عمارت کوشک شکار و در گنبد ہائے کوشک نزول و عمارت منارہ سنگین کہ در کوشک شکار و درون فیروزآباد و داشتہ اند در سنگ او نقرہ کنانیدہ۔ و مضمون آں بریں جملہ نویسانید کہ ایں چنیں شکار پیلان بافلیم وہم چنیں پیلان آوردیم وایں چنیں رعنائیہا نمودیم ایں ہمہ چہ بود تا میاں جہاں وجہانیاں وعالم وعالمیان ایں ہمہ تفاخر بر پیش اہل بصائر یادگار ماند، وخلائق جہاں وعاملان دوراں عبرت گیرند۔

(تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال صفحہ ۱۷۷)

تاریخ کا فن ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ آیا، اس سے پہلے اس ملک میں تاریخ کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا۔ ہندوستان کے علماء نے بعض دیگر علوم مثلاً الہیات اور ریاضیات میں حیرت انگیز ترقیاں کیں، لیکن تاریخ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ مسلمان بھی جس وقت وسط ایشیا سے شمالی ہندوستان

میں داخل ہوئے اور دہلی کی سلطنت قائم ہوئی مسلمانوں کا وسط ایشیا کے ملکوں میں علمی و ذہنی انحطاط شروع ہو چکا تھا اور تاریخ کی قدیم شاندار روایتیں ماند پڑ چکی تھیں، اس وقت تک فن تاریخ میں مسلمانوں میں بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہو چکی تھیں (مثلاً طبری اور البیرونی) اور مغربی ممالک اسلام میں جہاں عربی زبان رائج تھی تاریخ کی شاندار روایت عرصہ تک محو نہیں ہوئی بلکہ آٹھویں صدی کے اخیر اور نویں صدی کے آغاز میں ابن خلدون ہوا جو مسلمانوں کے مورخین میں ممتاز ترین ہستی رکھتا ہے۔ مشرقی ممالک میں جہاں فارسی زبان رائج ہو چکی تھی اور کتب تواریخ بھی اسی زبان میں لکھی جانے لگی تھیں تاریخ کا معیار روز بروز پست ہوتا گیا، ہندوستان میں مسلمان آئے تو ایسی حالت میں کہ وہ تاریخ نویسی کے اعلیٰ معیار کو فراموش کئے ہوئے تھے اور ان کا سابقہ پڑا تو ایسے ملک سے جہاں پہلے ہی سے اس فن کا رواج نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں تاریخیں لکھی گئیں لیکن اعلیٰ معیار سے نیچے۔ مورخ ہوئے لیکن کم اور مدت اور مدت کے بعد محض واقعہ نگار کی حیثیت سے بھی دیکھو تو ہمارے ہندوستان کے مورخ، منہاج، حسن نظامی، ضیائے برنی اور شمس سراج اپنے پیشرو مورخین ابوالفضل بیہقی اور البیرونی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ نہ ان سے کوئی محض واقعہ نگار کی حیثیت سے اپنے معاصرین ابن الاثیر اور ابن خلدون ہی کو پہنچتا ہے۔

اپنے زمانہ میں ہندوستان میں تاریخ کی طرف سے بے توجہی اور بے اہتمامی کا ضیائے برنی نے اپنی کتاب میں کئی جگہ ذکر کیا ہے:۔

"و دریں ایام کہ من تاریخ فیروزشاہی می نویسم ہفتاد سال از نقل سلطان بلبن گذشتہ است ... بے اہتمامی و بیہوشی علم تاریخ بجائے رسیدہ است کہ از اہل علم و یا از خداوندگان شمشیر و شجاعت کسے در نظر نمی آید کہ او را اخبار و آثار جہانداری سلطان بلبن روشن بود و یا در دانستن و شنیدن اخبار او یا از آں سلاطین ماضیہ کہ بر تخت گاہ دارالملک دہلی پیش از سلطان بلبن و بعد از و بودند ہوسے باشد فضلاً از دانستن و شنیدن اخبار و آثار سلاطین ماضیہ اقالیم دیگر ....

در بزرگان دین و دولت عہد و عصر آرزوئے دانستن و شنیدن اخبار بزرگان سلف معاینہ کنم حال من وعقد گار من کہ ازیں علم بہرہ دارم و دریں علم رنجے بردہ ام چہ شود ... (برنی صفحہ ۱۳-۱۴)

ضیائے برنی نے اپنی تاریخ کو سلیس، عام فہم عبارت میں لکھا ہے لیکن اُسکا طرز تحریر باوجود سہل ہونیکے تکرار لفظی ومعنوی اور خطابت کیطرف مائل ہے۔ باوجود اس کے اسکا طرز تحریر لفظی اور معنوی تصنعات سے بری ہونیکی وجہ سے فارسی مورخوں میں بسا غنیمت ہے کبھی کبھی اُس کا بیان رنگین ہو جاتا ہے اور ادبی شان اور شاعرانہ تخئیل پیدا کر لیتا ہے۔ اسکی زبان کے متعلق اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں ہندوستانی محاورات کا اثر پایا جاتا ہے۔ یہ اعتراض درست ہے۔ وہ ہندوستانی نژاد تھا۔ ہندوستان کی فارسی پر سو برس کے اندر ہندی زبان کا بہت کچھ اثر پڑا تھا۔ وہ مسلمان جو یہاں بود و باش اختیار کر چکے تھے ضرور ایک قسم کی ملی جلی زبان بولنے لگے تھے جو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی الفاظ کی آمیزش سے بنی تھی اور جس نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے اردو کی شکل اختیار کر لی۔ اس روزمرہ کی زبان کا ہندوستان کی فارسی پر اثر پڑنا چاہئے تھا اور پڑا۔ خسرو کی زبان میں بھی اس کا اثر ملتا ہے گو اس کے متعلق کسی اہل زبان کو مجال دم زدن نہیں ہے۔ ہندوستان کے فارسی شعرا اور نثر نگاروں کی تحریرات میں ہندی الفاظ ملتے ہیں بعض اوقات ایسے محاورات بھی ہوتے ہیں جو ہندی زبان سے فارسی میں ڈھالے گئے ہیں اور اُنکے ہندوستانی ہونیکا پتہ دیتے ہیں۔ یہی حال ضیائے برنی کا ہے۔ ہمیں اس طرز بیان کے متعلق نہ شرمندہ ہونیکی ضرورت ہے نہ اُس کے لئے معذرت درکار ہے نہ اخفا کی حاجت ہے۔ زبان بھی انسان کے دیگر معاملات کی طرح متغیر ہونیوالی چیز ہے اور ماحول سے بہت جلد متاثر ہوتی اور تبدیلیاں اختیار کرتی ہے۔ ہندوستان کی فارسی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اُسی نہج سے ایک مورخ اُسے دیکھنے پر مجبور ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اُس زبان کو بیقدری یا بے عزتی کی نظر سے دیکھیں۔ وہ اسی طرح متغیر ہوتی رہی جس طرح کہ ہم رفتہ رفتہ ہندوستان میں متغیر ہوتے رہے۔ یہ تغیرات ناگزیر تھے اور اُنکے متعلق افسوس کرنا بالکل نامناسب اور بیجا ہے۔

ضیائے برنی کی رنگین بیانی، ادبیانہ پرواز اور شاعرانہ تخئیل کا ہمارے خیال میں بہترین نمونہ تاریخ فیروز شاہی کا وہ مقام ہے جہاں اُس نے بلبن کے رنگیلے جانشین سلطان معز الدین کیقباد کی عیش پرستیوں کا نقشہ کھینچا ہے وہ خود اُس عہد میں بچہ تھا اور سن شعور کو نہیں پہنچا تھا جو کچھ اُس نے لکھا ہے اس میں تخیلہ سے کام لیا ہے۔ یہ مقام جو طویل ہونے کی وجہ سے پورا انتخاب نہیں کیا جاسکتا اصل کتاب میں پڑھنا

چاہئے (صفحہ ۱۵۶-۱۶۵) ضیائے برنی نے اس پر بڑا ناز کیا ہے اور اپنی انشا پردازی کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہوئے اُسکا "قبتہ التواریخ" نام رکھا ہے۔

ہیں چند دستے کہ در اخبار و آثار معزی نوشتہ ام و اوراق اخبار عیش و عشرت او را و ہم عصران او "قبتہ التواریخ" نام کردہ۔ معانی غزلہائے دیوانی در وصف جمال خوبرویاں درج گردانیدہ" (صفحہ ۱۲۶)

سلطان معزالدین کیقباد بلبن کا پوتا تھا۔ اُسکا باپ سلطان ناصرالدین بغرا خاں بلبن کی وفات کے وقت بنگال میں حاکم تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں کیقباد دہلی میں بادشاہ بنا دیا گیا۔ بعد میں باپ بیٹے میں تخت سلطنت کے لئے نزاع ہوا لیکن بالآخر صلح ہوگئی۔ اور باپ نے بیٹے کو دہلی کا بادشاہ مان لیا۔ اس تمام قصہ کو خسرو نے قران السعدین میں لکھا ہے۔ وداعی ملاقات کے وقت باپ نے اپنے نوجوان اور عیش پرست بیٹے کو نصیحتیں کیں اور عیاشیوں سے روکنا چاہا۔ کچھ دن بیٹا اپنے باپ کی نصیحتوں پر عمل کرتا رہا لیکن بالآخر پھر عیش و عشرت کا شکار ہوگیا۔ ضیائے برنی نے دکھلایا ہے کہ کس طرح بادشاہ اس جال میں دوبارہ پھنستا چلا گیا۔

بادشاہ کے عیش و طرب کی شہرت پہلے سے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اطراف و جوانب ملک سے گروہا گروہ ارباب نشاط دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ اب جو بادشاہ کے تائب ہونیکا حال معلوم ہوا تو ایک کھلبلی مچ گئی۔ بالآخر ایک دن ایک ماہ رو شوخ و شنگ، بلائے پیرہاں اور آفت بے بدل" قبائے زرنگاری پہنے ترکش زرانداز کمر سے باندھے، خیزرکی دم ترکش میں لٹکائے، کلاہ شاہانہ نیمہ گوش تک سر پر رکھے، اسپ سبز خنگ دم برافراشتہ پر جو ساز طلا سے مرصع تھا سوار زندہ ہزار میں پہنے، چابک سوار شکار انداز کی شکل میں پریم پیادہ گھوڑے کے سینہ پر لٹکائے" خوش سے نکلا اور گھوڑے کو کودانے پھاندنے لگا اور بادشاہ کے مقابل جا پہونچا۔ اُس کے حسن کو دیکھکر سب مدہوش رہ گئے کوئی روک نہ سکا۔ وہ فوراً گھوڑے سے اتر کر بادشاہ کے گھوڑے کے سامنے لوٹ گیا اور نہایت دلکش آواز میں یہ بیت پڑھی۔

"گر قدم بر چشم ما خواہی نہاد دیدہ بر رہ می نہم تا می روی"

اور کہنے لگا "شاہجہاں اس غزل کا مطلع زیادہ مناسب حال ہے لیکن خوف شاہی سے پڑھنے کی ہمت نہیں رکھتا"

بادشاہ اسے دیکھکر وارفتہ ہو گیا اور اُسے اجازت دیدی۔ اُس نے فوراً یہ شعر پڑھا۔

سرو سیمینا بصحرا می روی　　　　نیک و بد عہدی کہ بے ما می روی

پھر کیا تھا۔ تو بہ ختم ہوئی فوراً شراب طلب ہوئی اور بادشاہ نے جام شاہی ہاتھ میں لیکر یہ شعر پڑھا۔

شب زمے توبہ کنم از بیم ناز شاہداں　　　　بامداداں روئے ساقی باز در کار آورد

غرض اس قصہ کو کہاں تک لکھا جائے اُس پری رو نے جب بادشاہ کو والہ و شیفتہ دیکھا تو بادشاہ سے سفارش کی کہ اور بھی بہت سے میرے ساتھی ہیں جو نوازش کے منتظر ہیں انہیں بھی باریخشا جائے۔ جشم زدن میں عیش و عشرت کا بازار گرم ہو گیا (صفحہ ۱۶۱-۱۶۵) جس کا ضیائے برنی نے ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ واقعی قابل دید ہے:۔

"فرمان شد تا آں طائفہ را پیش آوردند۔ چوں در جمال ایشاں نظر انداختند یکے از یکے خوبتر زیبا تر و نغز و شیریں تر بودند چوں در سرود و پاکوفتن در آمدند حاضران مجلس ما از نظارہ آں ل بہوشاں حور پیکر و از کرشمہ آں خوباں ماہ منظر و از نیک روئی آں سرو قدمستان مایۂ ناز و از تنگ و آں گلعذاراں جاں نواز حیرت روئے نمود۔ و سلطان ما از شوخی آں رہ دیدگان عجب آمدہ گو و از لطیفہ گفتن آں زرد با زاں عربدہ جو و از پاکوفتن آں دلربایاں سیمیں ساق و از رباب زدن آں جاں نوازاں نیک آواز پند پدر فراموش شد۔۔۔۔۔ و از نرد تیطرنج باختن آں مہ پیکراں و گرہ بازی کعبتین غلطانیدن آں بہراں آشفتہ تر و مدہوش تر می شد۔۔۔۔۔ و در ہر منزلیکہ سرا پردۂ سلطانی بر آوردند از ہر چہار جانب سرا پچہا بانگ از خوبرویاں خوش آواز بر می آمد و از صوت ناز دلنوازشاں زہرہ در سویم آسماں معلق می زد۔۔۔۔۔ و از زاریدن چنگ و رباب و نالش کمانچہ و نالہ مُل و نائے دلنواز ایشاں مرغ از ہوا فرود می آمد و حوش مدہوش می شد۔۔۔۔۔

وازسرود آں سادہ پسران چہارابرو وازرقص آں پاکوباں عربدہ جو وازکرشمہ آں پزیکان دلربا وازغمزۂ آں پرجفایان بے وفا خوب طبعان لشکر وسربازان ولاور دیوانہ وعاشق می شدند ودرصفت آں خوبان تازہ وترغزلہائے جدیدی گفتند، وجوانان آشفتہ خوئے و آشفتگان دیوانہ روپیراہنہا ضرب می کردند وجدہا می بریدند، وقرار وسکون ازدلہائے بیدلاں می پرید وفریاد عاشقان دل باد دادہ بآسماں می رسید۔

وہرخرچے کہ عاشق پیشگاں بے سروساماں درکیسہ ہمیان داشتند درتماشائے آں جاں نوازان دلربا برسرایشاں نثار کردند ودلدادگان بے خان وماں اسپ وسلاح وغلام وکنیزک وخیمہ دستوری فروختند ودرزیر پائے خوباں می ریختند۔ . . . مسکین عاشقان مستمند را ازغلبہ ہوائے بتان آدمی رو وازشوق لقائے سادہ پسران بدخور وخواب خورفراموش گشتہ۔ روزہمہ روزبیہوش می بودند وشب ہمہ شب مدہوش ماندند۔

وازسخن مسخرگاں وبھنڈائی بھنڈان (بھانڈ) وبوالعجبی بازیگران وبے شرمی داستان کہ ازاطراف ممالک بدرگاہ رسیدہ بودند دراطراف سرائچہائے سلطانی بازیہا می کردند و ہنرہائے خود می نمودند وداد سخن می دادند ونادختی وبھنڈائی را بہ نہایت می رسانیدند از ہرطرف خندہائے قہقہہ برمی آمد ونظارگیان راحیرت رو نمود . . . . شہریاں رادرہوائے آں رقصان ودرعیش آں سروقامتان ماہ ہا صرف شد ملک ہا درگرو افتاد وخانہا وسرہا ازدست رفت ووامہا برگردن آمد۔ وملک زادگان دیوانہ شدند وخواجہ زادگان آشفتہ گشتند۔ ملتانی بچگان ازبود وسودا بازافتادند وتوانگرزادگان رااجلاس روئے نمود وبے خانماں شدگان راہ لکھنوتی گرفتند وعاقلاں شیدا شدند، وعالماں درمعصیت افتادند، وزاہداں ازتعبد دست برداشتند وعابداں درخمارخانہا گرفتند وننگ ونام ازجہاں برفت . . . . ودرقبہا شراب سبیل کردہ بودند وخمہائے تمر فرو بردہ . . صفحہ ۱۹۴ ‏(۱۹۵)

ضیائے برنی نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ ابتدائے آدم کے وقت سے لیکر اپنے عہد تک کی

تاریخ لکھنا چاہتا تھا لیکن طبقات ناصری کے ہوتے ہوئے جو اسی قسم کی عام تاریخ ہے اُس نے اس ارادہ کو ترک کر دیا اور صرف دارالملک دہلی کے آٹھ اخیر بادشاہوں کی تاریخ جن کی سلطنت کا بیان طبقات ناصری میں نہیں تھا لکھا گیا۔ فیروز شاہی میں حسب ذیل سلاطین دہلی کی تاریخ ہے۔

(۱) سلطان غیاث الدین بلبن	بیس برس	(۶۶۴-۶۸۶ھ ۱۲۶۶-۱۲۸۷ء)
(۲) سلطان معزالدین کیقباد	تین برس	(۶۸۶-۶۸۹ھ ۱۲۸۷-۱۲۹۰ء)
(۳) سلطان جلال الدین خلجی	۷ برس	(۶۸۹-۶۹۵ھ ۱۲۹۰-۱۲۹۶ء)
(۴) سلطان علاء الدین خلجی	بیس برس	(۶۹۵-۷۱۵ھ ۱۲۹۶-۱۳۱۶ء)
(۵) سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی	۴ برس ۴ ماہ	(۷۱۶-۷۲۰ھ ۱۳۱۶-۱۳۲۱ء)
(۶) سلطان غیاث الدین تغلق	۴ برس چند ماہ	(۷۲۰-۷۲۵ھ ۱۳۲۱-۱۳۲۵ء)
(۷) سلطان محمد بن تغلق	۲۷ برس	(۷۲۵-۷۵۲ھ ۱۳۲۵-۱۳۵۱ء)
(۸) سلطان فیروز شاہ	۶ برس (ابتدائی)	(۷۵۲-۷۵۸ھ ۱۳۵۱-۱۳۵۷ء) (صفحہ ۲۲-۲)

ضیائے برنی نے اپنے تاریخ کے ذرائع معلومات اس طرح بیان کئے ہیں کہ بلبن کی تاریخ اس نے اپنے باپ اور دادا سے جو اُس بادشاہ کے زمانہ میں معزز عہدوں پر فائز تھے نیز دیگر سربرآوردہ اشخاص سے جو اس کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے سنکر لکھے ہیں:۔

"آنچہ ایں ضعیف از اخبار و آثار سلطان غیاث الدین بلبن در تاریخ آوردہ است از پدر و جد خود استماع دارد و از ایشاں کہ در عہد او اصحاب اشتغال خطیرہ بودہ اند کیفیت ملک داری او شنیدہ است"
(صفحہ ۲۵)

معزالدین کیقباد کی تاریخ اپنے باپ مؤیدالملک اور اپنے استادوں سے سنے ہوئے واقعات کی بنا پر لکھی ہے:۔

"ایں ضعیف در جلوس سلطان معزالدین کیقباد نبیسہ سلطان بلبن خوردسال بودہ است، وآنچہ اخبار و آثار جہانداری او دریں تاریخ بیشتر ترا از مؤیدالملک پدر خود و از استادان خود کہ علامہ

روزگار بود تدساع دارد (صفحہ ۱۲۷)

سلطان جلال الدین خلجی کے عہد سے لیکر اخیر تک اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر لکھا ہے۔

"آنچہ ایں ضعیف در اخبار و آثار جلالی و علائی و تا آخر دریں تاریخ نوشتہ است، برحکم شاہدہ و معائنہ در قلم آوردہ" (صفحہ ۱۷۵)

اسی طرح ضیائے برنی کی کل تاریخ زبانی روایات اور ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ اُس نے اس کتاب کے لکھنے میں دوسری کتابوں یا معاصر مصنفوں سے نقل نہیں کی ہے۔

اس طریق تصنیف کا اُس کی کتاب پر بین اثر پڑا ہے۔ وہ ایک محقق مدقق کی طرح پر جس نے تمام جزئیات کا کامل تفحص کیا ہو اور ہر ہر واقعہ کے متعلق علمی تحقیقات انجام دی ہوں نہیں لکھتا، نہ وہ اپنی یا دوسروں کی تحریری یادداشتیں نہیں رکھتا ہے جس سے استفادہ کرسکے۔ وہ ایک عام داستان گو کے طریق پر اپنی تاریخ لکھتا ہے جس کی وجہ سے اسکا بیان شگفتہ رواں اور دلچسپ ہے۔ وہ واقعات کو بنظر مجموعی دیکھتا اور عام حیثیت سے لکھتا ہے۔ اُس کے بیان میں اسکا انداز بہ نسبت ایک وقائع نویس کے ایک عام مورخ کا ہے جو ترتیب واقعات اور استقصائے جزئیات کے متعلق تو زیادہ فکر نہیں کرتا لیکن مجموعی اور عام تصورات کو پیش نظر رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے تاریخ کی اس نوعیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ چنانچہ محمد تغلق کے عہد میں وہ لکھتا ہے:-

"من دریں تاریخ کلیات مصالح جہانداری و اہمات امور ملک داری سلطان محمد نبشتہ و در تقدیم و تاخیر بر نتیج ماول و آخر ہر سرگذشتے و فتنہ وحادثہ نظر نینداختہ و ترتیب و نسق مراعات نمودہ کہ اہل دانش را از مطالعہ کلیات مصالح جہانداری و اہمات امور ملک رانی اعتبار حاصل شدنی است . . . . " (صفحہ ۴۶۷)

ضیائے برنی کے اس انداز بیان اور طریق تاریخ نگاری کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ باوجود راستباز ہونے کے جابجا غلطیاں کر گیا ہے۔ وہ اپنی تاریخ میں تاریخوں اور سنین کو بہت کم لکھتا ہے اور غالباً جو سنین و تواریخ لکھی ہیں وہ زبانی یادداشت سے لکھی گئی ہیں اسی وجہ سے سنین اور واقعات کی ترتیب میں جابجا اُس کے بیانات غلط ہیں۔ بعض واقعات کے متعلق اُس کی اطلاعات بہت تھوڑی اور نا تمام ہیں بعض واقعات جو لکھ

جانے کے قابل تھے نظرانداز ہوگئے ہیں۔ اُس نے تاریخ کا اصلی مقصد بجائے صحت و ترتیب واقعات کے محض علمی یعنی اخلاق آموزی قرار دیا ہے۔ اگر بجائے زبانی اطلاعات اور ذاتی معلومات پر اکتفا کر لینے کے وہ علمی تفحص اور تحقیقات سے بھی کام لیتا تو وہ ان نقائص سے بڑی حد تک محفوظ رہ سکتا۔ یہ سچ ہے کہ اُس کے سامنے ایسی کتابیں نہ تھیں جو صحیح معنی میں اس دور کی تاریخیں کہی جا سکتیں لیکن معاصر مصنفین کی ایسی کتابیں موجود تھیں جن سے استفادہ کر کے واقعات کی تصحیح ہو سکتی اور مزید معلومات بہم پہنچ سکتی تھیں۔ خود اس کے دوست خسرو کی کتابیں بلبن کے عہد سے لیکر غیاث الدین تغلق کے وقت تک کار آمد ہو سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ بعض دیگر مصنفین مثلاً کبیر الدین عراقی مصنف فتحنامہائے علائی (صفحہ ۱۲) سے وہ مدد لے سکتا تھا لیکن اُس نے اس طرف کبھی توجہ نہیں کی جو افسوسناک ہے۔ خسرو کے علاوہ دیگر مصنفین عہد کی کتابیں بالعموم تلف ہو چکی ہیں اور جو سہولت ضیائے برنی کو ہو سکتی تھی وہ اب مفقود ہے۔

ضیائے برنی کی ہر قسم کی غلطیوں اور کمیوں کو بالتفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس بحث کو ہم اُس کتاب کے لئے محفوظ رکھتے ہیں جس کا ہم نے اس مضمون کے تمہید میں ذکر کیا ہے۔ محض مثال کے طور پر چند باتیں لکھے دیتے ہیں۔ بلبن کا سنہ جلوس اس نے ۶۶۲ھ بتایا ہے، حالانکہ صحیح ۶۶۴ھ ہے۔ کیقباد کا ۶۸۵ھ لکھا ہے حالانکہ صحیح ۶۸۶ھ ہے، جلال الدین خلجی کا ۶۸۸ھ لکھا ہے حالانکہ صحیح ۶۸۹ھ ہے۔ اُس نے عہد علائی کی فتوحات دکن کو جو اُس عہد کی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور دلچسپ حصہ ہیں چند الفاظ میں بیان کر کے چھوڑ دیا ہے۔ اُس نے اسی عہد کے مغلوں کے تمام حملوں کا ذکر نہیں کیا۔ محمد تغلق کے عہد کے واقعات میں بڑی بے ترتیبی اور غلطیاں پائی جاتی ہیں جن کی تصحیح ابن بطوطہ کے بیانات سے ہو جاتی ہے (دیکھو دیباچہ انگریزی ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم مترجمہ خانصاحب مولوی محمد حسین مرحوم مطبوعہ دارالاشاعت پنجاب صفحہ ۱۰۹۰)، بلبن کا عہد پورے طور پر جانچے جانے کے قابل ہے۔

ضیائے برنی جیسا کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں تاریخ کو علمی فوائد کا آلہ بنانا چاہتا ہے۔ وہ تاریخ کو تجربہ، اور مواعظ و عبرت کا خزانہ سمجھتا ہے اُس کا میلان وعظ گوئی اور پند آموزی کی طرف ہے۔ وہ جا بجا وصایا اور نصائح کے بیان میں دلچسپی لیتا ہے (دیکھو وصایائے بلبن صفحہ ۷۹-۸۰ و ۹۵-۱۰۶ اور وصایائے سلطان ناصر الدین

راخال بسرِ بلبن صفحہ ۱۵۲-۱۵۶ ، نصائح قاضی مغیث الدین سلطان علاءالدین صفحہ ۲۸۹-۲۹۶) ان نصائح
ہلکت اری اور احکام سلطنت کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے ، جو اُس زمانہ کے فلسفہ سیاسیات اور آ سکے
روں کو بتلاتے ہیں ۔ ہمارے خیال میں یہ اکثر پند و نصائح جو اُن اشخاص کی طرف منسوب کئے گئے ہیں اُن
ردوں کی طرح جو یونانی مؤرخ تھیوکی ڈائیڈلس (   ) نے یونان کے
ہیر کیطرف منسوب کئے ہیں ، بہ نسبت صحیح تاریخی واقعات ہونے کے زیادہ تر فرضی ہیں ۔ اگرچہ وہ ان لوگوں
اخلاقی ، سیاسی اور تمدنی تصورات اور اُس عہد کے متداول خیالات کو صحیح طور پر ظاہر کرتے ہیں ۔ اخلاقی
یت سے سب سے زیادہ جو چیز اُسے غور کرنے اور عبرت کا درس دینے کیطرف مائل کرتی ہے وہ انقلابات
ج و تخت ہیں ۔ ایسے موقعوں پر وہ کائنات پر ایک حکیمانہ نظر ڈالتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی دکھاتا ہے اور
ا دثات اسکا بیان شاعرانہ لطف حاصل کرلیتا ہے ۔ جلال الدین خلجی بلبن کے محل ، "کوشک لعل" میں تخت
ینے کے لئے آتا ہے ۔ اُس وقت اُسے بلبن کا عہد اور اُسکا جاہ و جلال یاد آتا ہے جبکہ جلال الدین ایک معمولی
لی حیثیت رکھتا تھا ۔ وہ اصطبل کے قریب فوراً گھوڑے سے اتر پڑتا ہے اور محل میں پہنچ کر وہ اپنے امراء کو
ب کرکے اس طرح بیان کرتا ہے :-

" درایں زمان دہم چنیں وہم افتاد کہ سلطان بلبن در دں ایں کوشک بر تخت نشستہ است و بار
دادہ و من پیشش ایستادہ می روم و من ایں پادشاہ را در دں ایں کوشک بسیار خدمت کردہ ام و مرا
دل می زند ۔ و ہیبت و حشمت ہنوز از دل من ترفتہ است "

اس کے بعد سلطان جلال الدین اُس جگہ جہاں بلبن کے امراء بیٹھا کرتے تھے جا بیٹھتا ہے اور قبل
کے کہ کسی سے بات کرے دستار کے پلہ کو آنکھوں پر رکھکر زار زار روتا ہے اور کہتا ہے :-

" پادشاہی ہمہ فریب و نمایش است ، و اگرچہ بیرون بہ نقش و نگار می نماید ولیکن درون زار زار است
. . . . ایں زبان از روئے تجربہ می اندیشم کہ آنچناں پادشاہے کہ سلطان بلبن بود چہل سال
در فانی و پادشاہی ملک راند و آنچناں پسران شایستہ و برادر زادگان نامور و ارکان ملک
و مملکت و بندگان و بزرگان با چنداں حشمت و عظمت داشت کہ ہیچ یکے از اعوان دولت

او باب رسیدہ بود و ہیچ کدامی از شریکان و مخالفان و مزاحمان در ملک او نماندہ و سہ سال بیش نیست
کہ او نقل کردہ است و بر تخت او بنیۂ او نشستہ است این زمان درین جمع نظر می کنم بجز سہ
چہار کس ازاں جمع نمی بینم و از چنداں کوکبہ و دبدبہ و انبوہے کسے در نظر نمی آید ......
برآں چناں پادشاہے قاہرے کامگارے فراعدان پادشاہی نماند و بفرزندان او چنانچہ
باید نہ رسید رما چہ گونہ خواہد و بفرزندان ما چگونہ بمیراث خواہد رسید... کسیکہ بملک می رسد
بیک دادخود را فرزندان خود را وخیل وتبع خود در او رمی بازد" (صفحہ ۱۷۸-۱۸۰)

اُن کوتاہیوں کے باوجود جو ضیائے برنی میں پائی جاتی ہیں وہ اُس عہد کے لئے ایک ناگزیر موقع ہے، جس کے بغیر اُس عہد کی تاریخ کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکا بحیثیت مورخ کے ہمارے خیال میں اُس کی قدر و قیمت حسب ذیل امور پر مبنی ہے۔

(۱) وہ تین چوتھائی صدی کے لئے ایک معاصر مورخ ہے اور بقیہ ربع صدی کے لئے وہ نہایت قریبی مورخ ہے۔

(۲) وہ حرفت اور نسبت کے لحاظ سے مورخ ہے جس نے اس فن کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا اور اسوجہ سے واقعات کو مورخانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی تھا۔

(۳) وہ اُس عہد کے اکثر مشاہیر اور سربرآوردہ اشخاص سے جنہوں نے اُس عہد کی تاریخ کے بنانے میں حصہ لیا اور کارہائے نمایاں انجام دئے ذاتی طور پر واقف تھا۔

(۴) اُسکا مشاہدہ بالعموم عمدہ ہے اگرچہ وہ واقعات سے عام طور پر بغیر ترتیب و نسق کے بحث کرتا اور واقعہ نگار کی حیثیت سے غلطیاں کر جاتا ہے۔

(۵) وہ راست باز اور متدین ہے اور اگرچہ اُن معتقدات اور تعصبات سے بالا نہیں ہے جو اُس زمانے میں عام طور پر پائے جاتے ہیں اُس کے متعلق یہ اعتراض کہ اُس نے دیدہ و دانستہ کہیں غلط بیانی سے کام لیا ہے صحیح نہیں ہے بعض ناقدوں نے اُس کے بعض بیانات کو اخفائے حق سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً اُس روایت کے بنا پر جو ابن بطوطہ نے نقل کی ہے خیال کیا گیا ہے کہ سلطان محمد نے اپنے باپ تغلق کو ایک منعت

سے تیار کئے ہوئے محل کو گروا کر اُسے مروا ڈالا۔ ہمارے خیال میں یہ روایت خالی از شبہ نہیں ہے اور اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ضیائے برنی کو اسکا علم تھا۔ یہ سچ ہے کہ محمد تغلق اس کا مربی اور محسن تھا لیکن ضیائے برنی نے اُس کی سیرت کے بیان میں اُس کے عیوب کو نہیں چھپایا ہے۔

(۶) ضیائے برنی نے تاریخ کا جو موضوع قرار دیا ہے۔ وہ تذکرہ کے موضوع سے نہایت قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سیرت نگاری میں غیر معمولی دلچسپی لیتا اور اُس میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ ہمارے خیال میں اُسکی بہترین خوبی سیرت نگاری میں ہے۔ اُس دور نے بعض غیر معمولی شخصیتیں پیدا کیں مثلاً بلبن علاء الدین، محمد تغلق۔ اس کی لکھی ہوئی سیرتیں مکمل متحرک اور زندہ ہیں اور اُنکے متعلق اس کی تنقید منصفانہ ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے بعض شخصیتیں بہت دشوار اور پیچیدہ ہیں جن کے بعض واقعات کی ضیائے برنی صحیح تعبیر نہیں کر سکا ہے۔ مثلاً محمد تغلق کے انتظامات اور اصلاحات کی تہ تک نہیں پہنچا۔ محمد تغلق ان لوگوں میں تھا جو اپنے زمانہ سے آگے چلتے ہیں اور جنہیں انکے معاصر صحیح طرح نہیں سمجھ سکتے۔ سکہ میں جو اس نے تبدیلیاں کیں وہ معاشی اصول پر مبنی تھیں جنہیں اُس عہد کے لوگ نہیں سمجھ سکے۔ اسی طرح بعض انتظامات علاء الدین کے بھی صحیح طور پر نہیں سمجھے گئے۔

(۷) اُس کی کتاب کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اس کی معلومات کی تصحیح ہو سکتی ہے اور ان میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر ہم تاریخ فیروز شاہی کو علیحدہ کر لیں تو اُس عہد کی پوری تاریخ مرتب نہ ہو سکے گی نہ اُس عہد کی شخصیتوں کو ہم سمجھ سکیں گے۔

(۸) با ایں ہمہ وہ ہندوستان کا سب سے پہلا ہندوستانی مورخ ہے جو بجائے خود کچھ کم موجب فخر نہیں ہے۔

غزل

از مولنا سید شرف الدین صاحب یاس استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ

اپنی قسمت کو ترے ہجر میں رونے والے — سونے دینگے نہ تجھے چین سے سونے والے
مجھکو مارا ہے محبت سے تو نادم بھی ہو — او جفا کرکے پشیمان نہ ہونے والے
خاک و خوں میں نہ تڑپتا ہوا اب چھوڑ کے جا — دل میں او ناوکِ بیداد چبھونے والے
تم بھی دیکھو تو اسے کہتے ہیں فریاد و فغاں — میں بھی دیکھوں تو بڑے چین سے سونے والے
قتل عشاق پہ اس ناز بجا کے صدقے — او مرے خون کو دامن سے نہ دھونے والے
انکے بچپن میں اسی جنس کی بکری تھی فقط — دل ہی دل بیچے پھرتے تھے کھلونے والے
کچھ بھی اب وہم دل آزردگی غیر نہیں — او مری نعش پہ منہ ڈھانکے رونے والے

سختیاں ہجر کی اٹھ سکتی ہیں کس سے اے یاس
ان پہاڑوں کے فقط ہیں ہمیں ڈھونے والے

شمالی اور دکھنی اُردو کی علیحدگی

دکھنی اور اردو کے صوتی اور لسانی اختلافوں کی اہمیت اُن اہل علم دوستوں پر ظاہر ہے جنہیں کبھی اس بارے میں غور کرنے کا موقع ملا ہے۔ افسوس ہے کہ فنی اصطلاحات کی قلت کی وجہ سے انکے متعلق فی الحال کوئی خیالات اُردو زبان میں پیش نہیں کئے جا سکتے۔ صرف انکے اسباب و علل کی نسبت چند مختصر سے نوٹ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی نامناسب نہ ہوگا کہ دکھنی کی ابتداء، ارتقاء، عروج و تنزل پر ابتک پہلے تو اصلی اور صحیح ذریعوں سے مدد لیکر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس خیال پر مبنی ہے کہ دکھنی اور اردو ایک ہی زبان کے دو نام ہیں، یا پہلی کو دوسری سے جو تعلق ہے وہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک گندہ اور بھونڈی لڑکی کو اپنی پاکیزہ اور حسین ماں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اسی باطل خیال کی وجہ سے ابتک دکھنی اور اردو دونوں کے بولنے والے متعدد غلطیوں کے مرتکب ہوتے رہے ہیں اور انکی نوعیت اور نتائج دونوں اس قدر اہم ہیں کہ اگر اس وقت بھی ان پر غور و خوض نہ کیا جائے تو کئی طرح کی خرابیوں کا اندیشہ ہے۔

خشت اول چون نہد معمار کج تا ثریا می رسد دیوار کج

یہ چند تمہیدی جملے اور خود نفس مضمون اس توقع پر مبنی ہیں کہ اردو کی لسانی حیثیت میں دلچسپی لینے والے اس پر بھی غور و خوض کریں۔

برٹش میوزیم
۲۹ ستمبر [illegible]

سید محی الدین قادری

سلطان علاء الدین و اُس کے سپہ سالار ملک کافور، اور سلطان محمد تغلق کے ساتھ شمالی ہند کے امیوں

عالموں، فوجیوں، تاجروں اور کاریگروں نے جب دکن کا رُخ کیا اُس وقت خود انکی زبان عبوری حالت میں تھی۔ ان طبقوں کے افراد (جن میں سے اکثر دکن میں آباد ہو گئے اور بعض شمال کو واپس بھی ہوئے) جو غیر معین ہندلمانی[1] اُس وقت بولتے تھے۔ اُسی کو دکن کے وہ عربی النسل یا ایرانی مسلمان بھی استعمال کرنے لگے جو یا تو سندھ اور گجرات سے دکن میں آئے تھے یا مغربی ساحل سے داخل ہوئے تھے۔ اس زبان کی تشکیل اور ترویج میں اُن نو مسلموں نے بھی خاصہ حصہ لیا ہوگا جن کی مادری زبانیں دکن کی دیسی زبانیں تھیں لیکن جو اپنے ہم مذہبوں سے متحد رہنے کی خاطر فطرتاً ایک مشترکہ زبان کے خواہشمند تھے۔

جب دکن اور شمال سیاسی حیثیت سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اُنکے درمیان تعلقات منقطع ہو گئے تو ان دونو جگہوں کی ہندلمانیوں نے بھی جدا جدا طریقوں پر نشوونما حاصل کرنی شروع کی۔ شمال کے مسلمانوں کی طرح دکنی مسلمانوں کو بھی غیر زبان بولنے والے ہمسایوں سے سابقہ پڑا لیکن ان دونو جگہ کے ہمسایوں میں کئی طرح کا فرق تھا۔ شمال کے ہندوؤں کی زبان بالعموم ایک ہی تھی اور دکن والوں کی چار سے زیادہ۔ اس کے علاوہ دکن کی تمام زبانیں سوائے مرہٹی کے دراوڑی نسل سے تھیں اور شمال کی خالص آریائی۔

لسانیاتی قوانین کے مطابق شمالی اور دکنی ہندلمانیوں پر تغیرات کا ہونا لازمی تھا لیکن شمالی ہندلمانی اور دکنی ہندلمانی پر ایک ہی قسم کے تغیرات نہیں ہوئے کیونکہ دونوں جگہوں کی دیسی زبانوں کے علاوہ وہاں کی آب و ہوا اور وہاں کے سیاسی حالات بھی بالکل مختلف تھے۔ رفتہ رفتہ دکنی ہندلمانی شمالی سے علحدہ ہوگئی اور آخر کار ایک کا نام دکنی پڑگیا اور دوسری کا اُردو۔

دکنی اور شمالی ہندلمانیوں پر جن جن طریقوں سے تغیر ہوئے ان پر چند اجمالی اشارے یہ ہیں:

---

[1] چونکہ عہد محمد شاہ سے قبل اردو یا ریختہ کے لئے کوئی خاص اصطلاح موجود نہ تھی بلکہ اسوقت اُردو کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے جو آجکل ایک خاص زبان کا نام ہے اس لئے اُس زبان کیلئے جو ہندو اور مسلمانوں کے ملاپ سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں پیدا ہوئی تھی ہم نے ہندلمانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ ہندو مسلمانوں سے مرکب ہے۔ اسکو سب سے پہلے مولوی وحید الدین سلیم نے ایک اور مفہوم میں استعمال کیا تھا۔

(۱) شمال بہ نسبت دکن کے اُن ممالک سے قریب تھا جہاں کی مادری زبان فارسی اور ترکی تھی۔ وہاں بہ نسبت دکن کے ایرانی، افغانی، ترک اور مغل زیادہ آتے رہے قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک جتنے حکمران مسلسل گذرے وہ سب یکے بعد دیگرے ان شمالی حملہ آوروں میں سے تھے جن کی زبانیں ہندوستان کے لئے اجنبی تھیں۔ اس کے برخلاف دکن کے حکمران خاندانوں کے بانی وہی تھے جو دکن یا ہندوستان میں ایک مدت سے مقیم تھے اور دکن کی زبان اور طرزِ معاشرت سے مانوس تھے۔

حکمران سلسلوں کے بانیوں کے علاوہ شمال کے بالعموم تمام بادشاہوں کی زبان بھی فارسی یا کوئی اور بیرونی زبان تھی۔ محمد تغلق سے لیکر محمد شاہ اختر تک کسی شمالی بادشاہ نے ہندلمانی میں نہ نثر لکھی نہ نظم۔ اس کے خلاف دکن میں کئی بادشاہ ایسے گذرے ہیں جن کی دکھنی نظم اور نثر اس وقت بھی موجود ہے۔

---

(۲) جب کبھی ترکستان، ایران یا افغانستان میں کوئی سیاسی انقلاب ہوتا یا تباہی آتی تو وہاں کے باشندے پناہ لینے کے لئے یا تلاشِ معاش کی خاطر ہندوستان ہی کا رخ کرتے چنانچہ آئے دن نو واردوں کی ٹکڑیاں ہندوستان میں داخل ہوتی رہتی تھیں اور چونکہ دہلی کے امیروں اور قدردانوں کے دسترخوان کی وسعت میں اس وقت تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اس لئے سب کے سب وہیں جم جاتے۔ اور یہی نو وارد چند ہی دنوں میں بادشاہوں کے درباروں میں رسائی کر کے ملک میں بڑے بڑے مرتبے حاصل کر لیتے۔ غرض سپہ سالار سے لیکر ایک معمولی سپاہی تک اور وزیرِ اعظم سے ایک معمولی منشی تک ہر جگہ اکثر ایک ٹھیٹ ولایتی منتخب ہوتا۔ کیونکہ انتخاب کرنے والا خود ولایتی ہوتا تھا۔

بیرونی ہندسے خانگی درآمدوں کے علاوہ اکثر شمال مغرب کی جانب سے حملے ہوا کرتے تھے جن کا سلسلہ احمد شاہ درانی کے پانچویں حملے تک برابر جاری رہا اور یہ تمام حملہ آور غیر زبانیں بولنے والے تھے

سیاسی تحریکات کے علاوہ ہر وقت بیرونی اثر غالب رہتا تھا۔ شاہی دربا روں سے، محمد شاہ کے زمانہ تک بھی، بالعموم حیثیت ولایتی (ایرانی) شاعر گراں بہا صلے لیکر اپنے اپنے وطنوں کو شاد کام واپس جاتے تھے۔ ایرانی نوواردوں کی قدر میر اور سودا کے زمانہ تک باقی تھی۔

غرض ان فارسی گو امیروں، سپاہیوں، عالموں، شاعروں وغیرہ کی آئے دن آمد اور اقتدار و اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں سب کے لئے فارسی گوئی لازمی ہوگئی اور اگر کبھی کچھ مہلت پاکر فارسی کا زخم مندمل بھی ہونے پاتا تو پھر دو بارہ فارسی گویوں کا ایسا حملہ ہوتا کہ وہ زخم از سر نو ہرا ہو جاتا۔ اس طرح شمال کے باشندے اپنی ہندلالی میں ترقی نہیں کر سکے۔

دکن فارسی گو ممالک سے دور تھا۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں ایرانی نہیں گئے لیکن جو بھی گئے انہوں نے خود کی ذات کو دکن میں محو کر دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں بادشاہ دیسی زبان استعمال کرتا ہے تو انہوں نے بھی اس کے استعمال کو اپنے لئے ننگ و عار نہیں سمجھا۔ نیز وہاں ایرانی ہی برسر اقتدار نہیں رہے۔ دکن کی قدیم تاریخوں کا مطالعہ اس بات کے کئی ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہاں کے دیسی باشندوں نے ہمیشہ اجنبیوں کو زیر کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ وہ اکثر دفعہ ان کوششوں میں کامیاب بھی رہے۔ وہاں کے عالم زیادہ تر دیسی ہی ہوتے تھے۔ اور جو دیسی نہ ہوتے وہ دیسیوں کی تفہیم کی خاطر مذہبی کتابیں وغیرہ دیسی زبان ہی میں لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

(۳) شمال کے ہندو اور مسلمانوں میں زیادہ اتحاد و یکجہتی نہیں رہی۔ آخر آخر میں اکبر کے زمانہ میں اس کی جھلکیں نظر آتی ہیں لیکن وہ بھی دیر پا نہیں ثابت ہوئیں۔

دکن میں ابتدا ہی سے ہندو مسلمان متحد تھے۔ دکن کی شمال سے علحدگی کا آغاز ہی ہندو مسلم اتحاد (اگر کچھ تھا بھی) یا میل جول صرف معاشرتی اغراض پر مبنی تھا۔ دکن کے مسلمان معاشرتی و تمدنی ضرورتوں کے علاوہ سیاسی ضرورتوں کی بنا پر بھی اپنے ہم ملکوں سے متحد تھے۔ دکنی بحیثیت مجموعی شمال سے علحدہ ہونا چاہتے تھے۔ وہاں کے امیر شمالی امیروں کے مخالف تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ شمال سے لوگ دکن جائیں اور انکے معاملات میں دخل دیں چنانچہ اپنی اس آز

اور خود مختاری کی خاطر انہیں اپنے ہم ملکوں سے متحد اور انکے دوش بدوش رہنا پڑا۔ وہاں کے پہلے مسلمان حکمراں حسن گنگو سے لیکر آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ تک تقریباً ہر ایک کے دربار میں ہندو وزیر یا عہدہ دار موجود تھے۔

اس طرح شمال کے مسلمان عہدیداروں اور حاکموں کو ہندوستانی میں بات چیت کرنے کی بہت کم ضرورت پڑی اس کے خلاف دکن میں ابتدا ہی سے اس میں ترقی ہوتی گئی۔

---

(۴) شمال میں اگرچہ درباروں اور مجلسوں میں ہندو اور مسلمان امیروں اور عالموں کو بہت کم ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا تھا لیکن بازاروں اور لشکروں اور رات دن کے کام کاج میں دونوں قوموں کے عوام کو ایک دوسرے سے ہر وقت سابقہ رہتا تھا۔ اس میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کے عوام کی بول چال (یعنی ہندوستانی) مشترک ہوتی گئی۔ اور چونکہ شمالی ہندو ایک ہی قسم کی زبان بولتے تھے اس لئے مرور ایام کے ساتھ اس میں صفائی اور پختگی بھی پیدا ہوتی رہی۔ تاہم دونوں قوموں کی ادبی (یا لکھنے کی) زبانیں ایک زمانہ تک قطعاً جدا جدا تھیں ایک کی پراکرت یا سنسکرت تھی تو دوسری کی فارسی یا عربی۔

اس بارے میں دکن کی حالت بالکل مختلف تھی وہاں اگرچہ بالعموم ہندو اور مسلمان متحد تھے لیکن ان دونوں کی زبانوں کی متحدہ ترقی میں قسم قسم کی رکاوٹیں تھیں پہلے تو مسلمان جو ہندوستانی بولتے ہوئے دکن میں داخل ہوئے وہ وہاں کی دیسی زبانوں کے موافق نہ تھی کیونکہ وہ مرکب تھی شمالی ہند کی دیسی زبان اور فارسی سے اور شمال کی دیسی اور دکن کی دیسی زبانوں میں خاصہ فرق تھا۔

دکھنی مسلمانوں کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنی بول چال میں اپنے ہمسایوں کی زبان کے بعض اجزا بھی شامل کر لیتے لیکن یہ امر بھی دقتوں سے خالی نہ تھا۔ انکے ہمسایوں کی زبان ایک تو تھی نہیں وہ چار سے زیادہ تھیں۔ خود انکے آپس میں بہت زیادہ اختلاف تھا اور وہاں کا روبار کے لئے چاروں زبانوں سے واقفیت یا کم از کم ان کے الفاظ کا میل جول لازمی تھا۔

---

(۵) شمالی ہندوؤں اور مسلمانوں کی بول چال کی زبان (یا ہندلانی) میں بعد میں بہت کم فرق باقی رہ گیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ یہ یگانگت اس قدر گہری ہوتی گئی کہ مغلوں کے آخری زمانہ میں جب ہندو اور مسلمان سیاسی حیثیت سے بھی متحد ہونے لگے تو بول چال کی زبان کے علاوہ دونوں کی ادبی زبان بھی مشترک ہونے لگی۔ چنانچہ ہندو بھی فارسی میں لکھنے لگے۔ اور اُن کی ان فارسی تحریروں کی وجہ سے ان کی بول چال کی زبان بھی متاثر ہوئی۔ وہ اس میں بھی فارسی کے خاصے الفاظ استعمال کرنے لگے اور بہت جلد ان کی بول چال فارسی آمیز ہو گئی۔

اس کے خلاف دکھنی ہندوؤں اور دکھنی مسلمانوں کی زبانوں میں لسانیات کی رو سے بھی فرق تھا۔ کیونکہ دکھنی مسلمانوں کی ہندلانی کا آغاز دکن میں نہیں ہوا تھا۔ اُنکا ذریعہ ہمیشہ شمالی اور آریائی تھا۔ دکھنی ہندوؤں کی زبانیں زیادہ تر دراوڑی تھیں اور دکھنی مسلمانوں کو اپنے ہمسایوں سے متحد رہنے کے لئے اس امر کی ضرورت تھی کہ وہ رفتہ رفتہ اُن کی زبانوں سے بھی متاثر ہوتے اور فارسی یا کسی اَور بیرونی زبان کے الفاظ کم سے کم استعمال کرتے۔ وہ جتنے زیادہ فارسی کے الفاظ اپنی زبانوں میں ملاتے اتنا ہی اپنے ہم ملکوں میں اجنبی رہتے۔ اور اُنکے روزمرہ کے کام کاج میں دقتیں پیش آتیں غرض فارسی اور دراوڑی اثر نے بھی ان دونوں جگہ کی ہندلانیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں خاصہ کام کیا۔

حالات حج

(بسلسلہ سابق)

علیگڑھ پارٹی سے بھی ملاقات ہوئی ۔ پروفیسر حمید الدین خاں کہنے لگے کہ میں تو وہابیوں کا طرفدار تھا مگر مدینہ میں انکے جو جرائم دیکھے وہ ناقابل معافی ہیں ۔ انہوں نے قبروں کے گنبد گرا دیے ہیں جن پر آیات لکھی ہوئی تھیں ۔ علاوہ بریں قاضی مدینہ دو گھنٹہ تک مسجد نبوی میں بیٹھے رہے اور ان کے پاؤں روضۂ اطہر کیطرف تھے ۔

ان دو شکایات پر پروفیسر صاحب جملہ وہابیوں سے بیزار ہو گئے تھے ۔

مولوی سلیمان اشرف صاحب ہمارے پرانے کرم فرما بھی اس قافلہ میں تھے جو وہابیوں کے قدیمی مخالف ہیں ۔ کہنے لگے کہ دیکھئے آج پانچ تاریخ ہو گئی ہے مگر ابتک اعلان نہیں ہوا کہ حج کس دن ہوگا ۔ میں نے کہا کہ دستور یہ ہے کہ حج کمیٹی حج کے دن کا اعلان ۶ ذوالحجہ کو کرتی ہے جبکہ نجدی اور یمنی قافلے آچکتے ہیں کیونکہ ان سے رویت ہلال اور تعین تاریخ حج میں شہادت اور مدد ملنے کی توقع رہتی ہے ۔ لیکن مولانا اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور کہنے لگے کہ پچھلے سال عین وقت پر نجدیوں نے محض اس وجہ سے کہ لوگ جمعہ کے حج کو حج اکبر نہ سمجھیں تاریخ بدلکر حاجیوں کو پریشان کیا تھا ۔

میں نے جب اس امر کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مولانا کا بیان صحیح نہ تھا ۔ پچھلے سال بھی حسب معمول ۶ تاریخ کو اعلان ہوا تھا اور کوئی تبدیلی اس میں نہیں کی گئی تھی ۔ نجدی تو خود عوام الناس کی طرح جمعہ کے حج کو حج اکبر سمجھتے ہیں اور انکی کتب میں اسکی تصریح ہے ۔ مولانا نے مناسک حج پر ایک کتاب لکھی تھی جس کی نسبت بار بار فرماتے تھے کہ میں نے بہت اچھی کتاب لکھی ہے ۔ مجھے بھی ایک نسخہ دینا چاہا مگر میں نے اس وجہ سے نہیں لیا کہ جہاز پر اسکو ایک مسافر کے پاس دیکھ چکا تھا ۔

یہ کچھ دستور سا ہوگیا ہے کہ اکثر مولوی جب حج کو جاتے ہیں یا اسکا ارادہ کرتے ہیں تو مناسک پر کوئی کتاب یا رسالہ لکھ ڈالتے ہیں جس میں حج کے فرائض کی صرف ظاہری شکلوں سے بحث ہوتی ہے جن کا بڑا حصہ عملاً بیکار ثابت ہوتا ہے۔ ان کتابوں اور رسالوں کی اسقدر کثرت ہوگئی ہے کہ اب کچھ لکھنا لاحاصل ہے۔ اصل ضرورت حج کے حقائق سمجھانے کی ہے جن کے متعلق ایک حرف بھی ان میں نہیں ہوتا۔

ڈپٹی زین العابدین صاحب اس مختصر قافلہ کے امیر تھے۔ اور غالباً اسی کتاب کے قوانین و ضوابط کے ماتحت جرمانے اور تاوان لگاتے تھے۔ پروفیسر حمیدالدین خاں کہنے لگے کہ مجھ پر چار "دم" (قربانیاں) عائد ہو چکی ہیں۔ ایک بار جامہ احرام سوتے میں سر پر آگیا تھا۔ دوسری بار کندھے پر پھینکتے ہوئے تیسری بار کسی غیر کا دامن سر پر پڑ گیا تھا۔ چوتھی بار غالباً کوئی لونگ کھالی تھی۔

میرے ساتھ بٹوے میں سُکّے ہوئے پان تھے جو میں ہندوستان سے لے گیا تھا۔ اس کو پیش کیا پروفیسر نے منہ میں ڈالا مگر چونکہ اس میں الائچی تھی اس وجہ سے فوراً تھوک دیا اور منہ صاف کر ڈالا۔ ورنہ قریب تھا کہ فردِ جرم لگ جائے۔

ایک طرف فقہ کی یہ شدت تھی اور دوسری طرف یہ خفت کہ ہمارے ترک بھائی دین تو کجا اُسا میں قانون بننے کی بھی صلاحیت نہیں تسلیم کرتے تھے۔

مولوی محمد سلیم صاحب ظہورحسین وارڈ کے پرانے سب پر اکثر بھی مکہ میں ملے۔ روزانہ شام کو وہ اسی طرح پورے لباس میں حرم شریف میں آتے ہیں جس طرح مغرب کے وقت ظہور وارڈ سے کالج کی مسجد میں آیا کرتے تھے۔

ایک نوجوان ترک ڈاکٹر سعد چند ترکوں کے ہم لوگوں سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے یہ کیا کیا کہ اپنے دستورِ اساسی سے فلاں فلاں دفعات جو اسلام کے متعلق تھیں نکال ڈالیں ڈاکٹر نے اس کے جواب میں زور شور سے ترکوں کے اسلامی کارنامے بیان کئے اور کہا کہ کیا ایسی قوم کی نسبت یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ بیٹھی۔ میں نے کہا کہ ترک مسلمان ہی مگر جو حکومت یہ کہدے کہ میرا دین اسلام نہیں وہ یقیناً کافر ہے۔

اس کے جواب میں ڈاکٹر کے طویل بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ انکار نہیں ہے بلکہ غیر ضروری اعلان کا حذف ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ترک مسلمان ہیں پھر اس کے لئے دستور اساسی میں دفعات رکھنے کے کیا معنی۔

لیکن مولوی ظفر علیخاں صاحب کی اس جواب سے تسلی نہیں ہوئی۔ انہوں نے دو ایک یوروپین سلطنتوں کی مثالیں پیش کیں کہ باوجود عیسائی ہونے کے بھی انکے دستور اساسی میں حمایت عیسویت کے دفعات موجود ہیں۔

ڈاکٹر کا جواب یہ تھا کہ کیا اسی تقلید پر آپ ہم کو مجبور کرنا چاہتے ہیں؟

مکہ میں متعدد اقوام اور ریاستوں کی طرف سے رباط قائم ہیں۔ مصری رباط جو تکیہ کے نام سے مشہور ہے اور مسجد حرام کے متصل ہے ایک بڑی اور پختہ عمارت ہے وہاں سے ہزاروں فقراء اور مساکین کو روزانہ کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ بعض امرائے مصر اس میں ٹھہرتے بھی ہیں۔ ان لوگوں نے مجھکو اور مولوی ظفر علیخاں کو تکیہ دیکھنے کے لئے بلایا تھا۔ چائے اور قہوہ سے تواضع کی اور دیر تک گفتگو کرتے رہے اس میں ایک شفاخانہ بھی ہے جہاں سے اوسطاً روزانہ پچاس بیماروں کا علاج ہوتا ہے۔ دوائیں مفت دیجاتی ہیں۔ عمل جراحی بھی کیا جاتا ہے جس کے مکمل آلات موجود ہیں۔

سب سے بہتر رباط بوہرہ قوم کا ہے جو ملا سیف الدین طاہر کے حسب ہدایت غالباً آٹھ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے تیار ہوا ہے۔ یہ عمارت نہ صرف مکہ بلکہ سارے جزیرہ نمائے عرب میں بے مثل بتائی جاتی ہے اس میں پانسو حجاج نہایت آرام کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ عمارت بہت بڑی، عالیشان، صاف ستھری ہے اور مکہ میں سلطانی شفاخانہ کے بعد صرف یہی ایک جگہ ہے جس میں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی ہم نے دیکھا۔ اس کے متصل ایک کنواں بھی کھدوا گیا ہے جس کا پانی صاف اور شیریں ہے۔

جماعت اہل حدیث کے ارکان بھی ایک رباط کی فکر میں تھے۔ دیکھیں کب بنتا ہے۔

اہل حدیث وہابی قبضہ کے بعد سے مکہ میں اس طرح داخل ہوتے ہیں جیسے کوئی فاتح اپنے رقبہ مفتوحہ میں۔ اور اس میں شک نہیں کہ سلطان انکی عزت بھی کرتے ہیں لیکن ان میں سے بعضوں کا بیجا ناز ممکن ہے کہ اس عزت کو بھی کھودے۔

پہلے دن جب سلطان موتمر میں تشریف لائے تھے تو اس جماعت کے ایک مولوی صاحب نے ان کو مخاطب کر کے پوچھا کہ ہمارے "مذہب" کا نام کہیں قرآن میں بھی آیا ہے ؟۔ لوگ اس بیموقع اور بے معنی سوال کو سنکر برہم ہوئے۔ سلطان نے جواب دیا کہ آپ کو یہ سوال کسی عالم سے کرنا چاہئے اس نے کہا کہ آپ بھی تو امام ہیں۔ لیکن ادہر ادہر سے لوگوں نے اشاروں سے روکدیا۔ اور دوسرے دن جب دعوت کے رقعے تقسیم ہوئے تو اسکا نام خارج کرا دیا گیا۔

ایک دوسرے مولوی صاحب جن کو دعوت کا ٹکٹ نہیں ملا تھا سلطان کے محل پر پہونچے اور درخواست کی کہ مجھکو اپنے مہمانوں میں شامل کر لیجئے انکے ساتھ ایک مولانا اور تھے انہوں نے کہا کہ میرے لئے اونٹ کا بندوبست کر دیجئے۔ سلطان اپنے ایک ملازم سے یہ کہکر یہ حضرات جو کچھ فرماتے ہیں لکھ لو اٹھ گئے۔

حنبلی مصلے کے پیچھے ایک چوکی واعظوں کے لئے پڑی ہوئی ہے بیشتر علما اہل حدیث ہی کو میں نے اسپر وعظ کہتے ہوئے دیکھا۔ ایک دن راہ میں ایک مولانا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ حرم میں بھی آپ کا کوئی وعظ ہوا یا نہیں۔ فرمانے لگے کہ جی ہاں۔ فلاں شخص نے اپنی تقریر میں خلافت کے کارکنوں پر بہت لے دے کی تھی۔ میں نے اسی وقت اٹھکر مجمع کے سامنے جوابات دئے۔ پرسوں میری آخری تقریر حرم میں ہونے والی ہے۔

ابھی ہم اس جواب کی لذت ہی لے رہے تھے کہ ایک دوسرے مولانا مل گئے۔ ان سے بھی یہی سوال کیا۔ بولے کہ ظفر علیخاں صاحب نے اپنی تقریر میں رفع یدین اور آمین بالجہر کی مخالفت کی تھی۔ میں نے اپنے وعظ میں نہایت قوی دلائل سے انکا ثبوت دیا۔ اچھا اثر پڑا مجمع بھی خوب تھا۔

میں نے کہا مولوی صاحب نے تو صرف ان فروعی امور پر لڑنے جھگڑنے کی مخالفت کی تھی لیکن مولانا کو تو تقریر کے لئے ایک متنازع فیہ موضوع کی ضرورت تھی اور بس۔

رہا مجمع سو اسکی کیفیت یہ تھی کہ واعظ مغرب کے بعد کھڑا ہوتا و چار ہندی اس کے گرد بیٹھ جاتے اور بقیہ نمازی جن سے اسوقت مسجد کا صحن بھرا رہتا تھا تماشا دیکھتے ہوئے نکلتے چلے جاتے۔

اس فرقہ کو سلطان کی مدح میں اسی قدر غلو ہے جس قدر کہ متعصبین کو انکی ہجو میں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ سلطان جب مدینہ میں تھے تو وہاں بارش ہوئی پھر جدہ میں آئے تو وہاں بھی اور جب مکہ میں پہنچے تو یہاں بھی پانی پڑا اور عرفات میں گئے تو وہاں بھی۔ اہل حدیث میں سے ایک صاحب کہنے لگے کہ ان کی مقبولیت میں کیا شک ہے۔ دیکھتے نہیں کہ جہاں جاتے ہیں آسمانی رحمت ساتھ ساتھ رہتی ہے ایک دوسرے صاحب فرمانے لگے کہ سلطان ولی ہیں جس نے انکی مخالفت کی وہ اپنے رتبہ سے گر گیا چنانچہ فلاں فلاں اور فلاں ایک اور صاحب نے جو جدید تعلیم یافتہ تھے کہا کہ کاؤنٹ ٹالسٹائی نے جو پیشین گوئی کی ہے کہ دنیا کی نجات ایک نیا بانی مصلح کے ہاتھوں ہوگی وہ یہی ہیں۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ مکہ میں تعلیم نہیں ہے۔ چند مدرسے ہیں جن میں موسم حج کی وجہ سے تعطیل تھی۔ میں ان کو دیکھ نہ سکا۔ مدرسہ صولتیہ بھی بند تھا مگر اس کے مہتمم صاحب نے اس کی تینوں عمارتیں دکھلائیں جدید مکان نہایت عالیشان اور چہار منزلہ ہے۔ اس کی وہ اوپر کی چھت بھی دکھائی جہاں مولانا محمد علی اور شوکت علی صاحبان جب حج کو گئے تھے تو جاکر سویا کرتے تھے۔ واقعی نہایت وسیع صاف ستھری اور ہوادار ہے۔

مہتمم صاحب کا بیان تھا کہ یہاں دیوبند کا نصاب پڑھایا جاتا ہے اور معلمین کو بڑی بڑی تنخواہیں اور طلبہ کو وظائف دئے جاتے ہیں لیکن واپسی میں اسی مدرسہ کے ایک مدرس میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے ان باتوں کی تصدیق نہیں کی۔ اور کہا کہ یہاں سوائے ابتدائی تعلیم کے اور کچھ نہیں ہے۔ وظائف نہایت حقیر ہیں اور وہ بھی چند طلبہ کو دئے جاتے ہیں۔

مدرسہ فخریہ کے جلسہ میں بھی شریک ہوا۔ اس میں تجوید اور نوشت و خواند کی معمولی تعلیم ہوتی ہے۔

مدرسہ الفلاح اور معہد سعودی کا نصاب و نظام مجھے بالکل نہ معلوم ہو سکا۔

اہل مکہ اسی پر قانع ہیں۔ اور اپنی حالت کے لحاظ سے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ چنانچہ مدرسہ مسجد حرم میں مولوی ابراہیم صاحب راندیری کی دعوت میں شبلی صاحب کے بھتیجے سے جو

علمائے کعبہ کو کلید بردار ہیں اس موضوع پر میں نے گفتگو کی انہوں نے کہا کہ معہد سعودی جو قائم ہوا ہے اس میں حدیث و فقہ و تفسیر کے اچھے اچھے مدرس سلطان نے بلائے ہیں۔ اب انشاء اللہ مکہ میں بھی علماء پیدا ہونے لگیں گے۔ ان کی تقریر سے واضح ہوتا تھا کہ تعلیم کا مفہوم ان کے ذہن میں سوائے چند دینی کتب کے اور کچھ نہیں ہے۔ کاش اس مرکز دین میں دین ہی کے علماء پیدا ہوں۔ لیکن ممتاز اور ذی لیاقت تو ہوں۔

سلطان کو بھی اسکا بیحد افسوس ہے انہوں نے ایک بار کہا کہ لوگ روتے ہیں کہ مسلمانوں کا فلاں ملک نکل گیا اور فلاں صوبہ جاتا رہا اور میں روتا ہوں کہ اسلام ہی ہاتھوں سے جا رہا ہے۔ کیونکہ جب علماء نہ ہوں گے تو دین کیسے باقی رہیگا۔ میرے دیکھتے دیکھتے ریاض میں جہاں ستر نامی علماء تھے اب بارہ رہ کے رہ گئے ہیں۔

مگر باوجود اس احساس کے تعجب یہ ہے کہ وہ اپنے شاہزادوں کی تعلیم کیطرف بھی جو رات دن موٹریں دوڑاتے پھرتے ہیں اور اسی شغلہ میں اپنا سارا وقت برباد کرتے ہیں کوئی خاص توجہ نہیں کرتے۔

کتب خانے متعدد ہیں لیکن اس مرکز اسلام کی شان کے مطابق ایک بھی نہیں۔ سب سے بڑا کتب خانہ جو ہے اس میں کم و بیش پانچ ہزار کتابیں ہیں گو بعض قلمی نوادر ہیں لیکن بہت سی ضروری علمی مطبوعہ کتابیں ندارد ہیں۔

حضار میں سے علامہ احمد سورکتی ہم سے ملنے کے لئے آئے۔ یہ جاوہ کی جمعیت الارشاد کے صدر اور صاحب علم و فضل ہیں۔ اس جمعیۃ کے ایک دوسرے سرگرم کارکن علی بن عبداللہ باذیبی ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھکو محلہ قشاشیہ میں چائے پر بلایا تھا وہیں ایک شخص سے پہلی بار معلوم ہوا کہ عبداللہ عسیری مولانا شوکت علی اور چند دیگر اشخاص کے خطوط امام یمن کے نام رکھتا ہے۔

یہ عبداللہ پانچ چھ مہینے جامعہ ملیہ میں رہا تھا اور مکہ میں پہنچنے کے بعد خود بخود آکر ہمارا میر مبلغ بن گیا تھا مجھے اس کی پوری حالت معلوم تھی اور میں جانتا تھا کہ یہ کس قماش کا آدمی ہے۔ میں نے اس

خبر کی اصلیت سے اسی وقت انکار کیا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر اس قسم کے خطوط ہوں گے تو یقیناً جعلی ہوں گے۔

میں ۱۸ رجون کو مکہ سے واپس چلا آیا تھا بمبئی میں پہنچکر ۲۳ رجون کو میں نے اخبار خلافت میں پڑھا کہ عبداللہ گرفتار ہو گیا اور اس کے پاس سے خطوط بھی برآمد ہوئے۔ مولانا شوکت علی صاحب کی تردید بھی اسی نمبر میں تھی کہ یہ خط انکا نہیں ہے۔ وہ اگر تردید بھی نہ کرتے تو بھی مجھے یقین تھا کہ وہ خط انکا نہیں ہوسکتا حسن عطاس بیٹی آج بھی میرے پاس پڑھتا ہے وہ حلفیہ بیان کرتا ہے کہ اس نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اور میں اس کو عبداللہ سے زیادہ سچا سمجھتا ہوں۔ عبداللہ جاہل اور جسور آدمی ہے۔ وہ اپنے جعل میں آپ گرفتار ہوا ہے۔

اخبار خلافت کے اسی نمبر کے اڈیٹوریل میں "شہید حرم" کا عنوان نظر آیا جس کے نیچے اُس مصری پاگل کا قصہ بیان کیا گیا تھا جس نے مسجد حرم میں منبر پر چڑھکر جمعہ کے دن کئی آدمیوں کو زخمی کیا تھا آخر میں اس کے پاؤں میں بندوق سے چھرے مار کر اس کو اتار اگیا تھا مجھے اس اڈیٹوریل نگار کی ذہنیت پر ماتم کرنا پڑا کیونکہ وہ شخص آج بھی مکہ کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہے جس کو یہ شہید حرم بنا کر دہابی حکومت کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مکہ میں کل ایک ہی اخبار ہے جس کا نام ہے ام القریٰ۔ وہ بھی ہفتہ وار۔ میں اور مولوی ظفر علیخاں دونوں وہاں گئے۔ اسکا دفتر حمیدیہ کے متصل ایک بڑے مکان میں ہے جس میں پریس بھی ہے۔ اس کی اشاعت ۳۲۰۰ ہے۔

یہ اخبار ابھی عہد طفولیت میں ہے اور سوائے سلطان نجد اور انکے شاہزادوں کے آمد و رفت کے حالات حفلات ملوکیہ اور بلدیہ مکہ کے اخبار کے اور باتیں کمتر لکھتا ہے۔

جب حج کا دن قریب آتا ہے تو مکہ کے بعض باشندے حج بدل تلاش کرتے ہیں۔ اکثر ہندیوں کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنے اپنے اعزہ و اقارب کیطرف سے ایک ایک گنی پر حج کرایا۔ دہلی کے ایک صاحب بھی ملے جو کسی کی طرف سے حج کرنے گئے تھے۔ وہ ڈیڑھ ڈیڑھ روپیہ پھر کر

خریدے تھے۔ میں اس بوالعجبی پر حیران تھا کہ حج بیچیں اور عمرے خریدیں۔

میں نے دیکھا کہ حج بدل کے متعلق جملہ فرق کے علماء کا ایک ہی مسلک تھا یعنی سب کے سب اس کے جواز[1] پر متفق تھے بلکہ بہت سے حج بدل ہی میں گئے تھے۔ کاش اسی طرح دیگر مسائل میں بھی یہ لوگ اتفاق کر لیتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں یہ نفع نہیں۔ ایک مولانا صاحب جو ساتویں بار حج بدل میں گئے تھے مجھ سے فرماتے تھے کہ یہ اچھی تجارت ہے نصف تو کہیں گئے نہیں۔

مکہ میں تمباکو نوشی بالعموم ممنوع ہے لیکن گھروں میں کوئی روک نہیں۔ شارع عام پر احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نجدی اس سے نفرت رکھتے ہیں اور جب کسی کو پیتے دیکھتے ہیں تو بید سے سزا دیتے ہیں۔ مگر موسم حج میں کسی قدر رعایت برتی جاتی ہے۔ دکانوں پر سگریٹ اور سگار کے بکس بھی ملتے ہیں۔

ہمارے ساتھ حقہ تھا اور تمام جماعت میں سے صرف میں اور مولوی ظفر علیخاں پیتے تھے۔ آدمی کو ہدایت تھی کہ جب لال مندیل والا کوئی عرب ملنے کے لئے آئے جو نجدیوں کی خصوصیت ہے تو اس کو اٹھا کر الگ رکھدے۔

خود ہمارے ساتھیوں میں سے مولوی داؤد صاحب غزنوی بھی نجدیوں سے اس معاملہ میں کچھ کم نہ تھے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ شاید آپ کا گھر دربار صاحب سے قریب واقع ہے۔
ایک دن صبح کو کوئی ملازم نہ تھا مولوی ظفر علیخاں کو سخت طلب تھی اٹھے اور خود چلم بھر کر لائے۔ میں بھی چونکہ ان کا شریک عمل تھا اٹھکر حقہ تازہ کرنے لگا۔ اور اس وقت یہ شعر کہے۔

بھرتے ہیں چلم ظفر علیخاں　　　اسلم کرتے ہیں حقہ تازہ
مکہ میں جب آگئی یہ نوبت　　　حقہ کا نکالو جنازہ

---

[1] میرے نزدیک قرآن کریم کے اس عام اصول "لیس للانسان الا ما سعی" کے مطابق ہر انسان کو صرف اس کے ہی عمل کی جزا و سزا ملیگی۔ ایک دو روایتیں جو حج بدل کے متعلق آئی ہیں انکا محل مخصوص ہے وہ عام نہیں کی جا سکتیں۔

لیکن جنازہ تو نہیں نکالا گیا۔ ہاں یہ ہوا کہ ہمارا حقہ جمع میں ساتھ نہیں گیا۔

مکہ کی تاریخی یادگاروں کے متعلق کتاب مرآۃ الحرم نامی جو وہاں عام طور پر شائع ہے۔ نہایت مل اور مفصل ہے۔ لیکن اس کی روایات نیز وہاں کے معلمین کے بیانات کچھ زیادہ قابل وثوق نہیں معلوم ہوتے۔

اکثر مزارات پر پہرے قائم ہیں تاکہ زائرین سجدہ اور شرک نہ کرنے پائیں۔ بعض جگہ مثلاً غار حرا یا جبل ثور پر ہا سلطانی اجازت کے جانے نہیں دیتے۔

مسجد بلال جبل ابو قبیس پر ہے۔ مجھ سے بعض ہندیوں نے کہا کہ وہابیوں کا ظلم دیکھئے کہ اس کو مقفل کرادیا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ حرم شریف کے صحن میں سے نظر آتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ مسجد حرم کی نماز کو جس میں دوسری مساجد سے ایک لاکھ گنا زیادہ ثواب ملتا ہے کوئی چھوڑ کر اس میں نماز پڑھنے یوں جائیگا۔ علاوہ بریں حرم میں دس بار آنے جانے سے اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک بار بھی چڑھنا اغلب نازیادہ مشکل ہے۔ پھر ایسی صورت میں اسکا مقفل رکھنا ہی قرین مصلحت ہے۔

مولانا فاخر صاحب کو شکایت تھی کہ وہابیوں نے حضرت خدیجہ کا مزار توڑ ہی ڈالا تھا اب اس پر اونٹ بٹھالتے ہیں۔ مجھے اعتبار نہ آیا چنانچہ جب میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے گرد دیوار کھنچی ہوئی ہے اور وہاں تک اونٹ تو کیا بلی کا بھی گزر نہیں۔ احاطہ کے باہر میدان میں بے شک اونٹ بیٹھتے ہیں۔

سنت کے مطابق ۸ ذی الحجہ کو مکہ سے حج کے لئے روانگی ہونی چاہئے لیکن لوگ ۴ - ۵ ذی الحجہ سے جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص اہل جاوہ۔ کیونکہ انکے ذمہ وطن میں بھی جسقدر دعوتیں لازم ہوتی ہیں انکو وہ میدان عرفات ہی میں پہنچکر کھلاتے ہیں۔

امسال منا میں بھی پانی کا انتظام کافی تھا اور عرفات میں بھی۔ میں نے دیکھا کہ تو اکثر لوگ نہر زبیدہ سے خود پانی نکالکر لاتے تھے اور جابجا سبیلیں بھی لگی ہوئی تھیں جہاں سے مفت پانی ملتا تھا۔ مصری سبیل حیدرآبادی سبیل۔ ہوٹل والوں کی سبیل۔ بمبئی والوں کی سبیل اور خود سلطانی سبیل۔

مول بیچنے والے بھی ہر جگہ گھومتے تھے اور ۲ - ۸ ، ۰ کنستر تک پانی ملجاتا تھا۔

حاستہ میں نیز منا اور عرفات میں جا بجا چائے۔ پانی، شربت اور برف کی دکانیں تھیں۔ سلطان کی تمامتر کوشش یہی تھی کہ حجاج کو پانی کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ عرفات میں ایک کنویں کی کھدائی میں وہ پانچ ہزار گنی خرچ کر چکے ہیں ایک انجن بھی منگوایا ہے مگر ابھی تک پانی نہیں نکلا۔ سننے میں آیا ہے کہ جبل شہداء میں جو مکہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر ہے ایک سوتا دریافت ہوا ہے جس کا قطر نہر زبیدہ سے بھی زیادہ ہے اور پانی بھی اچھا ہے۔ احمد زہیر جو ایک عراقی رئیس اور سلطان کے خاص دوست ہیں بیان کرتے تھے کہ سلطان بہت خوش ہیں اور کہتے ہیں کہ ان شاء اللہ اس سوتے سے میں مکہ سیراب کر لوں گا۔

حجاج کے لئے منا سے عرفات تک ہسپتال کے متعدد کیمپ تھے۔ اور پانچ ڈاکٹر، عبد الہادی امین بیگ اور شبیر جو شامی ہیں اور عبد الحمید اور محمود جو لاہوری ہیں ہر وقت گشت اور علاج میں مصروف رہتے تھے۔ دو لاریاں اسی غرض کے لئے مامور تھیں کہ مریضوں کو کیمپ میں پہنچاتی رہیں۔

امسال اللہ کے فضل سے بہت امن رہا اور ۸ ذی حجہ سے ۱۲ تک یعنی پانچ دن میں اموات کی کل تعداد ۴۲۵ تھی جن میں سے ۵۰ فیصدی لو کی وجہ سے واقع ہوئیں۔ تقریباً تین لاکھ آدمیوں میں روزانہ ۰۔۷٪ اموات کا اوسط بالکل معمولی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ بعض حجاج اپنے بخل یا ناداری کی وجہ سے للہ زنی کس خیمہ کے لئے ادا نہیں کرتے جس کی وجہ سے انکو سایہ نصیب نہیں ہوتا اور بعض اوقات لو لگ جاتی ہے جس سے جانبری مشکل ہوتی ہے۔

ہندوستانی حاجیوں میں سے اہل بنگالہ بالخصوص باوجود روپیہ رکھنے کے بھی بخل سے کام لیتے ہیں اور ان میں سے بہت سے سوال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ واپسی میں میں نے دیکھا کہ جدہ اور نیز جہاز میں ان میں سے بعض لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ انکی وجہ سے تمام ہندوستانی عربوں کی نگاہ میں ذلیل ہیں۔

جہاز میں تو محض لالچ کی وجہ سے یہ مسکین بنجاتے تھے۔ ہوٹل سے دال بھات کھا کے آ رہے ہیں لیکن کسی کو گوشت یا پلاؤ کھاتے دیکھا فوراً پیالہ سامنے کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس بدپرہیزی سے بیاری

میں مبتلا ہوتے تھے اور مرتے تھے۔ اور اکثر تو بحیثیت مکہ سے ساتھ لاتے تھے۔ جہازمیں ۱۴ اموتیں ہوئیں جن میں سے ۱۲ بنگالی تھے۔

میں علماء بنگالہ سے خصوصیت کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھا دیں کہ سوال ذلت ہے۔ سوال حرام ہے اور سواد الوجہ فی الدارین ہے۔

منا میں قربانی کے بعد سلطان کو عید کی مبارکباد دینے کے لئے لوگ گئے۔ ہر شخص جو جاتا تھا۔ سلطان کھڑے ہوکر برادرانہ اس سے مصافحہ کرتے تھے۔ ٹیونس کے ایک بزرگ مصافحہ کے وقت جھک گئے۔ سلطان نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے کہ کسی کے آگے آدمی سر جھکائے۔ لوگوں کو جاہ و تمکنت پسند امراء نے یہ عادت سکھا رکھی ہے۔ میں مسلمانوں کے لئے اسکو نہایت نازیبا سمجھتا ہوں۔

عربوں میں یہ دستور بھی میں نے دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ کرتے وقت رخسار یا پیشانی چومتے ہیں اور یہ رسم اس قدر عام ہے کہ اختیار تمیزی کی اس میں بہت کم گنجائش ہے۔

ابراہیم الفضل اسی دوران میں انتقال کر گئے تھے انکے اعزہ منا میں تھے دوسرے دن ہم ان کی ماتم پرسی کو گئے۔ اس کے بعد رمی جمرات کیا۔ بعض جہال کی حالت دیکھکر مجھے بہت ہنسی آئی۔ ایک ہندوستانی عقبہ اولے پر رمی کر رہا تھا۔ بجائے چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے اس نے پتھر کے ٹکڑے لے رکھے تھے۔ زور، زور سے مارتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ "لے۔ اور لے" غالبًا وہ ان نشانات کو اپنے خیال میں مجسم شیطان سمجھے ہوئے تھا۔

ایک بڑے ڈیل ڈول والے الہ آباد کے واعظ بھی تھے۔ کہنے لگے کہ میں نے بھی آج تاک تاک کے شیطان کے منہ ہی منہ میں پتھر مارے۔ میں نے کہا تو پھر تو اس کے دانت بھی جھڑ گئے ہوں گے اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہونگی۔

قربانیاں لاکھوں کی تعداد میں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ انکا گوشت کھانے کے لئے لاتے ہیں۔ آس پاس کے بدوبھی بقدر ضرورت اٹھا لیجاتے ہیں۔ بعضوں کو میں نے دیکھا کہ وہ کھالیں بھی کھینچ کر

تھے۔ مگر کہاں تک بڑا حصہ بیکار رہ جاتا ہے۔ حافظ حلیم صاحب کانپوری سے اسکے متعلق گفتگو ہوئی کہ اگر آپ ان کھالوں کے نکالنے کا کچھ بندوبست کر سکیں تو یہ ایک بڑی خدمت ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ہر طرح پر اندازہ لگا لیا۔ تاجرانہ حیثیت سے اس میں جس قدر خرچ پڑے گا اتنا نفع نہ ہو گا۔ یہاں کارخانہ دباغت بھی قائم کرنا مشکل ہے کیونکہ پانی نہیں ہے۔

بالعموم دنبے اور بکریاں لوگوں نے ذبح کیں۔ خال خال لوگ تھے جنہوں نے اونٹ خریدے تھے۔ آٹھ دس روپیہ میں اچھے دنبے اور پانچ چھ روپئے میں اچھی بکری مل جاتی تھی۔ اونٹ تین چار گنی میں۔

امسال اونٹوں کے کرایہ میں حکومت نے بہ نسبت سالہائے سابق کے ۲۵ فیصدی اضافہ کر دیا تھا۔ حجاج اس سے ناراض تھے لیکن اصلیت یہ ہے کہ حکومت حجاج کے لئے آسائش اور امن و امان قائم کرنے میں بہت خرچ کرتی ہے۔ قبائل کے شیوخ کو جنکی ضمانتوں میں انکے علاقے ہوتے ہیں رقم دینی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ صحت عامہ پر بھی معمول سے زیادہ صرفہ بڑھ گیا ہے اور حجاز کی آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں بجز حجاج کے اس لئے ناگزیر تھا کہ اونٹوں اور موٹروں کے کرایہ میں اضافہ کر کے اخراجات کے لئے رقم نکالی جائے

میں نے دیکھا کہ نجدیوں اور نجدی حکومت کے زیادہ تر شاکی ہندی ہی تھے اور انکی اکثر شکایتیں نہایت خفیف بے بنیاد یا بربنائے تعصب تھیں۔ ورنہ ہم غیر عرب حجاج کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہمارا جان و مال محفوظ رہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے آب و گیا خطہ میں آرام و آسائش خاصکر پانی کا بندوبست کیا جائے۔ ان دونوں امور میں وہابی حکومت مطلق قاصر نہیں ہے۔ اتنا بڑا اجتماع تھا لیکن ایک شخص کی نسبت یہ سننے میں نہ آیا کہ وہ لوٹا یا مارا گیا ہو۔ ورنہ یہ کہ کوئی پانی کی قلت سے ضائع ہوا ہو۔ حالانکہ یہ باتیں وہابی حکومت سے پہلے بالکل عام تھیں۔

سال گذشتہ اس قسم کا صرف ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے سنا کہ ان حجاج میں سے جو مکہ سے جدہ کو واپس ہوئے کو شمار کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی غائب ہو گیا۔ ابن سعود کی پولیس

توت اس کی تلاش میں مصروف ہوگئی چنانچہ وہ ہندی راستہ میں ایک ٹیلہ کے نیچے زخمی ملا۔ سلطان نے اس علاقہ کے شیخ کو طلب کیا اور کہا کہ مجرم کو معہ حاجی کے سامان کے حاضر کرو۔ دوسرے دن بد و معطال سلوب کے جو اس کے سر پر تھا پہنچا یا گیا۔ سلطان بہت برہم ہوئے۔ اور کہا کہ لوگ اپنے اہل وعیال اور خانماں کو چھوڑ کر مال صرف کر کے اور سفر کی زحمتیں اٹھا کر بیت اللہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور یہ بے ایمان انکو لوٹتے ہیں۔ میں ایسی سخت سزا دوں گا جو دوسروں کے لئے عبرت ہو۔ قاضی نے اس کو ڈاکو قرار دیکر ایک ہاتھ اور پاؤں برخلاف کاٹ لینے کا حکم دیا۔ سلطان نے اعلان کرایا اور مجمع عام میں جدہ کے سامنے ڈاکو کو بلوا کر ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹوا دیا۔

امن کا مظہر وہاں اسقدر نمایاں ہے کہ بنگالی حاجی جو خوف کیوجہ سے شغدف سے نیچے نہیں اترتے تھے اب جدہ سے مکہ اور مکہ سے جدہ پیدل آتے جاتے ہیں۔ میں واپسی میں عشا کے بعد مکہ سے موٹر پر چلا تھا راستہ میں دیکھا کہ عورتیں اور لڑکیاں تک پیدل چلی آ رہی ہیں۔ اور وہی بنگالی جو شغدفوں سے نہیں اترتے تھے میدانوں۔ پہاڑوں کے دامنوں اور ہموار ٹیلوں پر جا بجا دو دو اور چار چار آرام سے سوئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمیانیاں انکی کمروں سے بندھی ہوئی ہونگی۔ اور کہیں نہ پولیس ہے نہ چوکیدار وہی بدو جو لوٹتے تھے اب محافظ ہیں۔

راستہ میں کہیں کہیں میں نے دیکھا کہ اونٹوں پر سے مسافروں کے بستر۔ برتن اور صندوق وغیرہ گرے پڑے ہیں موٹر والے سے کہا کہ انکو اٹھا لے جدہ میں چلکر ہم پولیس کے حوالہ کر دینگے۔ اس نے کہا کہ ہم نہیں اٹھا سکتے۔ اور آپ اطمینان رکھیں یہ سب کا سب صبح تک جدہ تک پہنچ جائیگا اور انکے مالکوں کے حوالہ کر دیا جائیگا۔

جدہ میں معلموں کے وکیلوں کے دروازوں پر پچاسوں حاجیوں کے سامان آئے ہوئے پڑے تھے جس میں صندوق بھی تھے۔ ہنڈبیگ بھی اور بستر بھی۔ وکیل ان حجاج سے کہتا تھا کہ جہاں ہر سے ہو وہاں اپنے اپنے سامان لیجاؤ۔ لیکن بہت کم لوگ ملے گئے۔ کیونکہ انکو یقین تھا کہ یہ جب تک ہمارے کمروں میں محفوظ ہیں اسی قدر اس سڑک پر۔ چنانچہ ایک ہفتہ تک میں رہا اور انکے سارے سامان وہیں

پڑے دیکھتا رہا۔

ڈاکہ اور رہزنی اب بالکل مفقود ہی بلکہ تقریباً ناممکن۔ ہاں چوریاں ہوتی ہیں وہ بھی بہت کم۔ اور بیشتر خود حجاج ایک دوسرے کا مال چراتے تھے۔ چنانچہ جہاز میں بھی اس قسم کے وقوعے ہوتے رہے۔

حج سے فارغ ہونیکے بعد واپس آنے والے حجاج عجلت کیساتھ جدہ پہنچتے ہیں کیونکہ واپسی کے ٹکٹ آمد ہی کی ترتیب پر ملتے ہیں۔ جہاز بھر جانے پر بقیہ مسافروں کو وہیں پڑا رہنا پڑتا ہے۔ ممکن ہو کہ دوسرے جہاز کے انتظار میں کئی ہفتہ لگ جائیں۔ اور امسال جہاز کی کپنیوں کے باہمی تنازع سے ایک کپنی کا مسافر دوسری کپنی کے جہاز سے نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے بہت سے آدمی وہاں پڑے رہ گئے۔ اگر مکہ ہی میں جہازوں کی روانگی کی تاریخ معلوم ہوتی رہے جو کچھ مشکل نہیں ہو کیونکہ ٹیلیفون لگا ہوا ہے تو حاجیوں کو حرم چھوڑ کر جدہ میں انتظار کے دن نہ کاٹنے پڑیں۔ جاوی حجاج کے لئے انتظام اچھا تھا۔ انکے تمام جہازوں کی روانگی کی تاریخ اخبار ام القریٰ میں پہلے ہی سے شائع ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے حجاج کا انتظام بہت اصلاح طلب ہو۔ خان بہادر ڈپٹی عبد الرحٰمن صاحب نے انکی پریشانیاں دیکھکر برٹش قونصل سے مفصل گفتگو کی تھی۔ مجھسے فرماتے تھے کہ میں نے اس کے متعلق تجاویز سوچی ہیں۔ ہندوستان میں پہنچکر انکو اسمبلی میں پیش کراؤں گا تاکہ قانونی شکل میں آجائیں۔

جدہ چھوٹا شہر ہے۔ سڑکیں معمولی ہیں۔ وہ حصہ کسی قدر صاف اور شاندار ہے جدہر قونصل خانے ہیں۔ بازار میں ضرورت کی جملہ اشیاء موجود ہیں۔ پانی البتہ یہاں ہر جگہ سے زیادہ گراں ہو کیونکہ سمندر کے کھارے پانی سے تیار کیا جاتا ہے اور قیمتاً ملتا ہے۔ قہوہ خانے اور ہر قسم کی کھانے کی دکانیں بہت ہیں۔

ہمارے مذاق کے علمی آدمی صرف شیخ نصیف ہیں۔ جاتے وقت سلطان ابن سعود انکے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے اسوجہ سے ان سے ہم نہ مل سکے۔ واپسی میں چونکہ میں اکیلا تھا اس لئے اکثر انہیں کے یہاں پہنچ جاتا تھا۔ انکے پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت اچھا اور بڑا ہے۔ عربی کی جملہ علمی کتابیں موجود ہیں اور شوقین اسقدر کہ جلدیں مصر سے بندھواتے ہیں۔ جہاں کسی کتاب کا نام سنتے ہیں فوراً منگاتے ہیں۔ ابن

جوزی کی تلقیح جو گذشتہ سال دہلی سے شائع ہوئی تھی انکے پاس تھی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری کی شرح ترمذی کی بابت بھی جو دہلی میں چھپ رہی ہے دیر تک مجھ سے پوچھتے رہے۔ امین ریحانی کی تاریخ النجد الحدیث جو اسی مہینہ میں شائع ہوئی تھی میں نے انکے یہاں دیکھی۔

میرے دوست مولوی عبدالرحمٰن صاحب مرآۃ الشعر والے جو دہلی یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے ہیڈ ہیں حج سے واپسی کے بعد جدہ میں ولایت کے سفر کیلئے جہاں انٹرنیشنل کانفرنس میں وہ ایک مضمون پڑھنے والے ہیں مصری جہاز المنصورہ کے انتظار میں تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ شیخ نصیف کے یہاں جاتے تھے شیخ کی دعوت بھی مجکو کبھی نہ بھولیگی جو سلطانی دعوت سے کم نہ تھی۔ اور تعجب یہ ہے کہ یہ بھی میز اور کرسی پر تھی اور چھری اور کانٹے کے ساتھ۔

ایک دن سلسلۂ گفتگو میں میں نے کہا کہ آخر یہ حنبلیت کس بنیاد پر ہے اور سلفیت کس اصول پر؟ کہنے لگے کہ علما نجد میں سے سب تو نہیں مگر اہل نظر اس تفریق کو ناپسند کرنے لگے ہیں اور صرف مسلمان بننا کافی سمجھتے ہیں۔ عرب جنکی تاریخ بچپن سے پڑھتے چلے آتے ہیں اس مختصر سے سفر حج میں آج بھی ہمکو انہیں صفات میں نظر آئے۔ انہیں دین ہے اور شجاعت۔ مہمان نوازی ہے اور کرم۔ خوش خلقی اور زندہ دلی انکی ایک ایک ادا سے ٹپکتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ قومی عیوب بھی ہیں جنہوں نے انکو کھویا ہے یعنی قبائلی عصبیت اور فخر بالانساب۔ انکے ساتھ سب سے دلچسپ گفتگو وہ ہوتی تھی جن میں قبائل کے انساب اور انکے مفاخر کا تذکرہ ہوتا تھا آجکل ربیعہ کی گردنیں بلند ہیں کیونکہ حکومت اور سیادت بنی تغلب کے ہاتھ میں ہے۔ مگر مضر میں سے قریش کی بزرگی اب بھی مسلم ہے۔

یہ امر نہایت رنجدہ ہے کہ غلامی جسکا رواج دنیا سے بالعموم اٹھ گیا ہے اب تک عرب میں پائی جاتی ہے اور مکہ جیسے محترم اور مقدس شہر میں جو اسلام کا مرکز ہے بردہ فروشی کی دکان موجود ہے۔ سلطان کو اسکا علم ہے لیکن پھر بھی وہ اس کے انسداد کیطرف توجہ نہیں کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اس کے کچھ ایسے خوگر ہوگئے ہیں کہ اس کو اتنا برا نہیں سمجھتے جس قدر کہ وہ ہماری نگاہ میں ہے۔

اسلم

کوہ مسوری

از مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل

مرحبا کوہ مسوری! یہ تری شانِ جمال — تیری چوکھٹ چومتے ہیں سر فروشانِ جمال
جا بجا خم دار سڑکیں اس پہ پھولوں کا ہجوم — جیسے بل کھائی ہوئی زلفِ عروسانِ جمال
یہ فلک فرسا بلندی پیکرِ شان و شکوہ — یہ بہشت آشوب رنگ آرائیاں جانِ جمال
تیری برف آلود چوٹی بن گئی آئینہ دار — دیکھنی چاہی شعاعِ حور نے شانِ جمال
تیرے کھڈ سے ابر یوں لہرا کے ہوتا ہے بلند — رقص میں ہو جیسے آہِ مستمندانِ جمال
صبحدم پھولوں پہ وہ اک کہر سا چھایا ہوا — کھل گئی ہو نیند میں یا زلفِ پیچانِ جمال
دامنِ کہسار میں وہ لالہ و گل کا ہجوم — رنگ لایا ہو غضب خونِ شہیدانِ جمال
ابر و باد و ماہ و خور سب تابعِ فرمانِ حسن — حکمراں اس سرزمیں پر ہے سلیمانِ جمال
یہ نضارت خیز منظر یہ نسیمِ مشکبار — ایک فردوسِ نظر ہے یہ خیابانِ جمال
حسنِ فطرت پر تمدن کی یہ رنگ آمیزیاں — ہو گیا لبریز گلہا آ کے دامانِ جمال
صبحدم وہ شعلۂ رخسارِ گل کی آب و تاب — جگمگا اٹھتی ہے گویا اک شبستانِ جمال

شب کو وہ فانوس برقی کی فروغ انگیزیاں ہر طرف روشن ہے اک سرو چراغانِ جمال
یہ قیامت خیز جلوے اُس پہ یہ حسنِ فرنگ ہر روش پر جلوہ گر سروِ خرامانِ جمال
ہر قدم پر "یا الٰہی خیر" کہتی ہے نگاہ آفت نظارہ ہے یہ محشرستانِ جمال

زیں گلستان شعلۂ شوقے بجانم درگرفت
تا دل افسردہ ام ذوق نوا از سر گرفت

ہے ہوا اس سرزمیں کی یا شرابِ زندگی پھر دلِ افسردہ میں ہے التہابِ زندگی
یہ نشاطِ بے خلش ہے زندگی کا ماحصل وقت جو گزرا یہاں وہ تھا شبابِ زندگی
رزمِ ہستی کی کشاکش سے رہائی ہو گئی یاں ملی آکر ہمیں تعبیرِ خوابِ زندگی
روح کو صحرائے غربت میں ملا درسِ سکوں تھی وطن کی زندگی تو خود حجابِ زندگی
رات دن شورِ من و تو، روز و شب فکرِ معاش بس خور و خواب و غلامی ہے نصابِ زندگی
صورتِ مرغِ قفس نغمے بھی اپنے وقفِ غیر ننگ ہے اس زندگانی پر خطابِ زندگی
اے مصوری! تیرے صدقے تو نے دکھلایا ہمیں کس طرح ہیں اہلِ مغرب کامیابِ زندگی
اب گئے وہ دن کہ مشرق سے یہ ہوتا تھا طلوع سوئے مغرب اب تو پہنچا آفتابِ زندگی
گوشِ عبرت سے تو سن مرغانِ صحرا کی صدا زندگی مرغِ قفس کی ہے عذابِ زندگی

تیری آنکھوں سے نہاں ہے چشمۂ آبِ حیات
یہ نمودِ ظاہری تو ہے سرابِ زندگی

روحِ حریت کی بیداری کو کہتے ہیں حیات
روز و شب سے تو لگاتا ہے حسابِ زندگی

قوم پر مٹنے سے ملتی ہے حیاتِ جاوداں
ٹوٹ کر خود بحر بنتا ہے حبابِ زندگی

ہوتی ہے سیراب خونِ آرزو سے کشتِ دل
دودِ آہِ دل سے اٹھتا ہے سحابِ زندگی

ہے نویدِ صبحِ ہستی خندۂ چاکِ جگر
اس قفس کا ٹوٹنا ہے فتحیابِ زندگی

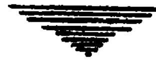
تو نے اس آسائشِ ہستی کو سمجھا ہے حیات
اے اسیرِ دامِ غفلت! یہ ہے خوابِ زندگی

جا سوئے گورِ غریباں گر ہے راحت کی تلاش
زندگی تو اصل میں ہے اضطرابِ زندگی

اے اسیرِ رنگ و بو تا کے گرفتارِ فریب
اٹھ کہ اب آیا ہے وقتِ انقلابِ زندگی

دہر کو معمور کر اے نغمۂ توحید سے
چھیڑ دے ناخن سے پھر تارِ ربابِ زندگی

خیز و گلزارِ وطن را آب و رنگ از سر بدہ
ایں خراباتِ کہن را رونقِ دیگر بدہ



تنقید و تبصرہ

رسائل

نورجہاں ۔ نظام المشائخ ۔ اسلام ۔ مولوی ۔ نمائش ۔ سفینہ

ر جہاں کا دارالخواتین نمبر نسائی رسالوں میں "نورجہاں" امرتسر نہایت ممتاز رسالہ ہے ۔ دوسرے رسائل ا طرح "نورجہاں" نے بھی خاص نمبر شائع کرنے شروع کئے ہیں ۔ دارالخواتین نمبر اسی سلسلہ کی تیسری کڑی ہے ۔ یہ نمبر تحریک دارالخواتین کی اشاعت اور تقویت کے خیال سے ترتیب دیا گیا ہے ۔ اور مفید علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۶۰ صفحوں پر ختم ہوتا ہے ۔ رسالہ کو دلچسپ بنانے کی خاطر کافی تعداد میں تصاویر بھی شامل ا گئی ہیں ۔ یہ امر بھی امید افزا ہے کہ گو رسالہ مرد مضمون نگاروں سے بے نیاز نہیں ہے لیکن اس کا یادہ حصہ عورتوں ہی کے تراوش قلم کا رہین منت ہے ۔ قیمت ۱۲

ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت نسوان امرتسر ۔

ظام المشائخ محمد رسول نمبر نظام المشائخ نہایت ہی قدیم مذہبی رسالہ ہے ۔ اس کا رسول نمبر ہمارے پیش نظر ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے مختلف پہلوؤں پر اس کے اکثر مضامین میں نہایت عقیدت اور محبت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس لئے عاشقان رسول کے لئے نہایت اچھا تحفہ ہے ۔ س رسالہ میں خواجہ حسن نظامی صاحب کی تفسیر القرآن بھی مسلسل شائع ہوتی ہے ۔ قیمت با تفسیر سالانہ ہے بے تفسیر دو روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ : درگاہ چیلان ۔ دہلی

اسلام کا پیغمبر نمبر | اسلام ایک تبلیغی رسالہ ہے اس لئے پیغمبر نمبر میں وہ اسی اسلام اور انکی تبلیغ کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ مضمون نگاروں میں اکثر معتقد حضرات کے نام بھی نظر آتے ہیں قیمت سالانہ ۶ ر
ملنے کا پتہ: اسلام امرت سر

مولوی کا رسول نمبر | "مولوی" دہلی نے اپنا رسول نمبر نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ لکھائی باریک اور چھپائی سرخ ہے جس سے پڑھنے میں عام طور پر تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں نہ صرف عمارات کی بلکہ کئی ایک انسانی تصاویر بھی موجود ہیں اور "مولوی" میں انکی موجودگی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اشتہارات کے سلسلہ میں جواتی اور اس کے لوازمات متعلقہ پر کافی سامان مہیا کیا گیا ہے جس سے ہماری رائے میں مولوی کو کم سے کم اس نمبر میں تو ضرور احتراز کرنا چاہیئے تھا۔ حجم ۱۲۰ صفحے قیمت ۱۲ ر سالانہ ۶ر
ملنے کا پتہ:۔ مولوی کوچہ چیلان، دہلی

نمائش | یہ رسالہ میرزا رفیق بیگ صاحب کی ادارت میں دکن سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں ادبی مضامین کے علاوہ سائنس اور صنعت کے مضامین کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ ستمبر کے رسالہ میں "ہندوستان اور زراعت"، "متحرک تصویریں" اور "یورپ کی صنعت کا زمانہ" اس حصہ کے خاص مضامین ہیں۔ دوسرے مضامین میں "اشتراکیت کی ابجد" خاص طور پر ناظرین کی توجہ کا مستحق ہے۔ قیمت سالانہ سے
ملنے کا پتہ:۔ نمائش کاچی گوڑہ

سفینہ | مدراس سے کسی وسیع اردو رسالہ کا شائع ہونا یقیناً تعجب خیز ہے۔ جنوبی ہند میں اردو زبان کا جس قدر کم رواج ہے اس کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ ایک رسالہ کو طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہونے کا امکان ہے مضامین کی کمی تو ممکن ہے کہ شمالی ہند سے پوری کیجا سکے لیکن خریداروں کی بے توجہی کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ ان حالات میں اردو سوسائٹی گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس کی یہ سعی کہ اس نے ایک سہ ماہی

رسالہ شائع کرنا شروع کر دیا یقیناً قابل مبارکباد ہے۔ رسالہ کی مجلس ادارت پانچ حضرات پر مشتمل ہے جسمیں چار طالب علم ہیں اور انکے صدر "فضل العلما" جناب محمد عبدالحق صاحب ایم اے ہیں۔ رسالہ کے پہلے دو نمبر اس وقت ہمارے سامنے ہیں فہرست مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ رسالہ مذکور کی نہایت صحیح اصولوں پر ابتدا کی گئی اور ذوق سلیم کے ساتھ اس کو ترتیب دیا گیا ہے یعنی اسے محض کالج کی فضا میں محدود نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ دعوت عام ہو۔ یقیناً مدراس میں ایک ایسے رسالہ کی سخت ضرورت تھی جو جنوبی ہند میں اردو کی ترویج کے سلسلہ میں مد ہو اور یہاں کے اردو داں طبقہ میں صحیح مذاق ادب پیدا کر سکے۔ سفینہ بخوبی اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کی کافی ہمت افزائی کیجائے گی۔ قیمت سالانہ ہے

(م۔ ع۔ خ) ملنے کا پتہ:۔ سفینہ۔ گورنمنٹ محمڈن کالج۔ ماؤنٹ روڈ۔ مدراس

کتب

خدا کے رسول۔ تذکرۂ رسول۔ منتخبات اردو۔ لطیفیات۔

خدا کے رسول | مرتبہ محمد مہدی صاحب اسسٹنٹ مہتمم تاریخ بھوپال۔ ناشر محمد قاسم صاحب جاگیردار مالی پوڑ بھوپال۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۴۶ صفحات۔ قیمت ۲ر

شکر ہے کہ بچوں کے لئے سیرۃ پاک پر چند مفید کتابیں مہیا ہو گئی ہیں۔ چونکہ لکھنے والے عموماً ایسے ہیں جنہیں رسول اکرم کی سوانح زندگی میں دنیا کے لئے ایک بہترین نمونہ نظر آتا ہے اور وہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت سے بھی واقف ہیں اس لئے ہمارے خیال میں جس نے بھی جو لکھا خوب لکھا ہے۔ محمد مہدی صاحب اسسٹنٹ مہتمم تاریخ۔ بھوپال کی کتاب "خدا کے رسول" ہم نے پڑھی۔ بچوں کے لئے بہت مفید تالیف ہے زبان نہایت آسان ہے اور واقعات صرف وہی لئے ہیں جو ایک آٹھ نو برس کے بچے کی سمجھ میں آسکیں مولوی صاحب سیرت نبوی پر چار کتابیں اور مرتب کر رہے ہیں جو ایک دوسرے سے نسبتاً مفصل و مشرح ہوں گی۔ ہماری دعا ہے کہ وہ کتابیں بھی جلد زیور طبع سے آراستہ ہو کر بچوں کے ہاتھوں تک پہنچ جائیں۔

تذکرۂ رسول | مؤلفہ محمد عبد الغنی حسنی صاحب۔ ناشر کتب خانہ رحمانی شیخ پورہ مونگیر۔ سائز [illegible] حجم ۵۵ صفحات۔ قیمت ۵ر

حضور اکرم کے مقدس حالات زندگی پر ایک مختصر سا رسالہ ہے جو دوسری بار شائع ہوا ہے۔ مولود خواں "طبقہ" اگر میلاد کی محفلوں میں جھوٹی سچی روایتیں بیان کرنے کے بجائے اس کتاب سے کچھ فائدہ اٹھائے تو بہتر ہے۔ تذکرۂ رسول میں دو چیزیں قابل ذکر ہیں معجزات رسول کا بیان اور چند اچھے شعراء کے حمد و نعت کا انتخاب جو کتاب کے آخر میں درج ہے۔

منتخبات اردو | مؤلفہ سید ابو ظفر صاحب ندوی۔ ناشر گجرات ودیا پیٹھ۔ احمد آباد۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۰۹ صفحات۔ قیمت ۲ر

یہ گجرات کی قومی یونیورسٹی کے نصاب کی کتاب ہے جو کم اردو جاننے ہندو طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے انتخاب اچھا ہے۔ اور دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے یعنی یہ کہ کتاب کے مطالعہ سے طلبہ کے دلوں میں اپنے ملک کی محبت پیدا ہو اور جو ناواقفیت عموماً ہندو طلبہ کو مسلمانوں کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ وہ باقی نہ رہے۔ ہمارے خیال میں سید ابو ظفر صاحب اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف ہندو طلبہ کے لئے مفید ہے بلکہ مسلمان بچوں کے لئے بھی موزوں ہے۔ اور اسلامیہ اسکولوں کے چھوٹے درجہ کے نصاب میں داخل ہو سکتی ہے۔ طباعت اور کاغذ وغیرہ بہتر ہے۔ اور قیمت ۲ر بہت کم۔

لطیفیات | مصنفہ محمد حسن صاحب لطیفی۔ ناشر جناب عارف ہاشمی ہاؤس۔ لدھیانہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۵ صفحات۔ قیمت ۱۲ر

لطیفی صاحب کے شاعرانہ جذبات اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ بیشتر مضامین اور نظمیں "راوی" "انیس" اور "انتخاب" وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ کتابت، طباعت اور کاغذ وغیرہ اچھا ہے۔

(ح۔ ع۔ خ)

شذرات

ہندوستان میں اس وقت جس قدر قومی مدارس ہیں ان سب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنی خصوصیات میں امتیاز رکھتی ہے وہ امتیاز یہ ہے کہ جدید مغربی علوم اور قدیم مشرقی آداب میں جو امتزاج ہوا اس کے لحاظ سے اہل ہند کے لئے جو بہترین لائحہ تعلیم ہو سکتا تھا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے دینی عقائد اور تمدنی و معاشرتی آداب کو ایک طرف سنبھالے رکھیں اور دوسری طرف مغربی علوم و فنون سے بھی بہرہ ور ہوں اس جامعہ کی صورت میں نمایاں ہوا۔ قوم و ملک کے تعلیمی رہنماؤں نے جن کے دل ملکی و قومی ہمدردی سے لبریز تھے اس کے نصاب اور نظام کو مرتب کیا اور اس درسگاہ کو قائم کر کے انہیں صحیح تعلیمی اصول پر چلایا۔

جامعہ کے مقاصد متعین ہیں اُن میں اس کو کسی قسم کا التباس یا تذبذب نہیں۔ اس کے سامنے ملک اور قوم کی بہبود اور آزادی ہے۔ دینی اور دنیوی صلاح و فلاح ہے۔ وہ مشرقی مدارس کی کہنہ اور فرسودہ نزاعات سے بیزار ہے اور جدید تعلیم گاہوں کے الحاد و بے دینی سے بمراحل بعید۔ اس کا مطمح نظر نہیں ہے کہ وہ دین کے نام سے چند کتابیں پڑھا کر طلبہ کو مسجدوں کی امامت یا مذہبی مناظروں کے لئے تیار کرے نہ یہ کہ فقط دنیوی تعلیم دے کر غلامی اور نوکری کے قابل بنا دے بلکہ وہ انکے دماغوں کو ان ادنیٰ امور سے اس بلندی کیطرف لیجانا چاہتی ہے۔ جہاں سے انسان حقائق شناسی کے ساتھ دینی اور دنیوی ترقی کی راہیں دیکھتا ہے اور اپنے اندازہ کے مطابق ملکی اور قومی خدمت کے قابل ہوتا ہے۔

یہ مقصد ایک حقیقت ہے جس کی طرف ابھی تک اہل ملک کی توجہ بہت کم ہے لیکن ہم کو یقین ہے کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جبکہ قومی اور ملکی تعلیم کے نظام پر ملت کو غور کرنا ہوگا اور اسی شاہراہ کو اختیار کرنا ہوگا جس کو ارباب بصیرت نے جامعہ کی شکل میں رونما کیا ہے۔

کیا ہندو اور مسلم تعلیم کا مسئلہ الگ الگ زاویۂ نگاہ کے مطابق رہے گا؟ کیا ان میں یکجہتی اور اغراض ومقاصد میں یگانگت نہیں پیدا کیجائے گی جس کے بغیر ملک کا ترقی کرنا محال ہے؟ کیا مسلمانوں میں ایک جماعت صرف عربی اور دوسری جماعت صرف مغربی تعلیم پر قائم رہے گی اور وحدت تعلیم کا سوال حل نہ کیا جائے گا؟ کیا ہندوستانیوں کی تعلیم دفتری حکومت ہی کے مفاد کے لئے ہوگی یا ان کو اپنا اور اپنی ملت کا مفاد بھی مدنظر ہوگا؟ غرض یہ اور اسی قسم کے اور بھی مسائل ہیں جن کا حل اس نظام اور نصاب میں موجود ہے جنکو جامعہ نے اختیار کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں دفتری حکومت نہ ہمکو امداد دے سکتی تھی نہ ہم اس سے توقع رکھ سکتے تھے چنانچہ حکومت کی امداد کا سوال ہمارے پروگرام سے روز اول ہی سے خارج ہے۔ اور جامعہ کا کل سرمایہ صرف ملک وملت ہے جس نے افسوس ہے کہ ابھی تک بہت کم توجہ اس طرف منعطف کی ہے ہم رؤسا، یا امرا، یا اس جماعت کو جو حکومت کے زیر اثر ہے کسی قدر معذور رکھتے ہیں کیونکہ ہمارے اغراض تعلیمی کے ساتھ انکی ہمدردی واعانت اسی وقت ہوسکتی ہے جب حکومت کا اشارہ ہو لیکن رہنمایان ملک۔ ارباب بصیرت اور عام ملت سے ہم کو ضرور گلہ ہوسکتا ہے۔

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم جو اس درسگاہ کے مربی اور سرپرست تھے انکی وفات کے بعد اجمل میموریل فنڈ کھولا گیا۔ باوجود اس کے کہ مسیح الملک کے تعلقات ہندوستان کے طول وعرض میں عوام سے لیکر امراء اور رؤسا تک کے ساتھ تھے لیکن پھر بھی کوشش بلیغ کے بعد آٹھ لاکھ کی اپیل میں سے صرف پندرہ ہزار روپے جمع ہوسکے اور جامعہ کی ان مالی مشکلات میں جو حکیم صاحب کے انتقال کے بعد آپڑیں اس رقم سے کوئی آسانی نہ پیدا ہوسکی۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جامعہ کا آٹھواں یوم تاسیس تھا جو بعض ضروری ارکان کی اس دن عدم موجودگی کیوجہ سے ۵ر نومبر کو منایا گیا۔

طلبائے جامعہ نے اپنے علمی تعلق کیوجہ سے اس دن کے لئے جامعہ کے واسطے اپنی اپنی قابلیت اور بساط کے مطابق تحفے تیار کئے تھے جو بیشتر علمی تھے۔ مثلاً مختلف اسلامی فتوحات کے تاریخی نقشے، حیوانات بری و بحری کی شکلیں۔ مشاہیر کی تصویریں، قطعات۔ کتبے۔ بزرگان دین کے مقولے دلکش خط میں نقش و نگار کے ساتھ۔ خطبات اور مختلف مضامین وغیرہ۔ حاضرین نے ان کو بہت دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا۔

شرکاء جلسہ میں بڑے بڑے رہنمایان ملک بھی تھے مثلاً پنڈت مدن موہن مالویہ۔ پنڈت موتی لال۔ لالہ لاجپت رائے۔ ڈاکٹر بیسنٹ۔ سری نواس آئنگر۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولانا عبدالقادر قصوری وغیرہ

مالوی جی نے قومی جھنڈا نصب فرمایا۔ اس کے بعد شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے جامعہ کی رپورٹ سنائی جس میں ملک و ملت کی بے توجہی کی تلخ حقیقت کو بھی شیریں الفاظ میں ظاہر کیا۔ اور کہا کہ پھر بھی نہ ہم مایوس ہیں نہ ناراض بلکہ کامیابی کا یقین لئے ہوئے صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ ہمارے کام کو دیکھنے کے بعد قوم مجبور ہو جائے گی کہ وہ ہماری طرف اپنی پوری توجہ منعطف کرے۔

ڈاکٹر بیسنٹ نے اپنی تقریر میں طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے مسلمانان سلف کی علمی کوششوں اور ترقیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ دین اسلام اور تاریخ اسلام سے بڑھکر علمی جد وجہد کی ترغیبات کہیں نہیں مل سکتیں

اراکین اردو اکادمی کی خدمت میں سال رواں کی چوتھی کتاب سیر المصنفین حصہ دوم روانہ کیجا چکی ہے۔ پانچویں کتاب تاریخ مغربی یورپ چھپ رہی ہے جو رابنسن کی کتاب [illegible] کا ترجمہ ہے۔ یہ بھی دسمبر میں حاضر خدمت کر دیجائے گی۔ بعض اراکین نے باوجود پیہم خط لکھنے کے تاریخ الامت حصہ ششم کے بارے میں ابتک اطلاع نہیں دی ہے کہ آیا یہ کتاب انکو بھیجی جائے یا نہیں؟ براہ کرم دفتر کو فوراً مطلع کر دیجئے ورنہ دسمبر کے بعد اکادمی سے زرچندہ میں ہم اس کو نہ بھیج سکیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولینا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

کیا اکبر اُمّی محض تھا؟

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اکبر لکھنا پڑھنا مطلقاً نہیں جانتا تھا۔ انگریز مورخین کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ نریندر ناتھ لا نے اپنی کتاب 'پروموشن آف لرننگ' میں اس سے اختلاف کیا ہے[۱]۔ بیورج نے اپنی کتاب کا جو پیش نامہ لکھا ہے اُس میں اُس نے نریندر ناتھ کے خیال کی تردید کر کے[۲] اکبر کے ناخواندہ ہونے پر زور دیا ہے۔ ہم ان سطور میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کرتے ہیں۔

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے[۳]:۔

"پدرمن در اکثر اوقات با دانایان ہر دین و مذہب صحبت می داشتند۔ خصوصاً با پنڈتان و دانایان ہندو۔ با آنکہ اُمی بودند از کثرت مجالست با دانایان و ارباب فضل در گفتگو ہا چناں ظاہر می شد کہ ہیچ کس پے بہ اُمّی بودن ایشاں نمی برد و بدقائق نظم و نثر چناں می رسیدند کہ ما فوقے براں متصور نبود۔"

اسمتھ اپنی مشہور تاریخ 'اکبر' میں لکھتا ہے[۴] کہ "اگرچہ اکبر کی تعلیم کے لئے چار استاد یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے مگر اُن کی سب کوششیں ناکام رہیں۔ اکبر استاد کے نقطۂ خیال سے بالکل ناکارہ تھا۔ اُسے لکھانے پڑھانے کیلئے جس قدر کوششیں کی گئیں اُن سب کا اس نے اس کامیابی سے مقابلہ کیا کہ وہ الف بے بھی نہ سیکھ سکا۔ وہ آخر عمر تک نہ کچھ پڑھ سکتا تھا اور نہ اپنا نام لکھ سکتا۔"

۱۔ نریندر ناتھ لا - پروموشن آف لرننگ صفحہ ۱۳۹

۲۔ ایضاً ایضاً پیش نامہ صفحہ ی ط

۳۔ تزک جہانگیری مدوّنہ سرسید احمد مرحوم صفحہ ۱۴

۴۔ اسمتھ - 'اکبر' صفحہ ۲۲

اسمتھ کا یہ خیال کہ وہ آخر عمر تک لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جب چار استاد یکے بعد دیگرے مقرر کئے گئے تو یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ اکبر جیسا ذہین اور قوی حافظہ لڑکا لکھنا پڑھنا بھی نہ جان سکے۔ یہ مانا کہ اکبر نہایت بدشوق اور کھلاڑی تھا جس سے اُس کے استاد عاجز تھے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ لکھنا پڑھنا مطلقاً کچھ نہ سیکھ سکا۔ علاوہ بریں ہمایوں کی سخت تاکید اور نگرانی تھی اسی لئے یکے بعد دیگرے چار استاد مقرر ہوئے۔ جہاں ایک استاد کی غفلت معلوم ہوئی وہ علیحدہ کردیا گیا اور دوسرا مقرر ہوا۔ ہر نیا استاد شروع شروع میں اکبر سے ضرور کام لیتا ہوگا ہمایوں کس طرح گوارا سکتا تھا کہ اُس کا اکلوتا بیٹا لکھنا پڑھنا بھی نہ جانے۔ فارسی خط بمقابلہ لاطینی یا ہندی خط کے مشکل اور پیچیدہ ضرور ہے مگر اس قدر نہیں کہ ایک ذہین لڑکا متواتر چار یا پانچ استادوں کی کوششوں کے باوجود اسے نہ سیکھ سکے۔ یہ مانا کہ اُس زمانہ میں مطبوعہ کتب نہ تھیں اور نہ خطِ شکستہ کا زیادہ رواج تھا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی تو صحیح ہے کہ اکثر قلمی نسخے آجکل کی مطبوعہ کتب سے نہایت عمدہ لکھے ہوتے تھے اور اِس زمانہ کی طباعتِ سنگ بھی آخر کیا ہے؟ یہ بھی تو قلمی خط کا عکس ہے۔

ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ اکبر عالم فاضل نہ تھا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ لکھنا پڑھنا مطلقاً نہیں جانتا تھا۔ تاریخ فرشتہ میں ہے۔[1]

"اگرچہ خط و سو[illegible]خت اما گاہے شعر گفتے و در علم تاریخ وفنے تمام داشت و قصص ہند نیکو می دانست"

لفظ کامل سے صاف طور پر پتا چلتا ہے کہ وہ کچھ لکھنا پڑھنا ضرور جانتا تھا۔ اگر وہ محض جاہل ناخواندہ ہوتا تو لفظ "کامل" کی جگہ "مطلقاً" یا "کلیتہً" استعمال کرتا۔

اسمتھ کی رائے تمام تر اکبرنامہ کی ایک عبارت پر منحصر ہے جسکا ترجمہ خود اُس نے اپنی

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۱۲۔

کتاب میں نقل کیا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے[1]:۔

"بر خردمندانِ دقیقہ شناس پوشیدہ نیست کہ تعین معظم دریں جا از باب رسوم و عادت است نہ از قسم اکتساب کمالات۔ وگرنہ دانش پرور ایزدی را بہ تعلم از مخلوق و توجہ بسبق چہ نیاز و لہذا ہرگز خاطر اقدس و باطن مقدس متوجہ تعلیم صوری نشد و بود۔ وعمدا حکم و مصالح بے پیایئے آنحضرت بحرف آموزی رسے آنکہ در زمان ظہور انوار فتوحات غیبی بر جہانیان ظاہر شود کہ دریافت بلند این خدیو زمان آموختگی و ساختگی نیست۔ و دادالٰہی است کہ تکاپوئے بشری را درآں مدخل نبودہ۔

و آنحضرت درآں زماں بہ بخنوری ظاہری و فراوانی دولت صوری اختصاص داشتہ از اظہار کمالات معنوی خود تجاہل عارف نمودہ اکثر اوقات بہ بازی می پرداختند و در نقاب خفا کار ہوشمندی می کردند بطوریکہ دور بینان روزگار ہم بر ایں نظر می افتاد۔"

اس تمام عبارت کا لب لباب یہی تو ہے کہ جب اکبر خداوند تعالیٰ سے براہِ راست علم و تلقین حاصل کرتا ہے تو اُسے کسی انسان کے شاگرد ہونے کی کیا ضرورت۔ اس عبارت میں دو مقدر سوالوں کے جواب ہیں۔ ایک سوال تو یہ کہ اکبر نے حرف آموزی سے کیوں جی چرایا اس کا تو یہ جواب دیا ہے کہ "تاکہ بڑے ہونے پر جب اُس سے فتوحاتِ غیبی ظاہر ہوں تو لوگ اُسے الہام سمجھیں۔ اگرچہ لفظ 'الہام' استعمال نہیں ہوا مگر مصنف کی مراد اسی سے ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ جب اکبر کو یہ سعادت حاصل تھی تو وہ دوسرے کم سمجھ نادان بچوں کی طرح کھیل کود میں کیوں اپنا وقت ضائع کیا کرتا تھا۔ اس کا یہ جواب دیا ہے کہ کمالات معنوی کے اظہار سے تجاہل عارفانہ کیا کرتا تھا تاکہ دیکھنے والے ہی دیکھ سکیں کہ وہ لہو و لعب کے پردہ میں کس قدر عقل کا کام کرتا ہے۔ آسمتہ نے اس عبارت کا ہو بہو لفظ بلفظ ترجمہ نقل کیا ہے۔ اس سے "عمدا حکم و مصالح"

---

[1] اکبر نامہ (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء) جلد اوّل صفحہ ۲۱۶۔

آنحضرتؐ کا ترجمہ بالکل غلط کیا ہے۔ وہ "عمدۂ حکم و مصالح" کے یہ معنی سمجھا ہے کہ اکبر عمدہ حکمتوں سے ماہر تھا۔ پورے فقرہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ "اکبر کے عمدہ حکمتوں میں ماہر ہونے اور نیز حرف آمیزی کی طرف مائل نہ ہونے کا سبب یہ ہے ...."

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کی اس غلطی سے اصل مطلب پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن ذرا غور کرنے سے کافی فرق معلوم ہوتا ہے۔ اکبر نامہ کے مصنف کا منشا اس فقرہ سے اکبر کی بدشوقی اور اس کے لکھنے پڑھنے کی طرف مطلقاً توجہ نہ کرنے کی بہترین مصلحت بیان کرتا ہے۔ اس طریقہ بیان سے مصنف کی غرض اخفائے حقیقت زیادہ صاف معلوم ہوتی ہے بمقابلہ اس مفہوم کے جو بیورج نے لیا ہے۔

تعجب ہے کہ باوجود اکبر نامہ و آئین اکبری میں اکثر مقامات پر اکبر کے براہ راست چشمۂ علم لدنی سے انوار علم و حکمت مقتبس کرنے کا تذکرہ ہے جو خوشامد و غلط بیانی کے علاوہ بمقتضائے "پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند" خدع و زور سے کسی طرح خالی نہیں۔ اسمتھ جیسا قابل مورخ اس قسم کے بیان کو اس قدر صحیح سمجھتا ہے کہ سر مو اس سے تجاوز کرنا نہیں چاہتا۔

اُمّی محض ہونے کا دعویٰ ایسے شخص کے لئے جو انبیا و رسل اور بانیانِ مذاہب کے طبقۂ عالیہ میں کسی نہ کسی طرح جگہ پانے کیلئے بیقرار ہے ایسی صورت میں جبکہ رسالتمآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو مسلمانوں کے نزدیک خاتم المرسل اور سرور انبیا ہیں اُمّی محض تھے ایک معمولی بات ہے۔

یہاں تک تو اسمتھ کا جواب ہوا۔ رہا جہانگیر کا ریمارک۔ اس کا بھی ایک جواب تو یہی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تزک جہانگیری کے دو نسخے ہیں۔ ایک وہ جس کو سرسید احمد مرحوم نے مدون کیا اور جسکو بعد میں انگریزی کا جامہ پہنایا۔ دوسرا نسخہ وہ جس کا پرائس نے ترجمہ کیا۔ اصل نسخہ ہنوز شائع نہیں ہوا اس کا برٹش میوزیم میں کوئی نسخہ موجود نہیں۔ اس لئے میں نہ دیکھ سکا۔ پرائس کا ترجمہ اس وقت پیش نظر ہے اسمیں ایک مقام پر جہانگیر اکبر کی بابت لکھتا ہےؒ

لہ پرائس۔ انگریزی ترجمہ واقعات جہانگیری مطبوعہ ۱۸۲۹ء صفحہ ۴۴ و حاشیہ

"ان پنڈتوں کے ساتھ میرے والد ہمیشہ گفتگو کیا کرتے تھے ۔ وہ درحقیقت ہندوؤں سب کے ہر قسم کے علما کے ساتھ صحبت رکھتے تھے ۔ اگرچہ وہ اُن کی قابلیتوں سے خاص طور پر فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن ان کی نثر ونظم میں اس قدر لطافت آگئی تھی کہ ایک انجان شخص ان کو جملہ علوم وفنون کا عالم جید خیال کرتا ہوگا۔"

اگر پرائس والی تزک کے اس مقام کا دوسری تزک کی اوپر نقل کی ہوئی عبارت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں عبارتوں میں ایک ہی مضمون ہے لیکن پہلی عبارت میں لفظ امّی دو جگہ آیا ہے اور اس میں ایک جگہ بھی نہیں۔

اس دوسری تزک (جسے پرائس نے واقعاتِ جہانگیری کا نام دیا ہے) کے اصلی ہونے کی بابت بہت کچھ شکوک ظاہر کئے گئے ہیں ۔

ریو مرتب فہرست متحف برطانوی لکھتا ہے[1] کہ دوسری تزک جو جعلی ہے شاہجہاں کے اوائل عہد میں اصلی تزک کو جس میں شاہجہاں کے خلاف بہت سی باتیں ہیں پس پشت ڈالنے کے لئے لکھی گئی ۔

ایلیٹ بھی ریو کا ہم خیال ہے ۔ اس نے ان دونوں تزکوں کے چند جزوی اختلافات کو بیان کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تزک کسی بادشاہ کی نہیں بلکہ جوہری کی تصنیف ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں زر وسیم اور جواہرات کی قیمتوں سے خاص طور پر اعتنا کیا گیا ہے[2] ۔ جس قدر اختلافات بیان کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر مختلف چیزوں کے مصارف کے تخمینہ کی بابت ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس تنقید مخالف کا خواہ وہ ریو کی ہو یا ایلیٹ کی ہو اس مسئلہ کہ تزک کی بحث مانحن فیہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا کیونکہ اس بحث کا تعلق نہ شاہجہان سے ہے جو شاہجہاں کی وجہ سے بدل دی گئی نہ زر وسیم کی قیمت یا تخمینۂ مصارف سے ہے کہ اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو ۔ اس کا تعلق تو اکبر کے امّی وغیر امّی ہونے سے ہے جسے دونوں نقادوں کی تنقیدوں سے کچھ سروکار نہیں ۔

---

[1] ریو ۔ فہرست کتب فارسیہ متحف برطانوی صفحہ ۲۵۳ ۔

[2] ایلیٹ ۔ تاریخ ہند جلد ۶ صفحہ ۱۵۲ سے ۳۹۱ تک ۔

علاوہ بریں "واقعات جہانگیری" اگرچہ جہانگیر کی لکھی یا لکھائی ہوئی نہیں ہے تو کم ازکم اس کے ناجہان کے ابتدائی عہد میں لکھے جانے سے کسی کو انکار نہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جو نہ تو اکبر کے عہد سے بہت پیچھے تھا اور نہ اُس ذہنیت سے جو عہدِ اکبری میں بانیٔ دینِ الٰہی کے زیرِ حمایت نشو ونما پا رہی تھی متاثر تھا۔ اس لئے اس نام نہاد واقعات جہانگیری کی شہادت تزک اصلی کے مقابلہ میں کم ازکم بحث مانحن فیہ کے متعلق زیادہ معتبر ہو سکتی ہے۔

رہی کیتھولک مشن کی شہادت کہ اکبر اُمّی محض تھا اس کا جواب یہ ہے کہ جب اکبر اور ارکانِ سلطنت کسی خاص غرض سے اس کے خواندہ ہونے کو چھپا رہے تھے تو ایک اجنبی جماعت جسے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع خاص صورت میں ملتا تھا حقیقت حال کیونکر معلوم کر سکتی تھی۔

اکبر کے اُمّی ہونے کی تائید میں ایک دلیل یہ پیش کیجاتی ہے کہ ہندوستان میں بادشاہوں کا ناخواندہ ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ علاء الدین خلجی اور سلطان حیدر علی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ان کی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ یہ مکتب میں بٹھائے گئے تھے یا ان کی تعلیم کے لئے استاد مقرر ہوئے تھے۔ یہ دونوں سپاہی زادہ تھے اور سپاہی زادہ اُس زمانہ میں عام طور پر نوشت وخواند سے بے بہرہ ہوتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں ہمایوں کو اکبر کی تعلیم کی طرف پوری توجہ تھی۔ وہ خود عالم تھا۔ اُس نے کئی استاد یکے بعد دیگرے مقرر کئے۔ اس کا ایک خط موجود ہے جس میں اس نے اکلوتے بیٹے کو تعلیم کی بابت بہت کچھ شفقت آمیز نصیحتیں کی ہیں۔

یہ امر دیگر ہے کہ پدرِ شفیق کی اس قدر توجہ واعتنا کے باوجود وہ علم حاصل نہ کر سکا لیکن اسی کے ساتھ یہ لغو ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا بالکل نہ سیکھ سکا۔ ذہین بچے لکھنا پڑھنا بہت جلد سیکھ جاتے ہیں البتہ شوق نہ ہونے کی صورت میں زیادہ ترقی نہیں کر سکتے۔ کوئی ایسی مثال نہیں کہ بچہ باقاعدہ مدرسہ میں بٹھایا گیا ہو یا اس کے لئے استاد مقرر کیا گیا ہو اور کچھ زمانہ تک یہ سلسلہ جاری رہا ہو اور وہ تاہم لکھنے پڑھنے سے نابلد رہا ہو۔ الف بے تے لکھنے کے بعد سب سے پہلے لڑکے کو اپنے نام لکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ لفظ اکبر کا لکھنا مشکل نہیں۔ پھر یہ کس طرح ذہن میں آ سکتا ہے کہ وہ اپنا نام تک

لکھنا نہیں جانتا تھا۔

ہمایوں اپنے بیٹے کو اکثر خط لکھا کرتا تھا۔ یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں کہ ایسے بیٹے کے بابر جس کی تعلیم کے لئے استاد مقرر ہوں باپ کا خط آئے اور وہ اُسے مطلقاً نہ پڑھ سکے۔

ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں "آئینِ آموزش" کے زیرِ عنوان جو کچھ لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ "بفرمودۂ گیتی خداوند" طریقۂ حرف آموزی و تعلم اس قدر سہل کر دیا گیا کہ "بدیں روشن آئین بسا لسا آموختے بماہ یل بروز کشید و جانے بہ شگفت در آمد"

اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اکبر سواد خواں تھا۔ تب ہی تو وہ یہ طریقہ نکال سکا۔ اگر خود اُس نے یہ طریقہ ایجاد نہیں کیا تو کم از کم مشورہ ضرور دیا۔ طریقۂ نوشت و خواند کی تسہیل کی بابت مشورہ وغیرہ دینا اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جو خود لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ اور اگر بفرضِ محال اُس نے اپنے زمانۂ طفولیت میں لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تو کیا یہ قرین قیاس ہے کہ اس کے تختِ سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد جب "آئینِ آموزش" اس قدر سہل ہو جاتا ہے تو وہ اس سے متمتع نہیں ہوتا اور جوں کا توں ناخواندہ رہنا گوارا کرتا ہے۔ مذہبی آزادی و روحانی بلند پروازی تو آگے چلکر پیدا ہوئی۔ اوائلِ حکومت میں تو وہ ہر طرح محتاط و پاسدارِ مذہب تھا۔ اگر طفولیت میں اُس نے بفرضِ محال لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا تو نئے قسم کے خیالات پیدا ہونے تک یعنی اُس زمانہ تک جب "امی" بننے کا سودا پیدا ہوا وہ ضرور لکھنا پڑھنا سیکھ گیا ہوگا۔

علاءالدین اور حیدر علی کی بابت یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی نے نبی یا بانیٔ مذہب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لہذا اگر ان کی ناخواندگی مشہور ہے تو وہ درحقیقت ناخواندہ ہی ہوں گے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان کی تعلیم کا کچھ حال معلوم نہیں۔ لیکن اکبر کا ناخواندہ مشہور ہونا اسکے مذہبی خیالات کی بنا پر کافی مشکوک ہے اور دیگر دلائل کی روشنی میں کلیتہً مردود۔

لہ آئینِ اکبری مطبوعہ کلکتہ جلد اول صفحہ ۲۰۱۔

ابوالفضل آئینِ اکبری میں لکھتا ہے[1]۔

ہر روز بجز دہ کاردانان آگاہ دل آنرا بوقت عرض بمطالعہ رسانند و ہر کتابے را از آغاز تا بانجام شنوند و ہر روز کہ بدان جا رسد بشمارۂ آن ہندسہ بقلم گوہر بار نقش کنند و بعدد اوراق خوانندہ را نقد از سرخ و سفید بخشش شود۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اکبر ہندسہ لکھنا جانتا تھا۔ بلاخ مَن نے اس عبارت کا ترجمہ اس طرح پر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقط نشان کر دیتا تھا۔ اس کے ترجمہ کا ترجمہ یہ ہے "...... جہاں کہیں پڑھنے والے رُک جاتے ہیں۔ بادشاہ اپنی قلم سے صفحات کے عدد کے مطابق نشان بنا دیتا ہے ......" یعنی وہ "بشمارۂ آن ہندسہ" کا ترجمہ "صفحات کے عدد کے مطابق" کرتا ہے۔ وہ 'کردن' کو فعل مفرد سمجھکر 'نقش' کو مفعول قرار دیتا ہے اور لفظ 'ہندسہ' سے صفحات مراد لیتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ دراصل 'نقش کردن' فعل مرکب ہے بمعنی "ثبت کردن" اور 'ہندسہ' اس کا مفعول ہے۔ اس جملہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ہر روز جہاں کہیں پڑھنے والا پہونچتا ہے اُس کے عدد کے مطابق ہندسہ بنا دیتا ہے۔ 'اسکے' میں ضمیر راجع ہے یا تو 'روز' کی طرف یا 'جا' کی طرف۔ یعنی شمار آن سے مراد یا تو 'شمار روز' یعنی تاریخ ہے یا شمار جا یعنی شمار صفحہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر روز اپنی قلم سے جہاں تک پڑھا جاتا ہے تاریخ بنا دیتا ہے۔ بلاخ من کا ترجمہ غلط بھی ہے اور بے معنی بھی کیونکہ صفحات کے نمبر کے مطابق نشان بنا دینے کے کچھ معنی نہیں۔ اگر یوں کہتا کہ صفحات کے نمبر پر نشان کر دیتا ہے تو بھی ایک بات ہوتی۔ گلیڈون نے اس فقرہ کا ترجمہ قریب قریب صحیح کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ[2] تاریخ ماہ کے ساتھ اس جگہ جہاں پڑھنے والا پہونچتا ہے نشان بنا دیتا ہے۔ بہرحال اس فقرہ سے دو معنی سمجھے جا سکتے ہیں یا تو صفحات کے نمبر

۱۔ آئین اکبری مترجمہ بلاخ مین جلد اول صفحہ ۱۰۰۔

۲۔ انگریزی ترجمہ آئین اکبری از گلیڈون مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۱۲۰

لکھ دینا یا تاریخ بنا دینا (آخری معنی زیادہ صحیح ہیں) دونوں صورتوں میں اکبر کا مہندسہ لکھ دینا ثابت ۔

امیر حیدر حسینی واسطی بلگرامی نے جو غلام علی آزاد کے نبیرو تھے اکبر کی تاریخ میں ایک کتا
موسوم بہ سوانح اکبری لکھی ہے ۔ اکبرنامہ ۔ تاریخ بدایونی ۔ طبقات اکبری ۔ تاریخ فرشتہ اکبرنامہ
اللہ داد فیضی سرہندی ۔ مآثر الامرا اور چہار دفتر منشآت ابوالفضل ۔ اس کتاب کے ماخذ ہیں ۔ منشآ
ابوالفضل کی بابت قابل مصنف لکھتا ہے کہ عام طور پر تین دفتر متداول ہیں اور چوتھا دفتر جو ترتیب از
ہی کمیاب ہے ۔ میں نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے ۔ اس تالیف کی اہمیت کا اس سے اندازہ
جاسکتا ہے کہ بلاخ من جیسا فاضل مورخ اسے "تنقیدی تاریخ" بتاتا ہے اور لکھتا ہے[1] کہ "تا
تاریخ عہد اکبر کے متعلق تمام مصادر و ماخذ کا ترجمہ نہ ہو جائے میں یورپین مورخین کو یہ رائے د
کہ انہیں 'سوانح اکبری' کو اپنی محنت و کاوش کی بنیاد قرار دینا چاہئے ۔ اس کتاب کی تا
میں ان تاریخوں سے مدد لیگئی ہے جن سے پیشرو مورخین نے کام نہیں لیا ۔ ہندوستانی کی
ہوئی تنقیدی تاریخ غالباً صرف یہی ایک ہے"

اس سوانح اکبری میں فاضل مورخ اکبر کے مکتب میں بیٹھنے کا حال یوں لکھتا ہے[2] ۔

"مکتب نشستن شاہزادہ و ذکر اساتذہ او ۔ ہفتم شوال سال نہصد و پنجاہ و چہار کہ از
عمر شاہزادہ چہار سال و چہار ماہ و چہار روز بسر شدہ بود در مکتب در آوردند و ملا زادہ
عصام الدین ابراہیم را بایں خدمت اختصاص بخشیدند و از سوانح ایں کہ برائے افتتاح
ساعتے خاص باتفاق اہل تنجیم تعین کردہ بودند ۔ چوں ساعت مختار رسید شاہزادہ مذوق
بازی در گوشہ رفت کہ با ایں ہمہ توجہ واہتمام جنت آشیانی ہر چند تکاپو نمودند پیدا نیر دند ۔
وہاناحکمت ایزد دریں باب نزد مؤلف آنست کہ ظاہر بیناں معلوم کنند کہ حصول این

---

[1] ترجمہ آئین اکبری ۔ بلاخ من صفحہ ۲۱۶ حاشیہ ذیلی ۔
[2] سوانح اکبری ۔ قلمی نسخہ صفحہ ۱۹ ۔ برٹش میوزیم ۔

امر موقوف بر عنایت فیاض حقیقی است - در ہند رسوم اصحاب علم نجوم گرفتار نباید بود - چنانچہ
پادشاہ باآنکہ در ساعتِ مختار ستارہ شناساں آغاز خواندن نہ نمود لیکن استعداد شایستہ
در ادراک دقائق شعر و انشا پیدا کرد و خود ہم سخن را موزوں می نمود "

اس عبارت کے آخری حصہ سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ وہ تعلیم سے ضرور بہرہ اندوز ہوا۔ فاضل
رخ نے اکبر کے "ساعتِ مختار" کے وقت روپوش ہوجانے کی جو مصلحتِ ایزدی بیان کی ہے
معقول نہیں نہ سہی اس کا اصل مطلب پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ہمارا مدعا اس عبارت کے نقل کرنے
سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ 'سوانحِ اکبری' کے فاضل مؤلف کے نزدیک بھی اکبر کسی صورت سے
اور ناخواندہ نہ تھا۔ وہ بہرصورت عاصل ہے۔

علاوہ بریں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ظفرنامہ کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہے۔ اس کے سرورق
اکبر کے دستِ خاص کا لکھا ہوا لفظ 'فردوس' موجود ہے۔ اس کے نیچے جہانگیر کے قلم کی
ہوئی یہ تصدیق ہے کہ یہ لفظ عرش آشیانی کا لکھا ہوا ہے اور پھر اس کے نیچے شاہجہاں کی تحریر
ہے۔ یہ لفظ 'فردوس' نہ کسی مبتدی بچہ کا خط معلوم ہوتا ہے اور نہ کسی منشیٔ خوش قلم کا۔ اوسط
بچہ کا خط ہے۔

ان سطور کو ملاحظہ کرنے کے بعد قارئین کرام خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اسمتھ کا یہ خیال کہ
اکبر آخر عمر تک نہ کچھ پڑھ سکتا تھا اور نہ اپنا نام لکھ سکتا" یا جہانگیر کا یہ ریمارک کہ "اُمی بودند"
تک صحیح یا غلط ہے۔

زرتشت اور بُدھ

(۲)

(بسلسلہ ماہ نومبر)

جب ہم زرتشتیت کے خدا کی حقیقت و ماہیت سے گزر کر اُس کے افعال و اعمال کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ آہورامزدہ کی تمام طاقتیں حق و عدل کو اپنی پشت پناہی میں لئے ہوئے ہیں اور جملہ سئیات و منکرات کے خلاف صف آرا ہیں۔ یہ دوگونہ خیال فوراً عقیدۂ جزا و سزا کی تعمیر کردیتا ہے۔ زرتشت ایک ایسے وقت کی آمد کا امیدوار ہے جبکہ حق و باطل کا یہ معرکہ اول الذکر کی فتح کامل پر ختم ہو جائیگا۔ حق کی یہ جیت دنیا کے حق و ناحق کے بڑے بڑے کیمپوں سے لیکر معمولی افراد کے باہمی نزاعات و مشاجرات تک حاوی ہوگی۔ (حدیث نبوی متعلق یوم الحساب .... یہانتک کہ بے سینگ والی بکری سینگ والی بکری سے بدلہ لیگی!) پس زمین پر خدا کی بادشاہت آنیوالی ہے اور جبروت" اسکی زندہ و موجودہ علمبردار ہے۔ مرنے پر ہر شخص کا جائزہ لیا جاتا ہے جس کے لحاظ سے نیک کردار لوگ اہورامزدہ کے "دارالنغمات" میں چلے جاتے ہیں، اور بُرے لوگ ایک غار تاریک عمیق میں جاگرتے ہیں جہاں تمام ارواح خبیثہ انکی رفیق حال اور شریک عذاب ہوتی ہیں (ملاحظہ ہو یاسن ۴۸-۷، ۴۵-۸، اور ۵۰-۴ نیز ۴۶-۱۱، ۳۱-۲۰، اور ۴۹-۱۱) ان فیصلوں کے لئے مسند عدل و قضا پر خود زرتشت متمکن ہوتا ہے۔

"جو لوگ انکار سینہ کی اقلیم کا تاج و تخت حاصل کر لیتے ہیں وہ اُس دن انتہائی کسمپرسی کی حالت میں ہوں گے۔ وہ نالہ و فغاں کرتے ہوں گے اور پیغمبر کی نوید راحت کے لئے تڑپتے ہوں گے۔ لیکن اُسوقت پیغمبری ان کی محرومی پر مُہر لگادیگا اور اُن کو

چہرۂ حق کے مشاہدے سے دیدہ بردوختہ کردے گا۔" (یاسن ۳۲-۱۳)

"فانی انسانوں میں سے جس کسی کو اسپیتاما زرتشت کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے کی توفیق ہوگی اُس کو اہورامزدہ زندگیٔ دوام بخشیگا۔" (یاسن ۴۶-۱۳)

زرتشت، شافع امت کی قبا میں بھی نظر آتا ہے، چنانچہ:

"جو کوئی انسان، مرد ہو خواہ عورت، ایسے کام کرتا ہے جو خدا کی نظر میں پسندیدہ اور بہترین اعمال ہیں اُس کو مزدہ اہورا فکر صالح کے توسط سے جبروت عطا کریگا۔ میری جماعت کے جو لوگ فرائض عبادت وعبودیت بجالائینگے ان کو اپنی معیت میں لیکر میں پُل صراط کو عبور کروں گا۔" (یاسن ۴۶-۱۰)

گاتھ کے اندر اسی قسم کے بیانات کے بین السطور میں ایسا مترشح ہوتا ہے کہ شفاعت کے دائرے میں زرتشت انہی لوگوں کو لینا چاہتا ہے جنہوں نے اسکی حیات میں اسکی ہدایت و لقاکو حاصل کیا اور غالباً وہ ان لوگوں کو اپنے عَلَم کے سایہ میں رکھنا نہیں چاہتا جو اُس کے بعد اُسکی امت میں داخل ہونا چاہیں، البتہ اپنے ذاتی مریدوں کے ساتھ اُس کا جو تعلق ہے اس کا رشتہ موت سے منقطع نہ ہوگا۔

زرتشت کی شریعت میں عورتوں کو جو بلند مقام دیا گیا ہے اور نسائیت کے متعلق جس غیر معمولی اور مفرط قسم کی فیاضی سے کام لیا گیا ہے وہ زرتشتیت کی ممتاز ترین خصوصیات میں سے ہے۔ عورت کی قدر و قیمت میں غالباً عورت کو اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ "شخصیت" کو ہے! شخصیت علی الاطلاق زرتشت کی نظر میں انتہائی محترم چیز ہے اور اس کے تمام مظاہر کو وہ خراج عزت ادا کرنا چاہتا ہے اور بلاشبہ عورت بھی ایک شخصیت کی حامل ہے۔ ہیئت اجتماعیہ کے اندر اپنے فرائض اور اس کے ایک جزے کی حیثیت سے عورت اہم نہیں ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ وہ بھی ایک مستقل شخصیت کا مظہر ہے! خود زرتشت کا خدا اپنی تمام ذات و صفات میں سب سے زیادہ ایک شخصیت ہی ہے[1]

[1] نوٹ آیندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

زرتشت کے دین کا ایک دوسرا عنصر یہ ہے کہ داعیٔ مذہب مستقبل میں ایک "نجات دہندہ" منتظر ہے جو اپنی ذات میں خود زرتشت ہی ہوگا، لیکن اُس وقت کا زرتشت نہیں بلکہ اُسکا نقش ثانی جسکی نشو ونما بعد میں ہوگی! گاتہ کی بشارت ہے:

"آنیوالے نجات دہندہ کی ذات قدسی کا جو اپنے وقت میں "بیت شریعت کا مکین" ہوگا، زرتشت کے ساتھ ایک رشتۂ خلت "اخوت" یا "ابوت" ہوگا" (یاسن ۴۵-۱۱)

"مستقبل کے نجات دہندہ کو جاننا چاہیئے کہ خود اُس کا انجام کیا ہوگا"؟ (یاسن ۴۸-۹)

گویا زرتشت اپنے ہی انجام بخیر کے لئے یہاں دست بدعا ہے!

"لوگوں کو مزدہ کی مرضات حاصل کرنا چاہیئے تاکہ آئندہ نجات دہندہ (موعودہ) اہورا کے قدوم میمنت لزوم کیلئے راستہ صاف ہو" (یاسن ۵۳-۲)

عہد حاضر میں ایک ہادی و قائد کی موجودگی اور مستقبل میں ایک نجات دہندہ کی آمد کی خوشخبری، ان دونوں چیزوں نے ملکر زرتشتیت کے تخیل کو بہت مستحکم و پائندہ بنادیا، جو محض خواب و خیال

نوٹ صفحہ گزشتہ:-

بدھ کے بعض مقولوں کا جو اس نے عورت کے متعلق کہے ہیں ان خیالات سے موازنہ کیجئے اور "تفاوت رہ" کا ملاحظہ کیجئے

"پس یہ ہے عورت کی سرشت! ایسی حالت میں وہ کیونکر محبوب یا معتمد ہوسکتی ہے؟" (دو شونگ ہنگ کنگ صفحہ ۲۴۵)

"ایک شخص معہ اپنی اس عقل و دانش کے جو اس نے اپنی سابقہ ولادتوں میں پیدا کی ہو قانون فطرت کا عالم بنسکتا ہو لیکن ایک عورت — وہ ضعف ارادہ، نقص عقل، اور قلوب محبت کی پتلی — بھلا کس طرح پرستاری حق کی صفات کی بجا آوری سے عہدہ برآ ہوسکیگی؟"

"پس ہر مرد کو ہوش و حواس سے کام لینا چاہئے اور عورت کو مردود سمجھکر اُس کے دامن سے بچنا چاہئے"

(صفحات ۱۷۷۲، ۱۷۷۳، ۱۷۷۰، کتاب مذکور)، (بدھ کا مطلب گھرا جو بدھ کو اپنا باغ نذر کرنا چاہتی تھی!)

سے بہت بالاتر تھا بلکہ جس نے ایک حقیقی واقفیت حاصل کرلی تھی، چنانچہ زرتشت نے اپنی زندگی میں اپنی قوم کے اندر ایک عادل ومحتسب خدا کے عقیدے کو پورے طور پر نقش دل کردیا ہستی باری کے متعلق بعد کے اَدْوَار میں اگرچہ یہ تصور مسخ و موہوم ہوتا رہا لیکن اُس کا جو نقش اول زرتشت نے قائم کردیا تھا وہ اہلِ زرتشت کے قلوب سے قطعی طور پر کبھی محو نہ ہوا۔ البتہ زرتشت کی وہ بشارتیں بروئے کار نہ آئیں، کوئی دوسرا پیغمبر اس کے عقب میں مبعوث نہ ہوا، اسکی وجہ سے قدیم شرک و بت پرستی کا بیشتر حصہ پھر عود کر آیا لیکن زرتشتیت کا روح رواں یعنی ایک خدائے عادل ومحسن کا خیال، حی ولایموت رہا اور موجودہ "پارسیت" خواہ وہ اپنے کسی اور مقاصد میں ناکام رہی ہو لیکن اپنے ان مخصوص صفات رکھنے والے خدا کی پرستش کی وہ ایک زندہ یادگار ہے، وہ خدا جو کسی نہ کسی دن اپنے ایوانِ عدالت کو منعقد کریگا اور کسی نجات دہندہ کو بھیجے گا۔

زرتشت کی تعلیمات کی اولین مخاطب اسکی قوم ہی ہے لیکن نفس خطاب کی عمومیت اس تخصیص کو گوارا نہیں کرتی، بلکہ یہ معلم اعظم ساری نوع انسانی کو اپنی چشم تصور کے سامنے اپنے پیغام کو قبول کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ عالمگیر دعوت کیلئے وہ بارگاہ خداوندی سے اس طرح پروانۂ اجازت طلب کرتا ہے:

"اے مزدہ! مجھکو حکم فرما کہ میں ہر زندہ متنفس کو اپنی ملت میں داخل کروں" (یاسن ۳۱-۳)

وہ توبہ و انابت کی ایک صلائے عام دیتا ہے:

"ہم اپنے کلمۂ حق کے ذریعے سے قزاقوں کے انبوہ کو انکے کیفر کردار کو پہونچائیں گے" (یاسن ۲۸-۵)

"غلط کاری کا کفارہ کیا ہے؟ یہ نہیں تو معافی کی چیز کے کیا معنی ہیں؟" (یاسن ۵۱-۴)

صحیفۂ قرآنی [illegible] ایک عظیم [illegible] کی مبارک و مسعود [illegible] کے [illegible] قلب سے

چشمہ حق ایسے کا تب وہ فکر صالح کے حریم قدس میں داخل ہوں گی اور اُس وقت مزدہ انکو

امان بخشے گا۔ (یاسن ۴۶-۱۲)

اب ہم اپنی عنان توجہ ہندوستان کے پیغمبر اعظم گوتم سدھارتھ کی طرف پھیرتے ہیں، یعنی عارف خانوادۂ ساکیا، مہاتما بُدھ! جیسا کہ معلوم ہے ابتدا میں ہندوستان اور ایران کا قدیم مذہب ایک ہی تھا لیکن اوّل الذکر ملک کے اندر اس مذہب کو ایک دوسرا ماحول ملا جس کے زیر اثر اُس نے عرصہ دراز تک ایک مختلف نوعیت کی نشو ونما حاصل کی۔ اہلِ تاریخ کا روایاتی مکتب اگر صحیح کہتا ہے تو اس کا یہ منشا ہے کہ قبل بدھ کی بعثت کے قریباً نصف صدی کا دور اس مذہب پر ایسا گزرا جس کے اندر اُس نے مخصوص قسم کی ارتقائی تغیرات قبول کئے لیکن اسی مسئلہ کے متعلق مورخین و محققین کی ایک دوسری جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ زمانہ پانسو برس سے لیکر ایک ہزار سال تک طویل ہے! بہر حال اسی انقلاب کی نوعیت کا یہ حال تھا کہ ایک عام ذہنی بیداری پیدا ہو گئی تھی اور کم ازکم ارض و سما کے پُر شوکت مظاہر والے "ارباب فطرت" اب انسان کی جبینِ نیاز کا مطالبہ کرنے سے قاصر تھے! اس کے علاوہ ایک اور ادارہ اور ایک اور عقیدہ پیدا ہو گیا تھا جنمیں سے ایک کا ظہور ایران کے اندر مجوسی کے حد تک ہوا اور دوسرا کبھی بھی معرضِ وجود میں نہ آیا۔ ہمارا روئے سخن علی الترتیب برہمنیت کے احبار و رہبان کے نظام اور تناسخ ارواح کے تخیل مذہبی کی طرف ہے!

آخر الذکر عقیدہ کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ اُس کے اثر سے گوتم بدھ بھی نہ بچا، چنانچہ نبئ اعظم کی ذہنیت کی تشکیل میں اس عوام و خواص کے یقین نے معتد بہ دخل پایا۔ گوتم نے ایک ایسے عہد طلائی میں تربیت پائی جس کے محاسن و قبائح دونوں اُس کے دل و دماغ کی ترکیب کے عناصر بنے! ہندوستان جنت نشان کی عام فضا کا ایک نظارہ کر لیجئے اور اس فضا کی طبعی پیداوار کے وجود میں آنے کے منتظر ہو جائیے؛ ایک وسیع و عریض ملک ہے جس کے طول و عرض میں سرسبزی و شادابی، زرخیزی و زرریزی کا ایک منظر پھیلا ہوا ہے، اجناس خوراک اور اسباب معیشت کی فراوانی ہے، امن و امان کا دور دورہ ہے، عظیم الشان شہر آباد ہیں جو ایک زبردست تمدن کا گہوارہ

بننے کے لئے تیار ہوئی لیکن آبادی کے لئے زمین کسی طرح کافی نہیں سمجھی گئی جو دنیا تنگ ہو تو اقتصادی
کشمکش کی طرح جہاں ہیں شدید ہو گئی ہے چنانچہ کوئی بیچ نہ ہو سکا مگر جو خیمہ بیچ جا کر کسی عظیم
حرکت کے لئے نہ ہو سکیں۔ لوگوں کے اخلاق و خیالات میں نہایت تنگ نظری تھی اور کوئی ملک
ذہنیت پیدا ہو گئی یہ جماعت جماعت کے حامیوں کی خاطر جنتی ملک کی حرب الی سے ہرتے تھے
بدترین بالکل ہی مختلف نہیں ہی اور جو حدت کے خلاف ان کو مسلم قانون سے کوئی بھی
تھا۔ آبادی کا کوئی اندرونی یا بیرونی خطرہ لاحق نہ تھا اور یہی وجہ سلطنت غیر مذہبی اور وطنی
خواہی کے جذبات بیدار یا شاید کم بہر دم سے مذہب مشہور ہوتے گئے۔ اسی لئے کا اقتدار اعلیٰ تھا جو
اس دور سے ہندوستان میں کئی سلطنتیں ہونے کا سبب ہے۔ جب جنگیں ہوتی تھیں تو
تھیں لیکن سب جو ایک دوسرے سے ہوتی تھیں کے لئے۔ ایک خاندان کا خاتمہ ہو جاتا اور اس کی جگہ دوسرا
حکمران خاندان کا ملک ہو جاتا مگر یہ انتقال و اضطراب صرف نظم حکومت کے محور اعظم کا محض ایک تبدیل
علی العموم ہوا کرتا پس جنگیں سکون جاری رہتا اور لوگوں کے لئے ان کی اس تبدیلی سے کوئی
تغیرات سے کوئی خاص اہمیت نہ تھی! نسل و خون کے احساسات بالکل معدوم اور نقل سے
چنانچہ مروجہ جنگوں کے کسی میدان کارزار میں کبھی ایک قوم کو بحیثیت مجموعی دوسری قوم کے خلاف
صف آرا نہیں دیکھا گیا بلکہ صرف دو سلطنتوں کے پرچموں کا تصادم ہوتا تھا۔ ایک ہی نسل کے
افراد تقریباً نصف برِ عظم کی وسعت میں پھیلے ہوئے تھے جن کے اندر متعدد اور مختلف الجہات ہونے
کے علاوہ اختلافات تھے تو محض لہجے سے زیادہ اہمیت کے لوگ کبھی ایک ہی حکومت کی رعایا بھی
ہو جاتے تھے۔ اس تمام عرصے میں ایک مرتبہ بھی ملک کی وسعت حق کے تصور کی تحصیل میں کوئی رفت
شخصی کی مزاحمت ہوئی نہ تھی اسکی بنیاد صرف علاقائی عادی کی بنیادی روشنی پر تھا اس
سے کو یہ جس میں بیچ کسی کی وجہ سے اس کا [illegible]
کرتے تھے [illegible] کبھی شہر لیکن کبھی [illegible] قوم نے اس [illegible]
دیا [illegible] ہندوستان کی حکومت [illegible] تھیں [illegible]

اندھکار سے مچ کوئی نئی مسلک حیات ہوتا تھا۔

پس گوتم نے ہندوستان کے اندر کسی قومی مصیبت کو نہ دیکھا' بلکہ صرف انفرادی و شخصی مشکلات کو! اُس کے مشاہدے کے سامنے کوئی ملی وطنی حادثہ یا خطرہ نہ تھا جیساکہ زرتشت کے وطن کے اندر درپیش تھا، بلکہ محض انسانیت عمومی کے مشترک و عالمگیر ہموم و غموم تھے جو مصائب کی حیثیت سے زرتشت کے متخیلہ سے مَس بھی نہ ہوتے تھے! پس مقدس گوتم اور زرتشت بزرگ کی دعوتوں اور تحریکوں میں جو اصولی فرق " انفرادیت و اجتماعیت کا " تھا وہ ان دو مذاہب کی تاریخ کے " مطالعۂ مقابلہ " (Comparative Study) میں ایک اہم ترین نکتہ ہے!

گوتم ایک محبت پاش شاہی باپ کی آغوش شفقت میں پلا تھا' جہاں وہ ہر قسم کی ناملائم چیزوں سے مامون و مصئون تھا' وہ شاہی محل کے حصار سنگین کی ایک منزل عشرت سے مسرور تھا' جہاں اگر دن تھا تو عید کا' اور رات تھی تو شب برات۔ اس بحر عیش زندگی کے طوفان تازونعم میں اگر اُسکو ایک ابتلائی احساس ہونے لگا ہو تو چنداں عجیب نہیں! اس شبستان عشرت کی بہشتی فضا سے گھبرا کر شہزادۂ گوتم کا اُس کو خیرباد کہہ دینا اس قدر بوالعجبی آمیز نہیں ہے جسقدر کہ عین توقع کے مطابق' اور حالات کا طبعی نتیجہ!

پس جیساکہ " ٹھنڈے سایہ کے نیچے بندھا ہوا ہاتھی صحرا کے آزاد خارزار کے لئے زنجیریں توڑانے لگتا ہے[1]" ، گوتم نے بالآخر اپنے دیوانۂ محبت باپ سے ذرا باہر چلنے پھرنے کی اجازت حاصل کرلی۔ یہ نقل و حرکت پہلے تو محلات شاہی کے چمنستانوں اور نزہت گاہوں تک محدود رہی لیکن بہت جلد پایۂ تخت کے کوچہ و بازار تک جا پہونچی۔ اس وقت ہر قسم کی احتیاط و پیش بینی ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ نازک دل شہزادہ کوئی ناگوار منظر نہ دیکھنے پائے لیکن مقدرات الٰہی کا سدباب کون کرسکتا تھا! شہزادہ محل شاہی کے دروازے پر جونہی اول روز نمودار ہوا تو ہاتف تقدیر نے کہا:

---

[1] بالفاظ نوشونگ سانگ کنگ صفحہ ۱۰۱

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم!

اقلیم عرفان و روحانیت کا تاج و تخت اسی شہزادۂ عالی تبار کا منتظر تھا!

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم

کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را!

الغرض شہزادۂ گوتم کی سیر و گشت کے دوران میں کئی بار ایسا اتفاق ہو ہو گیا کہ سرِ راہ ن بڈھے، کمزور، اور بیمار لوگ نظر آ گئے، متعدد دفعہ مردہ نعشوں کا منظر بھی پیش نظر ہو گیا۔ ایسا لوم ہوتا ہے کہ تمام اسباب کارکنانِ قضا و قدر نے ترتیب دئے تھے۔

بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد!

شہزادہ ہر بار مکدر و کبیدہ خاطر ہو ہو کر گھر لوٹتا، روز بروز یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا س کا یہ سارا عیاشانہ حصار، قصور و محلات، اشجار و انہار اور خدم و حشم، نیز اُسکی حور تمثال بیوی نکی آغوش محبت کا سب سے خوشنما گلدستہ تھی، مع اُس نومولود نورِ نظر و لختِ جگر کے جس کی نے محل شاہی کی بزم طرب کو اور بھی چمکا دیا تھا، صرف ایک حسنِ اتفاق کا نتیجہ ہیں، نیز یہ کہ دائمی نہیں!

خوش است عمر دریغا کہ جاودانی نیست
بس اعتبار بریں پنج روز فانی نیست،

درخت قد صنوبر خرام انساں را
مدام رونق نوبادۂ جوانی نیست،

گلیست خرم و خنداں و تازہ و خوشبو
ولے امیدِ ثباتش چنانکہ دانی نیست!

کدام بادِ بہاری وزید در آفاق
کہ باز در عقبش آفتِ خزانی نیست!

شہزادہ کا یہ رنگ طبیعت دیکھکر باپ نے اُس کی دلبستگی کا سامان کرنا چاہا تاکہ اسکی توجہ پریشان کن خیالات سے ہٹا کر دوسری طرف منعطف ہو جائے، چنانچہ رقاصہ لڑکیوں کی ایک عت بھیجی گئی جنہوں نے محبوب شہزادے کو اپنے جھرمٹ میں لے لیا اور مشاغل نشاط شروع ئے لیکن وہ بالکل بیر ثابت ہوا۔ باپ نے یہ معلوم کرکے حسینوں کے مجمع کو دوچند اور مرغوب تر

کر دیا لیکن شہزادے کی بے حسی و سرد مہری میں بالکل فرق نہ آیا! تب تو یہ کیا گیا کہ ماہپاروں اور مہرخوں کے ایک پورے پرستان نے دلگرفتہ شہزادے کو اپنی آغوشِ عیش میں لے لیا لیکن وہاں زبانِ حال پر یہی شکوہ تھا کہ:

دیکھیئے حوریں دکھائی جاتی ہیں   امتحاں ہے عاشقِ ناشاد کا!

اپنے لختِ دل کی یہ وحشت اور گریز پائی دیکھکر باپ نے گوتم کو ایک ایوانِ عیش میں پہونچا دیا اور حسن و رعنائی کے انتہائی زہدشکن نمونوں کو وہاں اُس کی مصاحبت کے فرائض تفویض کئے، ساتھ ہی چاروں طرف سے دروازے بند کردیئے گئے اور "شوقِ فضول" اور "جرأتِ رندانہ" کی آخری فضا پیدا کردی گئی لیکن وہاں یہ حال تھا کہ ع

باآبِ خضر اگر عاشق رسد لب تر نمی سازد!

ایک ہی ضرب میں ساری زنجیریں کٹ گئی تھیں اور اب اُس جوانِ حق کا پائے آزاد سیم و طلا اور لعل و گوہر کی بیڑیوں کو پازیب تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھا!

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما   وے طبیبِ جملہ علت ہائے ما!

اے علاجِ نخوت و ناموسِ ما   وے تو افلاطون و جالینوسِ ما!

قصہ مختصر شہزادہ گوتم کی طبیعت ذرا بھی اثر پذیر نہ ہوسکی، دل کی تڑپ اور لپٹ، جنون و خفقان کی حد کو پہونچ گئی، چنانچہ ایک دن رات کو جو کہ چاندنی رات تھی اور "منزلِ نور" کو جانیوالے مسافروں کے "شدِ رحال" کیلئے موزوں ترین وقت و ساعت، جواں عزم شہزادہ اس ساری جنت ارضی کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے۔ ایک شاعر نے اس شبِ ہجرت کو بڑے اثر انگیز طریقے سے یوں بیان کیا ہے:

اے زمینِ خاک برسر! یوں نہ ہو اندوہگیں   میں شریکِ غم ہوں تیرا، تیری غمخوار ہوں حزیں
تیری خاطر اور تیرے بچوں کی خاطر اے زمیں   مضطرب ہے یہ دل، جو سینہ میں مرے ہے آتشیں
نیم بسمل میں بھی ہوں تیرے الم سے غم

ساتھ ہے مجھ کو ہمیشہ تیرا تیرِ غم

اسی صورت ہے تیری لئے سیہ پوش آسمان　　　　تو گھٹا ہے اشکِ غم کی اپنے آہوں کا دھواں
اشکِ خوں اس پہ جیسا ہے شفق کی سرخیاں　　　　داغ تاباں ہیں سو خورشید سینے پر عیاں

تو ہے محزون اہلِ عالم کے مصائب دیکھ کر
شامِ غم، صبحِ قیامت بن رہے شام و سحر

اے ستارو! تم سراپا بن کے چشمِ انتظار　　　　دیکھتے ہو میری جانب صورتِ امیدوار
لو اب آیا میں! اب آیا تم پہ ہو نیکو نثار　　　　کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بیقرار

آہ میں جکڑا ہوا ہوں نیکی زنجیروں میں یہاں
ہر گھڑی آزاد ہو جانے کی تدبیروں میں ہوں

عشرتِ ایامِ آغازِ جوانی الوداع!　　　　الوداع اے تاج و تختِ مرزبانی الوداع!
الوداع اے ذوق و شوقِ عیشِ فانی الوداع!　　　　الفراق اے خرمی شنے شادمانی الوداع!

الوداع و الوداع لیلی و غبارِ آرزو،
اے دلِ غم دیدہ اب بنجا مزارِ آرزو!

آہ پھر تیری جدائی آہ او آرامِ جاں!　　　　ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھ کو دلِ ناشادماں!
تجھ کو سوتا ہے تجا یوں سنگدل آشکار!　　　　آئینہ سا تیری فرقت عجب بیکار گراں!

غم سا سخت ہے گر نہ تجھے موڑدوں کس طرح!
رشتۂ امید کو آہ توڑوں کس طرح!

تیری فرقت اسیر ہوں گوہرِ مقصود کی　　　　جو کہ ابھی دامنِ صدف میں ہے ابھی
میں کہ نہیں جیسے موت سے عطا کی زندگی　　　　آب و تاب زیست [illegible] ہو گئی

[illegible]

شمع دل افروز ہوگا فاتح جاں کے لیے،
مایۂ نور بصارت چشم حیراں کے لئے!

اے فریبِ الفتِ فانی نہ تو بہکا مجھے ! آہ اے جھوٹی محبت تجھ سے تاب دھوکا مجھے!
دیدنی ہی روئے گل پھر اس سے مطلب کیا مجھے! گر نظر آیا ریاضِ دہر کانٹوں کا مجھے!

یہ کشاکش ہائے بیجا ہیں سلاسل کی طرح
توڑدوں انکو طلسم نقش باطل کی طرح!

رخصت اے ماں باپ بیوی رخصت اے اہلِ دیار دیکھنا میری جدائی پر نہ ہونا اشکبار،
کی تمہارے ہی لئے میں نے یہ ہجرت اختیار دیکھئے کیا کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار!

المدد اے جستجوئے صادق راہِ نجات!
کونسی خلوت میں ہے اے شمع رازِ کائنات!

گوتم نے اپنے صحرائی دارالہجرۃ سے اپنے باپ کو یہ پیام بھیجا:

"میں جو اس طرح اپنے گھربار کو چھوڑ کر نکل گیا ہوں تو اس واقعہ پر کوئی ماتم نہ کیجئے۔ یکجائی خواہ وہ کتنی ہی طویل ہو، دائمی نہیں ہو سکتی۔ ...... جو قانونِ مفارقت اس قدر ہمہ گیر اور قدیم العہد ہے اس کے خلاف چند روزہ بقا کا کیا چارہ ہے! میرے لئے ماتم کرنا بے محل ہے اس لئے کہ میں نے اپنے پیچھے جس رنج و غم کو چھوڑا ہے وہ ایک عارضی صدمہ ہے...... جب یہ نقش محبت ماند پڑجائے گا تو زخم غم بھی مندمل ہوجائے گا...... اگر میں اپنے شوقِ آزادیِ روح میں اپنی بشری محبت کے تقاضے سے آپ لوگوں سے برابر وابستہ رہتا تو جو علیحدگی اس وقت میں نے دانستہ اختیار کی ہے وہ ایک دوسری طریقے سے عارض حال ہوتی یعنی موت یہ کام انجام دیتی! غور کیجئے وہ میری والدہ محبوب جن کی آغوشِ رحم میں میں نے پاؤں پھیلائے تھے اور جن کے لئے میں اس طرح کتنے بشریر درد و کرب اور تشنگی و تکلیف کا باعث ہوا تھا اس وقت کہاں ہے؟ ان کے سانحۂ ارتحال

بے فرزا بت ہے! میں اس کے کیا کام آیا ہ...... جس طرح آسمانی سیارے اپنی مسلسل گردش و حرکت میں چند لمحوں کے لئے باہم بغل گیر ہو جاتے ہیں میری نظر میں تو اہل زمین کے قلبی اتحاد و وصل کی یہی تعبیر ہے!" (ہنتا کا رتیا ، ۹ ، ۱۹۱)

تاہم وہ اس "المیہ" کی درد انگیزی کو تسلیم کرتا ہے چنانچہ :-

"اپنے عزیز و اقربا کی یہ جدائی کو انسا دل ہے جس میں نوک نہ پیدا کرے گی! لیکن آہ! اس جدائی سے تو بہرحال مفر نہیں، بس میں انجام کو آغاز میں خود ہی دیکھ لیتا ہوں اور اپنے عاشق باپ کے ظل شفقت کو خیر باد کہتا ہوں!" (ایضاً ۹ ، ۱۳۲)

"ہماری جتنی مرغوبات و مالوفات ہیں اگر وہ لازوال بنائی جا سکتیں اور تغیر و مفارقت کے خطرے سے بالاتر ہو سکتیں تو یہی دنیا بہشت بن جاتی اور ہم کو اپنے گھروں کی چار دیواری کے اندر ہی دار القرار مل جاتا! لیکن آہ آسمان کے نیچے یہ چیز کہاں!"
(فو شو ہنگ سان کنگ ۱۰۶۳)

"میں نے آپ لوگوں کو پہلے ہی جتا دیا ہے کہ ناموس فطرت کا منشا یہ ہے کہ جو چیزیں آج باہم بغل گیر ہیں اُن کا رشتہ مواصلت ایک وقت منقطع ہو کر رہے گا پس عشق و محبت کی یہ تمام ڈوریاں ہی شکستنی ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ جام الفت کے اس بادۂ خود کمینت دل کو سینے سے نکال کر پھینک دیا جائے!" (ایضاً ۱۰۶۱)

"اگر دنیا کی چیزیں ہم کو قیام و دوام کی ضمانت دیتیں اور ہم لوگ کمزوری و عمر رسیدگی، بیماری و موت کے غیا نوں سے آزاد ہوتے تو کچھ شک نہیں کہ میں بھی ساغر محبت کا اسیر ہو کر جہد کشی کرتا اس بزم عیش کی کبھی بس نہ اکتاتا!" (ایضاً ۲۰۳)

یہ عشرت وصل یار ولی کب تک   عشرت یہی سہی تو جوانی کب تک
گر یہی بھی تو فرصت ہے محال   دولت یہی سہی تو زندگانی کب تک

ان تحقیقوں کے بہت اسلوب میں جن جھلک نگہ پائی تھی!

جو حرکت متیاد جبلّاتی نہ سام منظر کے متزلزل تھی خطۂ … ملکی منزل
شعور کی تبدیلی ہونے وہ رہ تھی۔ مرد ہر طرف گوشوں سے شکر ادا تھا لیکن کہ کوئی … جو
نقش کی طرح مردہ آمیز کے ساتھ اس کا احاطہ کر سکتا۔ … کا ایک عجیب
منظر تھا۔ یہاں اہتمام … ان کے جیسے … تھے جن کو … ان کی بندگی
بنی نوع جنوں نے اپنی شریعت خیالی سے … تھے … الوہی … زیورات
سے آراستہ و پیراستہ کیا تھا لیکن در اصل اس "لباس مجاز" کے اندر وہ دیوتا ہی تو انسانی فطرت کے
جوہر دیکھ رہے تھے … پجاری لوگ … آتش کی … اور سوما
کی شراب طہور کے جام اس کی نذر کرتے! ان پجاریوں کو شرف قبول بخشنے کے لئے ہر دیوتا اپنے قدم
ہمت … اپنے استعانوں کو سرفراز فرماتے اور بالخصوص … اپنی بہتر قدمی کی تمنا
سے … کو بھی حاصل ہوتا ہے! اسی طرح … (برہمن احبار) مقدس
آتشدان کے شعلوں کو … تعلیمات فرماتے! … پجاریوں کی
یہ ساری جنگ زندگی ایک آزاد فکر کے لئے کھلا ہوا دروازہ تھا۔ … ان کے دیوتا نے
بلکہ ان کے علم و تعلیم اور حصول ترقی و استعمال … کی نفسانی … کے لئے آگے آئے کار!
ان کے عمل کم خدا اپنی ہی طرح کی … کے حاجت … تھے اور جو لوگ ان
کے … ان … کے … کی … کے محرم راز نے
ان کے لئے تو … زیادہ تھے!

ان مرحلوں کی … تھی لیکن … ایک
… سے … کام لیا۔ … اس کو
اپنے قلب و روح کی … تھا۔ … میں
حقیقت کی تلاش کی … جاری رکھا

ان مرتاضانہ اعمال کی حقیقی نوعیت ساحرانہ تھی۔ الغرض تپو شہر کی اعتکاف گاہ سینتا اسکیلا کی طرح گوتم نے بھی مشاہدۂ حق کے لئے ایک تنہا گوشے میں ایک "روحانی رصدگاہ" قائم کی۔ لیکن شاہدِ حقیقت کی رونمائی کی ساری آرزوئیں یاس و ناکامی ہوئیں اور گوتم کے ذاتی تجربہ کی بنا پر:

"تزکیۂ نفس احریتِ روح، اور معرفتِ کبریٰ کے حصول کے لئے یہ شغل کشود کار نہیں کرسکتے:" (بدھا کاریتا ۱۲، ۹۰)

گوتم جس چیز کی تلاش میں آوارۂ غربت ہوا تھا وہ کسی "ازلی یا کسبی گناہ" سے آزادی کا ذریعہ نہ تھا بلکہ دنیا کی اسی "قیدِ حیات" کی "بندِ غم" سے گلوخلاصی کا کوئی وسیلہ! "سارے جہان کے اسی درد" نے اس کے درد کو بیدرماں بنا رکھا تھا اور اُس کے دل پر ایک کوہِ غم ہرگھڑی سوار رہتا تھا۔ اسی مشکل معمے کے حل کے طور پر اُس کا خیال تناسخ کے تصور کی طرف منتقل ہوگیا!

گوتم ایک غیر معمولی طور سے مزکّی و مطہر روح کا مالک تھا اس لئے طلعتِ حقیقت کی نقاب برداری کے لئے اُس نے ہر ممکن و ناممکن نفس کشی و پرہیزگاری کے مطالبات کو پورا کیا لیکن دل جتنا پاکیزہ تھا دماغ اتنا بیباک نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اتنا بڑا شاہین روح بھی بالآخر تقلیدِ عام کا صید زبوں بن گیا! اسی نقادانہ میدان میں ہم اُس کو زرتشت سے فروتر پاتے ہیں! تعجب ہے کہ اُس نے عقیدۂ تناسخ کا کبھی آزادانہ جائزہ نہ لیا اور اُس کی مزعومہ صداقت کو مغلوبانہ قبول کرلیا۔ زندگی اور آلامِ زندگی کو اُس نے ہمرشتہ یکدگر سمجھا اور آخرالذکر کو ختم کرنے کا علاج یہی دیکھا کہ اول الذکر ہی کا خاتمہ کرلیا جائے! پس زرتشت کے بالکل برعکس، گوتم بدھ کا فلسفۂ حیات تمامتر ایک مایوسی، نفی اور سلبیت کی دعوت ہے۔ وہ نفس کشی اور ترکِ لذات کا داعی ہے اور یہی تخیل ہے جو آج کے دن تک ہندوستان کے مذہبی دماغ پر مستولی ہے۔

مکاتبِ مذہب کے اس مکتب کا منشا ہے کہ انسانی روح بے شمار ولادتوں یا جنموں کے ایک طویل سلسلے کے بعد جو مصیبت و مشقت سے لبریز ہوتے ہیں حقیقی زندگی و آزادی حاصل کرتی ہے۔ گوتم تمام ذی روح مخلوق کی زندگی کو یکساں بے ممن سمجھتا ہے چنانچہ جب کسانوں کے ساتھ

[illegible] ہے اب [illegible]
[illegible] رفتار [illegible] ہے۔ [illegible] کی
[illegible] کے درمیان رہتی ہے [illegible] کی [illegible]
[illegible] ہو جاتی ہے۔ وہ [illegible] میں منتقل کر
[illegible] اس کو [illegible] کرنا پڑتا
ہے اور [illegible] حاصل کر کے [illegible] دوبارہ [illegible] کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ
[illegible] ختم ہو جاتا ہیں۔ اگر ایسا ہو تو [illegible] روح کا یہ
ایک ایسے [illegible] میں [illegible] کیا جاتا ہے جو ایک [illegible] اور جا ں
[illegible] اور [illegible] ہر قسم کی [illegible] دیا جاتا ہے اور ایک سے [illegible]
[illegible] زندگی بسر ہوتی ہے۔ لیکن ابھی [illegible] ختم نہ سمجھئے۔ بہت ممکن ہے کہ اس "[illegible]" [illegible]
[illegible] اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس "تمام [illegible]" کے اندر روح کا [illegible] کر
[illegible] ختم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس پر ایک اضطراب طاری ہونے لگتا ہے
اور جنت کی گلی [illegible] پھرتے پھرتے بیزار [illegible] اس کے [illegible] ہونے لگتا ہے اور بس ان کے
بہشت کے [illegible] صرف نالہ و شیون ہو جاتے ہیں۔ [illegible] روح کے
[illegible] شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ زمین پر اس کا ہبوط ہوتا ہے اور ارضی زندگی [illegible] عذاب [illegible]
[illegible] شروع ہو جاتا ہے اور روح اس غار کی تہ سے بار دیگر [illegible] شروع کرتی ہے جہاں سے
اسے گزشتہ دفعہ وہ [illegible] معراج حاصل کی تھی!

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے؟

یہ سارے [illegible] ہم کو ایک طلسم ہوشربا نظر آتے ہیں لیکن [illegible] میں
[illegible] مشاہدہ کرتا تھا۔ [illegible]
[illegible] ہے کہ جن [illegible] کی وہ [illegible] ہے اس کی [illegible] کرنے سے

ہ نہیں تھا اس کی [illegible] ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خلقت انسانی کی زندگیوں کی یہ تمام تفاوت
ں میں [illegible] ہوتی ہے اور آئین کائنات کے ہر لمحہ کے خلاف کسی بخشش سے کام لیں یا بخش
ں کو [illegible] منظور نہ ہونے کا جو الزام عائد ہوتا ہے اس کو وہ ایک آیت عدل سے دور کرتا ہے
تناسخ کے اصول کی روشنی میں فطرت کی ستم ظریفیاں اور بے انصافیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ [illegible] حالات
ب گوتم کی [illegible] ہمارے دلوں میں بڑے درد کا احساس پیدا کرتی ہے۔ آج تک [illegible]
ں نے مصائب حیات کے مناظر سے [illegible] پیچ و تاب کھایا لیکن اس کے ذہن نے ذرا بھی ساتھ
ت نہ دیا کہ وہ مذہب تناسخ کی مضحکہ خیزی کو دیکھ لیتا!

گزشتہ بیانات میں جس طرح ہم دیکھ چکے ہیں زرتشت نے تخیل ذات باری کے متعلق
ر کیا تھا وہ بجائے خود ایک مکمل عقیدہ تھا جس کے اندر ایک مزید تخیل کا اظہار مضمر تھا [illegible]
تکمیل دین" "اتمام نعمت" اس وجہ سے وجود میں نہ آ سکا کہ [illegible]
بشارت دی تھی وہ مبعوث نہ ہوئے۔ لیکن ذات واجب الوجود کے بارے میں [illegible] کا تصور یہ ہے
ک آفاقی [illegible] ہو وہ جس کا کائنات کے اندر کار فرما ہے [illegible]
سو [illegible] ذات مقصود اس کے کچھ نہیں ہے کہ [illegible]
زن کو پا رکھتی ہے۔ ظاہر ہے مقصد [illegible] حصول [illegible] اور کبھی اس [illegible]
صائب [illegible] ایک [illegible] اور پھر [illegible]
تک [illegible] اس سے کہ [illegible] بعد [illegible]
با ہے! [illegible] زندگی مصیبت و مشقت سے [illegible]
ب میں اضافہ ہوتا ہے لیکن [illegible] نجات کی منزل [illegible]
[illegible]!

[illegible]
[illegible]

ایک ناقابلِ رشک چیز ہے۔ اسکی شخصیت کی اہمیت کا راز ہم کو کسی دوسری شے میں تلاش کرنا ہوگا!
اصل یہ ہے کہ بدھ ایک پیدائشی قائد تھا۔ تسخیر خلق کا ایک عجیب ملکہ قدرت نے اسکو ودیعت کیا تھا۔ اُس کے ایک اشارۂ ابرو پر لاکھوں انسان سربسجود عقیدت ہو جاتے تھے۔ اُس کی سیرت کی کتابوں میں ہم جوق جوق اور فوج در فوج لوگوں کو داخلِ سلسلہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ سارا دفتر اساطیر ایک مبالغہ آمیز رنگ میں ہے لیکن مشرب بدھیت نے جو عالمگیر فتوحات اشاعت حاصل کیں انکو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ واقعات کی عام شاہراہ و بیان منزہ و تاریخی ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے خشک، یاس انگیز، اور صبر آزما عقیدۂ مذہبی نے کیوں کر اس کثیر تعداد اتباع کے قلوب پر قبضہ کیا، اور پھر جس طرح اُس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے وہ بجائے خود ایک دیدنی حقیقت ہے۔ اس موقع پر لوگ کسی معمولی گرمجوشی اور ولولہ انگیزی کا ثبوت نہیں دیتے، بلکہ پھولوں کی بارشوں، وجد آور نغموں کے درمیان بدھیت کے قدوم میمنت لزوم کا نظارہ دیکھنے میں آتا ہے! لطف یہ ہے کہ انسانوں کے ساتھ جانور بھی بدھ کو اپنا محسن اعظم سمجھتے ہیں اور اس نجات دہندۂ جن و بشر کی راہ میں اپنی آنکھیں فرش کرتے ہیں!

"ذی روح مخلوق کی تمام اصناف و اقسام ایک دوسرے سے وابستۂ آشنائی و اُلفت ہو گئی تھیں؛ باہمی خوف و ہراس کافور ہو گیا تھا۔ عداوت و نفرت مفقود تھی ... . انحراف و انتشار ہر دو کی روحیں یکساں طور سے بدھ کی قدوسیوں کی ثنا و صفت میں رطب اللسان تھیں۔ عقیدت و ارادت کے ان مناظر میں اور ہدیہ و پیشکش کے ان مظاہر میں ہر متنفس ایک روحانی کیف و سرخوشی سے سرشار تھا!"

(فوشو ہنگ سان کنگ ۱۱۶۳)

"طوفانی ہوائیں، تاریک بادل اور ہر قسم کا غبار و ظلمت غائب ہو گیا تھا۔ فضائے سماوی سے بہشتی پھول اُترتے تھے اور ساری کائنات صدا ہائے امداد طیبہ کے ایک مسلسل عالم وجد میں جھوم رہی تھی!" (ایضاً ۱۲۶۳)

لیت اور تیداثیت کی یہ روح ہم کو کس درجہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے! غالباً اس غیر متوقع
بتہ میں دو عمومی اسباب بیان کئے جا سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ عقیدۂ تناسخ کے تہ دل
ں اُن کے لئے زندگی، دوزخ ارضی کی ایک غیر منتہم عذاب کے ہم معنی ہے۔ مصائب وشدائد
ے اِس دنیا کے ناقابلِ پیائش غمی کا محض تصور ہی تھکی ہوئی روحوں کو اور ماندہ کردے گا۔
یمیا فتہ فلسفیانہ رنگ طبیعت کے لوگ کسی ذہنی تسکین وتسلی کے حیلے اس تخیل مذہبی سے نکال
ام الناس کے لئے تو وہ یکسر ایک سوہان روح چیز ہے۔ لیکن بدھیت کے ظہور کے ساتھ
، کیا گیا اُس کا ایک روشن پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ "کشتگان" تناسخ جو "ہر زمان از غیب
ت کے عذاب دائمی میں گرفتار تھے اُن کے بعض اغلال وسلاسل اب کاٹ دے گئے
اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بدھ نے بشارت دی تھی کہ دنیا کے لیے سلسلہ تناسخ کی جڑی کی اب
یا آہنہ کڑیاں اور چھلیے کو رہ گئی ہیں۔ ان معدودے چند منازل کو طے کرکے ہر روح اُس
ِ جائیگی جہاں سے آخری دار النجات نظر آنے لگیگا! بس یہ ایک نسبتہً مستقبل قریب کی
ژدۂ جاں بخش تھا جسپر روحوں کا لبیک کہنا بالکل قدرتی تھا ع

کیا بات ہے تمہاری نوید نجات کی!

ن بدقسمتی سے پھر جلد ہی یہ عقیدہ بدعت وضلالت کے گھن میں آ گیا جس کی تحریک کا سرچشمہ
ِ ذات ہی بنی تھی۔ گوتم سدھارتھ کی رحمتِ عالم ہستی جب پردہ کر گئی تو فطرۃً اُس کے
سیدائیوں کے ہجوم غفیر کے قلوب کے اندر ایک بیتاب شوق بقا پیدا ہوا!

باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را!

ے مقام نجات کو ایک ایسے ملک سکینت میں فرض کرنا شروع کیا جہاں بدھ اعظم کی مبارک
ِ پھر حاصل ہو گی۔ تناسخ کے علاوہ ایک دوسرا عقیدہ بھی پیروان بدھ میں شائع تھا جس
ے تھا: یا عبارت ہو ایسے مقام سے جہاں بعد موت کے زندوں کے آباؤ اجداد کی
وہ ہوتی ہیں۔ اور انھی کے اعمالِ ثواب کے لئے شرادھ کے مراسم انجام دئے جاتے تھے۔ یہ

تو یہ آریائی عقیدہ تھا اور ممکن ہے کہ یہ ہندِ قدیم کے اصل اور اولین باشندوں کے تخیلات سے ماخوذ ہو۔ غالباً یہ بھی ایک اور عقیدہ ہی تھا جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ دراصل ایک بہشتی دُنیا کا عقیدہ بدھ کے مذہب کا اصلی جزو بھی نہ تھا بلکہ عین اُس کی ضد تھا لیکن بہرحال اس عقیدہ کو بھی مروجہ مذہبیات سے مستعار لے لیا گیا اور بدھ مت کی تعلیمات میں داخل کر لیا گیا۔ چنانچہ یہ ہم کو چین میں بھی نظر آتا ہے جو بدھ کی نام نہاد امت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

چنانچہ نندی اور گدا اپنے دو مریدوں کو خطاب کرتے ہوئے، ایک خطبے کے دوران میں بدھ کہتا ہے:

"جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا، اب آئندہ کوئی زندگی نہ ہوگی۔" (فو شو ہنگ سان کنگ ۱۳۳۱)

اور بتیا طلب راجہ بمبسارا:

"یہ اپنی جداگانہ ہستی کا خیال ہی تمام آلام و محن کا ذمہ دار ہے جس نے اہل عالم کو سلاسل عذاب میں جکڑ بند کر رکھا ہے، لیکن جب وقت یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ کوئی "انا" موجود نہیں ہے تو یہی انکشاف ان تمام بیڑیوں کے لئے ایک تیشہ ثابت ہوتا ہے۔" (ایضاً ۱۳۳۲)

مقام کوسل کے تبلیغی خطبات کے دوران میں بدھ نے کہا:

"جو کچھ میں تمہیں بتاتا ہوں اسکو مضبوط پکڑو۔ میری تکمیلِ نفس کا نتیجہ دیکھو کہ میرا سلسلۂ حیات اب ختم ہو گیا، آئندہ میرے لئے نہ کوئی جسم ہے نہ جنم، بلکہ جملہ علائق سے بھی دوری ہے آزادی کامل۔"
(فو شو ہنگ سان کنگ ۱۴۲۲)

مذکورہ بالا اقتباسات فو شو ہنگ سان کنگ سے لئے گئے ہیں جو کتاب بدھا کاریتا (بزبانِ سنسکرت) کا چینی ترجمہ ہے۔ چینی زبان میں یہ چیز پانچویں صدی مسیحی میں منتقل کی گئی اور اگرچہ تمام عمومی مطالب کا لحاظ وہی رکھا گیا ہے اور بدھ کے مختلف خطبات و مواعظ کے الفاظ کم و بیش محفوظ رکھے گئے ہیں لیکن اس کے اندر "مقامی فضا" بھی پیدا کر دی گئی ہے یعنی اہلِ چین کے اس وقت کے تخیلات و معتقدات کی کافی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ بدھ کے اپنی چینی امت کے ساتھ ذاتی تعلقات کے معاملے میں یہ تحریف

میں اعلان کیا گیا ہے:

"چہارم" اور آخر میں کے [illegible] کی طرح آگے [illegible] میں وہ اس جگہ کے باشندے ہیں

اس جگہ [illegible] ہوا ہے اس کے سامنے اپنی [illegible] اور وسطی روایت ہے کہ

"یہ شخص جو یہ مقام [illegible] میں بہت دور دور کسی جگہ سے [illegible] یا دہ [illegible]

[illegible] ہے وہ بہرا [illegible] آہستہ ہے [illegible] یہ کہ کوئی آدمی جیرت سا [illegible]

میں رہتا ہو لیکن [illegible] کی وجہ سے [illegible] میں اس [illegible] ہو!"

(ڈاکٹر [illegible] سان کنگ ۱۲۰)

اور پھر اپنے مریدوں کو نصیحت کرتا ہے کہ:

"جو وسائل و اعمال [illegible] کسب و حصول نجات روح کے لئے تم کو تعلیم کئے گئے ہیں

اُن پر ثابت قدم رہو اور جہد کے ساتھ عمل پیرا رہو۔ اُس شخص کا انتظار کرو جس کے [illegible]

تمام [illegible] کے لئے بند ہیں۔" (ایضاً ۲۰۴۸)

[illegible] سان کنگ کے اختتامی باب میں اُس کا مصنف آپ کے متعلق کہتا ہے:

"جس وقت وہ مقام [illegible] میں [illegible] جو لوگ اُس کے آئین نجات پر ایمان

رکھتے ہیں وہ اس کے نقش قدم پر چلے ہوئے آخر اُس کی حضوری میں پہنچ جائیں گے۔ میں

تمام [illegible] کو [illegible] اس پر [illegible] اور [illegible] رحمت آقا کی [illegible] کرنی

چاہیئے [illegible] کے مقام پر فائز ہوا کہ تمام ذی روح موجودات کا

نجات [illegible] ہو [illegible] ہے کہ اُس کا [illegible] مبارک اُس کا [illegible]

[illegible] ہو جائے۔" (ایضاً ۲۲۲)

کسی [illegible] کی [illegible] ہے کہ [illegible] کی [illegible] زندگی اس قدر [illegible] اور [illegible]

[illegible] کے [illegible] ہوں [illegible] اُس کے

ذکر اس قسم کی [illegible] سان کنگ کی [illegible] کے [illegible]

ہے متاثر و متغیر ہوئیں لیکن مسائل تشخص و تعین کے متعلق بدھ کے جو پُر زور احتجاجات ہیں وہ اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ داعیانِ مذاہب کی ذات کی پرستش کے رجحانات اُس کے عہد میں بھی موجود تھے۔ سچ یہ ہے کہ خود بدھ اعظم کی یگانۂ روزگار مقبولیت و محبوبیت کا راز بھی نفسیاتِ انسانی کے اسی نکتہ میں پنہاں تھا!

ہندو مت میں بھی بدھ مت (غیر محرف) کی طرح جو اپنے بعض اطراف و جوانب میں ہندو مذہب کی گویا شاخ ہے "شخصیت" بمنزلہ صفر کے سمجھی گئی ہے۔ ان مذاہب کے تخیل میں ذات و نفس ایک ایسی چیز ہے جس کو نظر انداز کرنا چاہئے، جس کی وقعت کو کم کرتے رہنا چاہئے اور بالآخر اُس کو بالکل اُڑا دینا چاہئے۔ یہی "ترکِ وجود" اور "نفیٔ خودی" نجات و وصال کے مترادف ہے! ہستی مطلق ان علائق و قیود سے بالکل مبرا و منزہ ہے۔ یہ صرف انسانیت کے لواحق و عوارض ہیں، اور جس قدر انسانیت اپنے درجے میں فروتر ہو گی اُسی قدر یہ لوازمات اُس میں زیادہ ہوں گے۔ ہندوستان کی تاریخ مذہب کے عہد اساطیری سے گزر کر جہاں مشاہیر اور نیم خداؤں کی کثیر التعداد شخصیتیں نظر آتی ہیں، ہم کو برائے نام افراد ہی بر اعظم ہند کی ناپیدا کنار دنیا میں ایسے ملتے ہیں جن کے حالاتِ زندگی داستانِ امیر حمزہ بنائے جانے سے محفوظ رہے ہوں! اور جس کی وجہ سے اُن کی شخصیت ایک افسانویت کے ساتھ مدغم نہ ہو گئی ہو۔ اِس ملک نے صرف معدودے چند ہی بادشاہ اس پایہ کے پیدا کئے جن کا شہرہ حدودِ ہند کو عبور کر کے دوسرے ممالک میں پہونچا۔ چندر گپت، اشوک اب شاید بمشکل کسی تیسرے کا نام لیا جا سکتا ہے! شعراء میں والمیکی اور ویاس سے بعض غیر ملکی لوگ آشنا ہیں، رشی وشسٹ اور وشوامتر اور مذاہب فلسفہ کے بعض بانیان کا بیرونی حلقہ شناسائی کچھ اس سے زیادہ ہے، لیکن ان تمام بین الاقوامی واقفکاروں میں بمشکل کوئی ایسا جو اُس جماعت سے باہر کا ہو جو "ہندیات" کے مخصوص ماہر ہیں! لیکن وہ عظیم الشان ابطال جنہوں نے ہندوستان پر عمیق اثرات ڈالے، مثلاً لغاتِ وید، اور اُپنشید و بھگوت گیتا کے مصنفین، اور وہ اربابِ سیاست جنہوں نے اس ملک کے حکمرانوں کی زمامِ حکومت کی رہنمائی کی۔ ان سب کی شخصیتیں

عام آبادی کے ہجوم میں گم ہیں! ہم کو یہ معاملات تو بخوبی معلوم ہیں کہ مہاتما بدھ کے کیا معنی ہیں، ان کے کیا اعمال و فرائض مذہب کیا تھے اور اس کے متعلقہ زندگی کیا ہیں اور بالخصوص بدھ مت (رہبانیت یا رہبانیت) کی روح موجودہ ہندوستان کی خلقت کی اصل بنیاد و حاکم ہے لیکن ہم خود ان مخصوص افراد کے متعلق بالکل تاریکی میں ہیں جو اس فلسفہ حیات کے داعی اور مظہر تھے! ہندوستان کی گمنامی پسند دنیا کی قریباً تمام کی تمام گمنام شخصیتوں کا مقابلہ روشناس عالم یونانی حکماء، رومی امراء عساکر، عبرانی انبیاء و رسل اور مسیحی اولیاء و اصفیا سے کیجئے اور دو بالکل برعکس مناظر کا مشاہدہ کیجئے!

وہ ننگ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے!

ہندو قوم کے تمام نامعلوم الاسم رجال اعظم میں صرف ایک بدھ کی منارہ نما ہستی نظر آتی ہے جس کے وجود کے مرکز قطبیت کے گرد ایک خلقت نے ہجوم کیا اور قلبی خلوص و محبت کے ہدیے پیش کئے لیکن اسے ان تمام مظاہر ذات کی جس نے پوری سختی سے ہمت شکنی کی:

"لوگو! میرا سایہ عاطفت مت ڈھونڈو! اپنی روح کے ملجا و مامن خود بنو!"

(کتاب وصال مقدس ۲ : ۳۳)

حیات! میں ہنوز ایک خام طالبعلمانہ حالت میں ہوں جس کو اپنی تکمیل نفس کے لئے ابھی بہت کچھ مدارج طے کرنے باقی ہیں اور میرا محترم اور محبوب آقا کوس رحلت بجا رہا ہے؟

بدھ اس بے محل ماتم گری اور روحانی بیراہ روی کی اطلاع پا کر فوراً آنند کو طلب کرتا ہے اور اس کو یوں تسلی دیتا ہے:

"بس چپ آنند! اس اضطراب و اضطرار اور شور و شیون کے کیا معنی؟ کیا میں نے تم لوگوں کو اس سے قبل بے شمار موقعوں پر اس ناموس فطرت سے روشناس نہیں کیا تھا کہ [illegible] قریب ہیں ان سے [illegible] جدائی مقدر ہو چکی ہے! [illegible] کہ [illegible] ہو سکتا ہے! [illegible] اس کے متعلق [illegible]
[illegible]

محبت و الفت ہے جس کی کوئی حد و حساب نہیں، مدت مدید تک! اے آنند! تم نے مجھ پر بڑی مہربانیاں اور احسانات صرف کئے ہیں اور میرے ساتھ ایک انتہائی قرب و محبت کا رشتہ پیدا کر لیا ہے جو غیر شکستنی ہے! تمہاری زندگی قابل داد ہے۔ آنند! بس اپنی مخلصانہ اور جانفشانہ جد و جہد کو اسی طرح جاری رکھو، اور مستقبل قریب میں تم بھی میری طرح تمام مکروہات ہستی یعنی شہوت نفس وغیرہ، اور تمام سیئات وجود یعنی انفرادیت و شخصیت اور فریب نظر و جہالت وغیرہ سے نجات پا جاؤ گے!" (ایضاً ۳۲۰۵ تا ۳۰۵)

تسلی! لیکن کتنی بیدردانہ اور سرد مہرانہ تسلی! لیکن بدھ کی جنبت خیال میں اس سے بڑھ کر کیا تھا؟ یہ ایک ایسے خون در دل کے درد کا مایوسانہ درماں تھا جو بالکل بے یار و مددگار رہا جاتا اور جس کے سامنے زندگی کا طوفانی سمندر ہے جس کو اسے ایک ایسی کشتی میں بیٹھکر عبور کرنا ہے جس کا نا بحر سرمدی کی امواج سے وصل ہو رہا ہے!

گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است!

ہم نے گزشتہ صفحات میں دو تصویریں کھینچی ہیں، اور فلسفۂ مذہبی کی دو مختلف دنیاؤں کا نمونہ پیش کیا ہے۔ یہ دونوں مرقعے بخط مستقیم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن تحقیق تاریخی کے ماضی قریب میں ایک اہم انکشاف ہوا ہے جس نے نہایت غیر متوقع طریقے سے ان ہر دو متضاد مظاہر میں ایک راہ تطبیق بتائی ہے!

جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی جنوری و جولائی (۱۹۱۵ء) کی اشاعتوں میں ایک تاریخی مقالہ ڈاکٹر سپونر کے قلم سے نکلا جس میں ان "حفریات" (کھدائیوں) کی ایک روئداد ہے جو ڈاکٹر موصوف کی زیر نگرانی شہنشاہ چندر گپت کے محلات (متصل پٹنہ) کے موقع پر عمل میں آئیں۔ ممدوح کا بیان ہے کہ میں نے اس محل کو شہر پرسی پولیس دیا یہ تخت ایران جو پانچویں صدی قبل مسیح کے دریافت شدہ قصر شاہی کا نقش ثانی پایا! اس تاریخی سراغ کے پیچھے پیچھے چل کر اور بعض دیگر آثار و قرائن کا اس پر اضافہ کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عہد مذکور میں شمالی ہند کے اندر اہل ایران

یج نوآبادیاں تمام تھیں جو یہاں نہ صرف تاجرانہ حیثیت سے وارد ہوئے تھے بلکہ اس ملک کے فاتح اور حاکم تھے۔ اُس کا خیال ہے کہ خود بدھ بھی دراصل ایرانی النسل ہے اور اس نظریہ میں اس حد تک متجاوز ہے کہ بدھ کے لقب ساکیہ منی کا ترجمہ بھی وہ "دانشمند ایرانی" کے الفاظ سے کرتا ہے! اُس کا یہ بھی قیاس ہے کہ گوتم کی اوائل عمر بھی مجوسیت کے ماحول میں بسر ہوئی! اور یہ کہ اُس کی دعوتِ دینی کی حقیقی تفسیر یہ ہے کہ وہ مجوسیت اور ہندویت کے درمیان ایک مفاہمت ہے! ممکن ہے کہ اس تاریخی خواب کی کچھ بہتر تعبیر مستقبل میں ملے اگر یہ خیال پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا تو ایک یادگار تحقیق ہوگی جس کی دیگر تفصیلات ہندوستان کے غبار آلود مذہبی تاریخ کے مطلع پر بہت روشنی ڈالیں گی۔ اسوقت بھی اُس کے اشارات کی بعض کرنیں چند تاریک گوشوں پر پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں چنانچہ اس نظریہ کی روشنی میں یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی مذہبیات کا عقیدۂ تناسخ ممکن ہے کہ بجائے دراوڑی توہمات (انتقالِ ارواح موتی با اجسام حیوانات) سے ماخوذ ہونے کے 'ایرانی تخیل "فراوشی" کی خوشہ چینی ہو جس سے مراد نوعِ انسانی کے افراد کے وہ روحانی مُثنے ہیں جو "عالم مثال" کی دوسری دنیا میں اس حیاتِ ارضی کے قبل و بعد موجود رہتے ہیں۔ کچھ بعید نہیں کہ مجوسی اور ہندو ہر دو عناصر کا معجون مرکب ہمارے سامنے مذہب گوتم کی شکل میں موجود ہو! اس لئے کہ بدھیت کا جو سب سے زیادہ مرکزی عقیدہ ہے یعنی نفیٔ وجود، وہ زرتشتیت کی ہر شاخ سے بھی بالکل مختلف ہے اور ہندویت کے سوادِ اعظم کے معتقدات سے بھی قطعاً متبائن ہے!

ہم نے یہاں زرتشت اور بدھ دونوں کے مذاہب پر پہلو بہ پہلو نظر ڈالی ہے اور اب ہم یہ استفسار پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ان ہر دو ملتوں کے داعیوں اور بانیوں کی جو نیت اور جو مطمحِ نظر تھا کیا وہ پورا ہوا؟ زرتشتیت "زمین پر خدا کی حکومت" کی مبشر ثابت نہ ہوسکی اور نہ زرتشت کی اُمید کے مطابق وہ نوع انسان کو اپنے علم کے نیچے لانے میں کامیاب ہوئی بخلاف اس کے اس نے سوچ لیا کہ اپنے کو تبلیغی مذاہب کی فہرست سے بھی خارج کر لیا ہے اور اس کی داخلی نشوونما بھی ختم ہوئی کہ معطل ہے۔ بدھ کی محبوب شریعت کا یہ حشر ہوا کہ جب ایک دفعہ اُس کا مسلک تھا ساحل تھا پہنچا تو اس نے پھر

کسی نشاۃ ثانیہ کا ثبوت نہیں پیش کیا۔ بدھمت کا حقیقی سرچشمہ تھا وہ قرنہا قرن ہوئے کہ بالکل خشک ہوگیا اور اگر گوتم بدھ کی اصلی تعلیمات و عقائد کو پیش نظر رکھا جائے تو ہم کو نام تھا لیکن بکثرت لامذہبیت و الحاد کی مردم شماری میں غیر معمولی طرح ویرانی کرنی پڑیگی۔ جو بدعت و تحریف بدھمت کے حرم میں ظہور پذیر ہوئی اسکی نوعیت یہ ہے کہ اُس کے حلقہ بگوش یہی نہیں کہ اس کے نقوش قدم سے بہت پیچھے پڑ گئے ہوں بلکہ وہ اصلی شاہراہ سے بالکل برعکس سمت میں جا رہے ہیں!

ہر دو مذاہب کے سروں پر جو گردشیں آئیں اُن کے تاریخی تبصرے سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اگر اُسے میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کروں تو میری تشخیص یہ ہوگی کہ یہ دونوں کاروانِ دعوت اپنی منزلِ مقصود کو نہ پہونچے۔ دونوں جگہ ناکامی کا سبب اثباتِ وجود کے احساس کا فقدان تھا۔ زرتشتیت کے معاملے میں یہ قصور زرتشت کی ذات کا نہیں، بلکہ اسکے مخاطبین کی نااہلیت سے متعلق ہے، لیکن بدھمت کے بارے میں تو تخریب کے تخم اُس اصل مذہب کی استخوان بست ہی میں پائے جاتے ہیں!

بدھ کے تمام خاکۂ نجات کا سنگ بنیاد یہ سلبی تخیل ہے کہ وجود ذاتی کا کہیں واقعی وجود نہیں۔ یہ محض ایک اعتباری اتفاق ہے جو ضمناً ایک ایسی دنیا میں ظہور پذیر ہوگیا ہے جس پر ایک غیر شخصی جبروت مجردہ کی فرمانروائی ہے اور اُس کے پیش نظر جو منزل اخیر ہے وہ تکمیل و استحکام نہیں ہے اور انسانی افراد کی یکجائی پیدائش کے مبنی بر نجبت واقعہ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جیسے "خزاں میں پارہائے ابر کا آنی معانقہ!" اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بدھمت کے [illegible] کی بنیاد نہ ہو اور کسی کی شخصیت کو غیر واقعی ثابت کرنے کی مذہبی کوشش میں جس نے خود اپنے وجود کی واقعیت ہی پر ضرب کاری لگالی! چنانچہ شمالی ممالک میں چین اور [illegible] کے اجماع نے عملاً اس عقیدہ پر فتویٰ ابطال صادر کردیا ہے۔ [illegible] کا مطالبہ کیا اور وہ ایک شخصی نجات دہندہ یا شفیع کے لئے تشنہ لب [illegible] خالی مسند پر خود حضرت گوتم کو متمکن کردیا!

بڑا ابہر خطو انسان نے زنجیر نہ تھام   دوسری جنت میں بعینہٖ وہ ہی تم آدم کب تک تھا
یا سلجھن اور ہمارے بھی حقوق الفقد ہو کر اس نفی خودی کی نفی کر دی جہاں نہ ہی تمدن کی
سے سکون پذیر ہو کر ایک معتدل قسم کی کرام وہ اور خشک ـ لاادریت کی شکل اختیار کر لی ہے
وجہ سے مختلف لوگوں کے اضطرابات اور مشکلات قریباً بدستور قائم ہیں اور مستقبل کا علاج کوئی
نسخہ پیش نہیں کرتا!

ودانشتیہت کی اصل ہیئت اُس کے بانی کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ اُس کے جانشین ایک
کے حق میں اپنے اعتماد کو تفویض کرنے سے قاصر ثابت ہوئے اور ایک آئین حیات معاشرت
بستہ دامن ہو گئے کیونکہ یہ آخر الذکر طریق اُن کے دل و دماغ کے لئے زیادہ سہل الحصول تھا
ن تو محض ایک ذہنی مفاہمت ہی چاہتا ہے ورنہ کمال یک شخص قبل اس کے کہ اس کے
ہو منک سالفہ تجربے اور از خود اعتماد کی تخلیق ہو ایمہ سے تسلیم و توکل کا اول کا مطالبہ بھی کی
ہے چنانچہ یہی زیادتی اُس کی اثر آفرینی کی ناکامی کی وجہ ہوتی ہے۔ ایرانی دل و دماغ سے
یان بالغیب کی توقع ہی عبث تھی۔ یہ علما بڑے ہی خشک لوگ تھے۔ مگر وہ امور کے ساتھ
ت بھی کافی ناقدانہ رنگ رکھتی تھی۔ چنانچہ اُس کے وجود کے ساتھ ساتھ ہی وہ آثار گرد و
بھی نظر رکھتے تھے اور "یا خدا ہم ہوشیار" کے مقولے پر عامل تھے! اگرچہ ذکی الحس فطانت و نیت
ہوئے ہم اُن کے ہیں تذبذب و اضطراب کو بالکل غیر محمود نہیں قرار دے سکتے اس لئے کہ وہ بحوال
عقائد کے و پیچھے رہتے تھے خواہ بعض اوقات اپنی مجبوریوں ہی کی کشمکش کا نتیجہ کیوں نہ بنا ہو
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کو جائز رکھتا تھا سحر و ساحری کے ایک طول و طویل اور تکلیف دہ نظام کو اپنے پیرووں پر عاید کرتا تھا و آگ کی پرستش کا حکم دیتا تھا، ساتھ ہی اپنے ایک واحد، قائماً بالقسط، حکیم و علیم خدا کے وجود کی شہادت دینے سے بھی بند نہ تھا!

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نبود!

ان سارے معاملات کے حقیقی تصفیہ کے لئے از بس ضروری و اہم صرف یہ بات ہے کہ ہم مظاہر "وجود" یا "شخصیت" کے بارے میں ایک صحیح نقطۂ نظر تک رسائی حاصل کریں۔ اگر ہم "بدھ" زاویۂ نگاہ قبول کر لیں تو لا ریب کہ ہستی کے تمام مصائب و آلام کا تریاق بجز اس کے بتلائے ہوئے علاج کے کچھ نہیں۔ لیکن اگر حقیقت و حقانیت کا حامل وہ عقیدہ ہے جس پر زرتشتیت کی بنیاد ہے، نیز جس کا اعلان اُن تمام انبیا و رُسل نے کیا ہے جو بدھ کی بہ نسبت ہمارے عہد سے بمراحل نزدیک ہیں، تو پھر ہم کو اُسی شاہراہ جد و جہد پر اپنا کاروان عزم چل کھڑا کر دینا چاہئے جو ایک ایسی منزل علیٰ پر جا کر ختم ہوتا ہے جس کا تصور بھی اس وقت ہمارا واہمہ بمشکل کر سکتا ہے!"

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

حقیقتِ حج

ارکان اسلام میں سے حج ایک ایسا رکن ہے جو توحید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ جیسی موحدانہ عبودیت، مخلصانہ خشیت الٰہی، اور والہانہ شیفتگی اس میں پیدا ہوتی ہے کسی دوسری عبادت میں نہیں پیدا ہوتی۔ اُس مرکز توحید کو جہاں حج کے مناسک ادا کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی خصوصیت بخشی ہے کہ وہاں مومن کے قلب پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جس کا گمان اور اندازہ بھی دوسری جگہ نہیں کیا جا سکتا۔

دنیاوی حیثیت سے یہ رکن امت اسلامیہ کے اتحاد اور ترقی کا ذریعہ اور اُس کے جملہ دینی اور دنیوی مفاسد کا مصلح ہے۔ اس میں اخوت اور مساوات کا عملی درس ہے جس سے شیرازۂ ملت مستحکم ہو سکتا ہے۔ یہ تبادلۂ خیالات کی ایک مقدس انجمن ہے جس میں اقوام مسلمہ ایک دوسرے سے اعانت و ہمدردی، دماغی و عقلی فوائد حاصل کر سکتی ہیں۔ یہاں عالم اسلامی کا اجتماع ہے جس سے امت کے ہر قسم کے تنازعات و اختلافات مٹائے جا سکتے ہیں اور ایک متفقہ نظام عمل تیار ہو سکتا ہے۔

تاریخ حج | عہد الست کا حامل انسان ابتدائی دور میں باوجود نبیوں اور رسولوں کی تعلیموں کے توحید کی طرف کم مائل ہوا۔ اور اپنی نادانی سے زیادہ تر مظاہر پرستی میں مبتلا ہو کر شرک کرتا رہا۔ یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برگزیدہ فرمایا، جو اپنی مستحکم توحید اور شان حنیفیت کے باعث موحدوں کے پیشوا سے اعظم ہو گئے۔ انہوں نے اکیلے اللہ کی خاطر اپنے باپ، گھر خاندان اور وطن سب کو چھوڑ دیا۔ اور جس وقت حجاز کے اس بے آب و گیاہ خطہ میں اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو لیکر آئے اسوقت دونوں نے ملکر خلوص قلب اور دلی دعاؤں کے ساتھ اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے کعبہ کو تعمیر کیا جو دنیا میں موحدوں کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ اللہ نے انکی دعائیں قبول کیں، اس گھر کو مبارک اور سرچشمہ ہدایت بنایا، اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، "وہ پیادہ اور دبلی سواریوں پر ہر راہ دور دراز سے آئیں گے، اور اپنے لئے فائدے حاصل

حج

اس اعلان کے بعد سے حج شروع ہوا اور سلسلہ قائم ہو گیا۔ لیکن قرنوں بعد قرن، اور صدیاں پہ صدیاں گزرنے کے بعد اس میں تغیرات پڑے۔ لازمی تھے۔ اولاد ابراہیم میں سے بنی اسرائیل کا [illegible] انبیاء مبعوث تھے اور اللہ کی ہدایت سے ان کا قبلہ بیت المقدس قرار پا گیا۔ اور کعبہ کا حج ان لوگوں کی رہنمائی میں ہونے لگا جو علم شریعت سے بے بہرہ اور توحید کی حقیقت سے ناآشنا تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس عبادت کو مشرکانہ رسوم اور خرافات کا مجموعہ بنا دیا۔

جب بنی اسماعیل میں دعائے ابراہیمی کا ظہور ہوا اور نبوت کبریٰ کے وارث رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے بحکم الٰہی پھر اس رکن توحید یعنی حج کو شرکیات سے پاک کر کے اپنی اصلی شکل میں قائم کیا۔ ۹ھ پہلا سال ہے جس میں دوبارہ صحیح اصول پر یہ فریضہ ادا کیا گیا، جو تاریخ میں حج اکبر کے نام سے مشہور ہے۔

فریضۂ حج یہ رکن چونکہ بنیاد اسلام یعنی توحید، نیز ملت کے ہر طرح کے منافع کا کفیل ہے، اسلئے سال کا ایک چوتھائی حصہ یعنی شوال، ذیقعد، ذالحج تین مہینے اس کے لئے مخصوص کیا گیا۔

حج کی نیت کرنے والے خالص توحید اور اکیلے اللہ کی رضامندی کی طلب کے لئے جائیں، نہ لڑیں نہ جھگڑیں، نہ عورتوں سے مباشرت کریں، اور زاد راہ ساتھ لیں۔ تجارتی سامان بھی فروخت کے لئے لینا ممنوع نہیں ہے۔

ہر مسلم جو حج میں جانے کی استطاعت رکھتا ہو لازم ہے کہ زندگی بھر میں ایک بار ضرور یہ فریضہ ادا کرے۔

احرام کعبہ [illegible] میل ہے لیکن [illegible] سے [illegible] ہو کر [illegible] دو رکعت نماز پڑھکر اس مقصد [illegible] زائرانہ لباس پہن لیتے ہیں۔ ایک لنگی اور ایک [illegible] ترتیب و زینت کر [illegible]

[illegible]

اللّٰھمّ لبّیک، لاشریک لک لبّیک

ہرایک کے وردِ زبان۔ سارے جھگڑے ختم۔ شکار و ذبح حرام۔ اور لہو ولعب بند۔

قافلہ رواں اور دواں ہے۔ وفورِ شوق سے دل بیتاب ہو رہے ہیں کہ کب اس منزل پر پہونچیں جہاں برکتیں اترتی اور رحمتیں برستی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جگہ آگئی۔ لبیک کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ زائرین بے قرارانہ داخل ہوئے اور پاک وصاف ہو کر اس گھر میں پہونچے جو دنیا کے تمام گھروں سے زیادہ محترم ہے۔

حجرِ اسود عہد ابراہیمی میں پیمانِ عام لینے کا دستور یہ تھا کہ ایک پتھر رکھدیا جاتا جسپر لوگ آآکر اپنے ہاتھ مارتے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جس عہد کے لئے وہ پتھر رکھا گیا ہے اسکو انہوں نے تسلیم کرلیا۔

حضرت ابراہیم نے جب کعبہ تعمیر کیا تو اس کے ایک کونے پر ایک پتھر نصب کر دیا کہ اس گھر میں جسکی بنیاد اکیلے معبود کی پرستش پر ہے جو داخل ہو پہلے اس پر ہاتھ رکھکر پھر طواف کرے یعنی سات چکر لگائے۔ گویا وہ اپنے آپ کو اس کی توحید پر جسکی عبادت کے لئے یہ گھر ہے نثار کرتا ہے۔ اگر جان بھی دینی پڑیگی تو بھی اس سے منحرف نہ ہوگا۔

اسی پتھر کا نام حجر اسود ہے۔ نہ اسمیں کوئی طاقت ہے نہ اسمیں کوئی قوت۔ نہ یہ جنت کی چٹان ہے نہ عرش معلیٰ کا فرش۔ صرف تجدید عہد ابراہیمی اور پیمان حنیفیت کے لئے ایک نشان ہے اور بس۔ اس کو چھونے یا ہجوم کی صورت میں دور ہی سے اس کی جانب ہاتھ اشارہ نے کو استلام کہتے ہیں۔ چونکہ یہ توحید کا مقدس پیمان ہے اس لئے ہاتھ یا پتھر کو چوم بھی لیتے ہیں۔ مسجد حرم میں پہونچکر سب سے پہلا کام یہی استلام ہے جس سے طواف شروع ہوتا ہے۔

"نادان ہیں وہ لوگ جو عہد توحید باندھنے والوں پر سنگ پرستی کی تہمت لگاتے ہیں۔ حج کے جتنے اعمال ہیں وہ تو سارے کے سارے شرک کے مذبح ہیں۔ حجاج کی امتیازی صفت قرآن میں یہ ہے "حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِهٖ" یعنی وہ اللہ کی طرف یک رُخے ہو جانے ہیں۔ کسی کو اس کا شریک بنانے والے نہیں۔

طواف | یہ نظارہ کس قدر روح پرور ہے!! سیکڑوں ہیں جو حجراسود کی طرف ہاتھ اٹھا کے طواف شروع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ہیں جو پروانہ وار گھوم رہے ہیں اور اللہ کے نام، اُس کی توحید اور اُس کے آستانہ پر نثار ہو رہے ہیں۔ دل سینوں میں اچھل رہے ہیں، آنسو آنکھوں سے اُبل رہے ہیں اور منہ سے یہ کلمات نکل رہے ہیں،

اَللّٰھُمَّ اَلْحَرَمُ حَرَمُکَ ۔ وَالْعَبْدُ عَبْدُکَ۔ جَاءَکَ تَائِبًا ھَارِبًا مِّنَ الذُّنُوْبِ ھٰذَا مَقَامُ

اَلْعَائِذِ بِکَ یَا اللّٰہُ ۔

بیکیوں کی چوکھٹ تھامے ہوئے خشوع اور خضوع کے ساتھ استغفار میں محو ہیں۔ بیسیوں غلاف سے لپٹے ہوئے گریہ وزاری کر رہے ہیں۔ بہت سے دیواروں سے لگے ہوئے سجدہ میں پڑے ہیں اور رو رو کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ایک وارفتگی کا عالم ہے جو سارے مجمع پر چھایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساعتِ قرب کی فضائیں کھنچ گئی ہیں اور جلال کبریائی سے قلوب پگھل پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔

یوں تو اللہ تعالیٰ کب اور کہاں نہیں مگر بعض بعض زمان و مکان کو اس نے خاص خاص خصوصیتیں دے رکھی ہیں جو دوسروں میں نہیں۔

مقام ابراہیم | طواف کے بعد اُس تجلی گاہ میں آتے ہیں جو مطاف کے حاشیہ پر ہے۔ یہ معمار کعبہ حضرت ابراہیمؑ کا مقام ہے جہاں مرمر کا ایک حجرہ اور سائبان بنا ہوا ہے۔ یہ خاص قبولیت کا مصلیٰ ہے۔ یہاں صلوٰۃ شکر کا دوگانہ ادا کر کے دعائیں کرتے ہیں اور غرط رقت سے دل کا خون آنکھوں سے بہاتے ہیں۔

سعی | صفا اور مروہ میں دو فرلانگ سے زیادہ فصل نہیں جس میں نیچے اینٹ سے روکی ہوئی پختہ سڑک ہے اور اوپر ترکوں کا ڈالا ہوا سائبان۔ مسجد حرم سے مشرقی جانب پہلا قدم جو باہر رکھا جائیگا وہ اسی سڑک پر پڑیگا۔ دو رویہ بازار ہے اور مکہ کا بڑا بازار۔

طواف کر کے حجاج سعی کیلئے نکلتے ہیں کہ یہ بھی شعائر اللہ میں سے ہے۔ کبھی ایک متبرک ہستی نے پانی کی جستجو میں ان پہاڑیوں کے درمیان بے تابانہ چکر لگائے تھے اور اس کی یہ ادا رب العزت کو بھا گئی تھی۔

سعی میں بھی دلوں میں وہی رقت ہے اور وہی سوز و گداز۔ تیز گامی بھی ہے اور آہستہ خرامی بھی۔ کبھی حمد و ثنا ہے اور کبھی استغفار و دعا۔ سات بار دوڑتے ہیں اور ہر دوڑ میں وہی محویت ہے اور وہی استغراق۔ جھنڈ کے جھنڈ ہیں مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔

سڑک کے دونوں جانب دوکانیں کھلی ہوئی ہیں اور خرید و فروخت جاری ہے لیکن یہ فدایانِ آستانہ کسی اور ہی دھن میں ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ کدھر بازار ہے اور کیسا کاروبار۔ ان کا سودا ہی دوسرا ہے۔

سعی سے فارغ ہونے کے بعد تمتّع یعنی خالی عمرہ کی نیت کرنے والے جامۂ احرام اُتار دیتے ہیں کیونکہ ان کا کام پورا ہو گیا۔ جب حج میں جائیں گے تو پھر اس کو پہن لیں گے لیکن قِران یعنی حج و عمرہ دونوں کی ساتھ نیت کرنے والے ابھی اسی فقیرانہ لباس میں رہیں گے تا وقتیکہ جملہ مناسکِ حج پورے نہ کر لیں۔

اب ہر ایک کے لئے زمانۂ حج تک اپنی اپنی محنت اور کوشش ہے۔ جسقدر چاہیں حرم میں نمازیں پڑھیں، دعائیں مانگیں اور طواف کریں اور جو کچھ ہو سکے خیرات و مبرات میں حصہ لیں۔ یہ مقدس مقام اور یہ موقع روز روز نہیں مل سکتا۔

<u>عرفات</u> آٹھویں تاریخ آگئی۔ حج کے لئے روانگی ہے۔ راستہ بھرا پڑا ہے۔ اونٹوں کی چار چار قطاریں ایک ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ ہزاروں گدھوں پر ہیں اور لاکھوں پیدل۔ سب کے سب کسی خاص دھن میں ہیں۔ نہ بات ہے نہ چیت نہ شور ہے نہ ہنگامہ۔ شام کو منا میں پہونچے۔ رات کو وہیں منزل رہی صبح کو پھر کوچ ہوا اور دوپہر کو اس مبارک میدان میں داخل ہوئے جو حج کی جگہ ہے جس کی کشش ان سب کو کھینچ کر لائی ہے۔ کارواں پر کارواں پہونچ رہے ہیں اور جہاں تک نگاہ جاتی ہے ڈیرے ہی ڈیرے لگے ہیں۔

حضرت علی کے مقولے نعم الوصلت کے مصداق ابنائے ملت کے ہر سمت، مغرب مشرق شمال، جنوب، دنیا کی چاروں سمتوں سے، دور دراز راہوں سے سمندروں کی چھاتیاں پھاڑ کر

وظیفے کرتے ہوئے اپنے مالک کی حضوری میں حاضر ہوئے ہیں۔ سب توحید کے فرزند آپس میں بھائی بھائی، ایک ہی بھیس اور ایک ہی رنگ میں۔ ایک ہی آستانہ کے پجاری اور ایک ہی در کے بھکاری۔ جلتے ہوئے پتھروں پر تپتی ہوئی دھوپ میں سر کھولے ہاتھ جوڑے اللہ کے سامنے کھڑے ہیں، دوڑ رہے ہیں، دل کو اس کے آگے اونڈیل رہے ہیں۔ دعائیں ہیں اور التجائیں، تسبیح ہے اور تحلیل، گناہوں کا اقرار ہے اور توبہ اور استغفار۔

یہ موقع زندگی میں کسی خوش قسمت ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ جو مانگنا ہے مانگ لو۔ جو مقصد ہو طلب کر لو۔ دین کے لئے بھی دنیا کے لئے بھی، اپنے لئے بھی، اوروں کے لئے بھی، کوئی مدعا رہ نہ جائے۔ کوئی آرزو چھوٹ نہ جائے۔ بڑے کریم کا دربار ہے جو یہاں آنیوالوں کو کم سے کم جو چیز دیکر راضی ہوتا ہے وہ جنت ہے۔

لیکن ہائے، ہائے، اس اجتماع میں یہ انفرادیت! بھائیوں سے بھائی خبر تک نہ ہوئے، نہ ایک نے دوسرے کو جانا۔ نہ دل کی راہیں کھلیں۔ نہ آپس کے دکھ درد معلوم ہوئے۔ رشتۂ اخوت کہاں گیا شیرازۂ الفت کیوں ٹوٹا ہوا ہے؟

خطیب جو رسول پاک کے منبر پر کھڑا ہوا وہ بھی کچھ نہ بولا۔ ایک ڈھلا ہوا مصنوعی خطبہ، فصیح و بلیغ، مقفیٰ و مسجع پڑھکر اتر آیا۔ نہ ضروریات ملت کی خبر نہ شناسائی۔ نہ حالات امت پر نظر نہ راہنمائی۔ خالی رسم کی خانہ پری تھی، صرف قافیہ بندی کی شاعرانہ دادطلبی، اور محض بے مغزی کا مظاہرہ!!

ضرورت تھی کہ عرفات میں اقوام و امم کا تعارف ہوتا۔ باہم ملتے جلتے۔ راہ و رسم پیدا کرتے جس سے ساری امت ایک رشتہ میں منسلک ہو جاتی۔ اور یہ دشوار نہ تھا۔ جس جس ملک یا قوم کے لوگ آئے تھے اپنے اپنے میں سے ایک ایک کو چنکر اپنا امیر بنا لیتے۔ یہ امراء مکہ میں باہم ملتے۔ تبادلۂ خیالات کے بعد انہیں میں سے ایک منتخب دماغ ہوتا جو یہاں خطبہ پڑھتا جس میں ملت کی اجتماعی رہبری ہوتی اور کم سے کم ایک سال کا لائحہ عمل۔

منبر ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ انکا رشتہ

ں کے ساتھ ہے کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں کی تہ تک نفوذ کرتی ہیں یہ بمنزلہ برقی
ں کے ہیں جتنے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہونچتی ہے۔ ان سب کا مخزن مبدا بن
ت کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدتہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے قلوب
نور، افسردہ، منتشر اور متفرق ہیں۔ تنظیم کی صورت صرف نصب مرکزیت ہی اور کچھ نہیں۔ کیونکہ
کی طرف ہر فرد متوجہ ہو جاتا ہے جس سے خود بخود ساری قوم منظم ہو جاتی ہے۔ جیسے شمع کہ اس کے
ن ہوتے ہی گھر کی کل چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں۔ افراد یا جماعتوں وغیرہ سے اس کو
ع کرنے میں ہمیشہ ناکامیابی ہوگی۔ کیونکہ یہ الٹا راستہ ہے۔

لفہ | عرفات میں حج سے فراغت ہوگئی۔ جس کام کے لئے آئے تھے وہ کام ہو چکا۔ غروب کے
ت قافلے روانہ ہوگئے اور مشعر حرام کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ حجاج تھکے ماندے بالعموم سو رہے۔ اِلّا
شاء اللہ۔

اے غفلت زدہ کاروان! یہاں ذکر الٰہی کا حکم تھا۔ سونے کیلئے تو زندگی پڑی ہے نہیں تو
ت کی نیند کیا کم پڑی ہے۔ یہ اُس مالک کی یاد کا موقع تھا جس نے ایسا دن دکھایا سب ملکر اسکی
ثنا پڑھتے اور اُس کا شکریہ ادا کرتے۔ تنہا بیٹھ کے ورد اور وظیفہ نہیں۔ کیونکہ یہ انفرادیت ہے اور
ان جمہوریت چاہیئے۔

بان گاہ خلیل | صبح اٹھکر مزدلفہ سے منا میں آگئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں توحید کے پیشوائے اعظم اور
عار کے سرگروہ نے اپنے بیلوٹھے بیٹے کو اللہ کے حکم کے مطابق قربان کرنے کیلئے پیشانی کے بل زمین
لٹا دیا تھا اور چھری نکال چکے تھے کہ آسمانی رحمت نے لپک کر ہاتھ تھام لیا اور کہا بس، تم اپنی طرف
سے سب کچھ کر چکے اور اس کڑے امتحان میں پورے اُترگئے۔

اسی کا فدیہ یہ ذبح عظیم ہے کہ ہر سال دین حنیف کے شیدائی اور ملت ابراہیمی کے فدائی
لوں ذبیحے یہاں اللہ کے نام پر قربان کر کے سنت خلیل کو تازہ کرتے ہیں۔

ربانی | یہ مجمع جو اطراف و اکناف عالم سے آکر جمع ہوا ہے بیت اللہ کا زائر اور اپنے رب کا

مہمان ہے۔ اس لئے اس نے اپنے ان بندوں پر جنکو استطاعت دی ہے یہ فرض عائد کیا ہے کہ ان
مہمانوں کی میزبانی کریں جس کے بدلے میں ان کو اجر اور ثواب ملے گا۔ دور دور کے ذی مقدرت
بھی جو خود نہ حاضر ہوں جانوروں کو قربانی کے لئے بھیجکر اس کار خیر میں حصہ لے سکتے ہیں۔

یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے یعنی اسکی غرض حجاج کی ضیافت ہے نہ کہ محض خونریزی۔
اللہ کا حکم یہی ہے:۔

فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ

یعنی قربانی کو خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدوں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔

قربانی کے بعد حج کی تکمیل اور اس فریضہ سے سبکدوشی ہو جاتی ہے۔ اب کھانا ہے اور کھلانا
اور فرق مراتب کا لحاظ۔ اسوجہ سے مساوات کے لباس جامۂ احرام کی ضرورت نہیں رہی۔ حجاج سر
منڈاتے، بال ترشواتے اور ناخون کاٹتے ہیں اور صاف ستھرے ہو کر اپنے کپڑے پہن لیتے ہیں۔

تین دن تک یہاں مجمع رہتا ہے اور تینوں دن قربانیاں ہوتی ہیں۔ یہی ایام تشریق ہیں۔

صدیوں سے اس قربانی کی جو حالت ہو رہی ہے اس کا بیان تکلیف دہ ہے۔ لاکھوں جانور ذبح
کر کے ڈالدئے جاتے ہیں جنکے کھانے کیلئے گدھ اور گیدڑ بھی نہیں ہوتے۔ آخر ان کو دفن کر دینا پڑتا ہے۔

کاش یہاں بھی تنظیمی شکل ہوتی۔ ہر ہر قوم کے ڈیرے جداگانہ قطعات میں لگتے جو اپنی جماعت
کے اندازہ اور ضرورت کے مطابق قربانیاں کرتے۔ ایک جگہ پکواتے اور ایک ساتھ کھاتے کھلاتے۔
قومیں بھی ایک دوسرے کی مہمانی اور میزبانی کا لطف اٹھاتیں اور باہم الفت و موانست پیدا کرتیں۔

ہر جماعت کے لوگ اپنے ہمراہیوں کو اپنی زبان میں عرفات کا خطبہ سناتے اور سمجھاتے۔ اس
صورت میں جو حاجی وہاں سے آتا وہ ملت کا پیغام اپنی بستی میں لاتا جس سے تمام عالم اسلامی میں
ایک اجتماعی روح پھیل جاتی۔

رمی جمرات | منا میں تین جگہ تین نشانات بنے ہوئے ہیں جو شیطان سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔ ان پر
تینوں دن حجاج کنکریاں مارتے ہیں۔ گویا اس رسم سے اس عدو سے دین پر جو انسان کو فریب دیکر

یل فرمان اور توحید الٰہی سے روکتا ہے تشبیہ کرتے ہیں۔ یہ دستور پیشتر سے چلا آتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو قائم رکھا ہے۔

وداع | تین دن یا کم سے کم دو دن منا میں رہکر مکہ میں آجاتے ہیں اور طواف کرکے حج کے فرائض سے فارغ ہوجاتے ہیں۔ اب کوئی وطن کو پلٹتا ہے کوئی مدینہ شریف کو جاتا ہے اور مجمع منتشر ہونے لگتا ہے۔ اسوقت ایک اجتماع عام کی ضرورت تھی جس میں سب ملکر اپنے رب کا ذکر کرتے۔ مواعظ بھی ہوتے اور خطبات بھی۔ حمد و ثنا کے قصیدے پڑھے جاتے اور شکر کے ترانے گائے جاتے۔ عربی میں بھی۔ عجمی میں بھی۔ ایرانی میں بھی تورانی میں بھی۔ اس کے بعد طواف وداع کرکے اس حرم پاک سے رخصت ہوتے۔

لہ قرین قیاس یہ ہے کہ رمی جمار کی تاریخ عہد ابراہیمی سے نہیں بلکہ اصحاب فیل کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جو کعبہ کو ڈھانے آئے تھے۔ اہل مکہ نے جو اس طاقتور لشکر کے رو در رو مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے ان تینوں جگہوں پر پہاڑ سے ان پر پتھراؤ کئے تھے جیسا کہ "ترمیھم بحجارۃ من سجیل" سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ ترمی کا فاعل بھی وہی مخاطب ہے جو پہلی آیت میں "الم تر" کا فاعل ہے نہ کہ "طیر" جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ لشکر جب عذاب الٰہی سے ہلاک ہوگیا تو اس کی یاد تازہ رکھنے کیلئے حج سے واپسی کے وقت ان مقامات میں رجم کا دستور مقرر ہوگیا۔ اسی طرح ابرہہ کے راہبر ابو رغال ثقفی کی قبر پر بھی جو مکہ اور طائف کے درمیان مقام مغمس میں ہے ہر عرب جو گزرتا ہے رجم کرتا ہے۔

کلامِ اثر

خواجہ درد کے شاگرد اثر کا دیوان ابتک شائع نہیں ہوا۔ مدت سے ہمارے محترم مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کو اسکی تلاش تھی۔ اثر کی ایک مثنوی انجمن کی طرف سے شائع ہو چکی ہے لیکن دیوان دستیاب نہ ہوتا تھا۔ جامعہ کے کتب خانہ میں دیوان اثر کا ایک قلمی نسخہ ہے جسکی نقل انجمن کو دیدی گئی ہے۔ مولوی صاحب کا قصد ہے کہ اور کوئی نسخہ مل جائے تو مقابلہ کر کے اُسے انجمن کی طرف سے شائع کردیں۔ ذیل میں ہم اسی قلمی دیوان سے دو غزلیں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

صرفِ غم ہم نیں[1] نوجوانی کی — واہ کیا خوب زندگانی کی
تیرے داغوں کی اے غمِ اُلفت — خوب ہم نے بھی باغبانی کی
کس کے ہاں تم کرم نہیں کرتے — کبھو اِدھر نہ مہربانی کی
اپنے نزدیک دردِ دل میں کہا — تیرے نزدیک قصہ خوانی کی
ہرزہ گوئی سے مجھکو وہی ہے نجات — ہے گی منت یہ بے زبانی کی
نہیں طاقت کہ دم نکال سکوں — اب یہ نوبت ہے ناتوانی کی

اثر اس حال پہ بھی جیتا ہے
کیا کہوں اس کی سخت جانی کی

اثر کیجے کیا، کدھر جایئے — مگر آپ ہی سے گزر جایئے
کبھو دوستی ہے کبھو دشمنی — تری کون سی بات پہ جایئے
بُرا دل مرے ہاتھ سے لیجئے اور — ستم ہے مجھی سے مُکر جایئے
کئی روز کی زندگانی ہے یاں — بنے جسطرح زیست کر جایئے

اثر ان سلوکوں پہ کیا لطف ہے
پھر اُس بے مروت کے گھر جایئے

---

[1] نے

ماموں جان

(بسلسلہ ماہ نومبر)

چوتھا ایکٹ

وانتشکی کا کمرہ: یہ اُس کا سونے کا بھی کمرہ ہے اور دفتر بھی۔ کھڑکی سے لگی ہوئی ایک میز ہے جس پر حساب کی کتاب اور بے شمار کاغذات کا انبار ہے۔ اس کے بعد ایک لکھنے کی میز، کتابیں رکھنے کی بکس، ترازو وغیرہ۔ پاس ہی ایک چھوٹی میز ہے جس پر استروف کا سامان ہے: رنگ، برش اور نقشہ کھینچنے کی چیزیں۔ اس کے پاس ایک بڑا تھیلا لٹکا ہے۔ ایک قفس جس میں ایک چڑیا بند ہے۔ دیوار پر ایک افریقہ کا نقشہ لٹکا ہے جس کا بظاہر کوئی مصرف نہیں ہے۔ ایک بڑا صوفا جس پر امریکن چمڑہ چڑھا ہوا ہے۔ بائیں طرف ایک دروازہ جو اندر کے کمروں میں کھلتا ہے۔ داہنی طرف ایک دروازہ ہے جو ہال میں کھلتا ہے۔ دروازہ کے قریب، داہنی طرف ایک پائدان بچھا ہے تاکہ کسان اور دیہات سے آنے والے لوگ کمرے کا فرش نہ خراب کریں۔ خزاں کی ایک شام خاموشی۔

تلی گن اور مارینا آمنے سامنے بیٹھے اُون کات رہے ہیں۔

تلی گن: مارینا تیموفیونا! آؤ کام جلد ختم کر دیں۔ ابھی خدا حافظ کہنے یہاں بلائے گا۔ گھوڑے جوتنے کو کہہ دیا گیا ہے۔

مارینا: جلدی کر رہی ہوں، تیزی سے چلانے کی کوشش کرتی ہوں۔ تھوڑی اُون رہ گئی ہے۔

تلی گن: وہ خارکوف جا رہے ہیں۔ وہیں رہیں گے۔

مارینا: اچھا ہے۔

تلی گن: وہ بہت ڈر گئے ہیں۔۔۔ ہیلینا اندریونا کہتی ہیں "میں ایک گھنٹہ یہاں نہیں ٹھہروں گی۔ یہاں سے جلد چلو، جلد! جب ہم خارکوف میں قیام کریں گے۔۔۔ دیکھ لیں"

"شہر کو ذرا گھوم پھر کے دیکھ لیں پھر اپنا سامان منگوالیں گے ......" وہ اپنے ساتھ بہت سامان نہیں لئے جا رہے ہیں۔ ماریتا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قسمت میں نہیں ہے کہ یہاں رہیں۔ اُن کی قسمت میں نہیں ہے ......اللہ کی مرضی یہی ہے۔

ماریتا: یہ اچھا ہے کہ وہ یہاں نہ رہیں۔ ذرا صبح کے جھگڑے اور پستول کی لڑائی کا خیال کرو — خدا کی پناہ یہ حیوانیت سے بدتر ہے!

تلی گن: بے شک۔ ایک ایسا موضوع جس پر آلیواز دوسکی[1] کا قلم جادو رقم جولانیاں دکھائے۔

ماریتا: وہ منظر نہیں ہوتا۔ وہ خوفناک منظر (ایک وقفہ) اب ہم پھر پُرانی طرح رہیں گے، جیسے پہلے رہتے تھے۔ ہم آٹھ بجے ناشتہ کیا کریں گے، ایک بجے دوپہر کا کھانا کھائیں گے، اور سرِشام شب کا کھانا کھالیا کریں گے۔ ہر بات پُرانے طریقہ سے ہوگی جس طریقہ سے ہونی چاہئے، جیسا اور لوگ کرتے ہیں...... جو عیسائیوں کا دستور ہے۔ (ایک آہ سرد کے ساتھ) مدت ہوئی میں نے نوڈلس[2] نہیں چکھے۔ خدا مجھ پر رحم کرے!

تلی گن: ہاں! زمانہ ہوگیا کہ کھانے پر نوڈلس نہیں لائے گئے۔ (ایک وقفہ) ...... آج صبح میں گاؤں سے گزر رہا تھا کہ دوکاندار نے مجھے پکار کر کہا "ارے بے شرم، دوسروں کے ٹکڑوں پر کب تک پڑا رہے گا؟" یہ بات میرے دل پر تیر کی طرح لگی۔

ماریتا: نہیں، پیارے، تم اس کا ذرا اثر نہ لو۔ ہم سب خدا کے ٹکڑوں پر پڑے ہیں۔ اُسی کا دیا کھاتے ہیں۔ اس میں چاہے میں ہوں، یا تم ہو یا سونیا، یا آئورن پطرووچ، کوئی بے کار نہیں رہتا ہم سب محنت کرتے ہیں، کام کرتے ہیں! سب ...... سونیا کہاں ہے؟

---

[1] ایک روسی مصنف۔ مترجم۔

[2] نوڈلن ایک آبی پرندہ ہے جسے روسی شوق سے کھاتے ہیں۔ اس لفظ کے لغوی معنی سادہ لوح کے ہیں اور چونکہ یہ پرندہ نہایت آسانی سے پکڑ لیا جاتا ہے اسلئے اسے یہ نام دیا گیا۔ افسوس کہ مجھے اس پرندہ کا اردو نام نہیں معلوم۔ مترجم۔

لن : باغ میں اب تک بیچاری ڈاکٹر کے ساتھ آٹورن پٹروو چ کو ڈھونڈنے میں لگی ہے۔ انہیں ڈر ہے
یں وہ خودکشی نہ کر لے۔
ینا : اور اُس کا پستول کہاں ہے؟
لن : (چپکے سے) میں نے اُسے کوٹھری میں چھپا دیا ہے!
رینا : (مسکرا کر) خوب!
(باہر سے واَنشکی اور اشروف داخل ہوتے ہیں)
نشکی : مجھے اکیلا چھوڑ دو (مارینا اور تلی گن سے) جاؤ! مجھے اکیلا رہنے دو — خواہ ایک گھنٹہ کے لئے
ں! اپنی نگہبانی میں نہیں برداشت کر سکتا۔
لن : ضرور، ضرور، وانیا۔ (پنجوں کے بل باہر جاتا ہے)
رینا : راج ہنس کہتا ہے، قیں، قاں، قاں! (اپنا اون اکٹھا کرتی ہے اور باہر جاتی ہے)
نشکی : مجھے اکیلا چھوڑ دو!
شروف : بڑی خوشی سے اکیلا چھوڑ دوں گا۔ میں تو کب کا چلا گیا ہوتا لیکن میں پھر کہتا ہوں جب تک
یری چیز نہ واپس کرو گے میں نہیں جاؤں گا۔
نشکی : میں نے تم سے کوئی چیز نہیں لی۔
شروف : میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں مجھے نہ روکو۔ مجھے کب کا چلا جانا چاہئے تھا۔
نشکی : میں نے تم سے کوئی چیز نہیں لی (دونوں بیٹھ جاتے ہیں)
شروف : دیکھو، میں کچھ دیر اور توقف کرتا ہوں، اس کے بعد مجھے معاف کرنا میں زبردستی کروں گا۔ ہم
تمہارے دونوں ہاتھ باندھ دیں گے اور تمہاری تلاشی لیں گے۔ میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔
نشکی : تمہیں اختیار ہے (ایک وقفہ) میں بھی کیسا بیوقوف بنا : دو مرتبہ پستول چلایا اور دونوں
مرتبہ وہ بچ گیا! میں اس کے لئے خود کو بھی معاف نہیں کروں گا۔
شروف : اگر شدید ہی، گولی، بارود وغیرہ سے آپ کو کھیلنا ہے تو بہتر ہے کہ آپ خود اپنے کو نشانہ بنائیں۔

واتسکی: (اسے کاندھے سے ہلا کر) عجیب بات ہے۔ میں نے قتل کا ارادہ کیا اور میں گرفتار نہیں کیا گیا۔ کسی پولیس کو خبر نہیں کی۔ اس کے معنی ہیں کہ مجھے پاگل سمجھا ہے (ایک حماقت کی ہنسی ہنس کے) میں پاگل ہوں لیکن وہ لوگ پاگل نہیں ہیں جو اپنی بھدی موٹی بے وقوفی پر پردہ ڈال لیا کرتے ہیں۔ اپنی کھلی ہوئی بے ذوقی پر پروفیسری کا نقاب ڈالتے ہیں۔ وہ لوگ پاگل نہیں ہیں جو بڈھوں کے ساتھ شادی کرتے ہیں اور انہیں ہر شخص کے سامنے فریب دیتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں اس کا پیار لیتے ہوئے دیکھا! میں نے دیکھا!

اشرف: بے شک، میں نے اس کا پیار لیا۔ لیکن اس سے زیادہ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔

واتسکی: (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) نہیں نہیں، تمام دنیا پاگل ہے کہ تمہیں تمہارے کیے کی سزا نہیں دیتی!

اشرف: بس کرو۔ کیوں پاگل ہوئے ہو؟

واتسکی: اچھا پاگل ہوں۔ میرا کوئی قصور نہیں، مجھے بیوقوفی کی باتیں کرنے کا حق ہے۔

اشرف: کیا بہانہ ڈھونڈا ہے! تم پاگل ہرگز نہیں۔ تم میں یہ کمزوری ہے کہ بہت جلد متاثر ہو جاتے ہو۔ پہلے میں ہر اس شخص کو جو کمزور قلب کا ہو اور جلد اثر لیتا ہو بیمار سمجھتا تھا۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ انسان کے لئے یہ معمولی بات ہے کہ وہ کمزور قلب ہو۔ تم بالکل اور انسانوں کی طرح ہو۔ پاگل نہیں ہو۔

واتسکی: (اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے) میں نادم ہوں! کاش تم اندازہ کر سکتے میں کس قدر نادم ہوں! اس سخت اور تکلیف دہ احساس ندامت سے کسی درد کو نسبت نہیں۔ (افسوس کے ساتھ) کیا کروں؟ کیا کروں؟ (میز پر جھک جاتا ہے) اسے کیسے برداشت کروں؟ میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟

اشرف: کچھ نہ کرو۔

واتسکی: میرے لئے کوئی دوا تجویز کردو! اے میرے اللہ! میں سینتالیس سال کا ہوں۔ اگر میں ساٹھ برس کا ہو کر مروں تو ابھی تیرہ برس مجھے اور زندہ رہنا ہے۔ اُف! اُف! یہ طول حیات! ان تیرہ برسوں کو میں کس طرح گزاروں؟ اس طویل مدت میں کیا کروں؟ ان تیرہ برسوں کا میں کس طرح خاتمہ کروں؟

جانتے ہو...... (اشروف کے ہاتھ کو زور سے پکڑ کر) جانتے ہو! کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں باقی
زندگی کسی نئے طریقے سے گزار سکتا۔ ایک خاموش سنہری صبح آنکھ کھلتی اور ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ ایک
دوسری زندگی ملی ہے پرانا تمام ماضی فراموش ہے۔ صفحۂ یاد سے حرفِ غلط کی طرح منسوخ ہے۔ گویا میرا
ماضی دھوئیں کی طرح پھیل کر غائب ہو گیا۔ (روتا ہے) ایک نئی زندگی شروع کرنا...... آہ! مجھے
بتاؤ اسے کیسے شروع کروں...... کیا شروع کروں......

اشروف: (پریشان ہو کر) چپ رہو! خاموش ہو جاؤ! نئی زندگی! ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے
کوئی اُمید نہیں۔

دانشکی: کیا؟

اشروف: مجھے یقین ہے کوئی امید نہیں۔

دانشکی: خدا کے لئے مجھے کوئی دوا دو۔ میرا علاج کرو (اپنے دل کی طرف اشارہ کر کے) اس جگہ
بڑے سخت درد ہو رہا ہے۔ میرا دل جل رہا ہے۔

اشروف: (زور سے) بس بس! (آہستہ آہستہ) وہ جو ہم سے سو یا دو سو برس بعد رہیں گے اور
ہماری اس بے ذوقی، بے رونقی اور بے لطفی سے زندگی گزارنے پر ہنسیں گے، ہم پر طعنہ زن ہوں گے
۔ وہ، وہ، ہاں وہ شاید خوش رہنے کا کوئی ذریعہ تلاش کر لیں، مگر ہم...... میرے اور تمہارے
لئے ایک اُمید ہے صرف ایک، جب ہم اپنی اپنی قبروں میں سوتے ہوں گے تو شاید شاید ہمیں کوئی
امید افزا، خوش آئند خواب نظر آئے (ایک لمحہ کے سکوت کے بعد) ہاں دوست، سارے ضلع میں صرف
دو پڑھے لکھے، مہذب انسان تھے۔ وہ دونوں تھے جن کی ہر شخص عزت کرتا تھا۔ میں اور تم لیکن
ہاں! کوئی دس سال کے اندر اندر اس زندگی کے طوفان نے اس متعلق آلائش سے بھری جنّے والی
اور زندگی کے بڑھنے نے جلدی کشتیِ حیات کو الٹ دیا اور ہمارے دم و رگ پے تک کو اس نے مسموم
کر دیا اور ہمیں بھی اور لوگوں کی طرح قابلِ نفرت، قابلِ ملامت بنا دیا (زور سے) مگر
تم اپنے مطلب سے یا نکلنے کی کوشش نہ کرو۔ ہم ......

وانشکی : میں نے تم سے کوئی چیز نہیں لی۔
اشرف : تم نے میرے بکس سے مارفیا کی ایک شیشی نکالی ہے (ایک وقفہ) دیکھو۔ اگر تم اپنی زندگی ختم کرنے پر مصر ہو تو جنگل چلے جاؤ اور گولی مار لو۔ لیکن میرا مارفیا مجھے دیدو ورنہ چرچے ہوں گے اور میں بدنام ہوں گی۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں نے تمہیں شیشی دی۔ میرے لئے یہ کیا کم ہے کہ میں تمہاری لاش کا معائنہ کروں گا۔ کیا تم سمجھتے ہو مجھے اس سے تکلیف نہ ہوگی۔

(سونیا آتی ہے)

وانشکی : مجھے اکیلا چھوڑ دو۔
اشرف : (سونیا سے) سونیا الکزنڈریونا، تمہارے ماموں نے میرے دوا کے بکس سے مارفیا کی ایک شیشی نکال لی ہے اور واپس نہیں دیتے۔ ان سے کہو کہ یہ .... واقعی بہت نازیبا حرکت ہے اور میرے پاس ضائع کرنے کو وقت نہیں ہے۔ مجھے جانا ہے۔
سونیا : ماموں جان، آپ نے مارفیا چرایا؟ (ایک وقفہ)
اشرف : انہوں نے ضرور نکالا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔
سونیا : اسے واپس دیدیجئے۔ آخر آپ نے ہم سب کو اس قدر خوفزدہ کیوں کر رکھا ہے؟ (پیارے) ماموں جان دیدیجئے! میں بھی شاید آپ ہی کی طرح زندگی سے بیزار اور تنگ ہوں! لیکن دیکھئے میں صبر کر رہی ہوں اور مایوسی کو راہ نہیں دیتی۔ میں اسے برداشت کر رہی ہوں اور اسے برداشت کرتی جاؤں گی یہاں تک کہ زندگی آپ ختم ہو جائے گی .... آپ کو بھی صبر کرنا چاہئے (ایک وقفہ) اسے واپس دیدیجئے (اُس کے ہاتھ چومتی ہے) پیارے ماموں جان، میرے اچھے ماموں جان! اسے واپس دیدیجئے! (روتی ہے) آپ مہربان اور نیک دل ہیں۔ آپ ہم پر رحم کھائیں گے اور اسے واپس دیدیجئے۔ صبر کیجئے، ماموں جان! — صبر کیجئے!
وانشکی : (میز کی دراز سے شیشی نکالتا ہے اور اُسے اشرف کو دیتا ہے) لو، یہ لو! (سونیا سے) لیکن ہمیں فوراً کام میں لگ جانا چاہئے، جلدی کرو، کوئی کام ...... کام ...... ورنہ مجھے نہیں ......

ے بنیں برداشت ہوگا۔

نیا: ہاں، ہاں، کام۔ اپنے لوگوں کو رخصت کرتے ہی ہم بیٹھ جائیں گے اور کام کریں گے ...... (میز پر
ے ہوئے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر) ہر چیز بے ترتیب ہو رہی ہے۔

رف: (منشی کبس میں رکھتا ہے اور اس کا ڈھکنا بند کرتا ہے) اب میں جا سکتا ہوں۔

(ویلنا داخل ہوتی ہے)

لنا: آڈرن پیٹرووچ! کیا تم یہاں ہو؟ ہم جا رہے ہیں۔ الکزنڈر کے پاس جاؤ۔ وہ تم سے کچھ
نا چاہتے ہیں۔

ونیا: چلے جاؤ، ماموں جان! (وہ منشی کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے) آئیے چلیں۔ آپ کی اور اُن کی صلح
جانا چاہئے۔ یہ ضروری ہے۔

(سونیا اور واتلنسکی جاتے ہیں)

لنا: مَیں جا رہی ہوں۔ (اشروف کو اپنا ہاتھ دیتی ہے) خدا حافظ۔

روف: ابھی سے؟

لنا: گاڑیاں تیار ہیں۔

رف: خدا حافظ۔

لنا: تم نے مجھ سے آج وعدہ کیا تھا کہ چلے جاؤ گے۔

رف: مجھے وعدہ یاد ہے۔ میں ابھی جا رہا ہوں (ایک وقفہ) تم یہاں سے ڈر گئی ہو؟ (اُس کا
تھ لیتا ہے) ایسا بھی کیا ڈر؟

لنا: مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔

رف: بہتر تو یہ تھا کہ تم ٹھہرتیں! کیا کہتی ہو؟ کل میرے ہاں ——

لنا: نہیں! اب جانا طے ہے۔ اور میں تمہیں آزادانہ اور بے خوف ہو کے دیکھ رہی ہوں کہ جانا
طے ہے۔ میں تم سے صرف ایک عنایت کی طلبگار ہوں، مجھے اچھے دل سے یاد کرنا۔ میں جا رہی ہوں

تم میری عزت کرو۔

استروف: مت اٹھو، یہیں رہو، ٹھہر جاؤ۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ٹھہر جاؤ۔ سمجھ لو تمہیں اس دنیا میں کچھ نہیں آتا ہے۔ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ تمہارے دل و دماغ کو مشغول رکھنے کے لئے کوئی کام نہیں ہے اور آج نہیں تو کل تم اپنے جذبات سے شکست کھاؤ گی، جذبات کے تابع ہو گی، یہ ناگزیر ہے اور میں جانتا ہوں یہ شکست بجائے ہارکو یا کرسک میں کہیں واقع ہونے کے یہاں واقع ہو گی، یہاں، قدرت کی گود میں۔۔۔۔۔۔ یہاں جہاں شعریت ہے، جہاں کی خزاں بھی دلنواز اور خوبصورت ہے۔۔۔۔۔۔ یہاں کھیت اور جنگل ہیں۔۔۔۔۔۔ ترگنیف کے انداز میں کہوں تو یہاں قصبات اور آبادیاں ہیں، سبزہ ہی طراوت ہے اور نیم تباہ شدہ مکانات ہیں۔۔۔۔۔۔

ییلینا: تم نرے احمق ہو۔۔۔۔۔۔ میں تم سے خفا ہوں، تاہم میں۔۔۔۔۔۔ تمہیں محبت کے ساتھ یاد کروں گی۔ تم دلچسپ آدمی ہو، تم میں ایک جوہر ذاتی ہے۔ ہم اب کبھی نہ ملیں گے اس لئے ــــ کیوں چھپاؤں؟ ــــ واقعی مجھے تم سے ذرا سی محبت ہو گئی ہے۔ آؤ، ہاتھ ملاؤ اور دوستوں کی طرح جدا ہو۔ میری طرف سے اپنا دل صاف رکھنا۔

استروف: (اس کا ہاتھ دبا کر) ہاں، بہتر ہے کہ تم جاؤ۔۔۔۔۔۔ (خوش خیالی میں) تم ایک محبت کرنے والی، نیک دل، سادہ خاتون ہو تاہم تمہارے پورے وجود کے ساتھ ایک عجیب تخیل وابستہ ہے۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آئیں اور ہم سب جو اس سے پہلے اپنا اپنا کام کرتے تھے، محنت کرتے تھے اور چیزیں تخلیق کرتے تھے، اپنا کام چھوڑ کر، اپنے فرائض کو بھول کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ گرمی بھر ہمیں سوا تمہاری ملاقات اور تمہارے شوہر کے گٹھیا کے علاج کے کوئی کام نہ تھا۔ تم دونوں کی کاہلی ہم میں سے ہر ایک میں سرایت کر گئی ہے۔ مجھے تم نے لبھایا اور پورے ایک مہینے تک میں بیکار رہا اور اس عرصہ میں لوگ بیمار ہوتے اور کسانوں کے مویشی بہت چرتے، نئے تربیت یافتہ پودوں والے باغات میں گھسے اور انہیں پامال کر گئے۔۔۔۔۔۔ اور اسی طرح جہاں جہاں تم اور تمہارے شوہر جائیں گے اپنے ساتھ تباہی، پامالی لیتے جائیں گے۔۔۔۔۔۔ میں مذاق کر رہا ہوں معاف کرنا۔۔۔۔۔۔

مگر تاہم کیا میں غلط کہتا ہوں؟ اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم یہاں ٹھہر جائیں تو تباہی اور پامالی اس سے بھی زیادہ ہوتی۔ میرا کہیں ٹھکانا نہ ہوتا......... اور یہ تمہارے لئے بھی کوئی بہتری کی صورت نہ ہوتی غضب جاؤ۔ یہ گاڑی اب ختم ہے' بہتر!

یلنا: (اُس کی میز سے ایک پنسل لیکر اور جلدی سے اُسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے) میں یہ پنسل تمہاری نشانی کے طور پر لیجاؤں گی۔

اشرف: یہ عجیب راز ہے......... ہم دونوں دوست تھے اور یکدم نہ معلوم کس سبب سے......... اب ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملیں گے۔ یہی دنیا میں ہر چیز کے ساتھ ہے......... اس وقت جو یہاں کوئی نہیں ہے ـــــ اور قبل اس کے کہ ماموں جان گلاب لیکر آئیں ـــــ مجھے اجازت د کہ جدائی کے وقت تمہارا بوسہ لوں......... اجازت ہے؟ (اُس کے رخسار کا بوسہ لیتا ہے) شکر

یلنا: خدا تمہیں خوش رکھے۔ (اِدہر اُدہر دیکھتی ہے) اچھا آؤ! زندگی میں ایک مرتبہ تو تمہیں گلے لگا لوں۔ (اُسے زور سے بھینچتی ہے اور دونوں باری باری جلدی سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں) اب جاتی ہوں ـــــ جاتی ہوں!

اشرف: جلدی کرو اور جاؤ۔ اب جب گاڑی تیار ہے تو چلی ہی جاؤ۔

یلنا: میں سمجھتی ہوں کوئی آرہا ہے (دونوں آہٹ کو سنتے ہیں)

اشرف: خدا حافظ!

(سربریاکف، وونشکی اور ماریا واسیلیونیا ایک کتاب لئے، داخل ہوتے ہیں۔ تلی گن اور سونیا بھی اُ کے پیچھے آتے ہیں)

سربریاکف: (وونشکی سے) گزشتہ را صلوٰۃ۔ جو کچھ گزرا ہے اُس کے بعد سے ان چند گھنٹوں میں میرے دل میں اس قدر خیالات آئے ہیں اور میں نے اس قدر سوچا ہے اور ایسے خیالات اپنے جمع ہیں کہ اگر میں لکھنے پر آؤں تو آیندہ نسلوں کے فائدے کے لئے زندہ رہنے کے فن پر ایک مستقل تصنیف تیار کر سکتا ہوں۔ میں خوشی سے تمہاری معذرت قبول کرتا ہوں اور معافی کرتا ہوں

خدا حافظ!

(وہ اور وانٹسکی ایک دوسرے کا تین مرتبہ بوسہ لیتے ہیں)

وانٹسکی: آپ کو برابر اسی قدر رقم پہونچتی رہے گی جس قدر پہلے پہونچتی تھی۔ سب کام سابق کیطرح ہونگے۔

(ییلنا اینڈریونا سونیا کو گلے لگاتی ہے)

سربریاکوف: (ماریا واسلیو وینا کا ہاتھ چومتا ہے) اماں ....

ماریا: (اُسے چومتے ہوئے) الکزنڈر، اپنی تصویر دوبارہ کھنچوا کر اُس کی ایک نقل مجھے ضرور بھیجدینا۔ تم جانتے ہو میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں۔

تلی گن: خدا حافظ، حضور والا! ہمیں بھول نہ جائے گا!

سربریاکوف: (اپنی بیٹی کو پیار کرتے ہوئے) خدا حافظ....... خدا حافظ، نام بنام خدا حافظ (اشروف سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ کی پُرلطف صحبت کا شکریہ۔ مجھے آپ کے مطمح نظر، آپ کے نکتہ خیال، آپ کے جوش اور آپ کے مقاصد سے کافی دلچسپی و ہمدردی ہے لیکن ایک بڈھے آدمی کو اجازت دیجئے کہ اپنے رخصتانہ پیغام میں ایک ضروری بات آپ سے عرض کرے۔ آپ کو کام اور محنت کرنا چاہئے۔ میرے دوستو! کام اور محنت! (سب کے آگے کمر خم کرتا ہے) میں آپ سب کی خوشی و آسودگی کی دعا کرتا ہوں!

(باہر جاتا ہے اس کے پیچھے ماریا واسلیو وینا اور سونیا جاتی ہیں)

وانٹسکی: (گرمجوشی سے ییلنا اینڈریونا کا ہاتھ چومتا ہے) اللہ تمہارا نگہبان، میری پیاری ہیلن! خدا حافظ، خدا حافظ!....... میرا قصور معاف کردو....... اب ہماری ملاقات نہ ہوگی۔

ییلنا: (متاثر ہوکے) خدا حافظ، میرے پیارے، بہت پیارے آئیوان پیٹرووچ (اس کی پیشانی چومتی ہے اور باہر جاتی ہے۔

اشروف: (تلی گن سے) اُسے مفت خورے! خوب یاد آیا، ذرا اُن سے کہدو میری گاڑی بھی لے آئیں۔

تلی گن : ابھی کہتا ہوں۔ (جاتا ہے)

(صرف اشرف اور وائنشکی رہ جاتے ہیں)

اشرف : (میز پر سے رنگوں کی شیشیاں اٹھا کے انہیں اپنے تھیلے میں رکھتے ہوئے) تم جا کے انہیں رخصت کیوں نہیں کر آتے؟

وائنشکی : انہیں بغیر میرے رخصت کئے ہی جانے دو۔ میں...... میں رخصت نہیں کر سکتا۔ میرے دل پر ایک غبار ہے۔ مجھے جلد ہی اپنے کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی چیز تلاش کرنا چاہئے......

کام ! کام ! (میز پر رکھے ہوئے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے)۔

(ایک وقفہ ، گاڑی کی گھنٹیوں کی آواز آتی ہے)

اشرف : گئے۔ پروفیسر خوش ہے۔ اب وہ نہیں آئے گا۔

ماریا : (داخل ہوتی ہے) گئے۔ (ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور موزہ بنتی ہے)

سونیا : (داخل ہوتی ہے) گئے۔ (اپنے آنسو پونچھتی ہے) خدا خیریت کے ساتھ پہنچائے (اپنے ماموں سے) اچھا ماموں جان، ہمیں کام کرنا چاہئے۔

وائنشکی : کام ، کام ......

سونیا : ایک مدت ہو گئی کہ اس میز پر میں اور آپ ساتھ نہیں بیٹھے (میز پر رکھے ہوئے لمپ کو روشن کرتی ہے) مجھے یقین ہے کہ روشنائی نہیں ہوگی (قلم دان اٹھاتی ہے، کپ بورڈ کی طرف جاتی ہے اور اس میں روشنائی ڈالتی ہے) لیکن میرا دل دکھتا ہے کہ وہ چلے گئے۔

(ماریا واسلیو وینا آہستہ آہستہ کمرے میں آتی ہے)

ماریا : گئے۔ (بیٹھ جاتی ہے اور پڑھنے میں مشغول ہو جاتی ہے)

سونیا : (میز کے پاس بیٹھتی ہے اور حساب کے رجسٹروں کے ورق الٹتی ہے) سب سے پہلے، ماموں جان ہمیں حسابات درست کرنا چاہئے۔ ہم نے حسابات مرتب کرنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ آج پھر کوئی اپنا حساب مانگ رہا تھا اور ہم اسے نہیں بنا سکے۔ آپ بنا دیجئے۔ اگر ایک حساب آپ بنا

کریں گے تو دوسرا ئیں تیار کر دوں گی۔

وانشکی: (لکھتا ہے) "قرچہ......... یہ حساب جناب........" (دونوں خاموشی ہو کتی ہیں)۔

ماریشا: (انگڑائی لے کر) میں تو آرام کرنے جاتی ہوں۔

اشرف: کیسی خاموشی ہے! قلم چوں چوں اور جھینگ چرچر کرتا ہے۔ موسم خوشگوار اور پُرسکون ہے۔ میں نہیں جانا چاہتا (گھنٹیوں کی آواز آتی ہے) میرے گھوڑے تیار ہیں......... میرے دوستو مجھے اب سوائے خدا حافظ کہنے کے کوئی کام نہیں ہے۔ خدا حافظ کہتا ہوں ـــــ اپنی میز کو خدا حافظ کہتا ہوں ـــــ اور چلتا ہوں! (اپنے نقشے تھیلے میں رکھتا ہے)

ماریشا: تمہیں جلدی کاہے کی ہے؟ تم ٹھہر کیوں نہیں جاتے؟

اشرف: جانا ہی بہتر ہے۔

وانشکی: (لکھتا ہے) "دیا گیا مبلغ دو ربل پچھتر کاپک"

(ایک مزدور داخل ہوتا ہے)

مزدور: میخائل لووچ، گھوڑے کس گئے۔

اشرف: میں نے سن لیا (مزدور کو دوائیوں کا بکس، تھیلا، بستر وغیرہ دیتا ہے) لو، یہ لے چلو۔ دیکھو بکس الٹنے نہ پائے۔

مزدور: نہیں حضور۔

اشرف: اچھا اب' (خدا حافظ کہنے جاتا ہے)

سونیا: اب کب آپ سے ملاقات ہوگی؟

اشرف: میرا خیال ہے اگلی گرمیوں سے پہلے نہیں۔ جاڑوں میں ملنے کی کوئی اُمید نہیں......... اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدانخواستہ کوئی بات ہو، میری موجودگی کی ضرورت ہو تو مجھے فوراً اطلاع کرنا میں آجاؤں گا (ہاتھ ملاتا ہے) تمہاری مہمان نوازی، تمہاری مہربانی ـــــ تمہاری تمام عنایتوں کا شکریہ (انا کے پاس جاتا ہے اور اُس کے سر کو چومتا ہے) خدا حافظ، بڑی اماں۔

ئے پیٔے نہیں جا رہے ہو؟

ورت نہیں، اتّا۔

دودکا ایک گلاس پیوگے؟

دی طور پر، شاید۔

(مارینا باہر جاتی ہے)

ہفتہ کے بعد، میرا ایک گھوڑا لنگ کرنے لگا ہے۔ میں نے کل دیکھا جب

لئے جا رہا تھا۔

نال بدلوا دو۔

کر لوہار کے ہاں جانا ہوگا۔ اس سے مفر نہیں (افریقہ کے نقشے تک جاتا ہے اور

تا ہے) میں سمجھتا ہوں کہ اس افریقہ کے اندر اس وقت بڑی خوفناک گرمی

لیا۔

ہی سلئے واپس آتی ہے جس پر دود کا ایک گلاس اور ایک روٹی کی قاش ہے) یہ

(اشرف دود پیتا ہے)

اندرستی کے نام میرے پیارے (کرخم کرتی ہے) اس کے ساتھ کچھ روٹی بھی کھاؤ۔

مجھے یوں ہی پسند ہے۔ اچھا اب، خدا حافظ۔ اللہ آپ سب کو اچھا رکھے۔ مارینا

ر آنے کی ضرورت نہیں۔

تا ہے؛ سونیا ایک موم بتی سلئے اُسے رخصت کرنے جاتی ہے؛ مارینا اپنی آرام

)

۱۷ "دو لیری فردی بھٹی کا تیل بین پاؤنڈ۔ مولہ فردی بھٹی کا تیل پھر

میں بانٹ گیہوں .... (ایک وقفہ)

(گھنٹیوں کی آواز)

مارینا : گیا (ایک وقفہ)

سونیا: واپس آتی ہے اور موم بتی میز پر رکھتی ہے اگیا۔

وانشکی : (لکھتا ہے اور لکھتا ہے) "جملہ میزان .... پندرہ .... پچیس ....."

(سونیا بیٹھ جاتی ہے اور لکھتی ہے)

مارینا : (انگڑائی لیتی ہے) یا اللہ۔ رحم کر!

(تلی گن پنجوں کے بل کمرے میں آتا ہے، دروازے کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ستار کے تار درست کرتا ہے)

وانشکی : (سونیا کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس سے) میری جان، میرا دل دکھ رہا ہے! آہ! تجھے کیسے دکھا دوں میرا دل کیسا دکھ رہا ہے!

سونیا: اس درد کی کوئی دوا نہیں۔ ہمیں یہ زندگی گزارنی پڑے گی! (ایک وقفہ) ہم زندگی گزارے جائیں گے ماموں جان! نہ معلوم کتنی طولانی شامیں اور نہ معلوم کتنے لمبے بے لطف دن اسی طرح آئیں گے اور گزارنے پڑیں گے! ہم اپنی مصیبتوں کو صبر کے ساتھ برداشت کریں گے، جو ہمارے مقدر میں ہے اُس پر شاکر رہیں گے۔ ہم دوسروں کے لئے کام کریں گے، آج اور آج کے بعد بھی اُس وقت تک جبکہ ہم بڈھے اور ناکارہ ہو جائیں گے اور ہمیں کوئی آرام نہ ملے گا، اور جب ہمارا وقت آجائے ہم کسی کی شکایت نہ کریں گے اور چپ چاپ جاکر سو رہیں گے، مر جائیں گے، اور وہاں، قبر والی نگری میں ہم اپنی داستان سنائیں گے کہ ہم نے تکلیفیں اُٹھائی ہیں، آنسو بہائے ہیں، کہ زندگی ہمارے لئے، ایک بارِ گراں تھی اور خدا ہم پر ترس کھائے گا اور آپ کو اور مجھے، ماموں جان، پیارے ماموں جان، ایک زندگی عطا ہوگی جو روشن، خوشگوار اور پُرلطف ہوگی۔ ہم خوشیاں منائیں گے اور اپنی ان تلخیوں کو تبسم کے ساتھ، نرمی کے ساتھ یاد کریں گے — اور ہمیں آرام نصیب ہو

ے یقین ہے، ماموں جان مجھے پورا پورا یقین ہے۔ (گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ سرک کر اُس کی گود
ں پڑجاتی ہے اور اپنا سر اُس کے ہاتھوں میں رکھ دیتی ہے، ایک تھکے درد مند لہجہ میں) ہمیں آرام
ب ہوگا!

(ٹلی گن آہستہ آہستہ ستار بجاتا ہے)

یسا: ہمیں آرام نصیب ہوگا! ہمارے کانوں میں فرشتوں کی آوازیں آئیں گی، ہم ساری کائنات
شنی سے منور دیکھیں گے۔ ہم دنیاوی مصیبت، دنیاوی بدی کو ایک عالمگیر شفقت، ایک ہمہ گیر
ت میں غرق ہوتے دیکھیں گے! اور ہماری زندگی دغدغہ اور وسوسہ سے بری اور خدشوں سے
اد ہوگی۔ ایک بوسۂ محبت کے مثل آسودہ، معصوم اور شیریں ہوگی۔ مجھے یقین ہے، مجھے یقین
ے (ماموں جان کے آنسو اپنے رومال سے پونچھتی ہے) بیچارے، مصیبت کے مارے ماموں جان!
ب رو رہے ہیں (روتی ہے) آپ کو زندگی میں کوئی راحت کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی لیکن
یجیے، ماموں جان، کچھ دن صبر کیجیے۔ ہمیں آرام نصیب ہوگا (اپنی باہیں اُس کے گلے میں
دیتی ہے) ہمیں آرام نصیب ہوگا! (چوکیدار دستک دیتا ہے) ہمیں آرام نصیب ہوگا!

(ٹلی گن آہستہ آہستہ ستار بجاتا ہے، ماریا واسیلوینا اپنی کتاب کے حاشیہ پر نشان لگاتی ہے۔
یا موزہ بنتی ہے)

یسا: ہمیں آرام نصیب ہوگا!

پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔

محنت، موت اور علالت

ایک روایت

مصنفہ

لیو ٹالسٹائے

سنہ ۱۹۰۳ء

جنوبی امریکہ کے باشندوں میں ایک روایت عام ہے۔

وہ کہتے ہیں خدا نے انسانوں کو پہلے پہل ایسا بنایا کہ انہیں کام کی حاجت ہی نہ ہوا انہیں گھر چاہیئے تھے، نہ کپڑے، نہ خوراک۔ سو برس کی عمر تک وہ جیا کرتے تھے، اور بیماری تو ہی نہیں تھے کیا چیز ہوتی ہے۔

تھوڑی مدت بعد جو خدا نے توجہ کی اور دیکھنا چاہا کہ لوگ کیونکر زندگی بسر کر رہے، دیکھا کہ بجائے اپنی زندگی اطمینان و مسرت میں کاٹنے کے انہوں نے ایک دوسرے سے لڑنا کرنا شروع کر دیا تھا، اور ہر شخص کے خود غرض ہونے کی وجہ سے معاملات نے کچھ ایسی صورت کر لی تھی کہ بجائے زندگی سے خوش ہونے کے وہ اب اس پر لعنت بھیجتے تھے۔

پھر خدا نے سوچا "یہ ان کے الگ الگ ہر ایک کے بس اپنے اپنے ہی مطلب کے رہنے کا نتیجہ ہے۔ اور اس صورت حالات کو بدلنے کے لئے خدا نے ایسا انتظام کر دیا کہ ہر ایک ناممکن ہو گیا کہ بن کام کئے زندگی بسر کر سکے۔ بھوک اور سردی سے بچنے کے لئے اب اُن کے ہو گیا کہ گھر تعمیر کریں، اور زمین کھودیں اور اناج اور پھل کاشت کریں اور انہیں جمع کریں

خدا کا خیال تھا "کام ان میں اتفاق پیدا کریگا' بے ایک دوسرے کی مدد کے نہ تو یہ کوئی اوزار بنا سکیں گے، نہ شہتیروں کو تیار کر کے کہیں لے جا سکیں گے، نہ گھر بنا سکیں گے، نہ فصل بو یا کاٹ سکیں گے نہ ہی اپنے اپنے لئے کپڑا بُن یا سی سکیں گے۔

" اسی طریقہ ہی سے اُن کو سمجھ آئے گی کہ جتنا ہی خلوصِ دل سے ملکر یہ کام کریں اتنا ہی زیادہ کما سکتے ہیں، اور اتنی ہی بہتر اُن کی زندگی بسر ہو سکتی ہے' اس سے ان میں اتفاق پیدا ہوگا'

ایک زمانہ اسی حالت میں گزر گیا' اور پھر خدا دیکھنے آیا کہ لوگ کس طرح سے رہ رہے ہیں' اور آیا خوش ہیں یا نہیں۔

لیکن اب کے اُن کی حالت پہلے سے بھی بُری تھی' کام تو وہ مل کے ہی کرتے تھے' سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا' لیکن سارے ملکر نہیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر' اور ہر ٹولی یہی چاہتی تھی کہ دوسری ٹولی سے کام چھین لے' اور وہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہوتے تھے، اور اپنی طاقت اور اپنا وقت لڑائی جھگڑوں میں کھو دیتے تھے' اور ہر ایک کی حالت بُری تھی۔

خدا نے جو دیکھا کہ یہ حالت بھی ٹھیک نہیں تو اُس نے ایسا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا کہ انسان کو اپنی موت کا وقت کبھی معلوم نہ ہو' اور وہ اچانک ہی مر جایا کرے اور اُس نے یہ فیصلہ انسانوں کو سنا دیا۔

خدا کا خیال تھا کہ "ہر ایک جو سمجھے گا کہ موت مجھے اچانک آئے گی تو یہ چند روزہ نفع نقصانوں کی خاطر اپنی اُس زندگی کو جو ان کے حصہ میں آئی ہے برباد نہیں کریں گے۔"

لیکن ایسا بھی نہ ہونے پایا' جب پھر خدا دیکھنے آیا کہ انسان اپنی زندگی کیونکر بسر کر رہے ہیں اُس نے دیکھا کہ جتنی خراب اُن کی زندگی پہلے تھی اتنی ہی اب بھی ہے۔

جو سب سے زیادہ قوی اور توانا واقع ہوئے تھے' انہوں نے اس بات سے فائدہ اُٹھا کر کہ انسان اچانک مر جاتا ہے اُن لوگوں کو جو اُن سے مقابلتہً کمزور تھے دبا لیا تھا' بعض کو تو مار بھی ڈالا تھا' اور بعض کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دی تھیں، جو سب سے قوی اور توانا تھے بالکل کوئی کام نہ کرتے

تھے، اور سستی کی وجہ سے اُن کی طبیعتیں اُچاٹ گئی تھیں، اور جو کمزور تھے انہیں اپنی طاقت
کام کرنا پڑتا تھا، اور آرام کبھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ انسانوں کا ہر گروہ دوسرے گروہوں سے ڈرتا
نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور انسانوں کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ خوشی سے خالی ہو

یہ سب کچھ دیکھ کر، خدا نے حالات سدھارنے کی خاطر اب آخری طریقہ استعمال کرنے
کیا۔ اُس نے ہر قسم کی بیماریاں انسانوں کے ہاں بھیج دیں۔ خدا کا خیال تھا کہ جب انسان
میں ہوں گے کہ ہر ایک کو بیماری لاحق ہو سکے تو یہ سمجھ جائیں گے کہ جو تندرست ہوں انھیں
پر رحم کرنا چاہیئے اور اُن کی مدد کرنی چاہیئے تاکہ اگر وہ خود کبھی بیمار ہو جائیں تو اور لوگ بھی
ہی انکی باری میں ان کی مدد کر سکیں ۔

اور پھر خدا چلا گیا، لیکن پھر جب وہ یہ دیکھنے کے لئے آیا کہ اب جبکہ انسانوں کو بیماریاں لا
ہیں، یہ کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں، تو اُس نے دیکھا کہ اُن کی زندگی پہلے سے بھی بدتر
بیماری جو کہ خدا کا مقصد تھا انسانوں کو ایک کر دے اُن کے مزید تفرقہ کا باعث ہو گئی تھی، جو
اتنے توانا تھے کہ دوسروں پر جبری حکومت کر سکیں، اب اپنی بیماریوں کے ایام میں بھی اُن کو
اپنی خدمت پر مجبور کر رہے تھے، لیکن جب ان کی اپنی باری آتی تھی تو دوسروں کی بیماری
کی خدمت نہ کرتے تھے، اور جن لوگوں کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ دوسروں کا کام کریں اور بیماری میں
خدمت کریں کام کر کر کے ایسے تھک گئے تھے کہ اپنے بیماروں کی تیمارداری کے لئے بھی اُن
کوئی وقت نہ تھا، اور اس لئے مجبوراً انہیں ویسے ہی چھوڑ دیتے تھے، ... اس مقصد سے کہ
کا منظر دولتمند لوگوں کے عیش و عشرت میں مُخل نہ ہو، ایسے گھروں کا انتظام کر دیا گیا تھا جہا
مصیبتیں جھیل جھیل کے آخر مر جائیں، ان لوگوں کی بستیوں سے دور جنکی ہمدردی اُن کی خو
ہو سکتی تھی، اور ایسے لوگوں کے پلے بڑھے جوان کی تیمارداری میں رحم کو بالکل بھول جاتے
ملکوں کے غلام تھے، اور اُن سے صاف اظہار نفرت کر دیتے تھے، علاوہ ازیں لوگ بیمار و
سمجھتے تھے، ڈرتے تھے کہ یہ کہیں ہمیں بھی لاحق نہ ہو جائیں، اس لئے نہ صرف بیمار لوگوں

نے تھے بلکہ ان لوگوں سے بھی بچ بچ کر رہتے تھے جن کا کام بیماروں کی تیمارداری تھا۔

پھر خدا نے اپنے دل میں کہا "اگر اس طریقہ سے بھی انسان نہیں سمجھ سکتے کہ اطمینان اُن کو
ے حاصل ہو سکتا ہے۔ تو وہ مصیبتیں جھیلنے ہی سے یہ بات سیکھیں" اور خدا نے انہیں چھوڑ دیا کہ
اہیں کریں۔

اور جب انسانوں کو اختیار دیدیا گیا تو مدتیں صرف کرنے کے بعد اُن پر یہ بھید کھلا کہ اُنہیں
ں حاصل ہو سکتی ہے اور انہیں اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تھوڑی ہی مدت ہوئی
، کہ ان میں سے بعض بعض کو سمجھ آنے لگی ہے کہ کام بعض کے لئے دن رات کی مصیبت اور
ں کے لئے جان جوکھوں کی غلامی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ایک مشترکہ اور دل خوش کن مشغلہ ہونا
ہئے جو سب انسانوں میں اتحاد پیدا کرے، انہیں سمجھ آنے لگی ہے کہ جب موت ہر وقت ہمارے
ر کھڑی رہتی ہے تو ہر ایک انسان کا مناسب مشغلہ یہی ہو سکتا ہے کہ زندگی کے جو سال اور
ٹے اور منٹ اُس کے حصے میں آئے ہیں، اتحاد اور محبت سے گزارے، انکو سمجھ آنے لگی ہے کہ
ری بجائے اس کے کہ وہ لوگوں میں تفرقہ پیدا کرے، اُن کے باہمی اتحاد کا ایک ذریعہ ہونی
ہیئے۔

تنقید و تبصرہ

پیغام صلح ۔ نورس ۔ اجمل ۔ مونس

رسائل

پیغام صلح "کا آخری نبی نمبر" | مدینہ کے تاجدار حضرت آقائے نامدار سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک ...م دنیا کے لئے ایک مستقل اور صحیح شاہراہ عمل اور ہدایت کامل ہے' اس لئے اُسے زیادہ سے زیادہ اور ...سے بہتر انداز میں شائع کرنا مخلوق خدا کی زبردست خدمت ہے ۔

جہاں خود اہل اسلام کے اسلام اور ایمان کی صحت و تقویت کے لئے' وہ بے خطا نسخہ ہے' وہاں ...ن ہٹ دھرموں اور بے دینوں کے لئے بھی تازیانۂ عبرت و بصیرت' جو اسلام کی بہتر سے بہتر حقانیت ...ے درگذر کر کے اپنی مخالفت اور اسلام سے اپنے عناد قلبی کا مرکز صرف حضرت ہادی برحق صلی اللہ ...یہ وسلم کی ذات اقدس پر قائم کر چکے ہیں' اس لئے کہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ حضور کی سیرت ہی وہ چیز ...ہے جس نے بڑے بڑوں کے کفر توڑ کے رکھ دئے ۔

روشن خیال یورپ اس حقیقت کی تہ بہت پہلے پا چکا تھا اور وہاں کے اہل قلم اور ہمارے ...دوست نما دشمنوں نے اس سیل رحمت کا بے سود دفاع شروع کر دیا تھا ۔ ویسے بھی یورپ سے آج ...جماعت اور ہر متنفس غیر معلوم اور غیر محسوس طریقہ پر متاثر ہے ۔ اور یورپ ہی کی تقلید میں یہی فتنہ اب ...ہندوستان میں رواج پا رہا ہے اور بڑے افسوس کی بات ہے اور ہمارا یہ قوم کی ایک کثیر جماعت سے ...ہیں شکایت کا موقعہ ہے کہ وہ اپنے عقاید و خیالات کا پرچار' خلاف اصول و قاعدہ ہا سے نبی صلی اللہ ...وسلم پر گندے سے گندے حملے کرنا ہی سمجھے ہوئے ہیں ۔

اس اعتبار سے بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے صاحب علم و فہم اہل قلم حضرات اس طرف خاص

توجہ فرمائیں اور قومی جرائد کا یہ مذہبی فرض ہے کہ اُن کے رشحات کو بہتر اسلوب اور کثیر تعداد میں شائع اور رائج کریں۔ اُس کے بعد "اللہ جسے چاہے ہدایت بخشے اور جسے چاہے گمراہ کرے"

بڑی خوشی کی بات ہے ہمارے قومی مجبوں نے اس طرف کافی توجہ شروع کی ہے، انہی میں سے ایک "پیغام صلح" بھی ہے، جو ویسے بھی عموماً اسلام اور پیغمبر اسلام کی سیرۃ پر نہایت مفید، کارآمد اور ہدایت و بصیرت افروز مقالات شائع کرتا رہتا ہے۔ اس کے "آخری نبی نمبر" کا تقریباً ہر مضمون پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے لائق ہے جسے مسلمانوں کے علاوہ ہر اُس شخص کو پڑھنا چاہیئے جسے حقیقت و معرفت کی تلاش ہو۔

انجمن احمدیہ کی یہ خدمت جو خالص اسلام اور حضرت داعی اسلام خاتم انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کے متعلق ہے عرصہ سے جاری ہے اور یقیناً قابلِ توجہ ہے۔

سالانہ چندہ ۶ئے، اس خاص نمبر کی قیمت درج نہیں، غالباً مفت مل جائیگا۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر "پیغام صلح" لاہور

(۱۰۱م)

نورس | یہ اورنگ آباد کالج کا دوماہی رسالہ ہے جس کا جدید سلسلہ اب تقریباً ایک سال کے بعد پھر شروع ہوا ہے اور یہ دیکھکر بے انتہا مسرت ہوئی کہ رسالہ ٹائپ میں چھپتا ہے۔ مضامین کا معیار اچھا خاصا ہے۔ نومبر و دسمبر ۱۹۴۳ء کا رسالہ ہمارے پیش نظر ہے جسمیں مولوی احمد حسین صاحب کا مضمون "اسباب قحط ہندوستان" خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ سالانہ چندہ درج نہیں

ملنے کا پتہ:۔ اورنگ آباد کالج، اورنگ آباد (دکن)

اجمل | معین الدین حارث صاحب بی۔ اے (جامعہ) نے مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم و مغفور کی یادگار میں دو مہینے ہوئے یہ روزنامہ بمبئی سے جاری کیا ہے۔ [illegible] سائز کے ۴ صفحوں پر شائع ہوتا ہے۔ "اجمل" ایک کٹر قومی پرچہ ہے اور اس لئے وطن پرست طبقہ کی امداد کا مستحق ہے۔

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ دو ماہ کی قلیل مدت میں پرچہ کی اشاعت ایک ہزار سے متجاوز ہو گئی ہے
ث صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ چونکہ پرچہ صرف چار صفحوں پر شائع ہوتا ہے اس لئے زیادہ جلی اور
لی سرخیاں نہ دیا کریں۔ اس سے اخبار میں کافی جگہ بیکار ضائع ہوتی ہے۔ نیز بمبئی کی مقامی خبریں
دنیا کی خبروں کا نچوڑ جو وہ "ایک نظر میں سب کچھ" کے عنوان سے شائع کرتے ہیں ابھی کافی
یہ کا محتاج ہے۔ مقامی خبروں کے لئے نصف صفحہ اور "ایک نظر میں سب کچھ" کے لئے کم از کم
یک صفحہ کا وہ تمام حصہ ہونا چاہئے جیسی خبریں دیجاتی ہیں۔

ہمارے خیال میں خبریں بھی بہت تفصیل سے دینا ضروری نہیں۔ اسوقت ۲ دسمبر کا پرچہ
رے سامنے ہے۔ لکھنؤ میں سائمن کمیشن کے جلوس کے سلسلہ میں پنڈت جواہر لال پر جو حملہ ہوا
کی تفصیل اس پرچہ میں ۳ کالم سے زیادہ پر دی گئی ہے۔ لیڈنگ آرٹیکل عموماً ایک ڈیڑھ کالم کا ہوا
ہے۔ اگر یہ بالکل بند کر دیا جائے یا کبھی کبھی بہت ضروری مسائل پر ہوا کرے تو بہتر ہوگا۔ "اجمل"
سائز چونکہ چھوٹا ہے اور تعداد صفحات صرف چار۔ اس لئے یہ ضروری باتیں نظرانداز کرنیکے لائق نہیں۔

حارث صاحب چونکہ جامعہ کے ایک عزیز طالب علم رہ چکے ہیں اس لئے انکے اخبار سے
لو خاص دلچسپی ہے اور اسی بنا پر بلا تکلف بعض تبدیلیاں تجویز کر دیگئیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ "اجمل"
ی کرے اور حارث صاحب اس کے ذریعہ ملک کی بہترین خدمت کرکے "جامعہ" کا نام روشن کریں۔

س | ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء سے یہ رسالہ زیر ادارت جناب حفیظ اللہ صاحب دانش گوجرانوالہ سے
ری ہوا ہے۔ جسکا افتتاحی نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔ رسالہ نہایت خراب چھپا ہے۔ اور کاغذ
اچھا نہیں۔ البتہ ٹائٹل بہت خوبصورت ہے۔ اس رسالہ کے اجرا کا مقصد افسانوں کے ذریعہ
قوم کی ذہنی۔ اخلاقی اور معاشرتی ترقی مقصود ہے۔ مضامین تمام تر عام دلچسپی کے ہیں۔
ملنے کا پتہ منشی دانش گوجرانوالہ (۸ر)

کتب

تذکار سلف - اُردو قاعدہ - جواہر سخن - سرکار کا دربار - موسیقی امجد

تذکار سلف | ضیار احمد صاحب ضیا - ایم - اے - ناشر مجالس ادبیہ انٹرمیڈیٹ کالج علی گڈھ - سائز $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۳۲ صفحے قیمت ۴ر

عہدِ اسلامی کے قرونِ اولیٰ میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ ایک شخص نے عدل، ملّا پاسِ عہد اور ایمانداری کے سامنے اپنا اور اپنے عزیز و اقارب کا خیال نہ کیا - روزانہ کی زندگی کے یہی وہ واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ پچھلے لوگ ہم سے کتنے بہتر تھے - اِن واقعات کا محفوظ رکھنا اور انہیں بہتر سے بہتر طریقہ پر نمایاں اور بیان کرنا ہماری حیاتِ ملی کے لیئے ازبس ضروری ہے جناب ضیا نے مولانا شبلی کے طرز میں بعض واقعات نظم کیئے ہیں - جو ایک مفید کام ہے - "عہد سلف کا ایک زرّیں صفحہ" اور "اسوۂ حسین" اس مجموعہ کی نمایاں ترین نظمیں ہیں - جناب ضیار کا اگر یہ شوق جاری رہا تو توقع ہے کہ اُن کی نظموں میں دلکشی اور اسلوب بیان کی عمدگی بھی پیدا ہو جائیگی جو اس مجموعہ میں کمتر پائی جاتی ہے -

---

اُردو کا قاعدہ | مرتبہ .... ناشر قومی کتب خانہ - ریلوے روڈ - لاہور - سائز $\frac{20\times26}{16}$ - حجم ۲۰ صفحے - قیمت ۱ر

یہ قاعدہ بہت دبیز کاغذ پر چھاپا گیا ہے - ا - خ ، د - غ ، ف - ے ، تک علیحدہ علیحدہ تین حصّوں میں اسباق ہیں - ہر سبق کے بعد حروف شناخت کرنے کی مشق ہے - قاعدہ کو جدید اُصول پر نہیں لکھا گیا ہے - یہاں تک کہ مرکبات کا بھی وہی پُرانا طریقہ اختیار کیا ہے - آج کل سہل بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے - بہرحال جو قاعدے عموماً رائج ہیں اُن سے قاعدہ اِس لیئے ضرور بہتر ہے کہ اس کا کاغذ ایسا نہیں ہے جسے بچے آسانی سے پھاڑ سکیں -

---

ہرِ سخن | ازمولوی محمد عبدالمقیت صاحب شمس ثمیوی - ناشر جناب شمس ثمیوی - ثمی - ڈاکخانہ فتوحہ
ع پٹنہ - سائز ۲۲×۱۸/۱۶ حجم ۱۴۸ صفحے - قیمت ایک روپیہ -

قواعد تذکیر و تانیث پر یہ مفید کتاب ہے - الفاظ کے مذکر یا مؤنث ہونیکی سند مشاہیر شعراء
کلام سے پیش کی ہے - کتاب کے ایک تہائی حصہ میں متروکات و محاورات کی بھی بحث ہے اور
ن شعراء کے کلام کا انتخاب مع مختصر حالات درج ہے - جواہر سخن ٹکسٹ بک کمیٹی صوبہ بہار و
یسہ کی منظور شدہ کتاب ہے - یقیناً شمس صاحب نے اسکی تالیف پر بڑی محنت کی ہے -
ابلِ داد ہے - (ج)

کار کا دربار | مؤلفہ احمد الیاس مجیبی صاحب ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی - سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۵۲
حات - قیمت ایک روپیہ -

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات امتِ اسلامیہ کے لیئے اُسوۂ حسنہ ہیں
تعلیمی نصاب کا لازمی جزو رکھنا اور بچپن ہی سے اسکی تعلیم دینا چاہیئے تھا - مگر مدت ہائے دراز
مسلمانانِ ہند نے اس سے غفلت کی - اردو میں اس قسم کی پہلی کتاب جو تعلیمی غرض کو پیش نظر
ہ کر لکھی گئی وہ ہماری سیرۃ الرسول ہے جسکو ہندوستان کے طول و عرض میں بہت سے
لامی مدارس نے اپنے نصاب میں داخل کیا - اور بعض صوبوں میں اسکے ترجمے کر لیئے گئے
اسکولوں میں پڑھائے جانے لگے -

مگر یہ کتاب نویں اور دسویں جماعتوں کے طلبہ کے لیئے تھی - اور ضرورت یہ ہے کہ اس
ہ پہلے ہی سے اُن کو اس اُسوۂ حسنہ سے روشناس کیا جائے - اس غرض کے لیئے خواجہ
الحی صاحب فاروقی نے ہمارے رسول نامی کتاب لکھی جو مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع کی
- اب یہ کتاب یعنی "سرکار کا دربار" تعلیمی نقطۂ نظر سے نہایت پُرجوش اور مفید
ہ کے کارپرداز مولوی الیاس احمد صاحب مجیبی نے ترتیب دی ہے - بچوں کی ذہنیت کو

پیش نظر رکھ کر اُن کے مناسب حال واقعات لکھے ہیں ۔ زبان سلیس رکھی ہے ۔ اور چھپائی لکھائی سب موزوں ۔ اسمیں کہیں کہیں بعض بعض خامیاں تھیں ۔ وہ بھی اب نکالدی گئی ہیں امید ہے کہ اسکا آئندہ اڈیشن بالکل ٹھیک ہوگا ۔ بچوں کی دلچسپی کے لیئے مسجد حرم اور مسجد نبو کی تصویریں بھی دی گئی ہیں ۔ اور سرورق خوبصورت رکھا گیا ہے ۔ جامعہ کے نصاب تعا میں ابتدائی چہارم میں یہ کتاب پڑھائی بھی جاتی ہے ۔ دیگر اسلامی اسکولوں میں بھی چوتھی پانچویں جماعتوں کے دینی نصاب میں اسکو رکھنا نہایت مفید ہوگا ۔

وصلی ابجد | منشی عبدالمجید صاحب پروین رقم لوہاری منڈی لاہور نے ا ۔ ب کی پوری جلی اور خوشخط لکھ کر دبیز آرٹ پیپر پر چھپوا کر شائع کی ہے ۔ حروف نہایت خوشنما ۔ روشن ۔ اور دیدہ زیب ہیں ۔ اور چھپائی کی صفائی بھی نظر فریب ، خاصکر جدول اور سیاہی بہت د ہے ۔ وسط میں خود پروین رقم صاحب کا فوٹو بھی ہے ۔

یہ وصلی علاوہ اس کے کہ خوشخطی سیکھنے والوں کے لیئے نمونہ کا کام دے ۔ کمرے کی زین اور آرائش کے لیئے بھی عمدہ چیز ہے ۔ اور تصویروں سے کم دلکش نہیں ہے ۔

اصول فن کے لحاظ سے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مختلف اساتذہ کا اتباع کیا جاتا ہے ۔ دہلی والے میر پنجہ کش ، اور مولوی رضی الدین ، اور منشی عبدالغنی کے ہیں ۔ لکھنؤ میں حافظ نورالله ، محمد ابراہیم اور علی رضا ، نیز آخری خطاط منشی شمس الدین اعجاز رقم کا اسکول ہے ۔ اور لاہور میں امام ویردی کی شاگردی ہے ۔ منشی عبدالمجید صا کی یہ وصلی فی الجملہ آزاد ہے ۔ اور کسی خاص اسکول کی نقل نہیں معلوم ہوتی ۔ قیمت فی کا تعمیم فائدہ کے لحاظ سے اگر اسکی قیمت کم رکھی جاتی تو بہتر ہوتا ۔

(ع ۔ م)

شذرات

۱۹۲۸ء ختم ہو گیا۔ ہم اس پرچہ میں اپنے ناظرین کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ گزشتہ سال جامعہ اور اہلِ جامعہ کے لیے بڑی مشکلوں اور پریشانیوں کا سال رہا۔ مسیح الملک مرحوم کے انتقال سے گویا جامعہ کا اصلی بانی اور سرپرست دنیا سے اٹھ گیا۔ اور ان کا یہ عزیز ترین روحانی بچہ یتیم ہو گیا۔ اکابر قوم نے مسیح الملک کی یادگار قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور قدرتاً جامعہ ملیہ ہی کو اپنے مرحوم قائد کی بہترین یادگار تسلیم کیا کہ اسی کے قیام و استحکام کی کوشش میں مرحوم نے اپنی عمر کے آخری ایام صرف کیئے تھے۔ اور یہی وہ اہم تعمیری کام تھا جسکی تکمیل کی تمنا لیکر وہ اس دنیا سے سدھارے تھے۔

مرحوم کو جو دلی تعلق جامعہ اور جامعہ والوں سے تھا اُسکا علم کچھ جامعہ کے کارکنوں کو ہی تھا۔ لیکن اہلِ جامعہ کو اسکا اقرار ہے کہ قوم کے تمام ذمہ دار اشخاص، اور ملک کے تمام ممتاز صحیفوں نے اس گہرے تعلق کو تسلیم کیا اور اس فیصلہ سے کہ جامعہ کو مسیح الملک کی یادگار بنایا جائے یقیناً مرحوم کے مقاصد اور ارادوں کے صحیح علم کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی اور ڈاکٹر انصاری نے اجمل جامعہ فنڈ کے لیے جو اپیل ملک سے کیا اُسکے مؤیدین کی فہرست اٹھا کر دیکھیے تو مشکل ہی سے ہندوستان کے مشہور قومی رسائل و اخبارات کے قائل دیکھیے، شاید ہی کوئی ہو جس نے اس اپیل کی تائید میں ایک بار نہیں بار بار نہ لکھا ہو۔ لیکن یہ اپیل شروع ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا۔ اور اس سال کے ختم ہونے میں ایک مہینہ باقی تھا کہ اسوقت تک ہماری احسان ناشناس قوم نے اپنے اس محسن اور خادم الارقائد کی یادگار قائم کرنے کے لیے بمشکل چار ہزار روپے جمع کر پایا تھا! ہماری قومی زندگی کے انتشار، بادوں کی بہتات اور اصلی کام سے بیزاری کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔

لیکن وسط نومبر میں مولنا ابوالکلام صاحب آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سلسلہ میں مدراس کا سفر کریں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ ان کے ہمراہ تھے۔ کچھ عرصہ پہلے سے مدراس کے مشہور اہلِ دل سیٹھ جمال محمد صاحب سے خط و کتابت ہو رہی تھی، تجارت کی عام حالت خراب ہونے کے باعث سیٹھ صاحب کا خیال تھا کہ ابھی اس کام کو ملتوی رکھا جائے۔ لیکن یہ خیال کرکے کہ آخر دنیا کا کام کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا ہے انہوں نے جامعہ کے وفد کو دعوت دیدی۔ اور ۱۹ر نومبر کو یہ وفد مدراس پہنچا۔

مدراس میں متعدد جلسے ہوئے جسمیں اراکین وفد نے جامعہ کے مقاصد سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ مدراس کے مسلمانوں نے کام کی اہمیت کو سمجھ کر اور جس نام کو قائم رکھنے کے لیے روپیہ جمع ہو رہا تھا اسکی عزت و احترام کا خیال کرکے خوب اچھی طرح دل کھول کر مدد کی۔ شہر کے معزز ہندو حضرات نے بھی چندہ میں شرکت فرمائی۔ اور وفد کو اس دورہ میں تقریباً ۴۵ ہزار روپیہ وصول ہوگیا۔

اہلِ جامعہ خصوصیت کے ساتھ مولنا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے شکرگزار ہیں کہ باوجود دیگر سیاسی مصروفیتوں کے انہوں نے جامعہ کے کام اور اپنے مرحوم رفیق کی یادگار قائم کرنے کے لیے وقت نکالا۔ مولانا نے تو باوجود ناسازی طبع کے یہ سفر اختیار فرمایا۔ اور سفر کی زحمتوں کے باعث مدراس میں طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہوگئی۔ جسکی وجہ سے کئی روز تک مدراس میں اور رکنا پڑا۔ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمارے ان دونوں مخدوموں کی سعی کو مشکور فرمایا۔ کاش چند اور اکابر اُمت بھی اس اہم تعمیری کام کے استحکام کے لیے کچھ وقت نکال سکیں۔

یہ سچ ہے کہ وقتی ضرورتیں ہماری بیکار کو ایک لمحہ کی فرصت نہیں دیتیں۔ اور ہر منٹ اپنے

ائل اپنے ساتھ لاتا اور ان مسائل کے حل کا فوراً طالب ہوتا ہے۔ ہر لمحہ کا کام بیشک اہمیت رکھتا ہے
ن قومی زندگی کے معمار جہاں جزوی لیپ پوت کے فرائض سے غافل نہیں ہو سکتے وہاں یہ کب درست
کہ نئی تعمیروں کی بنیادوں کی استواری و استحکام کی طرف سے بیخبر ہو جائیں۔ سچ یہ ہے کہ وقتی
م فوراً اپنا وقتی انعام بھی پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن "عاجلہ" اور "آخرہ" کے فرق کو جانتے
لے ان انعاموں کی حقیقت سے ناآشنا نہیں ہوتے۔ اور آنی و وقتی جلسوں اور جلوسوں کے
اب نظر کی خاطر "سعی مشکور" کے انعام ربانی کو کم حقیقت نہیں جانتے۔ اور جب فوری لیکن
پائدار اور وقتی ـــ کامیابی کی پرستش کرنے والے ان صبر و استقامت سے کام کرنے والوں سے
ں فوری نتائج کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ شاعر کا یہ قول انہیں سنا دیتے ہیں کہ :۔

"بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے"

اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ کاش ہماری قوم میں وقتی نتائج کے مقابلہ میں مستقل
امیابی کی زیادہ قدر ہو۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جو مستقبل کی پائدار بنیادیں رکھنے کے
شوار کام کے لیئے اپنے اندر کافی "ایمان" بھی رکھتے ہوں۔ اور اسکے لیئے "سعی" کرنے کو
ں آمادہ ہوں۔ "لیڈروں" کی ہم میں کمی نہیں، کچھ "بستی بسانے والے" درکار ہیں۔

مدراس کے وفد کی کامیابی کے سلسلہ میں ہمارا فرض ہے کہ سیٹھ جمال محمد صاحب کا اہل جامعہ
کی طرف سے دلی شکریہ ادا کریں۔ سیٹھ صاحب موصوف مسیح الملک کے خاص احباب میں تھے۔ اور
رحوم کی زندگی ہی میں طویل خط و کتابت اور تبادلۂ خیالات کے بعد آپ جامعہ کے دل سے حامی ہو گئے
تھے۔ آپ مسلمانان مدراس بلکہ مسلمانان ہند کے لیئے ایک مایۂ ناز ہستی ہیں۔ خدا نے دولت دی ہے
ور وہ چیز جو اکثر دولت والوں کو نہیں ملتی، یعنی اچھا سمجھنے والا دماغ بھی عطا کیا ہے۔ اور پھر وہ
ہستی بھی ارزانی کی ہے جو ان دونوں سے کیا جیے۔ یعنی درد مند دل۔
صوبۂ مدراس میں متعدد خیراتی کام آپ کی فیاضی سے چل رہے ہیں۔ جنمیں خصوصیت

کے ساتھ مدرسہ جمالیہ اور جمالیہ ہوسٹل قابل ذکر ہیں ۔ اول الذکر قدیم اور جدید علوم دونوں سے کما حقہ واقفیت رکھنے والے علماء پیدا کرنے کے لیے قائم ہے ۔ اور اپنے مقاصد میں جامعہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے ۔ موخر الذکر اس لیے ہے کہ سرکاری کالجوں کے طلبہ کو یہاں وظیفہ دیکر رکھا جائے ۔ اور انہیں اُن کے کالجوں کی تعلیم کے علاوہ علوم دین سے بھی واقف کیا جائے ۔ اِن دونوں کاموں پر ہی سیٹھ صاحب تقریباً ۳ ہزار روپے ماہوار صرف کر رہے ہیں ۔ جامعہ کے وفد کو آپ نے فی الحال چار ہزار روپیہ عنایت فرمائے ۔ اور سو روپے ماہوار مستقلاً مقرر کیے ۔ اور آئندہ بھی امداد کے لیے اپنی پوری آمادگی ظاہر فرمائی ۔ ہم سیٹھ جمال محمد صاحب ۔ سیٹھ سی عبدالکریم صاحب اور دیگر مدراسی معاونین جامعہ کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں ۔

شاید ناظرین کو معلوم ہوگا کہ گزشتہ سال شروع دسمبر میں دنیا کے عیسائی طلبہ کی جمعیتہ کا اجلاس شہر میسور میں منعقد ہوا تھا ۔ اِس جمعیتہ اجلاس میں دنیا کے تقریباً تمام ممالک سے طلبہ کی تحریکوں کے نمائندے آئے تھے ۔ اجلاس کا افتتاح مہاراجہ صاحب میسور نے ایک نہایت ہی مؤثر تقریر سے کیا اور پھر دو ہفتہ تک اسکی کارروائی جاری رہی ۔

اجلاس میں علاوہ مختلف ممالک کے نمائندوں کے ہندوستان کے مختلف مذاہب کے نمائندے بھی بلائے گئے تھے ۔ ہندوؤں کی طرف سے کلکتہ یونیورسٹی کے اُستاد فلسفہ پروفیسر رادھا کرشن کو بلایا گیا تھا جو عنقریب اکسفورڈ یونیورسٹی میں معلم فلسفہ کی حیثیت سے جانے والے ہیں مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کو دعوت دی گئی تھی ہمیں یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ شیخ الجامعہ کی تقریر کو اس کانفرنس میں بہت پسند کیا گیا اور کانفرنس کے نمائندوں نے جنکے ذہن میں اسلام اور اسکی تعلیمات کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں تھیں اپنے استعجاب اور تشکر کا اظہار کیا ۔ اور اکثر نے کہا کہ " اگر یہ اسلام ہے تو ہم بھی مسلمان ہیں " البتہ یہ بات اکثر کی سمجھ میں نہ آئی کہ مسلمان آخر اپنے پیغمبر کو خدا کیوں نہیں مانتے !

عیسائیت کی سب سے بڑی فضیلت انکی نظر میں یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام (نعوذ باللہ) خدا ہیں !!

اس اجلاس کے سلسلہ میں ہمیں جو کاغذات ملے ہیں ان سے بہت دلچسپ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں جو ہمارے لیئے عبرت کا سامان ہو۔ مختلف ممالک کے نمائندوں نے اپنے اپنے دیس کے طالبعلموں کی مذہبی و معاشرتی حالت پر رپورٹیں پیش کیں۔ اور طلبہ میں عیسائی تعلیم کے پھیلانے اور عیسائی اخلاق کی ترغیب دینے کے وسائل کی طرف توجہ دلائی۔ اس جمعیۃ کے اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کے تقریباً ۱۸ لاکھ اعلیٰ تعلیم پانے والوں میں سے تقریباً سوا دو لاکھ یعنی ۱۲ ½ فیصدی اس میں شامل ہو چکے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تقریباً ۷ ½ لاکھ اعلیٰ تعلیم پانے والوں میں سے تو ۴۰ فیصدی اسمیں شامل ہیں۔ تیس ممالک میں اس جمعیۃ کی شاخیں ہیں۔ اور مختلف قومی شاخوں کے نمائندوں کا اجلاس ہر دوسرے سال ہوتا ہے۔ یہ دو سالہ جلسے مختلف ممالک میں ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ پہلا جلسہ تھا۔

اس جمعیۃ کے مختلف کاموں میں ہم ایک کام کی طرف اپنے ناظرین کی توجہ خاص طور پر منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ یعنی پردیسی اور نادار طلبہ کو مدد پہنچانے اور انہیں اپنی مدد آپ کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے متعلق انتظام کی طرف۔ انشاء اللہ ہم کسی آئندہ اشاعت میں ان انتظامات کے متعلق ایک مفصل مضمون ہدیۂ ناظرین کرینگے۔

نومبر کے رسالہ جامعہ میں ڈاکٹر برکت علی قریشی کے مضمون میں حضرت [illegible] کے متعلق جو ایک فقرہ [illegible] جس کی اشاعت [illegible] رسالہ [illegible] - چنانچہ مولوی عبد[illegible] صاحب [illegible] نے بھی اپنے [illegible] میں اسکا شکوہ کیا۔

[illegible] کہ [illegible] رسالہ جامعہ نے [illegible] ڈاکٹر صاحب کے اعتقاد

پر یہ چھاپ دیا۔ چھپنے کے بعد جب رسالہ مجھ کو ملا اور میں نے پڑھا تو مجھے بہت قلق ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اسکی معذرت لکھوں گا کہ اس اثنا میں دریا بادی صاحب نے بھی اسکی طرف توجہ مبذول کرائی جسکا میں شکر گزار ہوں۔

مولوی صاحب موصوف نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسے مضامین شائع ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں نہیں ہیں جہاں لا یسمعون فیھا لغواً ولا تاثیما الا قیلا سلاما سلاما کا دور ہو۔ بلکہ عالم ناسوت میں ہیں جہاں رحمانی کلام کے شیطانی آوازیں بھی سنی پڑتی ہیں۔ ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذیً کثیرا۔ افراد کے لیئے گو یہ آواز کیسی ہی تلخ ہو لیکن قومی حافظہ کا تو اس سے خالی رہنا مناسب نہیں۔ رہی تردید تو اسکی تردید کرکے خود تردید کی اہمیت کھونی ہے۔

مولوی دریا بادی صاحب نے اپنے اس شکوہ میں قدیمی طنزیہ انداز میں میرے متعلق جو تعریض کی ہے وہ افسوس ہے کہ نہ اُن کی شان کے مطابق ہے نہ میری۔ مگر اس موقعہ پر رسالہ کے مدیر ہونے کی حیثیت سے اس غلطی پر خواہ وہ کسی کے تسامح سے ہوئی ہو اپنی مسٔولیت کا احساس کرتے ہوئے میں درگزر سے کام لیتا ہوں۔

یہ معذرت میں لکھ چکا تھا کہ رسالہ معارف موصول ہوا۔ اسمیں بھی اس غلطی پر توجہ کی گئی ہے اور بسیط شذرہ لکھا گیا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ دونوں نقادوں نے اس سے دو مختلف فائدے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مُدیر سچ کو میرے ساتھ عناد ہے، اس لیئے انہوں نے اس موقعہ پر میرے عقیدہ کی توہین سے اپنے ایمان کی پختگی کا اظہار کرکے قلب کی تشفی فرمائی ہے اور مدیر معارف نے اس ایک غلطی پر مغربی یونیورسٹی کے تمام عربی تعلیم یافتوں کے جملہ تحقیق "Research" ضبط کرکے مشرقی مدارس کے طلبہ کے حوالے کر دیئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرادارت

مولنا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سیّد عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ فروری ۱۹۲۹ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

۲۷

ایک تصویر

لیونارڈو دا ونچی (Leonardo da Vinci) نے اُس زمانہ میں ایک تصویر بنائی تھی جب اطالیہ میں قدیم یونان کا اثر اپنے عروج پر تھا، ملک کے تمام روشن ضمیر لوگ یونانی جمالیات کے بادۂ کہنہ سے مست تھے، اور یونانی تخیل گہرے سے گہرے جذبات تک سرایت کر گیا تھا۔ لیونارڈو بھی انہیں روشن ضمیر لوگوں میں سے تھا، لیکن اُس کی اپنی شخصیت اسقدر مضبوط اور تخلیقی تھی کہ وہ دوسروں کی طرح یونانی تہذیب میں فنا نہیں ہو گیا تھا، بلکہ اُس کے اثرات کو اپنے جذبات کے قوی اور دل کے وسیع بنانے کے لئے استعمال کیا۔ دوسرے یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے عشق میں کلیسا اور حضرت عیسیٰؑ اور دین عیسوی کو بھول گئے، لیونارڈو نے یونانی جمال کو عیسائی اطاعت اور ایثار کے رنگ میں رنگا، اور ایک تصویر بنائی جو صدائے مستانہ بھی ہے اور فلسفہ بھی، عشق بھی اور مذہب بھی۔

یہ تصویر حضرت یوحنا کی ہے، ایک ولی جو مسیح سے کچھ پہلے پیدا ہوئے۔ وہ جنگلوں اور ویرانوں میں بسر کرتے تھے، اور جو لوگ ان کے پاس جاتے ان سے کہتے تھے کہ "میں مسیح نہیں، اس کا پیش رو ہوں۔ میں مسیح کے قدم چھونے کے لائق بھی نہیں۔ میں صرف اُس کا راستہ صاف کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے نالہ کو ہوش سے سنو، اور بپتسمہ کے پانی سے اپنے گناہ پاک کرو۔" اعتقاد اور انکسار، جوش اور خود فراموشی کا بہتر نمونہ عیسائی مذہبی تاریخ میں مشکل سے ملے گا۔ اسی واسطے لیونارڈو نے انہیں اپنی تصویر کے لئے سب سے مناسب سمجھا۔ انہیں صحرا میں دکھایا، ان کے چہرہ کو روشن کیا، ہاتھ میں صلیب دی۔ یہ سب عیسائی روایات کی پیروی تھی، باقی جو کچھ تصویر میں ہے وہ یونانی جمالیات کا جوہر ہے۔

یونانی تصور انسانیت کے معموں میں اس قدر مشغول، اس کی عظمت کا اتنا دلدادہ تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کی کافی تعظیم اور توصیف نہ کر سکا۔ یونانی شہری ریاستوں کی طرح یونان کا عالم بالا

بھی مختلف دیوتاؤں میں تقسیم تھا۔ ہر دیوتا آزاد، خود مختار، بے نیاز انسان کے اُس جذبہ یا انسانی زندگی کے اُس پہلو پر حکومت کرتا تھا جو اُس کے سپرد تھا۔ منروا عقل و دانش کی دیوی تھی، وینس حسن کی، کیپڑ اور پولکس حیا زرانی کے، ڈایونیسس انگور اور شراب کا۔

ڈایونیسس اُس وقت یاد کیا جاتا تھا جب دنیاوی امور سے فراغت ہو، اور خوشی اور مستی مقصود ہو۔ ڈایونیسس کا مندر صحرا اور چشمے اور درختوں میں چھپی ہوئی وادیاں اور پہاڑیاں تھیں، وہیں اس کے پجاری جا کر اُسے یاد کرتے، اور اپنی مجلس اور شراب خواری میں شریک ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ عوام کے تصور میں ڈایونیسس خوش مزاجی، موٹے ہونٹوں، مخمور آنکھوں اور نمایاں توند کا مجموعہ تھا اور اُسے پجاری بھی ایسے ہی ملتے تھے۔ مگر وہ قوم جو مشرقی شاعری میں ناصح اور واعظ کے نام سے مشہور ہے اسے کب روا رکھ سکتی تھی۔ اُس نے طے کیا کہ ڈایونیسس کی مستی شراب کی نہیں، شراب اور شراب خواری محض تمثیلیں ہیں۔ ڈایونیسس ایک سنجیدہ، خوش اخلاق بلکہ نہایت درجہ پارسا دیوتا ہے۔ اُس کا نشہ روحانی ہے اس لئے اس کی پرستش میں شراب خواری بغرض مستی و مدہوشی ہرگز جائز نہیں۔ یونانی آرٹسٹ کو نہ عوام کی پیروی منظور تھی نہ اخلاقی رہنماؤں کی۔ اُس نے ڈایونیسس کو ایک خوبصورت مرد کی شکل دی، ایسا جیسے خوش مذاق اور سنجیدہ لوگ اپنی عیش و طرب کی مجلسوں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اُسکی آنکھوں میں ایسا خمار پیدا کیا جو روحانیت اور شراب خواری دونوں کا حیرت انگیز مجموعہ تھا......

یونانی تخیل کا نیا دور جس میں افلاطون کی شخصیت نے نشوونما پائی تھی، نہ پُرانے دیوتاؤں کو انکی دیرینہ شکل میں پیدا کر سکا، نہ ان کے پجاریوں میں جوش اور فطری عقیدت۔ ظاہر تھا کہ اگر عیسائی عقیدت نے ان کو اپنے زیر سایہ نہ لیا، یا وہ اپنی صورت دنیا اور تہذیب کی نئی شکل کے مطابق نہ بدل سکے، تو دونوں کو سخت نقصان ہوگا۔ عیسائی مذہب ایک خاص لحاظ سے لوگوں کی فطرت میں سرایت کر چکا تھا لیکن اُس میں تعمیر اور تخلیق کی طاقت اتنی کم رہ گئی تھی کہ پُرانے دیوتاؤں نے اُس کے قلعہ کو آسانی سے فتح کر لیا۔ ان دونوں میں مطابقت کرنا، اس مطابقت سے ایک نئے مذہب کا کام نکالنا

اس زمانہ کی تہذیب کا سب سے اہم مسئلہ تھا جس تصویر کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کوشش کا ایک نہایت کامیاب نمونہ ہے۔

حضرت یوحنا ایک صحرا میں رونق افروز ہیں، ہاتھ میں صلیب، کندھے پر کملی ہے مگر صحرا پرستی کالی گھٹا کی طرح چھائی ہے، یہاں تک کہ ان کی صلیب کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، ان کے سامنے ایک کھوہ ہے ویسا ہی جس میں ڈایونسیس کے پجاری اپنی مجلسیں کیا کرتے تھے۔ حضرت یوحنا کے بال لٹوں میں بندھے ہیں، انکا جسم ویسا ہی سفید اور نرم اور خوبصورت، ان کا انداز ویسا ہی مستانہ، ان کی آنکھوں میں وہی ذومعنی خمار ہے جو ڈایونسیس کے لئے مخصوص تھا، لیکن وہ صلیب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، گویا یہ ساری دنیا، یہ خمار، یہ حسن، سب اُسی کا کرشمہ ہیں۔ اسی اشارہ میں تصویر کا سارا فلسفہ ہے۔

کلیسا نے شروع سے نفس کشی اور رہبانیت کو روحانی ترقی اور نجات کا اکیلا صحیح اور سیدھا راستہ قرار دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا جوہر یہی مانا گیا تھا کہ انسان حیوانی خواہشات، دنیا کی مسرتوں سے دل کو ہٹائے، اور نفس کو روح پر قربان کرے۔ صدیوں کی عادت سے لوگوں کی ذہنیت میں پارسائی کے یہی معنی اور اُس کی یہی صورت مقرر ہو گئی تھی۔ لیکن صدیوں کے تجربہ نے انہیں کچھ مایوس بھی کر دیا۔ رہبانیت اور زہد کی دشواریوں نے ان کی ہمت پست کر دی۔ جب انہوں نے قدیم یونان کا رنگ دیکھا، یونانی انسانیت کی عظمت کا انہیں احساس ہوا، تو وہ اپنے مذہبی عقیدوں اور اصولوں سے منہ پھیر کر اس نئے دین کے معتقد ہو گئے۔ اس دین میں جذبات اور نفسی خواہشات کے نشو و نما کا موقعہ تو ضرور تھا لیکن اخلاق کی جڑ کٹ جاتی تھی۔ کچھ لوگ کلیسا کے ڈھرے پر چلنا چاہتے تھے اور انہوں نے یونان اور یونانی تہذیب کو شیطان کا جال بتایا، اور قوم کو آگاہی دی کہ اگر فلاح کی خواہش ہو تو اس سے محفوظ رہیں، زیادہ تر بغیر اپنے عقیدوں کا اعلان کئے ہوئے دونوں تہذیبوں سے لطف یا فائدہ اُٹھاتے رہے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے مذہب کو بالائے طاق رکھا اور یونانی دیویوں پر عاشق ہو کر نفس کی لگام ہاتھ سے چھوڑ دی۔

ان میں سے کوئی طریقہ بالکل صحیح نہیں تھا مگر کسی فریق کی نظر میں اتنی وسعت نہ تھی کہ حضرت عیسیٰ اور قدیم یونان کو ایک ہی دل میں جگہ دے سکے۔ لیونارڈو داونچی نے عقیدے اور کارناموں کے یہ معجزہ بھی دکھایا۔ یوحنا کی تصویر میں صلیب پر فوراً نظر جمتی ہے، انکی ظاہری ہستی پارسائی اور ایثار کا پیغام دیتی ہے، لیکن تصویر پر یہ بھی صاف لکھا ہے:

من ایں نے چوں مغان دو پشیں
زچشم مست ساقی وام کردم

حسن پرستی اور پارسائی کی عداوت صرف عیسائی مذہب کی خصوصیت نہیں۔ یہ عداوت ہر مذہب، ہر ادب، ہر دل میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جو اس زمانہ سے جب انسان میں اخلاق اور مذہب کا احساس پیدا ہوا ابھی تک جاری ہے، اور اُس کا انجام ابھی تک کچھ نہیں نکلا۔ حسن پرستی نے عموماً لوگوں کو ورغلایا ہے، برباد کیا ہے، پارسائی نے اکثر اُن کی برسوں کی جانکنی کا کوئی صلا نہیں دیا۔ دونوں فریق میں ایسے افراد ہیں جو اپنی تمناؤں کی ہکیبی اپنی آرزوؤں کی نا اُمیدی کا اعتراف کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو مخالفین پر حملہ آور ہو کر عام توجہ انکی کمزوریوں کی طرف منتقل کراتے ہیں، کہ اُن کی اپنی خامیاں چھپی رہیں۔ اس جھگڑے کا فیصلہ ہر شخص صرف اپنے لئے کر سکتا ہے، اس لئے کہ اس کے سوا اور کوئی اُس کی طبیعت کو اسقدر نہیں سمجھ سکتا جتنا اس امر کے قطعی فیصلہ کے لئے ضروری ہے۔ ہمارا مقصد بھی واعظ اور رند کے درمیان صلح کرانا نہیں ہے بلکہ وہ سلسلۂ خیالات بیان کرنا جو لیونارڈو داونچی کی تصویر میں پوشیدہ ہے اور اس کو دیکھنے سے ہم پر ایکبارگی ایک عجیب سانشہ پیدا کر دیتا ہے۔

لیونارڈو نے براہ راست یہ نہیں ظاہر کیا ہے کہ جمال یا جمالیات انسان کو منزل مقصود پہ پہنچاتے ہیں۔ اُس کی تصویر ایک عاشقانہ یا صوفیانہ شعر نہیں ہے۔ حضرت یوحنا کو ڈایونیسس کا لباس پہنا کر اس نے ڈایونیسس یا اُس کے پجاریوں کی عزت افزائی نہیں کرنا چاہی ہے، اگر ہم اس کے مطلب کو تعلیمی شکل دینا چاہیں تو اُس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلے گا۔ دنیا عموماً سمجھتی ہے کہ زندگی

کا لطف حسن اور نفس پرستی میں ملتا ہے، اور پارسا بننے کے لیے جو ایثار کرنا ہوتا ہے وہ زندگی کو بالکل بے لطف اور ویران کر دیتا ہے۔ لیو نارڈ و نے ایسے لوگوں کو حقیقت سمجھانے کیلئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے، اور اس کا دعویٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا جوہر ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو "مے مردافگن" کا حریف بننا چاہتا ہے، اور حسن لازوال کی دیدار کا آرزومند ہے، اُسے چاہئے کہ ایثار اور محبت میں حضرت عیسیٰ کا پیرو بنے، اسی طرح جیسے حضرت یوحنا تھے۔ جس قدر وہ اس راستہ پر سفر کریگا اُس کا ذوق بڑھتا رہیگا، "ہمت رندانہ" اپنے کرشمے دکھائیگی اور اُس پر ایسی مستی چھائے گی جو صرف دار اور صلیب پر چڑھنے سے اتر سکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں ماہرین نفسیات نے یہ دریافت کیا ہے کہ تمام جذبات دراصل صرف جنس کی مختلف شکلیں ہیں، جن میں ظاہر ہے کہ روحانیت، مذہب بھی شامل ہیں۔ مذہبی جوش، چاہے وہ زہد کی صورت اختیار کرے، چاہے قلندری کی، صرف جنسی ضبط اور اور پرہیز کا نتیجہ ہے، اور اس میں اور کوئی بڑا بھید نہیں۔ معمولی انسان شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، اپنے پیشے اور دوسری دلچسپیوں میں اپنی قوت ضائع کرتے ہیں۔ اگر وہ بجائے اس کے زاہد یا قلندر یا مذہبی رہنما بنجائیں اور جنسی جذبات کی پوری قوت محفوظ رکھیں تو وہ بھی عقیدت اور روحانیت کے وہی معجزے دکھا سکتے ہیں جنہوں نے چند شخصیتوں کو مشہور کر دیا ہے۔

سائنس کی تعلیم سے قطع نظر کرنا یا بلا سائنس داں ہوئے اُس کے نظریوں کی تردید کرنا خطرناک ہے، لیکن اگر ہم اس نظریہ میں سے مادیت کی بو نکال دیں تو اُس کی صحت کا اقرار کرنے میں کوئی بے ادبی نہیں، اور بزرگوں کی بزرگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ضبط نفس کی ساری مصلحت یہی ہے کہ اُس سے انسان کی فطری قوت ضائع نہ ہو، اور ارادہ سے جس طرف حاجت ہو، قوت منتقل کر دی جائے۔ جو شخص اپنے جنسی جذبات حیوانی رغبتوں سے پاک رکھتا ہے وہ بے حس نہیں ہو جاتا، اسکے جذبات خود کو دیا تربیت کے بعد اپنے لئے کوئی اور راستہ نکال لیتے ہیں۔ شہوت محبت بن جاتی ہے، محبت ایثار، عشق کا انجام شادی اور بال بچے یا رنگیلے شعر نہیں ہوتے، نظر ہوس کا پیغام نہیں

بتی۔ اور جب یہ ضبط بالکل فطری ہو جائے، اور انسان اس نئی کیفیت میں نشو و نما پانے لگے تو حسن اُسے اپنا پوشیدہ
از بتا دیتا ہے، عشق میں اُسے آزادی کی لذت ملتی ہے اور ہر تکلیف میں اُس کیلئے عیش کا سامان ہوتا ہے۔
یونانی تہذیب جمالیات کے اس پہلو اور ضبط نفس کی لذت سے بخوبی واقف تھی! افلاطون نے جمال اور حق کو
ائی کا درجہ دیا ہے، اور حسن پرستی کی، جسکا ہر جگہ اور ہمیشہ چرچا رہتا ہے، عین بد مذاقی بھی ثابت کی ہے۔ جمال کا احساس
ر نفس پر قابو رکھنا اسکے نزدیک انسانیت کی شرط ہیں۔ لیکن یہ کسی طرح سے نہیں کہا جا سکتا کہ یونانی دل اسقدر
لتے کہ وہ اس تعلیم کے تمام لوازمات پورے کر سکیں، اور ایک فلسفیانہ نظریے سے یہ امید نہیں کیجا سکتی کہ وہ مذہبی
عقیدے کا کام دے۔ یونانی انسانیت کا یہی ایک کرشمہ ہے کہ اسنے بغیر کسی پختہ مذہب کی مدد کے اخلاق اور تہذیب
بں اسقدر بلند رتبہ حاصل کیا۔ بہرحال عیسائی رہنماؤں کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اخلاق کی بنیاد صرف جمالیات
ا صحیح تعلیم مقرر کریں۔ انکا تصور کمزور تھا، وہ اسی منطق کے قائل تھے جسپر دنیا چلتی ہے۔ انہوں نے جسم کو بذات
دہوس پرور پایا، اور اُسی تکلیف پہونچانے کیلئے نئے نئے طریقے سوچے، ضبط نفس کو ناکافی سمجھ کر روحانی نشو و
ما کیلئے نفس کشی لازم کی گویا ارادہ کیا بلند پروازی کا اور شہ پر کاٹ دئیے۔ اسکا انجام یہ ہوا کہ ملت کیلئے اُن کی
یروی دشوار ہو گئی اور انکی آبرو اس لئے بچ رہی کہ انسان اپنے عیب کامیابی سے چھپا سکتا ہے۔
اس تنگ نظر "ہیچ مدانے برخود پیچیدہ" تہذیب میں جب یونانی انسانیت کے راز فاش ہوئے تو اودہم
مچ گیا۔ عام زندگی میں کسی قسم کا توازن یا اعتدال ناممکن ہو گیا، اور اُسی جسم نے جو صدیوں سے ہلاک ہو رہا تھا
لدے بدلہ لیا۔ لیونارڈو دا ونچی نے یہ سمجھ لیا کہ انسانی زندگی میں ایک بہت عظیم الشان انقلاب ہونیوالا
ہے، اور اس نے اپنے طرز پہ رہبری بھی کی۔ اُس کے تصورات نے ان تمام منزلوں کی سیر کرائی جو یونانی
نسانیت طے کر چکی تھی، مگر اس نے ایک قدم آگے بھی رکھا۔ یونانی انسان کے پاس ضبط نفس کی رغبت
لانے کیلئے کوئی روحانی آرزو نہیں تھی، نہ کوئی رہنما جو اُس کی کیفیتوں سے واقف ہو۔ عیسائی تہذیب کا
ہر ایک صاحب دل کی سرگزشت تھی، ایک دل کا افسانہ، جسکے سمجھنے کیلئے اُس میں کافی وسعت نہ
ی۔ لیونارڈو دا ونچی نے یہ دیکھ کر رند کے ہاتھ میں صلیب دی، مذہب میں نشہ پیدا کیا اور عشق
پختہ کار بنا دیا۔

اگر میں واعظ ہوتا ؟

عنوان بالا سے ۴ جنوری [illegible]ء کے ڈیلی ٹیلیگراف میں برٹرنڈرسل کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا ترجمہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے - برٹرنڈرسل کے اس مضمون میں ہندوستان کے قومی ماہرین تعلیم کے لئے غور و فکر کا کافی مواد موجود ہے جو بچوں کو بید مار کر ڈرا دھمکا کر (اور یہ رسم ہمارے سارے ہی مدارس میں ہے) کچھ کراتا، ان کی آئندہ زندگی کے بعض خطرناک عیبوں کے پیدا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اچھا ہو اگر ہماری آزاد قومی تعلیم ایسے افراد پیدا کرنے کی کوشش کرے جو ان عیبوں سے بمقابلہ دوسروں کے زیادہ پاک ہوں۔

یوسف

اگر میری جان لی جا رہی ہو اور اُس وقت مجھے صرف ۲ منٹ اپنی آخری الوداعی تقریر کے لئے دئے جائیں تو میں کیا کہوں گا ؟

اُس وقت ضرورت ہوگی کہ میں سادگی اور اختصار سے کام لوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اُس وقت ایک بات پر سب سے زیادہ زور دوں گا اور وہ بات ہوگی انسانی دل سے ڈر دور کرنے کی اہمیت میرا خیال یہ نہیں کہ انسانیت اس طرح مکمل کیجا سکتی ہے۔ کچھ بھی کیوں نہ کیا جائے کوئی نہ کوئی خرابی ضرور باقی رہے گی۔ لیکن بہت سے عیب جو ہمارے نوجوانوں میں ہوتے ہیں انکی وجہ وہ تعلیم کی غلطیاں ہیں جنکا تدارک ممکن ہے۔ ان غلطیوں میں سب سے اہم دل میں ڈر پیدا کرنا ہے۔

والدین، مُلّا اور حکومتیں اس بات میں مایوس ہوچکی ہیں کہ عقلِ انسانی کی اپیل سے اپنا رعب داب قائم رکھ سکیں۔ انہیں کمینے ڈرپوک غلام بنانا پسند ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ ڈر کے ذریعہ کوئی اچھی بات حاصل کیجا سکتی ہے۔ میرا اعتقاد یہ ہے کہ اس طریقہ سے جو وفاداری حاصل کیجاتی ہے اس کا نہ حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے۔ ڈر پر، بہ حیثیت ایک اجتماعی قوت کے دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ وہ جو ڈراتے ہیں

انپر بڑا اثر اور وہ جو ڈرتے ہیں انپر۔ دونوں اہم ہیں اگرچہ آخرالذکر زیادہ اہم ہیں۔

شروع میں انہیں لیجئے جو ڈراتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بے رحم اور دوسروں کو دبانے کے خوگر ہو جائیں۔ اُن میں اختلاف گوارا کرنے اور دلیل سننے کی تاب نہیں رہتی۔ ایسی کوئی حجت جو یہ بتاتی ہو کہ وہ اپنا رعب و داب غلط طریقہ پر استعمال کر رہے ہیں انہیں سننا گوارا نہیں۔ وہ اُن لوگوں کو ترجیح دینے لگتے ہیں جو بے اصولے ہیں اور جن میں اپنی ذاتی عزت کا احساس نہیں (دراصل) وہ خود ڈر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ انہیں اسکا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اپنے اسی رعب و داب کو نہ کھو بیٹھیں جو بے انصافی پر مبنی ہے۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اُنکے ماتحت، واجبی طور پر، اظہار خفگی نہ کریں۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں دنیا زیادہ سمجھدار نہ ہو جائے۔ ان خطروں کے باعث وہ اپنی بے رحمی کو بڑھاتے ہیں اور بے رحمی کی ہر زیادتی سے (انکے دلوں میں) بدلوں کا خوف بڑھتا ہے۔ غرضکہ اس طرح یہ ایک چکر ہے جو ظلم اور ڈر کی برائیوں کے تعلق کو اور زیادہ گہرا کر دیتا ہے۔

ڈر کا اثر اُن پر جو ڈرتے ہیں اور بھی زیادہ برا پڑتا ہے۔ ڈروں کی مختلف قسمیں ہیں۔ انمیں جسمانی ڈر جسے روایتاً سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، سب سے کم نقصان دہ ہے۔ اخلاقی اور ذہنی ڈر بہت زیادہ بڑے ہیں۔ ہر ڈر تھوڑا بہت غصہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ جس سے ڈر ہوتا ہے اس پر غصہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے اسکا اظہار ظلم کی صورت میں کمزور پر ہوتا ہے۔ جس طرح اہل قوت کے دل میں ظلم سے ڈر پیدا ہوتا ہے بالکل اُسی طرح اُنکے غلاموں کے دلوں میں ڈر سے ظلم پیدا ہوتا ہے۔

اجتماعی ناپسندیدگی کا ڈر، موجودہ دنیا میں، کمینے پن اور نامہربانی کے بڑے سببوں میں سے ہے۔ لوگ (اس) اجتماعی ناپسندیدگی کے اظہار سے اس لئے محفوظ ہوتے ہیں کہ وہ خود اس کے ڈر سے دب چکے ہیں۔ جب آدمی اپنے پڑوسیوں کی اچھی رائے حاصل کرنے کے لئے کچھ قربانی کرتا ہے تو اُسے بڑا غصہ آتا ہے جب اور کوئی ویسی ہی قربانی کرنے سے انکار کرے۔ وہ ایک خوفناک اخلاقی بن جاتا ہے۔ اور باہمت گناہگار کو سزا دینے کی ٹھان لیتا ہے۔ اُن گناہگاروں میں جو اجتماعی ناپسندیدگی کے سزایافتہ ہیں، وہ سب شامل ہیں، جو ریاکار ہیں، وہ سب جن کے پاس نئے خیالات ہیں جلدی

طور پر خالص سائنٹفک نہ سہی او وہ سب جو اپنے گروہ سے زیادہ وسیع، کم سخت گیر اخلاق پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے اجتماعی ناپسندیدگی کا ڈر پیدا کرنا بڑی خطرناک بات ہے۔ اجتماعی تعاون خود اپنی خوشی اور عقل کے مطابق ہونا چاہئے نہ کہ ہر فرد کی (جماعت کے آگے) ڈرپوک پنے سے تسلیم۔

ڈر کے بُرے اثرات میں سب سے زیادہ بُرا اثر یہ ہے کہ اس سے حماقت پیدا ہوتی ہے۔ عقل کے لئے ایک ذہنی بے خوفی ضروری ہے۔ اس کے لئے ذہنی آزادی درکار ہے اور ذہنی آزادی وہاں مشکل ہی سے ملے گی جہاں اجتماعی آزادی نہیں۔ اس لئے وہ جماعتیں جو اجتماعی ربط پر بہت زور دیتی ہیں، ضرور ہے کہ احمق انسانوں پر مشتمل ہوں۔ اس لئے وہ لازمی طور پر نہ اجتماعی ترقی کر سکیں گی نہ علمی۔ جوشیلے سے جوشیلا حقوق نسواں کا مدعی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ عورتوں نے ابتک بمقابلہ مردوں کے بہت کم ذہنی آزادی کا ثبوت دیا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ بمقابلہ مردوں کے "اخلاق خوف" کے ماتحت سختی سے رہی ہیں۔

میں ان سے کانپتا ہوں جنکا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسانی روح اور انسانی ذہن کو زنجیروں میں رکھیں۔ میں اس (فہرست میں) پُروہتوں، مدرسوں، ۹۰ فیصدی مجسٹریٹوں اور ججوں، اور ان میں سے اکثروں کو جنہوں نے سخت ظاہری اخلاقی معیاروں پر پابندی سے عمل پیرا ہو کر جماعت میں عزت حاصل کی ہے، شامل کرتا ہوں۔ یہ مختلف انسانی طبقے، الگ الگ طریقوں سے، اجتماعی ناپسندیدگی یا تعزیرات کے ذریعہ ان دعوؤں میں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں ہر صاف گو محقق مشتبہ سمجھتا ہے اور جنہیں اعداد و شمار کا ہر طالب علم اجتماعی طور پر نقصان دہ خیال کرتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ کہا جائیگا کہ نوجوان اس وقت تک نیک نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ان غلط دعوؤں میں یقین نہ رکھیں۔ یہ عجیب انداز ہے اور یہ دو منطقی مغالطوں پر مبنی ہے پہلے یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ "عمل صالح" ایک ایسی بات ہے جس کی تائید میں کوئی عقلی دلیل نہیں دی جا سکتی دوسرے یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ خلاف عقل اور جھوٹی دلیلیں اس کے لئے کافی ہیں کہ ان کے ذریعہ

بمقابلہ وہ اختیار کرایا جاسکے جس کی تائید میں مسلمہ طور پر کوئی عقلی وجہ نہیں ۔

عقلی چلن سکھانا واقعی مشکل ہے۔ لیکن یقیناً وہ عقلی طریقہ سے سکھانا بمقابلہ خلاف عقل طریقوں کے سکھانے کے زیادہ آسان ہے۔ ایک بچے کو یہ بات فرض کرنے کا عادی بنا دیجئے کہ جو آپ اُس سے کہتے ہیں اس کے لئے اچھی دلیلیں موجود ہیں۔ جہاں کہیں وہ اس امر کی تصدیق کرسکے اُسے کرنے دیجئے۔ اُسے اُس وقت تک کچھ نہ کہئے جب تک آپ خود کسی بات کی سچائی میں یقین نہ رکھتے ہوں اس کی سائنٹفک اسپرٹ کی نشوونما کیجئے تاکہ جب کبھی ہوسکے وہ آپ کے دعووں کی تصدیق کرسکے۔ اس طرح آپ ایک ایسا انسان پیدا کرینگے جو صاحب عقل ہوگا۔ یہ بات انکے لئے ناممکن ہے جن کی پرورش گناہ کے اس تخیل پر ہوئی ہے جو جبری مذہبی امتناع پر مبنی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عاقل انسان اس سارے اخلاقی آئین کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جو کلیسا نے رائج کئے ہیں، تو اس آئین کی مٹی پلید ہے۔

ڈروں کی ایک اور قسم ہے جہاں خطرہ واقعی موجود ہے لیکن جسے کافی ہوشیاری سے دور کیا جاسکتا ہے۔ اس کی سیدھی سادی مثالیں جسمانی خطرے ہیں۔ مثلاً وہ خطرے جو پہاڑوں پر چڑھنے میں لاحق ہوتے ہیں۔ اور دوسرے بھی بہت سے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اجتماعی ناپسندیدگی کے ڈر کو لیجئے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ ایک آدمی گھوڑا چرا سکتا ہے حالانکہ دوسرا آدمی ٹٹی کیطرف بھی نظر نہیں ڈالے گا۔ اس فرق کیوجہ وہ خاص مزاجی رجحان ہے (شروع سے) دوسرے لوگوں کیطرف ہوا کرتا ہے وہ آدمی جو بھائی بندوں کے سامنے دوستانہ بے خوفی کے ساتھ آتا ہے وہ اپنے اس رویہ کی تصدیق نتائج سے کرسکے گا۔

وہ بچے جو کتوں سے ڈرتے ہیں اُن سے بھاگتے ہیں۔ اسی لئے کتا بھونکتا ہوا انکی ایڑیاں آلیتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ بچے جو کتوں سے محبت کرتے ہیں کتے بھی انہیں چاہتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے رویہ کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ اچھا نتیجہ مخالفت (ناپسندیدگی) کے مقابلہ میں ہمت کرنے سے نہیں نکلتا۔ وہ تو صرف مخلص (سچی) دوستی اور اُسی کی توقع سے پیدا

ہو سکتا ہے۔

خطروں کی ایک اور تیسری قسم ہے جس سے الگ نہیں رہا جا سکتا بلکہ جو آدمی کے نقطۂ نظر کے مطابق خوفناکی اختیار کر لیتے ہیں۔ مالی خسارہ اس کی ایک مثال ہو۔ اکثر انسانوں کی زندگی کا بیشتر حصہ غربت کے ڈر سے ڈھکا رہتا ہے۔ سخت غربت، اُسی مزدور کی سی جس کے پاس کام نہیں، ایک خوفناک برائی ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ غربت ہو جس کا کھاتے پیتے تاجروں کو خوف رہتا ہے۔ اغراض اور مزاجوں کے غلط راستہ پر لیجانے سے یہ ایک بڑی برائی بن سکتی ہو۔

میں یہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا کہ صرف ڈر کی عدم موجودگی ہی سے اچھا انسان پیدا ہو سکتا ہو بلاشبہ دوسری باتیں بھی ضروری ہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ڈر سے نجات حاصل کرنا اہم مقاصد میں سے ایک ہو۔ عقلمندی سے تعلیم دینے سے، بمقابلہ اور دوسری اچھی خصائل کے، یہ آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہو۔ ڈر سے نجات ملنے سے جسمانی، اخلاقی اور ذہنی منافع حاصل ہوتے ہیں۔ مس مارگرٹ مک ملن اس بات کیطرف اشارہ کرتی ہیں کہ جن بچوں کو بار بار برا بھلا کہا جاتا ہے وہ ٹھیک طرح سے سانس نہیں لیتے۔ بمقابلہ دوسرے بچوں کے یہ بچے (adenoids) ناک کی بیماریوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سی مثالیں اس امر کے ثبوت میں دی جا سکتی ہیں کہ کس طرح ڈر سے تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے۔ خصوصاً اسکا دخل ہاضمہ کے ساتھ مسلم ہو۔

ڈر سے جو اخلاقی نقصان پہونچتا ہے وہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ کچھ تو اس کی وجہ صحت کا نقص ہوتا ہے، جیسا کہ یہ اب مسلم ہو کہ اکثر خطرناک اخلاقی عیوب کا تعلق ہاضمہ کی حرکت سے ہے۔ بمثال کے طور پر لالچ کو لیجئے۔ لیکن ڈر سے جو سب سے زیادہ اہم برائی پیدا ہوتی ہے وہ دنیا کے خلاف غصہ کا انداز ہے۔ جب آدمی اپنے ہم جنسوں سے ڈرتا ہے تو مدافعت کے لئے ردّ عمل اس طرح کرتا ہو جس طرح وہ اسوقت کریگا جبکہ کوئی اس کی آزادی خیال و حرکت میں دخل انداز ہو۔ جہانتک کہ جذبات کا تعلق ہے اس کے ردّ عمل کی یہ حالت ہوتی ہو لیکن اس کے چھپے ہوئے غصہ کا اظہار، کچھ حد تک، اس کے ڈر سے ہوتا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر کوئی محفوظ راستہ ڈھونڈھتا ہے۔ اسے یہ راستہ دشمن ہو کر، مذہبی ...

اخلاقی سزا دہندگی، جنگ وجدل کی محبت اپنے بچوں پر ظلم کرنے، یا ان تمام کے مجموعے میں ملجانے - یہ ساری خباثتیں، دس میں نو دفعہ، چھپے ہوئے ڈروں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

ذہنی طور پر بھی ڈر کے بڑے نقصان وہ نتائج ہیں۔ کسی غیر معمولی رائے کے ڈر سے انسان اپنے پڑوسیوں کی احمقانہ رایوں کے برخلاف نہیں سوچتا۔ پھر موت کا ڈر ہے جس کے باعث لوگ مذہبی معاملات پر سیدھا نہیں سوچتے۔ اور پھر اپنی راہ آپ ڈھونڈنے کا ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ اپنے فیصلہ کی تائید کے لئے کسی اور کی شش تلاش کرتے ہیں۔ ڈروں کی مختلف شکلیں دنیا کی آدھی حماقت کی ذمہ دار ہیں۔ ڈر کا بڑا حصہ، جس سے عورتوں اور مردوں کو عمر بھر سابقہ پڑتا ہے، انکے بچپن کے شروع کے چھ سالوں میں جاگزیں کیا جاتا ہے۔ یا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو "نیک" بنایا جائے یا وہ والدین کے ڈروں کا اثر ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس نیکی، کی مطلق پروا نہیں کرتا جو ڈر پر مبنی ہے۔ میں ہر جگہ یہ چاہتا ہوں درخصوصًا بچپن کی تعلیم کے زمانہ میں، کہ ایسے انسان بنائے جائیں جو اجتماعی تعاون کی ضرورت کے مطابق اہل ہوں۔ اُن اسباب کی بنا پر جنکا ڈر سے کوئی تعلق نہیں۔ میری رائے میں اخلاقی تعلیم کا اصل مسئلہ یہی ہے۔ یہ مسئلہ ناقابلِ حل نہیں۔ صرف تعصبوں کے بوجھ اور بے رحم روایت کیوجہ سے مشکل ضرور ہے۔

اشتراک

انسان کی جماعتی زندگی پر نظر ڈالیے۔ ہر طرف دو متضاد قوتیں کارفرما دکھائی دیں گی۔ ایک قوت جو
ہے دوسری توڑتی ہے۔ ایک باندھتی ہے دوسری کاٹتی ہے۔ ایک ملاتی دوسری جدا کرتی ہے۔ ایک
وحدت و نظم کی طرف لیجاتی ہے دوسری کثرت و انتشار کی طرف۔ ایک محبت کی قوت ہے دوسری ن
کی۔ ایک مثبت ہے دوسری منفی، ایک الٰہی ہے دوسری ابلیسی۔

ایک وہ ہے جس نے معنی و مفہوم سے خالی فرد کو جماعت میں لاکر بامعنی بنایا، فرد کے سینہ
جماعتی زندگی کی لگن لگائی، آدمی کے بچہ کو اور سب جانداروں سے زیادہ اپنے والدین کا دست نگ
زبان، روایات، تمدن کا سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرایا اور ماضی کو مستقبل سے مربوط
خاندانوں سے قبیلے اور قبیلوں سے قومیں بنوائیں۔ اور جب ملکوں کی حدود بھی تنگ معلوم ہوئیں تو مخ
ملکوں کے ہم نسل باشندوں کی وحدت پیدا کی، پھر اس تفریق کو بھی ہٹایا اور عقاید کے اشتراک سے
ملک و نسل کے امتیازات کو مٹایا۔ اور عقاید کے اختلافات کے باوجود ایک خالق اور ایک رب
سب سے منوا کر بندوں کے انتشار کو آقا کی وحدت میں گم کر دیا اور انسانی برادری کا تصور قائم کیا

دوسری وہ ہے جس نے ایک ہی آقا کے چاکروں سے باہم ایک دوسرے کی گردنیں کٹ
جس نے قرونِ وسطیٰ کی ایک عیسائی دنیا کو درجنوں وطن پرست قوموں میں بانٹا، جو آج ایک عالم اس
کو ترک و عرب، افغان اور ایرانی میں تقسیم کر رہی ہے۔ جس نے خود ان قوموں سے ہر ایک میں د
قومیں بنادیں، ایک امیر ایک غریب، ایک حاکم دوسری محکوم۔ ایک فاعل دوسری منفعل۔ جس۔
خاندانی زندگی کے سکون اور وحدت کو عورت "مرد کے حقوق" کے چکر میں ڈال کر فنا کیا، جس۔
جماعت کو افراد میں تحلیل کر دیا، اور ایک قادر اور کافی بالذات فرد کا تصور پیدا کر کے جماعتی تعمیر کی
بنیادوں کو — ان کا نام مذہب ہو یا معیشت، فنونِ لطیفہ یا اخلاق — کھوکھلا کر دیا۔

سماجی زندگی کے مطالعہ کرنیوالے کے لئے بڑی دشواری یہ ہے کہ صرف دوسری قوت ہی نہیں بلکہ پہلی بھی اپنے کو اکثر چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے کہ کل انسانیت بحیثیت ایک جم کے بہت کم عمل پیرا ہوسکتی ہے۔ البتہ پہلی قوت کی بنائی ہوئی اور دوسری قوت کی مظہر جماعتوں میں روح و ذہنیت کے اعتبار سے زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ پہلی اگر ٹولیاں بناتی ہے [illegible]س لئے کہ اتحاد ہوسکے، دوسری اتحاد بھی کراتی ہے تو اس لئے کہ اختلاف شدید بنجائے۔ ایک کی ویرانیاں آبادی کی خاطر اور دوسرے کی آبادیاں بھی ویرانی کے لئے ہوتی ہیں۔

ان قوتوں کے اثر سے جو جماعتیں بنتی ہیں وہ اپنے لئے یا اپنی قدر مشترک کے لئے کوئی نہ کوئی نام تجویز کرتی ہیں۔ یہ نام رواج پکڑتے ہیں اور بہتیرے انہیں بے سمجھے استعمال کرتے اور انکو طلیقوں پر لکھ کر اپنی پیشانیوں پر لگالیتے ہیں۔ بہت کم ہوتے ہیں جو ان ناموں کی تہ میں جو قوت کا اثر پائیں اُسے تلاش کریں اور سمجھنے کی تکلیف اُٹھائیں۔ نادانی سے اچھے اور نادانی سے بُرے بنجانیوالوں کی تعداد دنیا میں بہت ہے۔ بے سمجھی سے ان ناموں کو استعمال کرنیوالے، اُن کے لئے جینے اور اُن کے لئے مرنیوالے، ان ناموں میں متضاد معانی کو اسطرح یکجا کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم ان کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش بھی کرے تو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ انسانوں کے سینے خیر و شر دونوں کے جولانگاہ ہیں۔ ان کے اعمال و افکار بُرے ناموں میں اچھے معانی اور اچھے ناموں میں بُرے معانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی نام کو اچھے بھی لیتے ہیں بُرے بھی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ابھی اس نام کی تختی اپنے ماتھے پر نہیں چپکائی ہے حیرت سے منہ تکتے ہیں کہ یہ ہے کیا؟

"سوشلزم" اسی قسم کا ایک نام ہے۔

یہ نام یوں تو نیا ہے۔ شاید سب سے پہلے اٹلی کے ایک مصنف گیو لیانی نے اسے ۱۸۰۳ء میں استعمال کیا تھا۔ لیکن اس سے مفہوم تھا پروٹسٹنٹ مذہب کے مقابلہ میں کیتھولک مذہب۔ پھر شاید سین سیموں کے ایک معتقد ٹرانسیٹر نے ۱۸۳۲ء میں اسے استعمال کیا۔ لیکن نام نیا ہو، اسکا اطلاق "پرانی چیزوں" پرانی شخصیتوں اور تحریکوں پر بھی ہوتا ہے۔ کوئی "سوشلزم" کی اس نیم سرکاری تاریخ

کو اٹھا کر دیکھیے جو کاؤٹسکی اور برن شٹائن نے شائع کی ہے تو حیرت میں رہ جائیے کہ آخر اس نام میں کیا کیا شامل ہے؟ اگر اس میں سماجی زندگی کے ابتدائی اشتراک املاک کا ذکر ہے تو فلاطون کی ریاست کا بھی۔ اسپارٹا کے دستور اساسی پر بھی نظر کی گئی ہے تو قدیم مسیحی جماعتوں کے 'اشتراک' پر بھی۔ رہبانوں کے اشتراک کا بھی ذکر ہے اور پیراگوئے میں جیسوعیٹوں کی ریاست کا بھی۔ پھر اس سب کی داستان بھی ہے جو انیسویں صدی میں اس نام سے دنیا میں ہوا۔ ان مختلف النوع مظاہر کو اس نام میں کیسے جمع کر دیا گیا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ محبت کا پیام لانیوالا مسیح اور نفرت کا دین پھیلانے والا کارل مارکس دونوں 'اشتراکی'، 'سوشلسٹ' ہوں؟ فلاطون اور بکارین دونوں پر ایک ہی نام کا اطلاق کیسے ہو گیا؟

سوشلزم کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے پہلے یہی دشواری پیش آتی ہے۔ اس نام میں اسے خیر بھی ملتی ہے' شر بھی' نور بھی' تاریکی بھی' محبت بھی' نفرت بھی۔ اور متضاد طبائع کے انسان انہیں متضاد عناصر کی موجودگی کے دھوکہ میں اس نام کی چھپ اپنے ماتھے پر لگا لیتے ہیں۔ کوئی یہ چھپ لگا کر اپنے کو مسیح' اور فلاطون کے ساتھیوں میں سمجھتا ہے کوئی مارکس اور لینن کے ہم کابوں میں۔

اس دشواری کو سوشلزم کے مستند موزخوں نے محسوس کیا ہے اور بڑے بڑے علماء نے اس کی ایک تعریف بتانے سے اپنے کو قاصر بتلایا ہے مثلاً مشہور جرمن مصنف اسٹاملر اس سے معذوری ظاہر کرتا ہے کہ ان متعدد اور مختلف مظاہر ذہنی و جماعتی کے لیے جنہوں نے اپنے لئے اس نام کا استعمال کیا ہے کسی ایک تصور کا تعین کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مختلف سوشلسٹ نظریوں اور نظاموں کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے تو اسٹاملر کا یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم ان مادی نتائج اور خارجی مقاصد کو پیش نظر رکھیں جو سوشلزم اور اسکی متعدد اقسام کی امتیازی خصوصیت ہیں تو شاید ہم کوئی تصور قائم کر سکیں۔

دنیا میں لوگوں نے جب سے سیاسیات پر لکھنا شروع کیا ہے اسی وقت سے یہ مسئلہ پیش نظر

ہے کہ انسانوں کی سماجی زندگی کے لئے سب سے اچھی اور سب سے مفید شکل کیا ہے۔ انہیں سے اکثر کا یہ خیال رہا ہے کہ ہر معقول سماجی نظام کے لئے کسی نہ کسی قسم کی طاقت بالادست لازمی ہے۔ بلا کسی قسم کے آئینی جبر کے ان لوگوں کے نزدیک سماج کا منظم ہو سکنا ممکن ہی نہیں۔ اس کے مقابلہ میں ایک مذہب اور ہے جس کے نزدیک سماجی زندگی کی بہترین صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کسی قسم کا جبر آئینی نہ ہو نہ کوئی طاقت بالادست۔ آدمی بس اپنی مرضی سے باہم ملیں اور جب چاہیں سماج سے باہر ہو جائیں۔ اس مذہب کو نراج کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح سماجی زندگی کی دو ممکن بنیادی شکلیں ہوئیں: ایک وہ جس میں جبر ہو، ایک وہ جس میں کسی قسم کا جبر نہ ہو۔

سماج کے جن نظاموں میں جبر کی جگہ ہے اُن کی بھی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں لیکن ہم نے چونکہ مادی نتائج اور خارجی مقاصد کو پیش نظر رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اس لئے ان قسموں پر بھی اس نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے۔ مادی اشیاء کی فراہمی اور تقسیم کے لحاظ سے یعنی معاشی زندگی کے اعتبار سے ان جبری نظامہائے جماعت میں تفریق و تقسیم کی سب سے اہم وجہ مسئلہ املاک ہے۔ مختلف نظاموں نے بھی مختلف حل پیش کئے ہیں لیکن اصولاً دو تقسیمیں ہو سکتی ہیں: ایک تو وہ جبری نظام جنہیں املاک شخصی و انفرادی ہو، دوسرے وہ جنہیں املاک اجتماعی اور سماجی ہو۔

آج دنیا کے بڑے حصہ میں سماج کا جو نظام مقبول ہے وہ وہ ہے جس میں جبر آئینی کو تسلیم کیا جاتا ہے اور شخصی و انفرادی املاک کو سماج کی معاشی زندگی کی بہترین اساس مانا جاتا ہے۔ جبری نظام کی دوسری قسم یعنی وہ جسمیں ملکیت شخصی نہیں بلکہ اجتماعی ہو یا تو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں پائی جاتی ہے یا اب روسی انقلاب کے بعد سے بڑے پیمانہ پر روس میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے۔ لیکن روس کے تجربہ ہی کو اجتماعی نظام کی ایک ممکن شکل سمجھنا غلطی ہوگی۔ اصولاً و تاریخاً ایسے نظاموں کی جنہیں معاشی زندگی کی بنیاد مشترک جماعتی ملکیت ہے تین قسمیں کیجا سکتی ہیں۔ جن لوگوں نے وقتاً فوقتاً رائج الوقت انفرادی و شخصی ملکیت کے نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے انہوں نے مندرجہ ذیل تین شکلوں میں سے ہی ایک شکل کو اسکی قائم مقامی کے لئے پیش کیا ہے۔ وہ

تین قسمیں ان ناموں سے معروف ہیں : (۱) سوشلزم (۲) کمیونزم (۳) زرعی سوشلزم - ذیل کی سطور میں ہم انکی مختصر سی تعریف کریں گے۔[1]

(۱) سوشلزم تو وہ مذہب ہے جس کے نزدیک پیدائش دولت و ثروت کے ذرائع و وسائل پر کسی شخص کی انفرادی ملکیت کا حق تسلیم نہیں کرنا چاہیئے! اس لئے کہ ایک تو یہ پسندیدہ نہیں اور دوسرے سماجی زندگی جس طرز اور رفتار سے ارتقاء کے منازل طے کر رہی ہے اُس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہے کہ ان وسائل دولت آفرینی پر سے شخصی املاک کا حق مٹ جائے۔ ہر شخص جانتا ہوگا کہ وسائل و ذرائع دولت آفرینی سے مراد وہ مادی چیزیں ہیں جنسے انسانی ضروریات کو پورا کرنے کی دوسری مادی چیزیں تیار کرنے میں مدد ملے۔ اسمیں تمام زمین آجاتی ہے، تمام صنعتی اوزار، اور کلیں آجاتی ہیں، کارخانے مشینیں، اجناس خام، اجناس نیم خام سب اس کے تحت میں آتے ہیں۔ ہمارے رائج الوقت نظام معاشی میں ان چیزوں پر افراد کا تصرف ہے۔ سوشلزم چاہتا ہے کہ یہ تصرف افراد سے لیکر جماعت کے سپرد کر دیا جائے۔ جماعت میں کوئی فرد ایسا نہ ہونا چاہیئے جو کہہ سکے کہ یہ کھیت میرا، وہ کارخانہ میرا۔ ان تمام وسائل دولت آفرینی پر ملکیت کا حق ہیئت اجتماعی کو منتقل ہو جانا چاہیئے اس کا نام ریاست ہو یا اور کچھ۔ لیکن سوشلزم انفرادی و شخصی ملکیت کو صرف وسائل دولت آفرینی پر سے ہٹانا چاہتا ہے۔ شخصی صرف کی چیزوں پر سے نہیں۔ سوشلزم کے متعلق یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اس میں کسی قسم کی شخصی آمدنی کو روا نہ رکھا جائے گا۔ ہاں سوشلزم یہ نہیں گوارا کرتا کہ صرف بعض مادی اشیاء پر حق ملکیت رکھنے کی وجہ سے کسی فرد کو کوئی آمدنی حاصل ہو۔ لیکن وہ کام کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے اور اُسے اپنی مرضی کے مطابق اپنی ضروریات رفع کرنے کے لئے صرف کرنے کا مخالف نہیں۔

(۲) کمیونزم سوشلزم سے ایک قدم آگے جاتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ شخصی ملکیت

---

[1] ان تصورات کو جدا جدا پیش کرنے اور واضح کرنے کی خدمت علم المعیشت کے لئے جرمنی کے مشہور استاد کارل ڈیل نے انجام دی ہے۔

صرف وسائل دولت آفرینی ہی پر سے نہ ہٹ جائے بلکہ اشیاء استعمال و صرف پر بھی کسی کو شخصی و انفرادی ملک حاصل نہ ہو۔ سوشلزم کی رو سے تو ایک فرد اپنے کام کے معاوضہ میں جو آمدنی حاصل کرے اسے خود تصرف رکھتا ہے اور اُسے اپنی حاجتیں رفع کرنے میں جسطرح چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ دن میں آٹھ گھنٹے کام کرنے کے معاوضہ میں اُسے جو مزدوری ملی ہے اُس سے وہ چاہے تو معمولی کھانا کھاکر اچھے اچھے کپڑے پہن سکتا ہے، یا زردہ پلاؤ کھاکر پھٹے پرانے کپڑوں پر اکتفا کرسکتا ہے۔ جو کچھ بچے اُس سے چاہے تو کتابیں خریدے، چاہے سگریٹ، اُس کا جی چاہے تو ٹکٹ خرید کر کسی بڑے عالم کا لکچر سنے چاہے ٹکٹ خرید کر بڑے سے بڑے سینما اور تھیٹر میں جا بیٹھے۔ غرض اپنی محنت کے معاوضہ کو جن چیزوں سے چاہے بدل لے۔ لیکن کمیونزم اس کو روا نہیں رکھتا۔ اس کے یہاں صرف کارخانے اور زمین مشینیں اور اوزار ہی شخصی تصرف سے نکال کر جماعت کے سپرد نہیں کئے جاتے بلکہ جماعت ہی کو یہ طے کرنے کا حق بھی ہے کہ افراد کو کھانے کے لئے کیا اور کتنا، پہننے کو کیا ملے، تفریح کے کیا سامان ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یعنی سوشلزم اگر ذرائع کار پر سے شخصی ملکیت کو ہٹاتا ہے تو کمیونزم اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ "نتائج کار" پر سے بھی اسکو مٹانا چاہتا ہے۔

(۳) زرعی اشتراک۔ جہاں کمیونزم شخصی ملکیت کو مٹانے کے بارے میں سوشلزم سے ایک قدم آگے جاتا ہے وہاں زرعی اشتراک سوشلزم سے ایک قدم پیچھے رہنا چاہتا ہے۔ سوشلزم اگر تمام ذرائع دولت آفرینی کو جماعت کے ہاتھ میں دینا اور افراد سے چھین لینے کا طالب ہے تو زرعی اشتراک تمام ذرائع دولت آفرینی میں سے صرف ایک کو یعنی زمین کو اس غرض کے لئے علیحدہ کرلیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمین پر کسی فرد کو شخصی ملکیت کا حق تسلیم نہ کیا جائے۔ باقی دوسرے ذرائع دولت آفرینی شوق سے شخصی ملکیت میں آسکتے ہیں۔

خارجی نتائج اور مادی مقاصد کے اعتبار سے تو ہم نے ہئیت اجتماعی تعمیر نو کے متذکرہ بالا تین نظریوں کو پیش کردیا۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں انہیں سے ہر ایک کے عالم وجود میں آنے اور فروغ پانے کے وجوہ ایک سے نہیں ہیں۔ یہ نہیں کہ اگر ہم نے سوشلزم کی ایک تعریف کردی

گو ہر اشتراکی نظام کی تہ میں ایک ہی سے فلسفیانہ تخیلات، ایک ہی سی روح کارفرما ہے۔ نتیجہ ایک سی لیکن نیت ایک نہیں۔ مختلف الخیال، مختلف المزاج لوگ اگر اس مقصد کے لئے ساعی نظر آتے ہیں تو مختلف محرکات ہیں جو انہیں اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ان نظریوں کے فہم کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان مختلف خیالات اور محرکات میں ہی اپنے لئے کوئی ترتیب پیدا کرلیں جیسے اشتراک، کمیونزم، بانراج وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ہم سوشلزم کی بابتہ یہ کوشش کریں گے۔

اپنے بنیادی محرکات اور فلسفیانہ اساس کے اعتبار سے ہم تمام اشتراکی نظاموں کو دو انواع میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) تصوری اشتراک (۲) ارتقائی اشتراک۔

'تصوری' اشتراک والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی 'تصور' کسی مطمح نظر کی خاطر مشترک ملکیت کے خواہاں ہیں۔ اس خیال سے کہ اس 'تصور' اس 'عین' کی تکمیل ان کے نزدیک اشتراکی جماعت ہی میں ممکن ہے۔ یہ اشتراک کے طالب مثلاً اس لئے ہیں کہ عدل کا تصور دنیا میں مکمل طور پر پورا ہو، یا مساوات عین کی فرمانروائی ہوجائے' یا 'اخوت' کا دور دورہ ہو۔ یا اسی قسم کے کسی اور تصور کی تکمیل ممکن بنائی جاسکے۔ چنانچہ یہ اشتراکی اپنے مخصوص مطمح نظر کو سامنے رکھکر ایک نظام بناتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جماعت سے اس نظام کو منوائیں۔

ارتقائی اشتراک والے کسی تصور کے قائل نہیں، کسی عین کے دلدادہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم چاہتے کچھ نہیں، ہمارا مطالبہ کچھ نہیں، ہم تو جو جانتے ہیں وہ بتاتے ہیں۔ ہم یہ کچھ نہیں کہتے کہ کیا کرو، ہم یہ سناتے ہیں کہ کیا ہوگا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ خواہش اور رائے کا معاملہ نہیں۔ تم چاہو نہ چاہو اشتراکی نظام جماعت آکر رہے گا۔ جسطرح ہمارے گردوپیش کی مادی اشیاء پر قدرت کے قوانین عمل پیرا ہیں اسی طرح جماعتی زندگی بھی قوانینِ نشو و ارتقا کی پابند ہے اور ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام قائم ہو۔

تصوری اشتراک کی اگر دو بڑی بڑی تقسیمیں کریں تو ایک مذہبی کہلائیگی دوسری اخلاقی۔ اول الذکر اپنے تصورات مذہبی دنیا سے لیتا ہے اور ایک اشتراکی نظام کا مطالبہ اس لئے کرتا ہے کہ

اس کے خاص قسم کی مذہبی زندگی ناممکن ہے۔ اسکے حامیوں کا خیال ہے کہ مذہبی زندگی کے کامل
ونما کے لئے ایسا نظام جماعتی ہی کام دے سکتا ہے جسمیں شخصی املاک نہ ہو۔ خصوصاً عیسائی مذہب
اس قسم کے بہت سے عناصر ہیں جو اشتراکی زندگی کی طرف لیجاتے ہیں۔ تاریخ میں متعدد مثالیں
ے عیسائی فرقوں کی موجود ہیں جنہوں نے چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر اشتراکی زندگی کا نظام قائم کیا۔ آج
امریکہ میں متعدد نوآبادیاں بعض عیسائی فرقوں کی موجود ہیں جنہیں اشتراک املاک پر عمل ہوتا ہے۔
عجیب بات یہ ہے کہ اشتراکی تجربوں میں اگر کامیابی ہوئی ہے تو انہیں مذہبی جماعتوں کو۔

اخلاقی اشتراک وہ ہے جو کسی نہ کسی اخلاقی قدر کو دنیا میں مکمل اور رائج کرنے کے لئے
تراک املاک کا نظام پیش کرے۔ یہ اخلاقی قدریں بہت مختلف ہو سکتی ہیں اور اس اعتبار سے اخلاقی
تراک کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اصولاً یہ انہیں دو قسموں میں رکھہ سکتے ہیں۔ ایک وہ جسمیں جماعتی
ول پیش نظر ہو ایک وہ جسمیں انفرادی اصول کو سامنے رکھا جائے۔

جماعتی اصول سے مراد یہ ہے کہ نظام جماعت کی ترتیب میں فرد کو کل میں جزو کی، جسم میں
نو کی حیثیت دیجائے۔ مقصود کل کی فلاح ہو اور جسم کی صحت نہ کہ کسی فرد کی بہبودی یا کسی عضو کی
ئی۔ یہاں افراد کو بہت سے 'حقوق' دیکر خوش کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ افراد سے بالاتر جماعت،
'ریاست' کے نشو و نما اور ارتقا کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت فلاطون نے
پنی مشہور کتاب 'ریاست' لکھی ہے۔ یہی اصول اسکی دوسری تصنیف 'قوانین' میں اسکے سامنے
ہے۔ ان تصانیف نیز دیگر یونانی فلاسفہ کی تعلیمات کے اثر سے 'ریاست' یا جماعت' کو کائنات مفصل اور
افراد کو کائنات مجمل سمجھا جانے لگا۔ افراد کی طرح 'ریاست' کی بھی ایک شخصیت تسلیم کیگئی اور افراد
اس شخصیت کا خادم مانا گیا۔ اس نظریہ میں انسان کے حقوق کی جگہ اس کے فرائض سے پُر ہوتی ہے اور
فرائض تمامتر جماعت کی خدمت گزاری سے عبارت ہوتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو فرد کو اس خدمتگزاری
سے روکے اس نظریہ کی رو سے عیب ہے اس لئے یہ ایسی چیزوں کو مٹانا چاہتا ہے۔ شخصی ملکیت
چونکہ اس خدمت گزاری کی راہ میں سب سے بڑا پتھر ہے اس لئے اسکا ہٹانا بھی ضروری ہے۔

اسی نظریہ کے ماتحت لوگوں نے اشتراک ازدواج وغیرہ کی تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ متاخرین میں اس مذہب کا مشہور رہنما میر جرمن اشتراکی راڈبرٹس ہے۔

اس کے بالکل مخالف انفرادی اصول ہے۔ اسکی بنیاد افراد کے حقوق پر ہے۔ جماعت یہاں افراد کی بنائی ہوئی اور ان کے فائدہ کے لیئے ہے۔ ان سے افضل اور اعلیٰ نہیں۔ یوں تو یہ اصول بھی شاید اتنا ہی پرانا ہو جتنا خود انسان لیکن اسکو ترقی ہوئی جدید آئین فطری کے نظریے جبکی بنیادیں سب سے پہلے گروشیس نے ۱۶۲۵ء میں استوار کیں۔ اسی نے انسان کے ازلی اور فطری حقوق کی صدا اُٹھائی۔ روسو نے اس آئین فطری اور حقوق ازلی کے نظریہ کو اور آگے بڑھایا۔ اور جماعت کو افراد کے معاہدہ پر مبنی تبلایا۔ روسو نے انسانی حریت اور مساوات کے اس نظریے مساوات سیاسی کے مطالبہ کو تقویت دی۔ اور بعد کو انفرادی اصول والے اشتراکیوں نے اسی کی بنا پر مساوات املاک کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مذہب کے اشتراکی شخصی املاک کو اس لئے مٹانا چاہتے ہیں کہ ہر فرد کو املاک پر اپنا اپنا مساوی حق حاصل ہو جائے۔ اور تقسیم دولت کی موجودہ عدم مساوات مٹ جائے۔

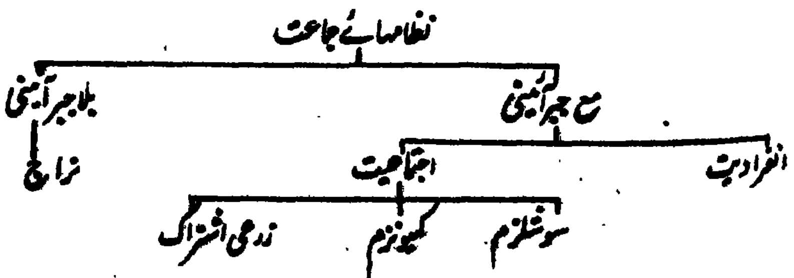
اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر اشتراکی نظام کے مؤیدین کے مقابلہ میں ایک ارتقائی مذہب ہے جو کسی قدرِ جماعتی کا دلدادہ نہیں۔ کسی اصول کا شیدائی نہیں۔ یہ 'حکما' کا گروہ ہے جو دنیا کی افراد اور جماعت کے ارتقاء کو سمجھنے کا مدعی ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ وہ "آرزوؤں" کے سراب سے نکلکر "حکمت اور علم" کی محکم چٹان پر پہونچ گیا ہے۔ یہ صرف یہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ جماعتی نشو و ارتقا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نظام اشتراکی قائم ہو جائے۔

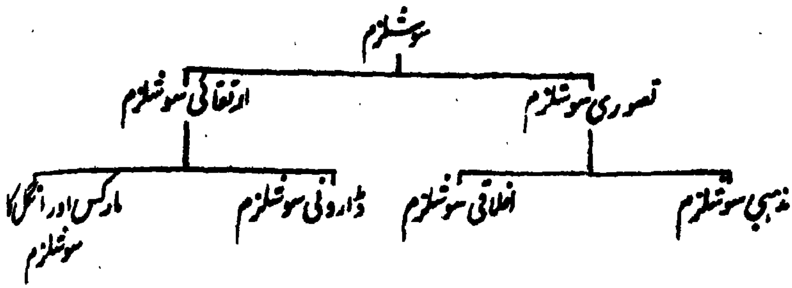
اس مذہب میں بھی دو فرقے ہیں ایک ڈارونی فرقہ اور دوسرا مارکس اور انگلس کا۔ ڈارونی فرقہ تو جماعت انسانی پر ماحول فطری کے تمام قوانین کو عاید کر دیتا ہے۔ اور مدعی ہے کہ تمدن انسانی بھی اپنے ارتقا میں تطبیق، توارث، اور تنازع للبقا کے حیاتیاتی قوانین کا اتنا ہی پابند ہے جتنی کہ غیر انسانی دنیا۔ سرمایہ داری کا نظام دراصل اس کشمکش حیات میں کامیاب ہونیکا نتیجہ ہے؟

نژادِ انسانی کے لئے ضروری ہے۔ یہ صرف تجارتی مقابلہ کا موقع دیکر بجائے ترقی کے جماعتی تنزل پیدا کر رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پیدائش دولت میں مقابلہ کے مواقع پیدا کئے جائیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہر کام کرنیوالے کے پاس پیدائش دولت کے ذرائع بھی موجود ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع دولت آفرینی چند اشخاص کی ملک نہ ہوں بلکہ جماعت کے تصرف میں ہوں جو سب افراد کو ان کے استعمال کا موقع دیسکے۔ اس مذہب کا ممتاز معلم دولٹمان ہے۔

دوسرا ارتقائی فرقہ مارکس اور انگلس کا ہے۔ یہ لوگ ڈارون کے حیاتیاتی نظریہ ارتقا کو تو جماعتی زندگی پر نہیں لگاتے، لیکن انہوں نے تمدن انسانی کے نشو و ارتقا کے بعض قوانین خود بنائے ہیں۔ جو ان کے مادیاتی نظریہ تاریخ کی شکل میں علمی دنیا کے سامنے ہیں۔ عملی دنیا میں سب سے زیادہ فروغ اسی آخری فرقہ کو ہوا ہے۔ اُس کے اشتراکی اسی فرقہ کے لوگ ہیں۔ یورپ کے ہر ملک میں مارکس کی ملت موجود ہے اور بڑھ رہی ہے۔ خود ہندوستان میں مارکس، رشی، کے نام لیوا پیدا ہونے لگے ہیں۔ اس مذہب کے پیدا ہونے کے اسباب، اس کی نشوونما، اس کے فلسفہ کے پیچ، اس کی حکمت کے فریب، انکی تاثیر کا راز یہ سب ایسے مباحث ہیں جنپر اسوقت بحث و نظر ہمارے ملک کے لئے بہت ضروری ہے لیکن یہ تفصیل کے طالب ہیں اسلئے ہم اس مضمون میں اس فرقہ پر زیادہ نہیں لکھتے۔ انشاءاللہ آیندہ مفصل بحث کرینگے۔

ذیل میں قارئین کرام کی سہولت کے لئے اس مضمون کے مطالب کا خلاصہ ایک نقشہ کی شکل میں پیش کر دینا غالباً مفید ہوگا:۔




سوشلزم
ارتقائی سوشلزم
تصوری سوشلزم
مارکس اور انگلز کا سوشلزم
ڈارونی سوشلزم
اخلاقی سوشلزم
مذہبی سوشلزم

عراق عرب

مسٹر جے 'ایم' بالفور نے جو دولت ایران کے نائب مشیر مالیات رہ چکے ہیں اپنے قیام ایران کے زمانے کے مشاہدات' تجربات اور دیگر معلومات پر ایک کتاب ("تازیانہ شیون ایران") لکھی ہے۔ مسٹر موصوف کا زمانہ' ملازمت جنگ عظیم کے اواخر سے شروع ہوتا ہے۔ کتاب ۱۹۲۱ء کے اختتام کے ساتھ ختم ہوتی ہے اسلئے کہ اس کا دیباچہ مسٹر بالفور کے قلم سے فروری ۱۹۲۲ء میں نکلا ہے۔ مسٹر بالفور' لارڈ بالفور کا ہمقوم ہے لیکن غالباً آخر الذکر بالفور کے نقطہ نظر سے اول الذکر بالفور اپنے ملک و ملت کا ایک ناخلف فرزند ہوگا جسکی "اولین جنبش قلم" سے ایسی کتاب نکلی۔ بیچارے مسٹر بالفور کو خود بھی اپنے اس "ننگ قومی" کا احساس و اعتراف ہے' چنانچہ دیباچہ کے صفحات میں اس کا علانیہ اظہار ہے۔ لکھتا ہے:

ملک کے اندر اس عقیدہ سیاسی کا ایک "مکتب" موجود ہے جس کا یہ خیال ہے کہ ارکان حکومت و اکابر سیاست کی غلطیوں کا اعلان کرنا ارتداد و الحاد سے کچھ ہی کم ہے۔ بڑے لوگوں کی غلطیاں اگرچہ "محفل خاص" کے اندر افسانہ بزم و انجمن ہوا کرتی ہیں لیکن عوام الناس کے سامنے ان کو بے نقاب کرنا سخت مخدوش بات ہے۔ وہ واقفکار لوگوں کے درمیان ایک راز سربستہ کا احترام رکھتی ہیں اور ان پر کھلے لاگ تنقید مفاد عامہ کے خلاف ہے اور مصالح سلطنت کے منافی۔ لیکن میں اس "دستور زبان بندی" کا قائل نہیں ہوں۔ بخلاف ازیں میرا خیال یہ ہے کہ غلط کار لوگوں سے تعرض نہ کرنا ان کی ہمت افزائی کرنا ہے اور مزید مفاسد کی دعوت دینا۔ نہایت ضروری ہے کہ کلمہ حق بلند کیا جائے تاکہ جو لوگ حکومت کی مسندوں پر قابض ہیں وہ ایک فریب خوردہ پبلک کی غلط پشت پناہی سے محروم ہو جائیں اور ملک کو ان

خطرناک ارباب حل و عقد سے نجات ملے۔ سیاست خارجہ کے بہت سے میدانوں میں ان تلافی مافات سے آخری و انقطاعی حوادث کا سد باب ہو جائیگا۔ حماریہ عظیم نے اس غضب جمہور کو فرائض مؤکدہ بنا دیا ہے۔ ان ایام میں بڑے بڑے ناخدایان کشتی سلطنت نے خطرناک چٹانوں سے تصادم کرائے ہیں اور مشکل سے اُن کے ہاتھ اب اس قابل رہے ہیں کہ زمام حکومت ہنوز ان کی انگلیوں میں رکھی جائے۔ ایران کے اندر اس بے راہ روی سے جو نقصان پہونچا ہے اس کا کوئی نعم البدل اور علاج اب ممکن نہیں۔ ہندوستان، مصر، عراق عرب اور فلسطین اسی تیز خرامی سے پامال ہو رہے ہیں اور جلد یا بدیر یہاں بھی کم و بیش ایسا ہی حشر ہونیوالا ہے۔ پس ان حالات نے مجھکو لب کشائی پر مجبور کیا اور میرا یہ مضبوط اعتقاد ہے کہ ان معاملات میں خاموش رہنا ایک مجرمانہ سکوت ہوگا اور ملت و سلطنت کی خیانت!"

اس احساس ذمہ داری و فرض شناسی کے ساتھ مسٹر بالفور نے یہ کتاب لکھی ہے اُفا رئین کرام کے لئے یہ توقع کرنا بالکل قدرتی ہوگا کہ مصنف موصوف نے برطانوی و دیگر دول متعلقہ کے خداوندان سیاست کی بڑی بڑی دسیسہ کاریوں کے ورق کھولے ہونگے اور نیز ایران کے متعلق ایک عینی شاہد اور بالغ نظر ناظر کی حیثیت سے جو حالات سپرد قلم کئے ہوں گے وہ اس قریباً مجہول الحال ملک پر درجہ اول کی روشنی ڈالتے ہوں گے۔ بلاشبہ ایسا ہی ہے اور بدرجۂ غایت ایسا۔ چنانچہ اپنی صاف گوئی اور حق بیانی کے اقتضا سے اُن کو خود اہل ایران کے متعلق بعض تلخ حقائق کا اظہار کرنا پڑا ہے جس کے لئے وہ بجا طور سے اُس درگذر کے مستحق ہیں جس کی التماس انہوں نے اپنے ان ایشیائی میزبانوں سے کی ہے۔

مسٹر بالفور کی کتاب جو بقول اُن کے "اُنکی پہلی اور شاید آخری تصنیف" ہے اور جو انہوں نے محض مصنفانہ شوق رقمطرازی کے داعیات کے ماتحت نہیں لکھی ہے بلکہ صرف عرض حقیقت کی خاطر (بلاشائبہ عرض ہنر) تین سو صفحے کی کافی ضخیم کتاب ہے جس میں انہوں نے ملک ایران

کی تاریخ سیاسیات اور بالخصوص مسائل مالیات کے تمام ضروری عنوانات سے بحث کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس صحبت میں اس کے آخری باب کے مطالب کا ایک حصہ ناظرین کے سامنے پیش کریں جس میں مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک خصوصاً عراق عرب کے مطلع سیاسی کا "نظارۂ طائرہ" آگیا ہے۔ ہم نے بجائے لفظی "ترجمہ" کے مصنف کے مفہوم کی "ترجمانی" کا اصول پیش نظر رکھا ہے۔

عراق میں قدم رکھتے ہی میرا پہلا احساس یہ تحیر تھا (اور جیسا کہ واقعہ ہے کہ یہ احساس ہر ناظر کے ساتھ شریک رہا ہے) کہ کسی سلطنت کو عراق جیسے ملک میں قدم رنجہ فرمانیکی روئے زمین پر کونسی چیز دعوت دے سکتی ہے! دوسری بات جس نے میرے تخیل کو مَس کیا اُس نظر باز سپاہی کا قول تھا جس نے عراق کے منظر وحشت وہلاکت کا مشاہدہ کر کے کہدیا تھا کہ "انگریزوں کو اُن کے اس مقبوضہ سے نکال باہر کرنیکے لئے کسی جوابی حملہ آور کی تیغ آتشیں کی ضرورت نہ ہوگی!" عجیب تر یہ ہے کہ برطانیہ اس فضولکاری اور تباہ کاری پر بُری طرح مُصر ہے اور اس حماقت آمیز اور نا عاقبت اندیشانہ فعل کو شرف مداومت عطا کرنے پر تُلی ہوئی ہے!

اوائل جنگ عظیم میں جن مقاصد نے عراق عرب کی پہلی فوجی مہم کو ضروری بنایا تھا اُن کی معقولیت کو بآسانی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایرانی چشمہائے روغن گل کی حفاظت اشد ضروری تھی، نیز خلیج فارس کی بحری کمینگاہ سے جرمنوں اور ترکوں کو محروم کر دینا بھی ایک اہم جنگی پیش بینی پر مبنی تھا۔ مگر بصرہ اور اُس کے حوالی کے قبضہ نے ان ہر دو معلوم و مشہور مصالح کی کافی ضمانت کر دی تھی۔ لیکن اس کے بعد "بڑھاؤ تمام جام" کے اصول پر بغداد کی تسخیر اور سارے ملک کی فتح اور تصرف کی جو غایت اور مصلحت تھی وہ ایک راز سربستہ ہے! کہا گیا تھا کہ بصرہ کے قبضہ نے دشمن کو چھیڑ دیا تھا اور اسکی جوابی یورشوں کے سد باب کے لئے ضروری تھا کہ ہم ساحل سے ذرا آگے بڑھکر کسی ایسے عسکری مرکز پر گرفت حاصل کرلیں جہاں سے غنیم کے خطرات سے مامون ہوجائیں لیکن دنیا جانتی ہے اور برطانوی افواج کے ذاتی تلخ تجارب ہیں کہ ہم نے اس "علاج بالمثل" سے اپنے مصائب و افکار کو المضاعف کر لیا! اس راز کا اصلی حل میری تشخیص میں یہ ہے کہ ہمارے بعض نوآموز اور شوقین اہل حرب اس بات کے بہت مشتاق تھے کہ اصل مرکز جنگ سے ہٹکر غیر اہم اطراف میں اپنے ہتھیاروں کی کچھ نظر فریب نمائش کر دیں تاکہ قلب رزمگاہ میں جانے

سینہ پر جو مزبیں پڑی ہیں اُن کی قدرے اشک شوئی ہو جائے! بس بغداد کی فتح محض ایک "انعطاف توجہ" والی حرکت سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے دفتر جنگ کے ناآشنائے جغرافیہ و تاریخ ارکان کی اُن حسین خوابوں کے اندر عراقی مہم کا خاکہ کھینچا گیا ہو جنہیں بغداد کا مرقع الف لیلہ کے افسانوں کو سنکر چشم تصور کے سامنے آیا ہو، اور لندن کے رہنے والے، ہارون الرشید اعظم کی عروس البلاد (بغداد) کا فاتحانہ نظارہ کرنا چاہتے ہوں اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر گئے ہوں کہ بغداد اور "بہشت شداد" کی بہاروں کو دست بُرد زمانہ کی خزانی ہواؤں نے ایک "عالم ہو" میں تبدیل کر دیا ہے!

سامراجی مقاصد کو اس معاملے سے کوئی تعلق نہ ہو سکتا تھا، اس لئے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ ضروری تحفظات تھے وہ بصرہ کے قبضے سے حاصل ہو گئے تھے۔ اس نواح میں زیادہ پاؤں پھیلانے کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ اس سے ہمارے لئے ایک آیندہ "فصل مشکلات" کی تخم ریزی ہو جائے۔ عراق عرب پر ہمارا دخل ترکی اور عرب باشندوں دونوں کے لئے ایک وجہ اشتعال تھا۔ اسمیں ایک مذہبی ابانت کا پہلو نکلتا تھا اور یہ چیز وسطی اور مغربی ایشیا کے ممالک میں جہاں مذہبی حسیات وجذبات بہت اہم عنصر ہیں ایک مخدوش مادہ آتشگیر ہو سکتی تھی۔

اس سمت میں برطانوی مصالح کبھی رونما نہیں ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عراق مسٹر ونسٹن چرچل کی سیاسی تفریح بازیوں کے لئے ایک دلچسپ بساط ہے! کم از کم وزیر ممدوح کی جودت طبع اور ندرت تخیل ثبوت یہ اسکیم ضرور ہے، لیکن جہاں اُس کی اس قابل داد خوبی سے انکار نہیں وہیں کچھ غیر مشتبہ علامات اس حقیقت مخفی کے بھی پائی جاتی ہیں کہ ان خوابوں کی "نقشہ بندی" میں مسٹر ہیتھ ماٹسن کے دل و دماغ کو بھی کافی دخل رہا ہے!

ہم کو یہ تاریخی حقیقت بتائی گئی ہے کہ دجلہ و فرات کا دوآبہ ایکوقت میں دنیا کا غلہ کا گودام تھا اور یہ کہ وہ بہت آسانی سے اپنی یہی عالمگیر اقتصادی حیثیت دوبارہ اختیار کر سکتا ہے۔ پہلی بات کے تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں لیکن دوسرے جملے میں جو بیبا کانہ اعلان کر دیا گیا ہے وہ ارباب حل وعقد کی طفلانہ آسان پسندی کا ایک دلچسپ مظہر ہے۔ بیشک عراق دنیا کے رزق کا مخزن ہو سکتا

سکتا ہے لیکن یاد رہے کہ ساتھ ہی وہ ایک "کان زر" کا مطالبہ بھی کریگا! معلوم ہونا چاہئے کہ اقوام عالم میں برطانیہ ہی تنہا وہ ملک نہیں ہے جو عراق عرب کے زرعی امکانات کا "عرفان" رکھنے کا مدعی ہو۔ شاید لوگوں کو یہ سنکر کسی قدر غیر مطبوع قسم کا استعجاب لاحق ہو کہ ترک بھی اس مسئلہ میں پوری بیداری کا ثبوت دیچکے ہیں! چنانچہ قبل ازیں ترکی حکومت نے ایک ممتاز ماہر انجنیر کا تقرر اسی غرض سے کیا تھا کہ وہ عراق کے "احیار ثانیہ" کے بارہیں اپنی آرار وسفارشات پیش کرے۔ چنانچہ جو رپورٹ گذری وہ یہی تھی کہ یہ مہم بالکل معقول اور ممکن العمل ہے، بشرطیکہ اس کام کے لئے وہ زرخطیر پہلے سے فراہم کرلیا جائے جو ناگزیر ہوگا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو جو تخمینہ تیار کیا گیا تھا وہ قریب قریب چالیس ملین تھا اور اگر ان غیر متوقع ضروریات واخراجات کو بھی محسوب کرلیا جائے جو ایسی عظیم الشان عزائم میں ہمیشہ پیش آیا کرتی ہیں تو اصلی مصارف کی میزان کل پچاس ملین سے کم نہوگی۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ کیا ضرور ہے کہ کل کام کو بدفعۃ واحدہ ہاتھ میں لے لیا جائے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ بالاقساط اسی خاکہ کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کام کی کلی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وہ اس تقسیم کے اصول کو قبول نہیں کریگا۔ ملک کے طول و عرض میں ریگستان اور دلدلیں پائی جاتی ہیں اس لئے آبپاشی اور اخراج آب کے مسائل کی بنا پر کام کا جزو اعظم بیک گردش عمل ہی انجام دینا پڑے گا۔ پھر آج جو تخمینۂ اخراجات بنیگا اس کے اعداد وشمار دیکھنا چاہئے کہ کیا ہونگے ؟ کم از کم ترکونئے تخمینہ کو دوچند تو کردینا چاہئے! اور اس اندازمیں قطعاً کسی مبالغہ کا شائبہ نہ سمجھنا چاہئے۔ تو اب سو ملین کی رقم وہ رقم ہے جسکی اس جیسے یکسوئی طبع اور فراغت معاش والے کام کیلئے بہم رسانی حکومت عراق اور انگلستان ہر دو کیلئے کار دارد کا مضمون ہے۔

بظاہر حالات اس مجموعی تعداد کی ایک کسر کی دستیابی کی بھی مستقبل قریب میں دور تک کوئی امید نظر نہیں آتی۔

بفرض محال اگر اس کو مان بھی لیا جائے کہ مالی مسئلہ حل ہوجائیگا تو آگے بڑھکر پھر یہ کام مشکلات کی بہت سی لاعلاج منزلیں رکھتا ہے مثلاً مصارف کے بعد مزدوری کا مرحلہ آتا ہے۔ عراق کے اندر وہ آدمی کہاں مل سکینگے جو نئی برآوردہ شدہ آراضیات کا تردد کریں گے! ملک کی کل مردم شماری تین ملین نفوس پر مشتمل ہے اور اس آبادی کا وہ حصہ جو زراعت پر بسر اوقات کرتا ہے پورا کا پورا اسی پیشہ میں مشغول ہے۔ میرے کان اس تجویز سے بھی آشنا ہوئے ہیں کہ مذکورہ بالا مشکل کا یہ علاج کیا جاسکتا ہے کہ جزیرۃ العرب کے مختلف اقطاع کے خانہ بدوش اور بادیہ نشین قبائل کو

عراق جدید میں اقامت گزیں ہونے اور آیندہ فلاحین کی سی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیجائے جسکو ممکن ہے کہ وہ لبیک کہیں۔ لیکن میں صرف یہ کہوں گا کہ علی سمات شیخ چلی کی ان خوابوں پر مبنی نہیں کیجاسکتیں! قرینہ غالب ہے کہ آخری جواب میں ہندوستان کے فراہم شدہ قلیوں کی طرف دعوت نظر دیجائے لیکن! اول تو عراق کے اندر ہندوستانی عنصر روز بروز تقلیل کی طرف مائل ہے جس کے اسباب کا آئندہ بھی سد باب نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ایک بڑے پیمانہ پر ہندی مزدوروں کی درآمد کی کوشش کی بھی گئی تو اول تو خود عراق کی عرب آبادی اُن کو خوش آمدید کہنے میں سخت متامل ہوگی اور اس اقدام کو "بین النہرین" کے اندر گنگا اور جمنا کے دوآبہ والے ایک نئے "وطن الہنود" کی بنیاد ڈالنے سے تعبیر کریگی اور ان قومی خدشات کے ماتحت ہندوستانی تارکان وطن کیلئے اپنے ملک کی زمین حتی المقدور گرم کر دیگی۔ دوسری طرف خود ہندوستان میں اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا جائیگا اور یقیناً ایک شدید احتجاج کی لہر اٹھیگی۔ اس نکتہ کو محسوس کرنا چاہیئے کہ ہندوستان کے ارباب سیاست اور اصحاب حرفت جو بیرون ہند میں اقامت رکھنے والے ہندی مزدوروں کی مظلومانہ حالت پر اس قدر شور و غوغا مچاتے ہیں انمیں حب وطن اور ہمدردی نوع بشری کی گلبانگوں کے ساتھ غرض پرستی کے جذبات کی بھی کچھ صداہائے بازگشت ہوتی ہیں! ہندوستانی کارخانہ داروں کے لئے یہ سوچنا بالکل قدرتی ہے کہ اس طرح ملکی بازار مزدوری کو روز بروز خشک کرتے رہنے کا ان پر براہ راست یہ اثر پڑیگا کہ یہ جنس پھر خود ہندوستان کے اندر نسبتہً کم رہجائیگی اور مزدوروں کا یہ قحط خواہ مخواہ اُن کو گراں نرخ بنادیگا! ان گوناگوں مشکلات و معاملات کی بنا پر عراق کے اندر کوئی ایسی مہم سر نہیں کیجاسکتی جسکی امید پر برطانیہ اپنے دخل عراق عرب کو جاری رکھے ہوئے ہے، نیز جسکو وہ اپنی اس پُرخار اور گرانبار مصارف پالیسی کی تائید اور نعم البدل کے طور پر پیش کیا کرتی ہے۔

عراق عرب کی زرعی "حیات بعد ممات" کی اسکیموں کے بعد اس ملک کے وہ چشمہائے روغن گل ہیں جنکے اندر انگلستان پا بگل ہو رہا ہے اور جو پورے عراق کی قربانیوں کی قیمت سمجھا جاتا ہے لیکن اس ضمن میں اول تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ پرشین آئل کمپنی کی معرفت جو مراعات ہمکو حاصل ہیں وہ ہم کو شکم سیر

کرنے کیلئے کافی ہیں اور برطانوی بیڑہ ابھی سالہاسال تک اُس پر اپنی اوقات بسری کر سکتا ہے۔ اب اگر عراق میں بھی تیل کے لئے "کوہ کندن" کیا جائے گا تو مصارف کی کثرت کے عدم تناسب کی وجہ سے اُس کا نتیجہ بھی "کاہ برآوردن" سے زیادہ نہ ہوگا۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ خزینۂ روغن تنہا برطانیہ کا اجارہ نہ ہوگا لیکن چونکہ جو سارے اخراجات وخطرات کے لئے تو انگلستان بلاشرکت غیرے ماشاءاللہ سینہ سپر ہو گیا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ "نیلا تیل" کتنے زیادہ "سرخ انسانی خون" کے معاوضہ میں خریدا جائیگا اور ابھی کتنے اور "دینار سُرخ" خرچنے ہوں گے جو بیعنامہ پر حق برطانیہ مہر تصدیق و توثیق ثبت کر سکیں گے!

اصل یہ ہے کہ انگریزی سرمایہ داروں کی اندرونی ریشہ دوانیاں اور فرمانفرمائیاں اس پالیسی کے اختیار کرنے میں حقیقی کارفرما عنصر ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جنگ عظیم سے قبل ہی ایک برٹش سنڈیکیٹ نے ترکی حکومت سے نواح موصل کے "چاہات روغن" کا ٹھیکہ لیا تھا۔ یہ سب طلے اسوقت خاموش نہیں بیٹھ سکتے!

تیل کی یہ حقیقت، زرعی فتوحات کی وہ سرگزشت، اور امپیریل مقاصد کی وہ دور رازکاری، سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر سرزمین عراق میں بجز خرمے کے درختوں اور نینوا و بابل کے تاریخی آثار کے اور کیا رہجاتا ہے جس کے لئے انگلستان فوج وفل اور ایک دوعملی انگریزی عربی حکومت کے گراں مصارف کو برداشت کر رہا ہے۔ وہمی وفرضی اغراض ومصالح کیلئے کسی سلطنت نے کبھی اپنے کو اس طرح کی خود طلبیدہ مصائب وافکار کے لئے وقف نہ کیا ہوگا۔

اس راز سربستہ کے حل کی جستجو میں سارے گوشوں سے ناکام پھرنے کے بعد آؤ ہم ذرا ان لوگوں پر تو ایک متجسسانہ اور مفتشانہ نظر ڈالیں جو بغداد کی سڑکوں پر سفید عبائیں اور سرخ طربوش پہنے ہوئے ادہر اُدہر ہشاش بشاش چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور جنکی آنکھوں سے عیاری اور سارے سراپا سے مرفہ الحالی ٹپکتی ہے! یہ عراق کے یہودیوں کا حلیہ ہے۔ بنی اسرائیل کے مسئلہ نے آج بہت سے ارباب سیاست کو اس سے زیادہ پریشان بنا رکھا ہے جتنا کہ اُس قوم نے ماضی بعید میں انبیا ورسل کو

بنایا تھا! میرے لئے یہ امر بہت معنی خیز تھا کہ یہودی جوق جوق طبقہ و بیرونی ممالک سے ترکِ اقامت کرکرکے عراق میں آرہے تھے اور اس ملک میں روز بروز اپنے عنصر کو تقویت پہنچاتے معلوم ہوتے تھے۔ یہ بات خالی از علت نہ تھی۔ صرف بغداد شہر کے اندر یہ لوگ آبادی کے پورے ایک ثلث حصہ پر قابض ہیں اور ان کے تمول کا تناسب انکے تعدادی شمار سے کہیں زیادہ ہے۔

اگر یہودیوں سے متعلق ہم نے اپنے کسی قسم کے مصالح کو عراق عرب کے قبضہ کے ساتھ منسلک کیا ہے تو ان منصوبوں کی لایعنیت محتاج تصریح نہیں۔ میں اس بارے میں پورا متیقن نہیں ہوں اور مجھے یہ خیال ہے کہ ممکن ہے کہ ان خبروں اور افواہوں کے پیچھے کچھ بھی نہ ہو لیکن پھر بہت سی علامات و قرائن ایسے ہیں جن کو نظرانداز کرنا مشکل ہے۔ موجودہ برطانوی وزارت کے ساتھ یہودی عمائد و اعیان کا جو خلا ملا رہا ہے اُس کے متعلق ایک سے زیادہ موقعوں پر افشائے راز عشق ہو چکا ہے۔ یہ تعلقات ہنوز روزافزوں ہیں اور پھر ان کی وسعت و نفوذ کا یہ حال ہے کہ مسٹر لائڈ جارج اور شاہ فیصل دونوں کی سیاسی خلوتگاہیں بنی اسرائیل کے "مالی مشیروں" کے راز و نیاز سے معمور ہیں!

یہودی ریشہ دوانیوں کے جال میں پورا فلسطین پھنس گیا ہے اور اس دام سخت کے حلقوں میں مرغ بسمل کی طرح پھڑک رہا ہے۔ فلسطین کے قبضہ کے وجوہات اُس سے کم نامعقول نہ تھے جتنے کہ عراقی دخل کے اسباب تھے اور اب اس قبضہ کے تسلسل کے جو تجارب و نتائج پیش آئے ہیں وہ عالم آشکارا ہو چکے ہیں اور ہمارے لئے کسی فریب نظر کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ارض مقدس کو یہودیوں کا "قومی نشیمن" بنایا جائے گا اور اس سلسلے میں انگلستان کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ اس یہودی وطن کی تعمیر کے اخراجات کے ایک معتدبہ حصہ کی فراہمی میں برطانوی ٹیکس دہندوں کو شرکت کی سعادت نصیب ہوگی! سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی یہ جماعت بافتہ امت بیت المقدس کی طرف اس ہجرۂ عظمیٰ کا ثواب آخر کیوں کمانا چاہتی ہے؟ نہایت معقول جواب یہ ہے کہ قوم یہود کی یہ متفقہ اور عالمگیر تمنا ہے کہ ارض یہودیہ کے اُجڑے گھر کو پھر بسائیں! لیکن

رض یہ ہے کہ اس بستی کے ساتھ موجودہ اہل خانہ کی جو خانہ ویرانی لازم و ملزوم نظر آتی ہے اُس کے لئے کیا سند جواز ہے ؟ کسی ملک میں توطن پذیرانہ حیثیت سے قدم رنجہ فرمانیکی صرف آرزو اُس ملک کا "تملیک نامہ" تحریر نہیں کرسکتی ! دنیا پوچھنا چاہتی ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کی دعوت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے کونسے دلائل و براہین ہیں ؟

قریباً تین ہزار برس ہوتے ہیں کہ ایک ایسے موقع پر جبکہ اپنی داخلی کمزوری سے معذور ہوکر سلطنت مصر نے اپنی قلعہ نشین افواج کو فلسطین سے ہٹا لیا تھا یہودیوں نے دریائے یردن کو عبور کیا اور ملک کے ایک حصہ پر قابض ہو گئے ۔ جس بربریت وسبعیت کا ثبوت انہوں نے اس عمر کا رنامے میں دیا اُس کے سامنے جرمنی کا حربی اسٹاف بھی اپنا سر نیاز جھکا دیگا اور کبھی ہمسری کی ہمت نہ کریگا ! فلسطین دو قدیم عظیم الشان تمدنوں کی باہمی شاہراہ کی ایک منزل تھا اس لئے اس خطہ پر یہودیوں کا عرصہ دراز تک کوئی دخل ممکن نہ تھا ' چنانچہ ایک وقت آیا کہ وہ یہاں سے نکالدئے گئے اور مختلف اقطاع و دیار میں جلا وطن کر دئے گئے ۔ اور بعد ازاں جب سائرس اعظم کے عہد میں انکو واپسی کی اجازت دیگئی تو اس دعوت پر ان کے ایک قدر قلیل جزو نے لبیک کہی ۔ ایرانیوں ' سکندر اعظم کے جانشینوں اور رومیوں کے دور میں یہ لوگ عموماً ایک قسم کی غلامی اور مقہوریت کی حالت میں رہے اور موخر الذکر جباروں کے زمانہ میں تو انہوں نے شام و فلسطین کے اندر ایک گونہ آتش مسئلہ کی حیثیت اختیار کرلی اور اپنے مسلسل فسادات اور آتش افروزیوں سے شاہ وقت کو مجبور کر دیا کہ وہ ان سب کو بیک جنبش دو دگوش ان نواح سے خارج البلد کر دے !

یہ ہے یہود کی شاندار تاریخ فلسطین ! ان یادگار تاریخی نظائر کو پیش کرکے وہ ارض مقدس کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں اور بعض دیگر دول بھی ان کی تائید و پشت پناہی میں برطانیہ کی ہمنوائی پر آمادہ کرلئے گئے ہیں ۔ لیکن اگر اہل مغرب کو خدا نے ایسی ہی توفیق دی ہے تو "حق بحقدار رسانیدن" کی اس مہم کو کسی دوسری جگہ سے شروع ہونا چاہئے ۔ قبل اس کے کہ یہودی باب بیت المقدس میں داخل ہوں ' مراکش کے مورش عربوں کو قرطبہ و غرناطہ میں اور امریکہ کے سرخ

ہندوستانیوں کو واشنگٹن میں :-

قدم نما دفر ود آکہ خانہ خانۂ تست

کی صلا دینی چاہئے! لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں اور امریکنوں کے جذبات معدلت گستری و مظلوم نوازی کی رگ یہاں حرکت میں نہیں آتی! آہ! بیچارے موّرش عرب اور ریڈ انڈینس، یہودیوں کی طرح دنیا کے صرافہ پر تو قابض نہیں ہیں جس کے زور پر وہ سلطنتوں اور حکومتوں کی نظارتہائے خارجیہ کے ایوانوں میں بیٹھکر ملکوں اور قوموں کے کاتبانِ تقدیر نہیں!

برطانیہ ماشاء اللہ اس بات کا پورا ممکن قلب اطمینان دلاتی ہے کہ وہ فلسطین میں عدل و نوشیروانی کا سکہ چلائیگی! لیکن ابھی تک تو یہ تمام اعلانات " دروغ مصلحت آمیز" سے زیادہ ثابت نہیں ہوئے ہیں فلسطین کے عربوں پر اس نئے دورِ حکومت میں جو بیت رہی ہے وہ ایک طویل اور دردناک داستان ہم ہم فلسطین کے عربی وفد کے اظہارات ومعروضات کے بعض اہم نقاط کو یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں - ارکانِ سفارت نے کہا تھا کہ (ملخصاً) :

" واضح رہے کہ ہم اعراب فلسطین اپنے قلوب میں کسی قسم کے منافی "سامیت" جذبات نہیں رکھتے - واقعہ یہ ہے کہ ہم یہودیوں کے لئے اُس وقت امن وملجا رہے ہیں جبکہ مغرب کے مسیحی ممالک کے اندر وہ کشتنی وسوختنی سمجھے جاتے تھے! ہمارے لئے جو چیز ناقابل برداشت ہے وہ یہودیت کے بجائے صیہونیت ہے جو فلسطین کے اندر مہمان بنکر آنا نہیں چاہتی بلکہ مالکانہ اور فاتحانہ حیثیت سے داخلہ چاہتی ہے!

عبرانی زبان جو مشکل سے ملک کی ایک فیصدی آبادی کی بولی ہوگی فلسطین کی سرکاری زبان بنائی جاتی ہے! صیہونی نووارد مزدور عرب غربا کو اُن کے قوتِ لایموت سے محروم کرتا ہوا آتا ہے - وہ عرب کے مقابلہ میں نصف کام کرتا ہے اور ڈبل اجرت پاتا ہے! تعمیرات عامہ کے قریباً سارے ٹھیکے یہودی سرمایہ داروں کی اجارہ داریاں ہیں جنکے سامنے غریب عرب "نرخ بالا کن" کی مبارزت میں ٹھہر نہیں سکتا! فلسطین کا ہائی کمشنر "معتمد قانونی"

خزینہ دار ذخائر ملکی، ڈائرکٹر تجارت و حرفت اور صیغۂ ہجرت کا افسر اعلیٰ سب یہودی ہیں اور صیہونی مشرب و مسلک کے یہودی! اسی طرح تمام دفاتر و محاکم میں نوآموز اور ناتجربہ کار یہودیوں کی یورش ہے! سارا دفتر تشریعی عرب کشی اور یہود نوازی کی روح سے معمور ہے! عربی صحائف و جرائد کی ناطقہ بندی کیجاتی ہے۔ حب وطن اور دلسوزی ملک کا نعرہ بلند کرنیوالے عرب قائدین ملت کو اس عذر پر طوق و سلاسل میں جکڑ بند کیا جاتا ہے کہ انکی سرگرمیاں امن عامہ کے لئے خطرہ ہیں! اُن مزارعین و فلاحین سے جو صحیح معنوں میں نسلاً بعد نسل' قرنہا قرن سے "فرزندان زمین" بنے ہوئے ہیں، یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی آراضیات کا بینامہ حکومت کے نام کر دیں اس لئے کہ ترکی سلطنت کے جائز وارث کی حیثیت سے تمام حقوق زمین نئی حکومت کے حق میں منتقل ہو گئے ہیں! یہ بیع نامنضبطی زمین بعد میں یہودی کاشتکاروں اور زمینداروں کے لئے عطیۂ جاگیرات بننے والی ہے!

شریعت اسلامیہ کے مسلمہ و اعلان کردہ آئین کو پامال کر کے صیہونیت آب یہودی حکومت فلسطین کے اسلامی اوقاف کے نظم و نسق میں بیباکانہ مداخلت کے درپئے ہے! یونانی راسخ الاعتقاد (تقلید مسلک) کلیسا کے وہ تمام اوقاف جنکو ترکوں نے ملک خدا سمجھکر کبھی ہاتھ نہ لگایا، آج بحق حکومت ایک ضبط شدہ جائداد قرار پاتے ہیں اور ایک سرکاری کمیشن کے زیر اہتمام عمداً اتنی بڑی بڑی مقداروں میں وا ئر نیلام کئے جاتے ہیں کہ بجز یہودی قارونوں کے کوئی دوسرا اُن سے عہدہ برا نہ ہو سکے!

اور یہ محض ایک مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ عرب روزانہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی ایسی بے شمار کارستانیاں اور ریشہ دوانیاں دیکھتا ہے جس سے اُس کے قلب کے اندر خون اُبال کھاتا ہے!

عرب لوگ انگلستان اور ساری مہذب دنیا سے سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آیا اُنکی یہ ساری تلخ نوائیاں شکوہ ہائے بیجا ہی ہیں؟"

باوجود دیکطرفہ ہونے کے یہ سب بیانات حق بجانب ہیں۔ برطانوی پبلک کو بالکل تاریکی میں رکھا گیا ہے ورنہ سیاہ وسفید کے مختار لوگ ایسا اندھیر کرنے میں کچھ متامل ہوتے۔ لیکن ڈاوننگ اسٹریٹ (بطا دارالوزارت عظمیٰ) میں یہودیوں کو جو رسوخ حاصل ہے وہ اب بھی اس اپیل کو بیسود رکھیگا۔ متمدن دنیا کے دارالعدل میں جو استغاثہ کیا گیا ہے یقیناً وہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوگا۔ بیشتر مغربی ممالک نیلام اس "کار نیک" کے سلسلے میں درحقیقت اپنے اپنے ہاں کی آبادی کے اُس عنصر سے گلوخلاصی کی فکروں میں ہیں جو اُن کے لئے صدیوں سے ایک عذاب و لعنت بن رہا ہے! پھر اس سے بڑھ کر کیا بات ہوگی کہ برطانیہ تنہا "خون دوعالم" اپنی گردن پر لینے کو تیار ہے! لیکن "کشتوں کا یہ خون" مستقبل قریب میں بڑے ہولناک طریقے سے رنگ لائیگا اور اُس وقت برطانوی حکومت کے موجودہ کارپردازوں کو معلوم ہوگا کہ وہ کونسی مہلک راہ پر گامزن تھے!

کیسی بوالعجبی ہے کہ یہ سلوک عربوں کو جنگ عظیم کی اُن فتوحات کا انعام ہے جنکے حصول میں اہل فاتح کار آلہ عربوں کی "جان و ایمان" کی وہ قربانیاں تھیں جو اس فریب خوردہ قوم نے اتحادیوں عموماً اور برطانیہ کو خصوصاً پیش کی تھیں:

انگریزی وزارت جو پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے وہ یقیناً بہت ہی اندوہناک ہے بیت المقدس کے ایک برطانوی افسر سے جب میں نے اس بارہ میں تبادلہ خیالات کیا تو اُس نے فی الفور کہا کہ "یہ نہ سمجھئے کہ فلسطین کے ۸ لاکھ عرب غیر معین زمانہ تک ۸ ہزار یہودیوں کے مظالم و مفاسد کا اپنے کو تختہ مشق بنائے رکھیں گے۔ اُن کی یہ قومی مصیبت بلاشبہ ناقابل برداشت ہے اور جلد یا بدیر اُن کی تلوار سے ضرور ایک قتل عام کا فوارۂ خونی بہہ نکلیگا! بدقسمتی یہ ہے کہ یہ آفت یہیں تک محدود نہ رہیگی۔ جواب میں یقیناً برطانوی جنگی بیڑہ حرکت میں آئیگا اور انگریزی سنگینیں فلسطین کے تمام عربوں کو ذبح کر ڈالینگی البتہ ممالک اور نیز اسلامی ہندوستان کے مطلع پر ان خونچکاں حوادث کا جو عکس پڑیگا اُس کو چشم تخیل سے دیکھا جاسکتا ہے!

برطانیہ میں جتنے لوگ ماہرین مشرق کہلائے جانیکی اہلیت رکھتے ہیں ان کا بیشتر حصہ اس روش

کو سخت مخدوش کہتا ہے۔ لارڈ سڈنہم نے اُس تقریر پیچ کے دوران میں جو فلسطینی وفد کی آمد کے وقت انہوں نے ارشاد فرمائی تھی کہا تھا کہ: "لارڈ بالفور نے صیہونی یہودیوں کے لئے اپنے مشہور اعلان میں جو گلدستہ پیش کیا ہے وہ اس جماعت کے لئے ایک ڈائنامیٹ کا گولہ ثابت ہوگا! فلسطین کے خرمن امن میں اس حرکت سے ہم جو شرارہ لگائیں گے وہ تمام مشرق میں اتنی وسیع آتش جدال وقتال کو مشتعل کریگا کہ ہمارے سارے وسائل اُس کو سرد کرنہیں سوخت ہو جائیں گے!"

میں اسی قول فیصل پر فلسطینی مسئلہ کی بحث کو ختم کرتا ہوں، اور عراق کی طرف پھر بازگشت کرتا ہوں۔

عراق عرب کے اندر ۱۹۲۰ء میں جو بغاوت ظہور پذیر ہوئی اُس نے دو طرفہ اپنا زبردست خراج خون وزر وصول کرنے کے علاوہ اگر اور کچھ نہیں کیا تو کم از کم زبان آتشیں سے یہ اعلان تو کر دیا کہ ملک کی عام آبادی برطانوی دخل کو کسی طرح خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ لطف یہ ہے جیسا کہ مجھکو نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا! کہ اس ناکامیاب انقلاب کے اصل داعی شاہ فیصل کے عین ہواخواہوں میں سے ہیں! نیز یہ کہ اس مہم کے تغذیہ کیلئے جو روپیہ ملا تھا وہ اُس رقم نذرانہ کا ایک حصہ تھا جو برطانوی خزانہ ملک الحجاز کو پیش کیا کرتا ہے! انگلستان کو دیکھنا چاہیئے کہ کہاں تک وہ اپنی کمائی "بجائے حرام رفت" کی قربانگاہ پر چڑھاتا رہے گا!

عراق اور شاہ عراق کیساتھ جو دوستانہ معاہدات اور خوشگوار تعلقات ہیں وہ دراصل ایک سوانگ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ فیصل کے تخت شاہی کے پائے برٹش سنگینیں ہیں، اور اگر انگریزی فوجی طاقت عراق سے مراجعت کر آئے تو برطانوی ہائی کمشنر کے نقوش قدم پر ہی جناب فیصل بھی زمین ناپتے ہوئے نظر آئیں گے!

فیصل کی تخت نشینی فی الحقیقۃ اُس "دین" کی ادائگی کی ایک قسط تھی جو دوران جنگ میں شریفی خاندان کی خدمات کی بنا پر برطانیہ کے ذمہ واجب الادا سمجھا جاتا تھا! ورنہ باستثنائے نوجوان عرب پارٹی کے عراق عرب کے تمام علما، تجار، اکرد، اور وادی فرات کے جملہ قبائل فیصل کو اپنا سرتاج بنانے

کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے۔

فیصل کی تائید میں عراق عرب کے اندر جو مصنوعی استصواب عامہ کرایا گیا وہ بھی ایک ناقابل رشک انتخاب تھا۔ عالم بالا سے تمام ہدایات پیشگی صادر ہو چکی تھیں! اگر کسی نے کوئی کلمہ "حق بر زبان جاری" کیا تو سخت مواخذہ و محاسبہ کے شکنجے میں کسا گیا۔ انہی گناہوں کی پاداش کے سلسلے میں مشہور زعیم طالب پاشا کی جلا وطنی سیلون کا فی تشہیر حاصل کر چکی ہے۔

اپنی محرومیٔ قسمت سے میں شاہ فیصل کی تاجپوشی کی تقریب سعید میں شریک ہونے کے لئے وقت پر بغداد نہ پہنچ سکا، حالانکہ تمام لوازم کے اعتبار سے یہ موقع قابل دید و قابل داد تھا۔ ادنیٰ کمال یہ ہے کہ اتنے عظیم الشان قومی جشن کو منانے کے لئے کوئی قومی ترانہ بجز "God save the King" کے نہ تھا!

عراقی حکومت کے اخراجات اپنی گرانباری کی بنا پر ضرب المثل ہو رہے ہیں، اس پر طرہ یہ ہے کہ ملک کے سرچشمہائے آمدنی کے بعض صیغے ابھی سے اغیار کے ہاتھوں میں جا پڑے ہیں۔ عراقی ریلویز اور بندرگاہ بصرہ (جو ملک کا تنہا بحری تجارت کا دروازہ ہے) ایک برطانوی کمپنی کے اجارے میں ہے جو اپنے حلقے کے اندر سیاہ و سفید کی مختار کل ہے اور حکومت کا اس پر کوئی اقتدار نہیں۔ حکومت کی جیب میں اتنے ٹکے نہیں ہو وہ ریلوے کمپنی کی کل متاع و حقوق کو خرید سکے اور کمپنی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اپنی ذاتی اغراض و مصالح کو ملک کے مفاد کی خاطر قدرے نظر انداز کریگی!

برطانوی کابینۂ وزارت کی اُن تمام حرکات مذبوحی پر جنپر وہ مشرق قریبہ اور ایشیائے وسطیٰ میں عمل پیرا ہے ہم ایک عمومی و مجمل نظر ڈالتے ہیں:

ہندوستان اور مصر کے اندر وہ انتہا پسندوں کو مہمیز لگا رہی ہے، عراق عرب اور فلسطین کے باشندگان ملک کی پامالیٔ جذبات اور اغماض حیات کی ابتدائی مہم جاری ہے، افغانستان کے متعلق اُس کی روش کو شاید صورت حالات کا جائز فتویٰ کہا جائے، لیکن ٹرکی کے معاملے میں وہ اپنی شاہراہ عمل سے نہایت افسوسناک طریقے سے پیچھے پھر رہی ہے۔ روس کے بارے میں اُس کی حکمت عملی کسی دا

ل پر مبنی نہیں۔ علاقہ قفقاز کی نوزائیدہ جماہیر کو ہم اس لئے درخور اعتنا نہیں سمجھتے کہ ہمارا خیال ہے کہ حضرات الارض جیسی حکومتیں جلد یا بدیر روسی پارٹی میں جذب ہو جائینگی۔

برطانوی حکومت کی پالیسی پر ایک اصولی تنقید ان الفاظ میں کیجا سکتی ہے کہ جس جگہ مضبوط نے کی ضرورت ہے وہاں وہ نہایت مضرت رساں نامردی کی نمائش کرتی ہے اور جس جگہ "سپر باید انداختن" کا مقتضا ہوتا ہے وہاں وہ ناعاقبت اندیشانہ مظاہرات طاقت برپا کر دیتی ہے۔ ایک سری نوعیت یہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں سے ہو کر سلطنت کے مقاصد کے نکلنے کی کبھی تو بدترین توقع بھی نہیں ہو سکتی وہاں وہ آدمیوں اور روپیہ کا دریا بہا دیتی ہے۔ سلطنت کے طول و عرض کے اندر مختلف و گوناگوں اقدامات کے مابین کوئی یکسوئی و یکجہتی اور مقصد واحد و مشترک نظر نہیں آ! مخفی معاہدات اور خفیہ سیاست بازی ایک دوسرا بے سود اور مضر مشغلہ ہے جو برطانوی وزارت بہت مرغوب معلوم ہوتا ہے!

سائل

"حضور..... سرکار..... بندہ پرور..... تین دن ہو گئے ہیں..... فاقہ ہے.... کھیل اڑکر جو منہ کو گئی ہو۔ برف پڑ رہی ہے۔ دو اتی بھی نہیں کہ جاکر چھت تلے رات بسر کروں۔ اللہ سب جانتا ہے۔ اُس کی مرضی..... آٹھ برس ایک دیہاتی مدرسہ میں پڑھا چکا ہوں۔ نہ کچھ خطا نہ قصور۔ انسپکٹر نے معائنہ بُرا لکھ دیا۔ اب سال بھر سے دھکے کھاتا پھرتا ہوں......؟

وکیل صاحب، اسکورزو نے سائل کے پرانے نیلے کوٹ پر نظر ڈالی، اس کی گدلی گدلی مخمور اور غمگین آنکھوں کو دیکھا، گالوں پر لال لال ٹیکے دیکھے اور نہ جانے کیوں اُسے یہ یقین سا ہو گیا کہ ہو نہ ہو اس آدمی سے میں پہلے ضرور کہیں مل چکا ہوں۔

"اور حضور۔ ابھی جو پہونچ سکوں تو کلسگا کے ضلع میں ابھی آج مجھے ملازمت ملجائے۔ لیکن کرایہ کے لئے بھی تو کوڑی پاس نہیں۔ سرکار۔ اللہ آپ کا بھلا کرے گا۔ مسیحؑ کے نام پر میری کچھ مدد کیجئے۔ مجھے مانگتے شرم آتی ہے مگر کیا کروں۔ مصیبت بری بلا ہے۔"

وکیل صاحب نے سائل کے ربر کے جوتوں کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ ایک جوتا اونچا تھا، ایک نیچا۔ نگاہ پڑنا تھی کہ کچھ یاد آ گیا۔

"سنئے ہو جی، میاں صاحب، مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم تم پرسوں کہیں مل چکے ہیں۔ اُدھر بازار میں۔ مگر اُس وقت تم دیہاتی مدرس نہیں تھے۔ بلکہ مدرسہ سے نکالے ہوئے طالب علم تھے۔ کیوں، ٹھیک ہے نہ؟"

"نہ..... نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ناممکن ہے۔" سائل نے دبی دبی آواز سے کہا "میں تو مدرس ہوں۔ آپ کہئے تو اپنے کاغذات دکھلا دوں۔"

"بس ان فضول کی جھوٹی باتوں کو رہنے دو۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم طالب علم تھے، یہ تک

بتایا تھا کہ کس وجہ سے مدرسہ سے علیحدہ کئے گئے۔ کیوں، یاد آیا کہ نہیں؟"

مخاطب نے سر ہلایا۔ وکیل کو کچھ غصہ سا آیا اور اُس نے اظہار نفرت کے طور پر اس مفلوک الحال سائل کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور غصہ سے کہا: "یہ تو پتلے درجہ کا کمینہ پن ہے۔ کیوں جی تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہارا علاج تو بس یہ ہے کہ تمہیں گرفتار کرا دیا جائے۔ لاحول ولا۔ مانا کہ غریب ہو، بھوکے ہو لیکن اس وجہ سے یہ تھوڑی ہے کہ بیشرمی سے جو چاہو جھوٹ بک دو۔"

سائل کچھ گھبرا کر اور پریشان ہو کر ذرا پیچھے کو ہٹا اور دروازہ میں جو موٹھ لگی تھی اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا اور آہستہ سے کہا "میں نے ...... میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ آپ کہئے تو اپنے کاغذ دکھادوں۔"

"تم کیے جاؤ، یقین کون کرتا ہے۔ لوگوں کو طالبعلموں اور دیہاتی مدرّسوں سے جو ہمدردی ہے اس سے اس طرح بیجا فائدہ اٹھانا سخت کمینہ پن ہے۔ ذلیل، قابل نفرت۔ شرماؤ جی شرماؤ۔"

اسکورزو کو غصہ آگیا اور اُس نے نہایت بے رحمی سے سائل کو جھڑک کر نیچے اُتار دیا۔ جھوٹ کی وجہ سے اسکورزو کے اندر اس سے نفرت اور حقارت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو انسانیت پر جو یقین تھا اُسے صدمہ پہنچا تھا اور وہ چڑھ سا گیا تھا کہ انسانی ہمدردی کے جذبہ سے اس طرح کمینہ پن کے ساتھ فائدہ اٹھا کر یہ شخص اس خیرات کو آلودہ کرنا چاہتا ہے جو یہ نہایت صدق دل اور خلوص کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ سائل نے اپنی بریت میں کچھ اور کہنا چاہا۔ قسمیں کھائیں۔ لیکن بالآخر خاموش ہو گیا، شرما کر گردن نیچی کر لی۔ اور سینہ پر ہاتھ رکھکر کہنے لگا۔ "ہاں، حضور، سچ ہے۔ میں نے واقعی ..... واقعی جھوٹ بولا۔ میں نہ طالب علم ہوں نہ دیہاتی مدرس۔ یہ سب غلط تھا۔ میں گرجا میں گایا کرتا تھا۔ پھر پینے کی لت لگ گئی اس لئے مجھے نکالدیا گیا۔ لیکن میں کروں تو کیا کروں؟ بے جھوٹ کے کام بھی تو نہیں چلتا۔ سچ کہتا ہوں تو کام نہیں چلتا۔ سچ بولوں تو کوئی ایک دمڑی نہ دے۔ سچ بولوں تو بھوکوں مرجاؤں۔ آپ کا کہنا ٹھیک ہے۔ بالکل درست ہے لیکن آخر کروں کیا؟"

"کروں کیا؟ مرد آدمی، پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ کروں کیا؟" اسکورزو نے بہت نزدیک آکر کہا، "کرو کیا! کام کرو، کام۔"

"کام کروں ـــــ بہت ٹھیک۔ مگر کام پاؤں کہاں؟ مجھے کوئی کام نہیں دیتا؟"

"بکواس کرتے ہو۔ تم ابھی نوجوان ہو، ہٹے کٹے ہو، تندرست ہو۔ کام کرنا چاہو تو کام کیوں نہ ملے۔ مگر نہیں۔ تم تو سست ہو گئے، بیکار بن گئے ہو۔ عادت بگڑ گئی ہے۔ شراب میں مست رہتے ہو، شراب میں۔ دس قدم پر کھڑے ہو تو شراب کی بو آتی ہے۔ جھوٹ تمہارے گوشت پوست میں داخل ہو گیا ہے۔ اور تم بس اب جھوٹ بول سکتے ہو اور بھیک مانگ سکتے ہو۔ اور اگر کبھی کام پر آمادہ بھی ہوتے ہو تو ضرور ہے کہ کام ہلکا ہو اور مزدوری بھاری۔ کیوں ہے نہ؟ کسی گھر میں خدمتگاری یا کارخانہ میں مزدوری یہ تو آپ کو پسند نہ ہو گی؟ ٹھیک ہے، آخر اپنا اپنا مزاج بھی تو ہوتا ہے اور اپنی اپنی پسند!"

سائل کے لبوں پر نہایت تلخ تبسم رونما ہوا اور اس نے کہا "آپ آخر ایسی باتیں کیوں فرماتے ہیں...... مجھے کام کہاں مل سکتا ہے؟ Kommis کے لئے میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، ایسے تو لڑکپن ہی میں شروع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صیح عرض کرتا ہوں نہ؟ گھر میں خدمتگار مجھے کوئی بناتا نہیں۔ اس لئے کہ شکل صورت ایسی ہے کہ لوگ 'تو' 'تو' کہتے ذرا رکتے ہیں۔ یہی حال کارخانہ میں مزدوری کا ہے۔ اس کے لئے آدمی کو کوئی دستکاری آنی چاہئے۔ سو میں اس سے بھی نابلد ہوں...... لیکن"

"جی۔ جی۔ عذروں کی تو تمہارے پاس کبھی کمی نہ ہو گی۔ لیکن یہ تو کہو لکڑیاں چیرنے کا کام کیسا ہے؟" "میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ خوشی سے۔ لیکن آجکل تو خود پیشہ ور لکڑہاروں تک کے لئے کام نہیں ہے۔"

"اچکے اور نکمے ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔ ابھی اگر میں تمہیں یہ کام دوں تو ظاہر ہے انکار کر دو گے۔ یا نہیں، لکڑی چیرنے پر تیار ہو؟"

"جی ہاں۔ خوشی سے۔"

"بہت اچھا۔ پھر کیا ہے۔"

اسکورزو نے کچھ شرارت آمیز طریقہ سے اپنے ہاتھ ملے اور گھر میں سے ماما کو بلایا۔

"اولگا۔ انکو باورچی خانہ میں لے جاؤ۔ یہ وہاں لکڑیاں چیریں گے"

سائل نے کندھے اچکائے۔ اُس کے چہرے سے شبہ سا ظاہر ہوتا تھا کہ کروں کیا۔ اسی شبہ کی حالت میں باورچی خانہ کی طرف چلا۔ ظاہر تھا کہ اُس نے یہ کام صرف اس لئے قبول کر لیا تھا کہ پھر سے لیل صاحب اسے جھوٹا، کذاب نہ کہ سکیں۔ ورنہ نہ کام کا شوق تھا، نہ بھوک کی وجہ سے وہ اس پر آمادہ ہوا تھا۔ اس پر اسوقت شراب کا اسقدر اثر تھا اور اُس کے اعصاب اسقدر کمزور تھے کہ کام کی طرف تو اسمیں ذرا بھی رغبت نہ تھی۔

اسکورزو جلدی جلدی اپنے کمرہ میں گیا۔ کھڑکی میں سے لکڑی کا گودام اور نیچے صحن کی تمام کارروائیاں اُسے اچھی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ یہاں کھڑے کھڑے اس نے دیکھا کہ ماما اور سائل صحن میں آئے اور میلے میلے برف پر سے چلکر باورچی خانہ کی طرف گئے۔ اولگا اپنے ساتھی پر عجیب بُری نظریں ڈال رہی تھی اور اظہار نفرت کے لئے مڑ مڑ کر تھوکتی جاتی تھی۔ ماما نے گودام کا دروازہ کھولا اور پھر زور سے کواڑ بند کئے۔ اسکورزو نے دل ہی دل میں کہا "شاید ماما بیگم چا پی رہی تھیں۔ مخل ہوئے۔ اسپر بگڑی ہوئی ہیں۔ یہ بھی عجیب مخلوق ہے"

پھر اُس نے دیکھا کہ یہ سائل، جھوٹ موٹ کا طالبعلم اور مدرس، لکڑی کے ایک بوسٹے پر بیٹھ گیا، اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لیا اور نہ معلوم بیٹھ کر کیا سوچنے لگا۔ ماما نے زور سے لاکر کلھاڑی اس کے پیروں کے پاس دے ماری اور پھر کچھ منہ بنا کر تھو تھو کرنے لگی۔ سائل نے لکڑی کا ایک ٹکڑا بڑی بے دلی سے اپنی طرف گھسیٹا اور پاؤں سے دبا کر اُس پر کلھاڑی چلائی۔ کلھاڑی پھسل گئی اور لکڑی ایک طرف اچھل کر گری۔ سائل نے اسے پھر ٹھیک ٹھیک رکھا اور پھر کلھاڑی چلائی لیکن وار بھرپور نہ پڑا اور لکڑی اچھل کر ایک طرف کو گری۔

اسکورزو کا غصہ فرو ہو چکا تھا بلکہ اُسے اب اپنے طرز عمل پر کچھ شرم سی آنے لگی تھی۔ بھلا یہ کونسی انسانیت ہے کہ ایک تعلیمیافتہ، آرام طلب، اور شاید بیمار آدمی کو اس کڑاکے کی سردی میں اور ایسے سخت کام پر مجبور کیا جائے۔ لیکن اُس نے سوچا "کہ خیر، یہ سب اسکے فائدہ ہی کے لئے ہے"

کوئی آدھ گھنٹہ میں اولا آئی اور وکیل صاحب کو اطلاع دی کہ لکڑی سب چِر گئی۔ " اچھا تو اسے ایک روپیہ دیدو اور اس سے کہدو کہ جی چاہے تو ہر مہینہ کی پہلی کو یہاں آکر لکڑیاں چیر جایا کرے۔ دنیا میں کام کی کمی نہیں ہے۔"

دوسرے مہینہ کی پہلی تاریخ کو سائل پھر موجود تھا۔ پیر لڑکھڑاتے تھے اور کھڑا ہونا مشکل تھا مگر اس دفعہ بھی وہ ایک روپیہ کما کرلے گیا۔ اب تو یہ اکثر آنے لگا اور ہر مرتبہ اسے کچھ نہ کچھ کام مل ہی جاتا۔ کبھی راستہ سے برف ہٹانی ہوتی، کبھی صحن اور گودام میں جھاڑو دینی ہوتی، کبھی قالین اور دریاں جھاڑنی ہوتیں، اور ہر دفعہ اسے روپیہ بارہ آنے مل ہی جایا کرتے۔ اور ایک دفعہ تو کچھ پُرانے کپڑے بھی مل گئے تھے۔

وکیل صاحب نے جب اپنا مکان بدلا تو اسی سے تمام سامان ٹھیک کرا کے بھجوایا۔ اس دفعہ تو اس کے حواس بھی درست تھے۔ یہ پئے نہ تھا لیکن ذرا چپ چاپ اور کھنچا کھنچا ضرور تھا۔ جب سامان گاڑی پر لد گیا تو یہ سر جھکائے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گاڑی والوں نے اسکی کمزوری، اسکی سستی، اور اس کے پیوند لگے ہوئے کوٹ پر فقرے کسنے شروع کئے تو بیچارہ چپ رہا اور سردی میں سی سی کرتا سر جھکائے چلا گیا۔ جب اسکو رزو دوسرے مکان میں پہونچ گیا تو اُس نے اسے اپنے کمرہ میں بُلایا اور اُس سے کہا " معلوم ہوتا ہے کہ میرے الفاظ کا تم پر اثر ہوا ہے یہ لو، یہ پانچ روپیہ کا نوٹ ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اب پیتے نہیں اور کام سے بھی جی نہیں چُراتے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

" ٹُشکو "

" ٹھیک، میں اب تمہارے لئے ایک دوسرا بہتر کام تجویز کرتا ہوں۔ کیا تم لکھنا جانتے ہو؟"

" جی ہاں "

" تو یہ خط لیکر کل میرے دوست ــــــ کے پاس جانا۔ وہ تمہیں نقل کے لئے کاغذات دیں گے۔ خوب جی لگا کر کام کرنا۔ پینا چھوڑ دو۔ اور میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے اس کا خیال رکھو۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

اس بات سے دل میں خوش ہو کر کہ اس نے ایک انسان کو کام کا خوگر بنایا' اسکوزدو نے سائل کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور رخصت کے وقت اس سے ہاتھ تک ملایا۔ لشکو خط لیکر رخصت ہوا اور پھر یل صاحب کے یہاں کبھی دکھائی نہ دیا۔

دو برس گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت اسکوزدو ایک تھیٹر کے سامنے ٹکٹ خرید رہا تھا۔ اس کے بازو میں ایک شخص بالوں کا کوٹ پہنے اچھی سی ٹوپی لگائے کھڑا تھا۔ یہ آخری درجہ کا ٹکٹ مانگ رہا تھا اور قیمت میں تانبے کے ادھنّے دے رہا تھا۔

اسکوزدو نے اپنے پرانے لکڑی چیرنے والے کو پہچان لیا اور بول اٹھا "لشکو! کیا تم ہو؟ و کیا کرتے ہو؟ کیا شغل ہے؟ کیا حال چال ہیں؟"

"شکریہ۔ بس گزرتی ہے۔ میں آجکل ایک مختار کے یہاں ملازم ہوں اور مہینہ میں ۳۵ روپیہ پاتا ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ لشکو! سچ کہتا ہوں مجھے سکر بہت ہی خوشی ہوئی کیونکہ میں نے ہی تمہیں کام سے لگایا۔ تمہیں یاد ہے کہ میں کیسا بگڑا تھا۔ ہارے شرم کے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ خیر' خدا کا شکر ہے کہ میری باتوں کا اثر ہوا۔"

لشکو نے کہا "میں آپ کا بہت ہی شکر گزار ہوں۔ اگر میں اس وقت آپ کے پاس نہ جاتا تو شاید اس وقت بھی اپنے کو طالبعلم یا مدرس بتاتا ہوتا۔ جی ہاں۔ آپ ہی نے میری صلاح کی۔"

"میں سچ کہتا ہوں مجھے بہت ہی خوشی ہے۔"

"میں پھر آپ کے الفاظ اور آپ کی مہربانیوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے وقت خوب کہا تھا۔ میں آپ کا بہت ہی شکرگزار ہوں۔ لیکن آپ سے زیادہ آپ کی ماما کا۔ خدا اس نیک اور ایماندار عورت پر اپنی رحمتیں بھیجے۔ آپ نے اس وقت خوب باتیں کہیں اور میں مرتے مرتے آپکا ممنون رہونگا لیکن نجات دلائی مجھے اُسی آپ کی ماما اولگا نے۔"

"میری ماما اونگانے؟ وہ کیسے؟"

"بہت معمولی طریقہ سے۔ جب میں آپ کے یہاں لکڑی پھاڑنے آتا، تو وہ شروع کرتی "اے شرابی۔ بدقسمت آدمی۔ چلتا کیسے ہے، ابھی تک ختم کیوں نہیں ہو گیا؟" پھر وہ میرے سامنے بیٹھ جاتی نہایت غمگین آنکھوں سے مجھے دیکھتی، روتی اور کہتی: "بدنصیب! کمبخت! تیرے لئے اس دنیا میں کوئی آرام نہیں کوئی خوشی نہیں اور شرابی ہے، اُس دنیا میں بھی جہنم میں جلیگا۔ ہے ہے غریب گناہگار"۔ غرض ہمیشہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتی۔ اس نے میری وجہ سے کتنی کوفت نہیں اٹھائی کتنے آنسو میری ہمدردی میں نہیں بہائے۔ میں آپ سے کیا بیان کروں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے اس نے ہمیشہ میری جگہ آپ کی لکڑیاں پھاڑیں۔ آپ کو معلوم بھی ہے، میں نے آپ کے مکان میں ایک چپپ لکڑی کی نہیں پھاڑی۔ وہ یہ سب کیوں کرتی تھی اور اُس کے اثر سے میں کیسے بالکل بدل گیا اور پینا کیسے چھوڑ دیا۔ میں خود نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی باتوں سے اس کے شریفانہ برتاؤ سے میری روح میں ایک انقلاب ہو گیا۔ میری اصلاح اُسی نے کی اور میں اُسے کبھی نہ بھولوں گا ..... لیکن معاف فرمائیے۔ اب وقت ہو گیا ہے، وہ گھنٹی بج رہی ہے۔"

شکو نے سلام کیا اور اپنے درجہ میں جا داخل ہوا۔

غزل

(از مولانا محوی صدیقی)

چکی تھی نقاب یار سے　　جگمگا اُٹھی ہے دنیا تابشِ انوار سے
م حسن وعشق کے اسرار سے　　ہوگئیں سرگوشیاں دل اور نگاہِ یار سے
ر میں تھیں خونکی بوندیں تھیں　　رات بالیں پر جو ٹپکیں دیدۂ بیدار سے
، کی اللہ رے سادہ دلی !　　آرزوئے التفات اور وہ بھی چشمِ یار سے !
لرا تو پائے ساقی پر گرا　　یہ ہوا ہے کام اک دیوانۂ ہشیار سے
ندگی نے کر دیا ایسا اُداس　　جی نہ بہلا پھر کبھی نظارۂ گلزار سے
تنائے لذّتِ دیوانگی　　جو نظر آتے ہیں اس محفل میں کچھ ہشیار سے
و گیا دِل بے نیازِ کائنات　　نعمت دارین کیا پائی نگاہِ یار سے
درد سے لبریز سوزِ دل کا حال　　چھا گیا محشر میں سناٹا مری گفتار سے
ستِ قدرت کی ستم آرائیاں　　پھول ہم آغوش گلشن میں ہوئی ہیں خار سے
. وہ زخم جگر اے ضبطِ غم　　آج تک جسکو چھپایا اپنے ہر غمخوار سے

جی بھر آیا آ گئی محوی جوانی اپنی یاد
جھوم کر اُٹھی گھٹا جب دامنِ کہسار سے

دوشیزۂ سحر

(از حضرت دردؔ کاکوروی)

دوشیزۂ سحر تو محبوبۂ فلک ہے
تیری جبینِ روشن فطرت کی اک جھلک ہے

آمد کے تیری ہر سو سب اگ گا رہے ہیں
جنگل کے بسنے والے تانیں اڑا رہے ہیں

کیفِ جسم ایسا رقصاں طیور میں ہے
ہر طائرِ خوش الحاں گویا سرور میں ہے

اسرار جبر خامشی سے دریا جو بہہ رہے ہیں
فطرت کے چپکے چپکے سب راز کہہ رہے ہیں

دوشیزۂ سحر کی آنے کو ہے سواری
کیوں چھوڑ دیں نہ رستہ تاریکیاں فضا کی

کرتی چکی تھی فطرت ہر ایک شے پہ پالش
اک دم ہوئی ہوا کو پھر غیب سی جو جنبش

اتنے میں اک حسینہ رقصاں ہوئی فضا میں
خورشید کی کرن تھی ٹانکے ہوئے ردا میں

وہ دیکھو ظلمتوں کو پُر نور کر رہی ہے
عالم میں نام اپنا مشہور کر رہی ہے

ہر پتہ رقص میں ہے ہر ڈالی جھومتی ہے
دوشیزۂ سحر کے قدموں کو چومتی ہے

دوشیزۂ سحر تو جلوے دکھا رہی ہے
فطرت کی چلمنوں سے یا مسکرا رہی ہے

یہ تیری مسکراہٹ رنگینیوں کی ہیکل
عالم کا کھولتی ہے دروازۂ مقفل

وہ دیکھو لے رہی ہے دل میں نسیم موجیں
آغوش میں لئے ہے نورِ سحر کی فوجیں

شبنم کے برگِ گل پر قطرے پڑے ہوئے ہیں
فطرت کے یا چمن میں موتی جڑے ہوئے ہیں

کیا مست کر رہے ہیں طائر چہک چہک کر
کیا نغمے گا رہی ہیں چڑیاں پھدک پھدک کر

اے دردؔ ہو گیا ہوں دیوانۂ سحر میں
لیلائے رنگ و بو ہے عالم مری نظر میں

"ہندو کُش" عالمگیر کے عہد

کی

دو عجیب ہندو کتابیں

(کتبخانۂ جامعہ میں)

جامعہ ملیہ کی پُراصرار دعوت پر مجھے ایک ہفتہ کے لئے جامعہ آنا پڑا، اور اسی تقریب سے اُس کے کتبخانہ کی سیر کرنی پڑی۔ ارباب جامعہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے آٹھ برس کی مختصر مدت میں اپنے دوسرے شعبوں کے ساتھ اپنے کتبخانہ کو بھی قابل قدر حد تک وسعت دی۔ اس وقت اُس کے کتبخانہ میں کم و بیش آٹھ ہزار کتابیں ہیں جن میں عربی، فارسی، انگریزی اور اُردو کی کتابیں داخل ہیں، جو قرینہ کے ساتھ الماریوں میں رکھی ہیں اور مرتب ہیں۔ ان میں ڈھائی سو کے قریب عربی اور فارسی کی قلمی کتابیں ہیں جنکی ہنوز ترتیب کی نوبت نہیں آئی تھی میں نے اپنے مختصر قیام میں ان کتابوں کو دیکھا اور ان میں بعض ایسی کتابیں پائیں جو مختلف حیثیتوں سے قدر کے قابل تھیں منجملہ ان کے دو کتابیں مجھے نہایت عجیب معلوم ہوئیں کہ ان کا کوئی نسخہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

اِن دونوں کتابوں کی ندرت اور قدر کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اُس اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی تصنیف ہیں جس کو اُس کے دشمن اور مخالف، ہندو کش، ہندو علوم و فنون کا برباد کرنے والا، ہندو مذہب کو تباہ کرنے والا، ہندؤوں کو زبردستی مسلمان بنانے والا مشہور کرتے رہے ہیں، لیکن دوسری شہادتوں اور دلیلوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ خاموش کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں کہ اُس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام الزام تہمت ہیں۔

ان میں سے ایک کتاب کا نام "مت ابھرا" اور دوسری کا نام "ردّ کفر" ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کی دو مخالف اور متضاد منظروں کو پیش کرتی ہیں۔ پہلی کتاب ایک پکے ہندو کی تالیف ہے اور دوسری

ایک نومسلم ہندو کی پہلی کتاب کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو اُن کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، دوسری کا بت پرست ہندوؤں کو اسلام کا راستہ دکھانا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی زبان فارسی ہے، جو اُس زمانہ میں تمام ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان تھی۔

۱۔ مت اچھرا

یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۲۱۴ صفحوں میں ہے، کتاب کا یہ نسخہ فرخ آباد میں ۱۴ فروری ۱۸۴۸ء مطابق ۹ ربیع الاول ۱۲۶۴ھ کو اختتام کو پہنچایا ہے۔ کاتب کا نام سید کلام الدین شاہ قادری ساکن فرخ آباد ہے، کاتب مذکور نے یہ نسخہ قاضی محمد غلام محی الدین خاں "سررشتہ دار محکمہ کچہری صدر امین اعلیٰ" کے لئے لکھا ہے، جیسا اس کے آخر میں بیان ہے۔

کتاب کی فارسی زبان خاصی ہے، جا بجا اصطلاحات ہندی اور سنسکرت کے استعمال کئے ہیں، افسوس ہے کہ نسخہ بہت غلط ہے۔ دیباچہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جاک بلک (اور خاتمہ میں جاگ ولگ ہے) نام اُ رکھیسر (؟) نے بکرماجیت کے زمانہ میں اس کتاب کو اشلوک میں لکھا تھا۔ اس کا نام "سمرت جاک بلک" مشہور ہوگیا تھا۔ چونکہ وہ بہت مشکل کتاب تھی اس لئے گوشائیں بکھانیر (؟) نے اس کو نئے سرے سے مرتب کر کے اس کا خلاصہ کیا، اور "مت اچھرا" نام رکھا۔ اسی خلاصہ کا سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں لعل بہاری ولد رائے کا ہید سنگھ نے جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور جو اورنگ زیب کے دربار میں امیر اللہ وردی خاں کا متوسل تھا، ۱۰۶۰ھ میں سوبھاسکر پنڈت کی مدد سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، تاکہ سنسکرت سے ناواقف اس کو سمجھ سکیں اور فائدہ اٹھائیں۔ یہ سوبھاسکر پنڈت سنسکرت کے بڑے ماہر اسلام آباد عرف متھولی واقع سرکار گورکھپور کے باشندہ تھے۔

کتاب کا موضوع جیسا کہ دیباچہ میں ہے "احکام و مذاہب و اوامر و مناہی (نواہی؟) ہنود" کتاب تین مقالوں پر منقسم ہے اور ہر مقالہ میں متعدد فصلیں ہیں۔

مقالہ اول "در آچار و عبادتے کہ آنرا بزبان عرب عبادت گویند"، اس میں ۹ فصلیں ہیں۔

مقالہ دوم " در بیوپار ادھیائے کہ عبادت از معاملات باشد" اسمیں ۵۴ فصلیں ہیں۔
مقالہ سوم " در پرائشچت ادھیائے کہ آں را کفارت (کفارہ ؟) خوانند" اسمیں ۵ فصلیں ہیں۔

فصلوں کی تفصیل تو مشکل ہے مگر اس ترتیب و تعبیر سے صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانہ کے "روشن خیال" ہندوؤں کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے شاستر کو اسلامی فقہ کے نمونہ پر تیار کریں۔ جس طرح آج ہمارے محکوم روشن خیال اپنی اسلامی فقہ کو انگریزی قانون کی صورت میں ڈھالنے کے لئے بیقرار ہیں۔

اس کتاب کے دیباچہ میں "ہندو کش عالمگیر" کو جن آداب و القاب سے یاد کیا گیا ہے، وہ آج ہمارے ہندو بھائیوں کے پڑھنے کے لائق ہے۔

"اکنوں کہ دریں عہد بادشاہ، خلافت پناہ، عادل، مظفر، مؤید، ظل اللہ، سلیماں بارگاہ، مظہر الطاف الٰہی، مطلع انوار بادشاہی، مجسم داد و کرم، قامع آثار جفا و ستم، برداشتہ حضرت منان، گماشتہ ایزد سبحان، خورشید برج خلافت، مشتری آسمان سلطنت، ظل ظلیل سبحانی، واسطہ انتظام امنی وجانی، شیرازہ نسخہ اسلام، ماحی بدعت کفر و ظلام، مالک ہفت اقلیم، زینت افزائے تخت و دیہیم، وارث ملک سلیمانی، فروغ دودمان صاحب قرانی، خسرو فلک اقتدار، بادشاہ خورشید اشتہار سلطان بن سلطان، خاقان زمین و زماں، منتخب فرمانروایان حال و ماضی ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ، کہ دور عیش چوں دور قدح پر نشاط، و زمانش مانند ایام شباب پر سرور و انبساط، روز بازار فضل و دانش است، مندی نژادان فارسی دولت دانظم و نثر از حد بیشتر است۔"

غور کیجئے کہ یہ کتاب سرکاری حیثیت سے نہیں لکھی جا رہی تھی اور نہ بادشاہ کے دربار میں پیش کئے جانے کی غرض سے ترجمہ کی جا رہی تھی، مگر بایں ہمہ ان جذبات کا ادا ہونا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس عہد کے ہندو اُسکو کیا سمجھ رہے تھے، اور آج اُس کو کیا سمجھ رہے ہیں۔

آگے چلکر وہ اپنا اور اپنے آقا کا کس محبت اور منت شناسی کے جذبہ کے ساتھ ذکر کرتا ہے:۔

"پیش شاد خاطر احقر العباد مل بہاری علاوہ امی پہدا [illegible] مان مجبور دمن

مضافات سرکار شاہ آباد عرف قنوج متعلق بصوبہ اکبرآباد کہ رگ و پے ایں تربیت یافتہ کیف خاندان والا دودمان عزو علا نواب سپہر جناب، خورشید القاب، عالمیان تاب، رکن السلطنۃ العظمیٰ اعتقاد الخلافۃ الکبریٰ، سزاوار است آں عیوقی، چراغ دودمان سلجوقی، بیسبط العاطفت بادشاہی، منظور انظار خلیفۃ الٰہی نواب اللہ وردی خاں عالمگیر شاہی است۔"

کیا یہ سطریں آج انقلاب روزگار کی تصویریں نہیں؟

۲۔ ردّ الکفر

دوسری کتاب کا نام "ردّ الکفر بحجت القوی" ہے۔ اس کتاب پر قاضی محمد ولد قاضی محمد باقر کی ملکیت کی مہر ہے۔ اور معلوم نہیں کہاں سے جامعہ میں آگئی ہے۔ اس کا مصنف نومسلم ہندو ہے۔ اس کا پہلا نام ہرکشن تھا اور اسلامی نام عبدالقوی ہے۔ وہ سامانہ کا رہنے والا تھا، جو پنجاب میں ایک مقام ہے۔ مقدمہ میں وہ عالمگیر کا ذکر اور اس کتاب کی کیفیت اس طرح لکھتا ہے:-

"بندہ فقیر حقیر عبدالقوی ساکن سامانہ بخدمت اہل اسلام التماس می دارد کہ قبل ازیں نام فقیر ہرکشن بود، ایمان آوردبر دین حضرت رسالت پناہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہ حق است، وکفر باطل، کفر را در ساختہ، اسلام را حق شناختہ، نام خود را عبدالقوی نہاد..... شوال سنہ از دور خلافت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی، بصدقہ کہ صدق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعدلہ کہ عدل حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ، حلمہ کہ حلم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، وشجاعتہ کہ شجاعت حضرت شاہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ، خلد اللہ ملکہٗ وعمرہٗ وسلطنتہ در خاطر رسید مر دمان کہ در کفر اند..... (عبارت غلط ہے) رد کفر در قلم باید آورد و تا کذب کفر وصدق اسلام معلوم گردد۔ واگر مسلمان بخوانند سلامتی ایمان است، اگر کافر بخوانند در باب ایشاں خدائے تعالیٰ خوب خواستہ باشد مسلمان شود، نام ایں کتاب ردّ الکفر بحجت القوی (مصنف کے نام کی تلمیح ہے) نہادہ شد، امید کہ ایں نسخہ کہ ترین

بندگان بدست مسلمان که برسد کیفیت این رساله منتشر گرداند، سعادت دارین یابد، بطرف دلائل وعقاید نظر کنند نه بطرف املا والفاظ نظر کنند، اگر خطا شده باشد اصلاح بدہد، این بشر ثواب ایشان باشد۔

اس رسالہ کی زبان معمولی ہے۔ ۲۹ حقیقتوں پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ آخر سے کچھ ناتمام ہے۔ ہر حقیقت کے میں ہندوؤں کے مختلف عقائد ورسوم کو لیکر اس کی تفصیل کی ہے اور اسکی خرابیاں دکھائی ہیں اور کے مقابل میں اسلام کی خوبیاں بتائی ہیں۔

بہر حال اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایسے نومسلم ہندو ہوتے تھے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیر زمانہ میں دلائل کے زور کے بجائے تلوار کے زور سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا جاتا تھا۔

سید سلیمان ندوی

فاؤسٹ کے چند ورق

فاؤسٹ جرمنی کے اُوستادِ سخن گوئٹے کا مشہور ڈراما ہے۔ میں جناب مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کی فرمائش سے اس کا ترجمہ کر رہا ہوں جو انشاء اللہ اکتوبر تک انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہو جائے گا۔ اس کا ایک ٹکڑا نمونہ کے طور پر قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ ایک دیباچہ ہے جس میں گوئٹے نے دکھایا ہے کہ ڈراما لکھنے والے کو کس طرح مختلف مذاق کے لوگوں کی خوشنودی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

(عابد)

تماشا گاہ کا تمہیدی سین

منیجر، شاعر، مسخرا۔

منیجر - تم دونوں نے بارہا مصیبت اور پریشانی میں میری مدد کی ہے، اب یہ تو کہو، تمہارے خیال میں ہمارا کام جرمنی کی سرزمین میں چلے گا یا نہیں؟ مجھے تو عوام کو خوش کرنے کی فکر ہے کیونکہ اُن کا عمل اس پر ہے "جیو اور جینے دو"! کھمبے کھڑے ہو چکے ہیں، تختے جڑے جا چکے ہیں۔ اب ہر شخص ہم سے روحانی ضیافت کی توقع رکھتا ہے۔ وہ دیکھو تماشائی پالتی مارے، بھویں چڑھائے بیٹھے ہیں اور ایسی چیز دیکھنا چاہتے ہیں جس سے وہ حیران رہ جائیں۔ میں اُن کے مذاق کو خوب سمجھتا ہوں، لیکن اس بار میں ایسا پریشان ہوں کہ کبھی نہ تھا۔ یہ مانا کہ وہ اعلیٰ درجے کے تماشے دیکھنے کے عادی نہیں، لیکن کمبخت ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ آخر انہیں کیا چیز دکھائیں جو نئی اور انوکھی ہو، معنی خیز ہو، مگر ساتھ ہی دلچسپ بھی ہو؟ کیونکہ سچ پوچھو تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے چھوٹے سے تھیٹر میں تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ اور وہ چیختے چلاتے، داخلے کے تنگ دروازے پر یوں پلے پڑتے ہیں گویا وہ جنت کا دروازہ ہے۔ چار بجے دن ہی سے ٹکٹ گھر کے سامنے ان میں دھکم دھکا

ہونے لگتی ہے، اور ہر شخص ٹکٹ کے لئے جان لڑا دیتا ہے جیسے قحط کے زمانہ میں نان بائی کی دوکان پر۔ یہ معجزہ بس شاعر ہی دکھا سکتا ہے، تم بھی آج یہ دکھا دو تو کیا بات ہے۔

شاعر۔ میرے سامنے اس رنگ برنگ مجمع کا نام نہ لو، جسے دیکھکر ذہنی خیال رخصت ہو جاتی ہے۔ مجھے اٹھتی ہوئی لہروں کا یہ سیلاب نہ دکھاؤ جو ہمیں زبردستی اپنے ساتھ بہائے جاتا ہے۔ مجھے تو اس گوشۂ تنہائی میں لیجاؤ جہاں بہشت کا سا سکون ہے۔ جہاں اس خالص مسرت کے پھول کھلتے ہیں جس کا لطف بس شاعر ہی اٹھا سکتا ہے جہاں دل کو محبت اور دوستی کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ وہ باغ جسے خدا نے اپنے ہاتھ سے لگایا اور سنوارا ہے۔ ہائے کیا غضب ہے کہ وہ اچھوتے مضامین جو شاعر کے قلب کی گہرائی میں پیدا ہوتے ہیں، اور جنہیں اسکی زبان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں، بُرے بھلے انداز سے بیان کرتی ہے، موجودہ لمحے کی اشتہا کا لقمہ بن جاتے ہیں (حالانکہ اکثر شاعر کی افکار برسوں کی ریاضت کے بعد مکمل صورت میں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ طبع کی چیزیں موجودہ لمحے کے لئے ہیں، اور کھرا سونا آیندہ نسلوں کے لئے امانت رہتا ہے۔

مسخرا۔ آیندہ نسلیں! بخشئے حضرت، اگر ہم آیندہ نسلوں کی فکر میں رہیں تو موجودہ نسلوں کو کون ہنسائے؟ یہ بھی تو ہنسنا چاہتی ہیں اور کیوں نہ ہنسیں؟ مانا کہ یہ لوگ بچے ہیں مگر بچے بھی تو آخر انسان ہیں، جسے اپنے خیالات دلچسپ پیرائے میں بیان کرنا آتا ہے وہ عوام کے تلون کا رونا نہیں روتا، اس کے لئے تو جتنا بڑا دائرہ ہو اتنا ہی اچھا۔ اس میں اُس کی اور بھی جیت ہے۔ تو بس بھائی ذرا ہمت کر ڈالو، ہمیں وہ گیت سناؤ جس میں تخیل اپنے پورے طائفے کے ساتھ ہو، اور حکمت بھی ہو، عقل سلیم بھی ہو، جذبات بھی ہوں، جوش بھی ہو، مگر یہ یاد رہے، مسخرا پن بھی ضرور ہو۔

منیجر۔ خصوصاً واقعات بہت سے ہوں۔ لوگ اس لئے آتے ہیں کہ کچھ ہوتا ہوا دیکھیں۔ اگر قصے میں بہت سے دلچسپ سین ہوں، کہ لوگ حیرت سے منہ پھیلائے دیکھا کریں تو بس سمجھ لو کہ تمہاری شہرت پھیل گئی، اور تم ہر دلعزیز ہو گئے۔ بہت لوگوں کو رجھانے کے لئے بہت سی چیزیں چاہئیں تاکہ ہر شخص کو کوئی چیز اپنے مطلب کی مل جائے۔ جو بہت کچھ دیتا ہے وہ بہتوں کو کچھ دیتا ہے اور ہر شخص خوش خوش گھر جاتا ہے۔ اگر تم قصہ دکھاتے ہو تو ٹکڑے ٹکڑے کرکے دکھاؤ۔ ایسے پسندے لوگوں کو پسند آئیں گے۔ ایسا قصہ لکھنا بھی آسان ہے اور دکھانا

یہی آسان! اگر مسلسل تماشا دکھایا بھی تو کیا فائدہ، دیکھنے والے سلسلے کو توڑ ہی کے دیکھیں گے۔

شاعر۔ اور تماشا جو مٹی میں مل جائے گا! مگر تمہیں اس کا کیا احساس، تم کیا جانو اس میں شاعر کی کیسی ذلت ہے۔ تم تو بازی گر شاعروں کی ٹکے بندی کا کلمہ پڑھتے ہو۔

منیجر۔ تم خوب اعتراض کرو، میں برا نہیں مانتا۔ جو کوئی اپنے کام میں کامیابی چاہتا ہے، وہ مناسب اوزار استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ اتنا تو سوچو تمہیں کن خامکاروں سے سابقہ ہے، جن کیلئے تم لکھتے ہو ذرا ان کو بھی تو دیکھو۔ کوئی دتماشے میں اپنے شغلی سے اکتا کر آیا ہے، کوئی الوانِ نعمت سے سیر ہو کر، اور قیامت تو یہ ہے کہ اکثر لوگ اخبار چھوڑ کر آئے ہیں۔ بہتوں کو سوانگ دیکھنے کی امید، شوق کے پروں پر اڑا کر لائی ہے۔ خواتین بناؤ سنگار کئے ہوئے (بالانشین تماشائیوں کو) مفت کا تماشا دکھاتی ہیں۔ تم تو اپنے شاعری کی چوٹی پر تخیل کے مزے لیتے ہو، تمہاری بلا سے تھیٹر بھرا ہو یا خالی ہو۔ ذرا اپنے قدردانوں کو قریب سے دیکھو، آدھے بےحس ہیں اور آدھے بے تمیز۔ ایک تو تماشے سے جا کر تاش کھیلے گا، اور دوسرا کسی بیوہ کے آغوش میں رات گزاریگا۔ ان بیچارے سادہ لوحوں کو کیوں ستاتے ہو، کہاں یہ اور کہاں آرٹ کی دیویاں! بس تم تو لکھتے جاؤ، لکھتے جاؤ، اور لکھو، اور لکھو، پھر تمہاری کامیابی یقینی ہے، ایسی ترکیب کرو کہ لوگ چکر میں آجائیں، ان کو خوش کرنا تو بہت مشکل ہے۔ ہائیں یہ تمہیں کیا ہوا۔ خوش ہو گئے یا خفا ہو گئے ہو؟

شاعر۔ جاؤ، دور ہو یہاں سے، کسی اور غلام کو ڈھونڈ! کیا خوب! شاعر تیری خاطر اپنے عزیز ترین حق کو، فطرت کے عطا کئے ہوئے حقِ انسانیت کو، مسخرے پن میں برباد کر دے! اس کے پاس کیا چیز ہے جس سے وہ دلوں کو ہلا دیتا ہے، اور سارے عناصر پر حکمرانی کرتا ہے بجز اس ہم آہنگی کے جو اس کے دل کو ساری کائنات سے متحد کر دیتی ہے؟ جب فطرت ابدی رشتۂ تقدیر کو بے پروائی سے کات کر بل پر بل دیئے جاتی ہے اور ربابِ زندگی کے الجھے ہوئے تاروں سے بےسری صدائیں نکلکر سامعہ خراشی کرتی ہیں تو کون دیدہ وریزی سے ان تاروں کو سلجھاتا ہے اور ان کو کس کر نغمۂ حیات میں روانی پیدا کرتا ہے؟ کون انفرادی روح کا سر کائنات کے مہاسُر سے ملا کر ہم آہنگ، دلکش راگ سناتا ہے؟ کون جذباتِ قلب کی شورشوں سے طوفان کا منظر دکھاتا ہے؟ کون سنجیدہ تفکر سے شفق شام کا سماں باندھتا ہے؟ کون بہار کے سارے خوش رنگ پھولوں کو محبوب

کی رہ گزر میں بچھا دیتا ہے؟ کون ہے حقیقت سبز پتوں سے عزت کے ہار بناکر سورما کے گلے میں ڈالتا ہے؟ کون کوہ اولمپس[1] کی حفاظت کرتا ہے اور دیوتاؤں میں میل کراتا ہے؟ وہی قوت انسانی کا اعلیٰ مظہر جسے شاعر کہتے ہیں۔

مسخرا اچھا اب مجھ سے سنئے یہ قوت کیونکر ظاہر ہوتی ہے، شاعری کا دھندا اسی طرح چلتا ہے جیسے عاشق کا سودا ہوا کرتا ہے۔ کوئی اچھی صورت نظر آئی، دل پر چوٹ لگی، قدم رک گئے اور رفتہ رفتہ ہم دام الفت میں اسیر ہو گئے، پہلے تو قسمت یاوری کرتی ہے پھر اس سے لڑائی ٹھن جاتی ہے پہلے زمانے کے مسرت کی ایک جھلک دکھائی پھر ستم ظریفی شروع کر دی۔ بس چشم زدن میں ایک رومان تیار ہو گیا۔ آؤ ہم بھی ایک تماشا دکھائیں جس میں اپنا موضوع انسانی زندگی کو بنا لو، اسے بسر سب کرتے ہیں مگر سمجھتے کم ہیں اس کا جو رخ لیلو وہی دلچسپ ہے۔ گوناگوں تصویریں ہوں مگر روشنی کم، غلطیوں کا انبار اور حقیقت کی ایک ذرا سی چنگاری اس نسخے سے وہ نادر شراب بنتی ہے جس سے ساری دنیا کو سرور اور تقویت حاصل ہو۔ پھر دیکھنا تمہارے تماشہ میں کیسے کیسے حسین جوان آتے ہیں اور تمہاری لن ترانیوں کو کس شوق سے سنتے ہیں۔ پھر ہر درد آشنا دل تمہارے کلام سے حسرت و اندوہ کا لطف اٹھائے گا، کوئی بات ایک کو تڑپائے گی، کوئی دوسرے کو اور ہر شخص کو وہی چیز نظر آئیگی جو اس کے دل میں ہے۔ یہ نوجوان اب تک ذرا سی بات میں ہنسنے اور رونے لگتے ہیں۔ اب تک زور کلام کی قدر کرتے ہیں اور ظاہری خوبیوں پر سر دھنتے ہیں پختہ مغزوں سے بیشک کوئی امید نہیں لیکن خام کار نوجوان تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

شاعر اچھا تو مجھے بھی وہ دن واپس لا دو جب میں انہی طرح جوان تھا، جب میرے سرچشمۂ فکر سے لگاتار نئے نئے نغمے ابلتے تھے، جب دنیا میری نظروں میں ایک طلسم اسرار تھی اور ہر کلی ایک راز سربستہ۔ آہ اس زمانے میں سب وادیاں پھولوں سے مالامال تھیں اور یہ سب پھول میرے دامن میں تھے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا اور سب کچھ تھا۔ یعنی ایک دل جس میں حقیقت کی طلب تھی اور مجاز کا عشق لاؤ مجھے وہ من

---

[1] یونانی علم الاصنام میں اولمپس اس پہاڑ کا نام ہے جہاں دیوتا رہتے ہیں۔

کی موجیں اُسی اگلی سی وحشت کے ساتھ واپس دے دو۔ وہ گھری پُر درد لذتیں، وہ نفرت کی قوت اور محبت کی طاقت، لاؤ پھر مجھے جوانی پھیر دو۔

مسخرا۔ میرے پیارے دوست تمہیں جوانی کی ضرورت جب ہوتی کہ تم میدانِ جنگ میں دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوتے یا کوئی خوبصورت نازنین تمہارے گلے میں بانہیں ڈالکر زور سے بھینچ لیتی، یا تم دوڑ میں مقابلہ کرتے اور انتہائی تک پہونچنے کی قوت نہ پاکر انعامی ہار کو دور سے دیکھ کر للچاتے، یا دیوانہ وار رقص کرنے کے بعد رنگ رلیاں مناتے اور شراب وکباب میں رات بسر کرنے کے قصد سے بیٹھتے۔ مگر بڑے میاں، تمہارا کام تو یہ ہے کہ ساز زندگی کے جانے بوجھے تاروں کو ہمت اور خوش اسلوبی کے ساتھ بجاؤ اور جو منزل تمہارے پیش نظر ہے وہاں تک بھٹکتے بھٹکتے پہنچ جاؤ۔ یقین جانو کہ اس سے ہمارے دل میں تمہارا احترام کم نہیں ہوتا۔ یہ غلط ہے کہ بڑھاپے میں بچپن لوٹ آتا ہے بلکہ بڑھاپے میں بھی بچپن نہیں جاتا۔

منیجر۔ بس باتیں بہت ہو چکیں اب عمل کی باری ہے۔ جتنا وقت اس چنیں وچناں میں ضائع ہوا اسمیں کوئی مفید کام ہو سکتا تھا۔ یہ بیکار عذر ہے کہ طبیعت موزوں نہیں۔ جو ہچکچاتا ہے اُس کی طبیعت کبھی موزوں نہیں ہوتی۔ جب تم شاعر بنتے ہو تو شاعری کی باگیں سنبھالو۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے، ہمیں زوردار شراب معنوی چاہیئے، بس دیر نہ کرو جھٹ پٹ تیار کر دو۔ جو کام آج نہ ہوا وہ کل بھی نہ ہوگا۔ کوئی دن بیکار نہ کھونا چاہیئے۔ ہمت مردانہ وقت کو ایسا مضبوط پکڑتی ہے کہ وہ نکل کر جا نہیں سکتا تب اُسے چارناچار کام کرنا پڑتا ہے۔

تم جانتے ہو کہ ہماری جرمن اسٹیج پر جس کا جو جی چاہے دکھا سکتا ہے اس لئے تم بھی پردوں اور مشینوں سے دل کھول کر کام لو، ہلکی اور تیز روشنی دونوں کو استعمال کرو اور ستاروں کی بھرمار کر دو۔ ہمارے یہاں پانی، آگ، پہاڑ، چرند، پرند کی کمی نہیں۔ بس اسی لکڑی کے تنگ گھروندے کے اندر ساری کائنات کا نقشہ دکھا دو، آسمان سے زمین، زمین سے پاتال تک سیر کرو، تیزی سے مگر سنبھلے ہوئے۔

اقتباسات

ررپ کا فرض

جو لوگ یورپ کو مذہب اور روح کا دشمن سمجھتے ہیں اور جن کیلئے روس اور امریکہ بھی اسی طرح ،رپ' ہیں جیسے خود یورپ' وہ جرمنی کے مشہور فلسفی کاؤنٹ کیزر لنگ کی نئی کتاب یورپ' کو بڑی ت آمیز دلچسپی سے پڑھینگے۔ وہ اس کتاب میں ایک جگہ کہتا ہے: "آج یورپ کے ذمہ جو فرض ہوتا ہے اس سے بڑا فرض اسپر کبھی عاید نہیں ہوا تھا۔ روح کی جو تاریک اور طولانی رات ں وقت انسانیت کے سامنے نظر آتی ہے اسمیں روح کے مقدس شعلہ کی حفاظت کرنا اور اسے ۔ سے بچانا یورپ کے اور صرف یورپ کے سپرد کیا گیا ہے۔" جدید یورپ کے اہلِ نظر میں اس ت دو متضاد مذاہب کا پتہ چلتا ہے' ایک وہ ہیں جو وضاحت اور عقلیت پر اصرار کرتے ہیں ' ہرے وہ جو انسان کے وجدانِ ابتدائی پر مصر ہیں اور چاہتے ہیں کہ عقل کو جبلت و وجدان کے لک لیکن صحت بخش اور روح پرور چشمۂ حیات کے پانی سے بپتسمہ دیں۔

جرمن مورخ اشپنگلر بتا چکا ہے کہ بربریت سے چلکر انحطاط تمدن تک کا چکر جو ہر تمدن ئی کو پورا کرنا ہوتا ہے وہ یورپ کیلئے بھی قریب الختم ہے۔ اور اب کیزر لنگ بتاتا ہے کہ بالشوزم ۔نئے دور کا بربری آغاز ہے جس کا پہلا کام یہ ہے کہ مشرق کے انسانوں کو مادی تہذیب کی ۔ترسطح پر پہنچا دے۔ امریکہ میں بھی اسے یہی چیز دکھائی دیتی ہے یعنی تمام تر توجہ کا مادی اور جماعتی صدپر مرکوز ہونا اور شخصیت و امارت کی طرف سے ہٹا ہونا۔ اس طرح امریکہ بھی اس کے نزدیک ۔ائنے دور تہذیب کا بربری آغاز ہے اور یورپ ان دو عظیم الشان رقیبوں کے درمیان آپھنسا ہے جن ۔صدیوں تک روحانی مقاصد اور قدریں نظر انداز کیجائیں گی۔ بعض جدید ماہرین نفسیات کا وصاً آدلر کا ذکر کرکے کیزر لنگ کہتا ہے کہ اس نئے فلسفہ اور اس نئی امریکی حقیقت دونوں کا

مطمح نظر دراصل وہی ہے جو روسی اشتراکیت کا ہے یعنی " انسان اپنی انفرادی شخصیت کو جماعت میں، گروہ میں۔ پھر گم کردے۔

لیکن اگر امریکہ اور روس اس مقدس شعلہ کے صحیح وارث بننا چاہیں اور ایک نئی اور عظیم انسانی تہذیب پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو ان کے لئے لازمی ہے کہ وہ ابھی جماعتی جذبہ اور مادی تنظیم ہی پر توجہ کریں اور اس عرصہ میں بقول کیزرلنگ یورپ پر اس مقدس شعلہ کی حفاظت کا فرض عاید ہوتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ اگر اس شعلہ کے بجھنے کا اندیشہ اس وجہ سے ہے کہ کہیں یورپ بھی محض مادی قدروں کا بندہ نہ ہو جائے تو اس کا خطرہ یوں بھی ہے کہ کہیں یورپ اپنی خشک عقلیت اور ذہن پرستی سے اپنے کو تباہ نہ کرے۔ عقل وعشق تخلیق کے لئے دونوں لازمی ہیں۔ کوئی چیز جس میں ان دو متضاد عناصر کا صحیح توازن نہ ہو مؤثر نہیں ہو سکتی۔ لہذا یورپ کا کام یہی نہیں ہے کہ اس شعلہ کو جذبات اور مادیت کے سیلاب سے نہ بجھنے دے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس شعلہ کو عقلیت کے صحرا میں جلکر خاکستر مردہ نہ بن جانے دے۔

اگر یورپ ان جدید بربری قدروں کی مخالفت میں اپنی منطق اور عقلیت ہی پر زور دیتا رہا تو روح کا شعلہ یورپ میں بھی افسردہ ہو جائیگا اور روس اور امریکہ میں بھی روشن ہو نہ پائیگا۔ یورپ والوں کو بھی ضرورت ہے کہ وہ اس زمین سے تعلق پیدا کریں اور جبلت وجذبات کے حیات بخش چشمہ سے سیراب ہوں۔ جب وہ ان دونوں میں توازن پیدا کرلیں تب ہی اس مقدس شعلہ کے محافظ بن سکتے ہیں۔

رچارڈ ریس ورایڈلفی، لندن

حکومت ہند کی طرف سے ہر سال ہندوستان کے متعلق ایک رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیجاتی ہے جس میں سال کے تمام اہم معاملات کا ذکر اور ان پر تنقید وتبصرہ ہوتا ہے۔ ۲۷-۱۹۲۶ء کی رپورٹ جسے مسٹر کوٹ مین نے مرتب کیا ہے ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ اس میں تعلیم پر جو حصہ ہے اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

تازہ ترین اطلاعات مظہر ہیں کہ کل ملک میں ابتدائی تعلیم ۱۱۴ بلدیوں میں اور ۱۵۲۷ دیہی علاقوں
میں جبری ہے۔ ذیل میں جو نقشہ درج ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ مختلف صوبوں میں جبریہ ابتدائی تعلیم
نافذ کیا ہے۔ اس تحریک میں پنجاب کا حصہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ٹھیک نصف تعداد بلدیوں
ی اور ۲۸ چھوڑ کر سب کے سب وہ دیہی علاقے اس صوبہ میں ہیں جہاں ابتدائی تعلیم جبری ہے۔
نقشہ درج ذیل ہے:-

صوبہ	بلدیہ	دیہی علاقے	صوبہ	بلدیہ	دیہی علاقے
مدراس	۲۱	۳	برما	۰	۰
بمبئی	۷	۰	بہار و اڑیسہ	۱	۴
بنگال	۷	۰	صوبہ متوسط	۳	۲۱
صوبہ متحدہ	۲۵	۰	اسام		
پنجاب	۵۷	۱۴۹۹	میزان کل	۱۱۴	۱۵۲۷

پنج ذاتوں کی تعلیم کے متعلق رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ برما اور آسام کو چھوڑ کر باقی صوبوں
میں پنج ذات کے طلبہ کی تعداد چھ لاکھ سرسٹھ ہزار ہے۔ یعنی پنج ذات کی کل آبادی میں سے ۲.۳ فی
صدی۔ ان طلبہ کی زیادہ تر تعداد ابھی ابتدائی مدارج میں ہے اور ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں بہت ہی
کم۔ مثلاً ۱۹۲۵ء میں مدراس میں کل ۲۳ ایسے طلبہ کالجوں میں پڑھ رہے تھے، بمبئی میں کل ۱۴،
صوبجات متحدہ میں صرف ۱۱، صوبہ متوسط میں ۸، بہار و اڑیسہ میں صرف ۱ اور پنجاب میں ایک
بھی نہیں۔

" یہ احساس عام ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی حالت کمیت کے لحاظ سے چاہے کتنی ہی
اطمینان بخش ہو، کیفیت کے اعتبار سے اس میں بہت سی کمیاں ہیں۔ یہ خیال خاص طور پر ثانوی

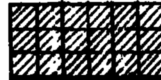
تعلیم کی بابتہ درست ہے جو بہ حیثیت مجموعی مغربی معیار کے اعتبار سے بہت گھٹیا ہے اور بعض حصوں میں غیر منظم۔ طریق تعلیم ناقص ہے؛ اساتذہ اپنے کام میں دلچسپی نہیں لیتے؛ اور طلبہ کا مطمح نظر بس روپیہ کمانا ہے۔ گزشتہ زمانہ میں تعلیم کے اخلاقی، جماعتی اور جسمانی پہلو پر بہت کم توجہ کی گئی ہے اور ذہنی پہلو سب کچھ رہا ہے۔

ہر تعلیمی کام کرنے والا جانتا ہے کہ تعلیم عمر بھر کا دھندا ہے اور اگر ملک میں جمہوری اداروں کو چلانا ہے تو عام بالغ لوگوں کی تعلیم کا انتظام لازمی ہے تاکہ وہ اپنے حق رائے کو مناسب طور پر استعمال کرسکیں۔ تعلیم گاہوں کے کام کو شہروں میں وسعت دینا تو دشوار نہیں البتہ دیہی آبادی کا معاملہ بہت نازک ہے۔ پچھلے زمانہ میں اس آبادی کے لئے مختلف تدبیریں ہندوستان میں اختیار کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ صحت اور عام مفید باتوں پر تقریروں کا انتظام کیا گیا۔ دوسری تدبیر مدارس شبینہ کا قیام ہے۔ ایک اور صورت یہ کی گئی کہ طبی پیشہ کے لوگوں کو گاؤں میں رہنے کی ترغیب دی جائے۔ کہیں یہ کیا گیا کہ گاؤں میں کتب خانہ یا ابتدائی ادبی اور علمی انجمنیں قائم کی گئیں۔ ذیل میں ہم وہ اعداد نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ مختلف صوبوں میں مدارس شبینہ کی تعداد اور ان میں طلبہ کی تعداد کیا ہے۔ اسمیں بمبئی، پنجاب، برما اور صوبجات متوسط کے اعداد میں تو صرف بالغ شامل ہیں لیکن دوسرے اعداد میں بالغ اور نابالغ دونوں ہیں۔

صوبہ	تعداد مدارس شبینہ	تعداد طلبہ	صوبہ	تعداد مدارس شبینہ	تعداد طلبہ
مدراس	۵۲۸۷	۱۳۶۶۲۶	برما	۱۹	۱۰۶۵
بمبئی	۱۹۱	۷۷۳۰	بہار و اڑیسہ	۱۰۳۶	۲۲۷۰۱
بنگال	۱۴۴۵	۲۷۷۷۳	صوبجات متوسط	۴۱	۱۰۶۷
پنجاب	۳۲۰۸	۸۵۴۲۲	میزان کل	۱۱,۲۲۷	۲۸۲,۳۸۴

ذیل میں ہم اس رپورٹ سے چار نقشے نقل کرتے ہیں جو یقین ہے کہ ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

انوی ہند میں خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کا تناسب



خواندہ

یک کروڑ ۵٦ لاکھ!)

ناخواندہ

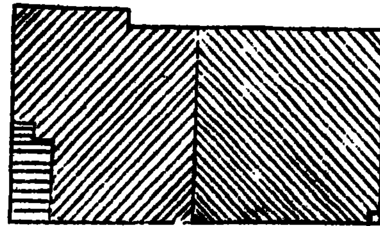
۲ کروڑ ۹۰ لاکھ!)

ہر مردم شماری پر نیز ۱۳ مارچ ۱۹۳۶ء و ۱۳ مارچ ۱۹۲۷ء کی تخمینی آبادی میں مرد اور عورتوں کا تناسب اور خواندہ و ناخواندہ مرد اور عورتوں کی تعداد

آبادی (ملین میں، ملین = ۱۰ لاکھ)

۱۸۷۲

مرد ۱۰۶ عورتیں ۱۰۰ کل ۲۰۶

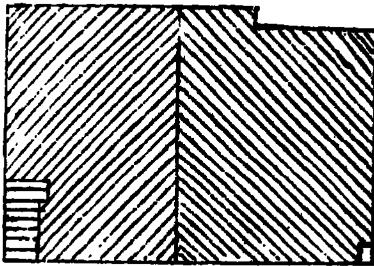


خواندہ: مرد ۹ ملین۔ عورتیں ۲ر۔ کل ۹ر۲

آبادی (ملین میں)

۱۸۸۱

مرد ۱۳۰ عورتیں ۱۲۴ کل ۲۵۴

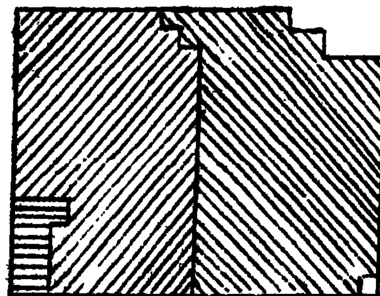


خواندہ: مرد ۱۰ر۵۔ عورتیں ۴ر۔ کل ۱۰ر۹

آبادی (ملین میں)

۱۸۹۱

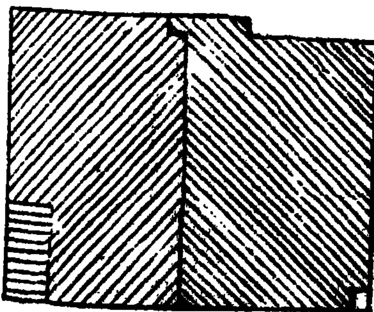
مرد ۱۴۷ عورتیں ۱۴۰ کل ۲۸۷



خواندہ: مرد ۱۱ر۵۔ عورتیں ۵ر۔ کل ۱۲

آبادی (ملین میں)

مرد ۱۴۹ عورتیں ۱۴۴ کل ۲۹۳

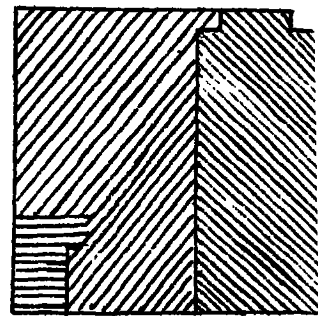


خواندہ: مرد ۱۴ر۰۔ عورتیں ۱۔ کل ۱۵ر۰

آبادی (ملین میں)

1911

۱ عورتیں ۱۵۴ کل ۳۱۵

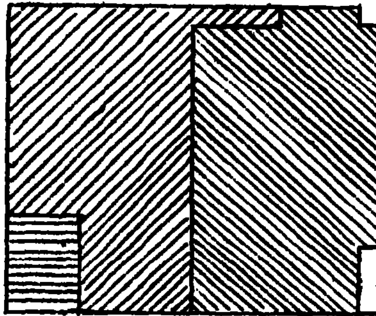


مرد ۱۶/۹ - عورتیں ۱/۶ - کل ۱۸/۵

آبادی (ملین میں)

۱۹۲۱

مرد ۱۶۴ عورتیں ۱۵۵ کل ۳۱۹

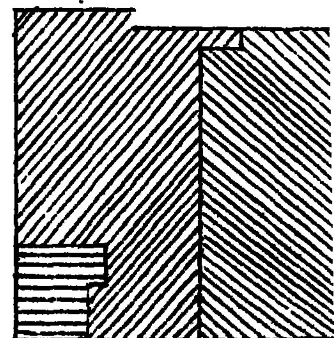


خواندہ مرد ۱۹/۸ - عورتیں ۲/۸ - کل ۲۲/۶

آبادی (ملین میں)

۳۱ مارچ ۱۹۲۶ء

۱۶ عورتیں ۱۵۸ کل ۳۲۶

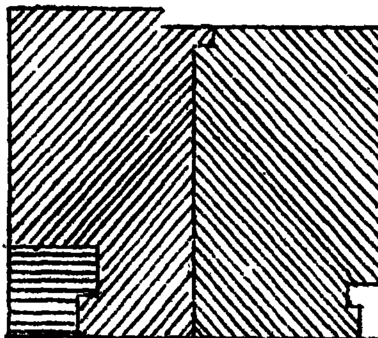


مرد ۲۲ - عورتیں ۳/۳ - کل ۲۵/۳

آبادی (ملین میں)

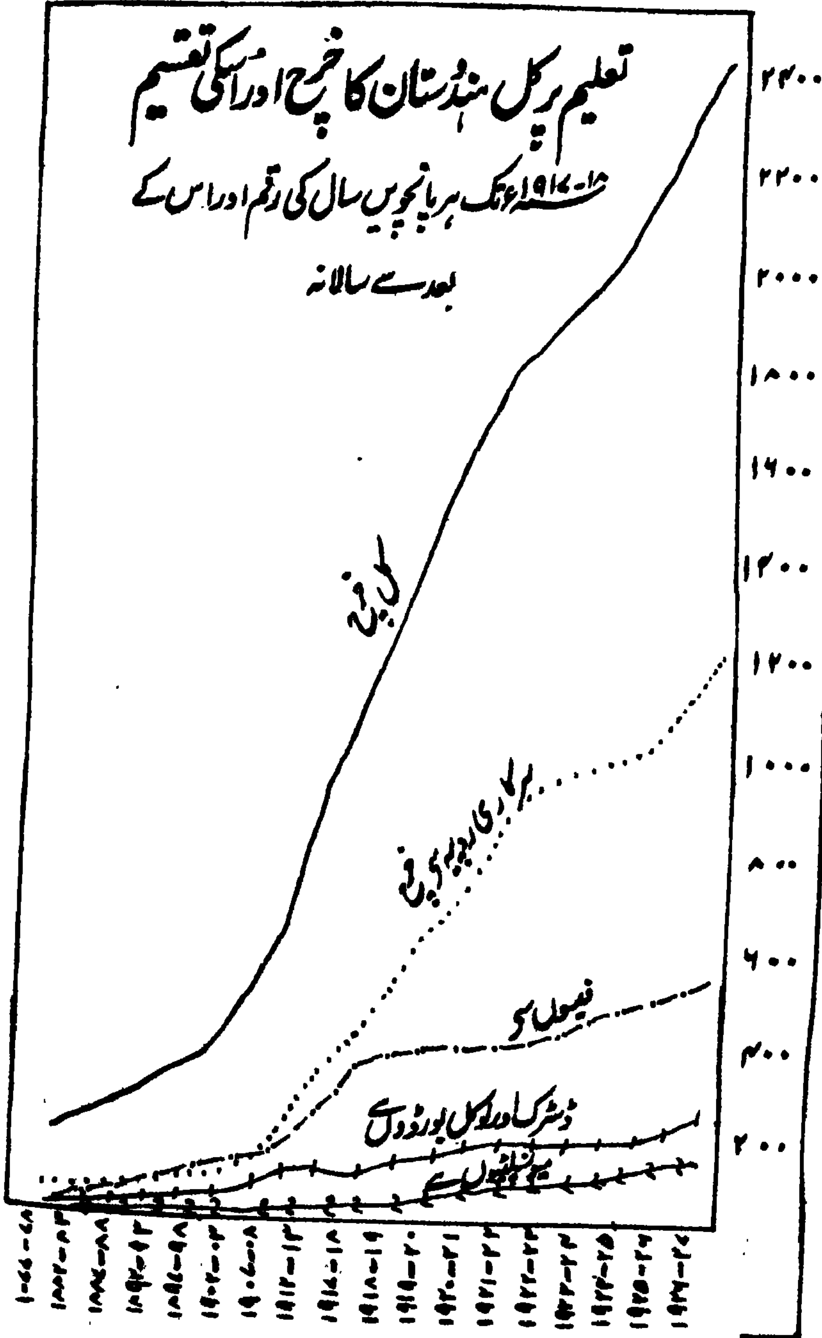
۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء

مرد ۱۶۹ عورتیں ۱۵۹ کل ۳۲۸



خواندہ مرد ۲۲/۷ - عورتیں ۳/۵ - کل ۲۶/۲

دوں کی آبادی ▨ عورتوں کی آبادی ▤ خواندہ مرد □ خواندہ عورتیں


تعلیم پر کل ہندوستان کا خرچ اور اسکی تقسیم
۱۹۱۷ء تک ہر پانچویں سال کی رقم اور اس کے
بعد سے سالانہ
کل خرچ
سرکاری ریونیو سے
فیسوں سے
ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں سے
میونسپلٹیوں سے
۲۴۰۰
۲۲۰۰
۲۰۰۰
۱۸۰۰
۱۶۰۰
۱۴۰۰
۱۲۰۰
۱۰۰۰
۸۰۰
۶۰۰
۴۰۰
۲۰۰

"گڑیا کا گھر"

قومی زندگی اور قومی مسائل کے مقابلۃً تنگ دائرہ سے گذرنا، دوسری سرزمین، دوسرے ماحول میں انسانی زندگی کا مشاہدہ کرنا ذہنیت کی صحیح تربیت کے لئے لازم ہے۔ اُسی طرح جیسے آب وہوا کی تبدیلی جسمانی صحت کی شرط ہے۔ ناواقفیت، جہالت اور محدود تجربہ تعصب اور بیہودہ خودستائی پیدا کرتے ہیں، اور جس قوم کو اپنی عظمت کا مغالطہ ہو جائے اُس کی نشوونما سمجھنا چاہیے ختم ہوگئی۔ ہندوستانی ذہنیت اس مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتی ہے، اور اس وقت ہر روشن خیال ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی اخلاقی حالت پر غور کر کے اپنی قوم کی اصلاح کے لئے معیار اور نصب العین مقرر کرے۔ دوسروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھائے۔ اُنکی آرزوؤں کا امتحان لے۔

یورپین تہذیب کے ہندوستان میں بہت سے دوست ہیں اور بہت سے دشمن اُسے سمجھنے والے کم ہیں۔ یہ اندیشہ مگر سب کو ہے کہ ہم اس کے اثرات سے بالکل بچ نہیں سکتے، اور اسی وجہ سے دوستی اور دشمنی دونو میں مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ ہم یوروپین تہذیب کی اصل صورت دیکھنے سے عموماً محروم رہتے ہیں، تو ہم اکثر غلط فہمیاں معاف بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہمارا فرض بھی ہو جاتا ہے کہ جس حد تک ہو سکے یوروپین تہذیب کی سیرت کو سمجھیں اور سمجھائیں اور نظر کے فریبوں سے گزر کر اس کی اصلیت تک پہونچیں۔

مشرقی زندگی ہمیشہ سے ایسے تخیلات کے ماتحت رہی ہے جو عام طور سے تسلیم کئے جاتے تھے، جن کے مطابق زندگی کے ہر پہلو کے لئے معیار اور قوانین مقرر ہوتے تھے۔ مغربی زندگی کا مشاہدہ کرنے والے ہیں سب سے پہلا دھکا اس بات سے پہنچتا ہے کہ وہ کوئی عام اخلاقی

اصول تسلیم نہیں کرتی، اور ریاست کے قانون کے حدود میں فرد کو کامل آزادی دیتی۔
ہمارے یہاں عورتوں کے لباس تک کو مذہبی تعلیم کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یورپ ؛
لباس کیا اخلاق تک ہر عورت اپنے لئے طے کر سکتی ہے اور جب تک وہ کوئی ایسی حرکت نہ ؛
جس کی قانوناً سزا مقرر ہے عام رائے بھی اس کی زندگی میں دخل نہیں دیتی۔ اس آزادی
نتائج برے بھی ہوئے ہیں اور اچھے بھی، مگر برے ہوں یا بھلے، وہ انسانی تجربہ کا ایک
ہیں جس سے مستفید نہ ہونا سخت حماقت ہوگی۔ ہمارے پاس اپنے معیار موجود ہیں۔ ہما
تاریخ کا سلسلہ قائم ہے، پھر یورپین تہذیب کے فیض سے ہمیں کیا اندیشہ، اس کے تجربا
میں لانے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔

افراد کی آزادی کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جس تنقید اور نکتہ چینی ا
انصاف پسند سماجی ضمیر نے یہ آزادی رفتہ رفتہ قائم کی ہے اس کی اہمیت اور ضرور
کو ہمیں بلا تکلف تسلیم کر لینا چاہئے۔ افراد کی موجودہ آزادی کی عمارت کلیسا کے کھنڈر در
تعمیر کی گئی ہے، اور یہ تخریب اور تعمیر دونوں اسی تنقید اور انصاف پسند سماجی ضمیر کے کا
ہیں۔ بیچ کی صدیوں میں مذہب اور خدا دونوں کلیسا کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے گویا انسان کی
کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ مارٹن لوتر نے یہ ٹھیکہ اس کے قبضہ سے چھین کر ریاست اور ملکی کلیسا کے
کیا۔ اس لئے کہ اس کا ضمیر کیتھلک کلیسا کی تعلیم اور اس کے طرز عمل کی درستی کو نہیں تسلیم کر
دو تین صدیوں بعد جو آگ لوتر نے جلائی تھی، بجھنے لگی۔ تو پھر یورپین ضمیر نے تنقید کے ذ
سے اس تخیل کی جڑ کاٹ دی جو لوتر کے زمانے سے اس وقت تک غالب رہا تھا۔ کیتھلک
کا اصول "ایک خدا، ایک کلیسا، ایک قانون" تھا۔ لوتر نے خدا کی وحدت تو قائم رکھی مگر کلا
قانون میں اختلاف اور رنگا رنگی کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اٹھارہویں صدی کے انقـ
نے اس انتشار کو ایک درجہ اور بڑھا دیا، اور خدا کی وحدت بھی قائم نہ رہنے دی۔ ایک لحاظ
تو یہ انقلاب برحق تھا، اس لئے کہ پرانے مذہبی اور اخلاقی اصول بالکل مردہ ہو گئے تھے، ا

اُنکے محافظوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُن میں دوبارہ جان پھونکنے کا حوصلہ کریں۔ مذہب اور اخلاق کی حفاظت یوں ہی ہو سکتی تھی کہ ہر شخص اپنے عقیدے کا ذمہ دار کر دیا جائے اور اُن کی درستی یا غلطی کا خود فیصلہ کرے۔ اس انقلاب کے پہلے رہنماؤں کی امیدیں کچھ بھی رہی ہوں۔ فتح اس میں عقل کو حاصل ہوئی، اور سب سے زیادہ نقصان مذہب کو پہنچا، اس لئے کہ اُسکی سماجی حیثیت بالکل جاتی رہی اور افراد کی ذہنیت پر عقل اور تجربہ کی خواہش اور مادی رجحان اس قدر غالب آگئے کہ مذہب کے لئے نہ دماغ میں گنجائش رہی نہ دل میں۔

مذہب کے ساتھ لازم تھا کہ اخلاقی معیار بھی شک اور تجربہ پر قربان کئے جائیں، اور ہر فرد اپنے لئے بہترین اخلاقی اصول دریافت کرنے کا بار اٹھائے۔ قانون نے شرط لگائی کہ جرم نہ سرزد ہوں، عام رائے نے شرط لگائی کہ کامیابی ہو، باقی افراد کو خود مختاری دیدی گئی۔ ہر انسان اپنی فلاح ہی چاہتا ہے، خواہ روحانی ہو یا جسمانی، موت سے پہلے یا موت کے بعد، اور چونکہ تجربہ کا میدان اسقدر وسیع تھا، اس لئے جو لگام مذہب نے چھوڑی وہ تنقید کے ہاتھ میں پہنچ گئی، اور یورپ میں تمام روشن خیال لوگ رہبری کے لئے اُن شخصیتوں کی طرف مڑے جو اُن کی زندگی میں نکتہ چینی کر سکتی تھیں، اور عوام کے ضمیر کے سامنے فیصلہ کرنے کے لئے مختلف اصول اور اُنکی عملی صورتیں پیش کر سکتی تھیں۔ ان نقادوں کے مشورے پر عمل کرنا کسی شخص پر لازم نہیں رہا ہے۔ لیکن یورپ کی موجودہ اخلاقی حالت بڑی حد تک انہیں کی بنائی اور بگاڑی ہوئی ہے۔

یورپ میں کوئی عام مذہبی یا اخلاقی نصب العین باقی نہیں رہا ہے لیکن اُس کی بجائے تہذیب اور تاریخ نے کامل انسانیت کی ایک آرزو پیدا کر دی ہے جو مذہب اور اخلاق کی جگہ پر محرک کا کام دیتی ہے۔ اسی انسانیت اور اسی کمال کی تمنا نے کیتھلک کلیسا کی بنیاد اکھاڑ مذہب سے جبر کی تعلیم اور تاثیر نکالدی اگرچہ اس کے ساتھ مذہب کے اڑ جانے کا بھی اندیشہ تھا اور اب یہی انسانیت یورپین تہذیب کا مایۂ ناز ہے۔ اُس کی تلاش میں ہزار ہا زندگیاں تج

ہوئی ہیں، اور ہو رہی ہیں، اور اس پر بھی جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ ممکن ہے بہت تھوڑا نظر آئے، لیکن کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہوا ہے۔ اور ہر انسان کو اس کی قدر کرنا چاہیئے

ہم کو ہر حال اس حوصلہ اور ایثار کا مشاہدہ کرکے اپنی غلامی اور غفلت یاد کرنی چاہیئے، ہمارے مذہب میں بے شمار خوبیاں ہیں، ہمارے اخلاقی اصول نہایت صحیح ہیں لیکن ہم نہ اپنے مذہب کے اہل رہے ہیں نہ اپنی اخلاقی تعلیم کے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم نے ہمیشہ سرتسلیم خم کیا ہے۔ بے سمجھ اور بے زبان جانوروں کی طرح جس طرف منہ موڑ گیا اُدھر چلے گئے، اور کبھی یہ نہ سوچا کہ انسانیت کے فرائض کیا ہیں۔ مذہب کن صورتوں میں قومی زندگی کا محرک ہوتا ہے، کن صورتوں میں نہیں۔ ہمارے ضمیروں پر غفلت طاری ہوگئی، دل بے حس ہو گئے اور اخلاقی پستی نے ہم کو غلام بنا کر چھوڑا۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ ہم اُن لوگوں کی بد اخلاقی پر افسوس کرتے ہیں جو اس وقت آسانی اور بے فکری سے ہمارے ملک اور ہماری ذہنیت پر حکومت کر رہے ہیں۔ اب اگر ہمارے لئے انسانیت کے اہل بننے کی کوئی صورت باقی ہے تو وہ یہی کہ ہم یورپ سے تنقید اور ذاتی تجربہ کی وقعت کرنا سیکھیں۔ اپنے ضمیروں کو بیدار اور ذی حس بنائیں۔ قومی زندگی سے کنارہ کش اور بیگانہ ہونے کی بجائے قوم کی ہر دشواری اپنی مصیبت سمجھیں، بُروں سے لڑیں، اچھوں کی مدد کریں۔ اور اپنے ماحول کی حالت پر غور کرکے اپنی اور اپنے عقیدوں کی خامیاں معلوم کرتے رہیں۔

ہم میں سے جو کوئی قومی اصلاح کی آرزو رکھتا ہے اُسے اِبسن کا کچھ ونوں شاگرد رہنا چاہیئے۔ ابسن صرف ایک ایسا نقاد نہیں تھا جو قومی زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہو اور ایسی باتیں بتائے جو اخبار اور پولیس کی زد سے باہر ہوں۔ وہ انسان کی فطرت سے اس قدر واقف تھا کہ نظر اسے کبھی کوئی فریب نہ دے سکی۔ اور وہ مبالغہ اور مغالطہ دونوں سے بچا رہا۔ اس نے صرف عام زندگی کو اپنا منظر بنایا ہے۔ مگر جن مسائل پر اس نے بحث

ناہے وہ ہر انسان اور ہر ماحول کے لئے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ اُسکا تصور بھی ایسا وسیع تھا کہ اس نے چند ڈراموں میں یورپین زندگی کے تقریباً تمام اہم مسائل پر رائے زنی کی ہے، اور ساتھ ہی فطرت انسانی کی بہت سی دلچسپ اور عبرت آموز خصوصیات ظاہر کی ہیں۔ وہ صرف ڈراما نویسی میں ایک نئے طرز کا موجد نہیں تھا، نہ آرام پسند اور مطمئن انسانوں کی بغل میں ایک نیا کانٹا۔ وہ ایک نئی زندگی کا پیغام بھی لایا، ایسی زندگی جس میں ایثار اور بلند اخلاقی حوصلہ قومی اور انفرادی زندگی کی سب سے عزیز دولت ہوں، جس میں ساری جماعت ہر فرد کی تکلیفیں محسوس کرے، اور ہر فرد اپنے فرض کو اپنا حق سمجھے۔ اس کے ہر ڈراما میں کسی نہ کسی شکل میں یہ پیغام سنایا گیا ہے، اور یہ پیغام ایسا ہے جسے سن کر ایشیا اور یورپ کا ہر باشندہ اپنے دل میں جوش پیدا کر سکتا ہے۔

تمدنوں کی ترقی اور تنزل، اُن کی زندگی اور موت ایسے قوانین کے ماتحت ہوتی ہے جو انسان کے قابو میں نہیں ہیں۔ لیکن جہانتک انسان کو اختیار ہے اُس اختیار میں مرد اور عورت یکساں شریک ہیں، اور شاعر نے اگر عورتوں کو آئین حیات کا محافظ تصور کیا تو بیجا نہیں۔ ایک نسل سے دوسری کا تعلق انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور وہ اس تعلق کو جو حیثیت چاہیں دے سکتی ہیں۔ قوم کی اصلاح بھی اسی وجہ سے عورتوں کی اصلاح پر منحصر ہے کیوں کہ جو اثر وہ قبول کریں مشکل سے قوم میں دیرپا ہو سکتا ہے۔ اُنکی طبیعت میں قرار اور استقلال بھی مردوں سے زیادہ ہوتا ہے، اور برے اثرات اُن تک سرایت کر جائیں تو اُنکا دور کرنا بھی نسبتاً دشوار ہوتا ہے۔ یورپ میں مردوں اور عورتوں کی باہمی زندگی کی جو صورت ہے وہ کسی ڈراما نویس کے لئے عورتوں سے قطع نظر کرنا ناممکن بنا دیتی ہے، مگر ابسن نے انہیں اپنی تصانیف میں خاص اہمیت دی ہے، اور زندگی کے ان پہلوؤں پر جو عورتوں سے متعلق ہیں، بہت روشنی ڈالی ہے۔ "گڑیا کا گھر" ہمارے نزدیک ابسن کے سب سے کامیاب ڈراموں میں سے ہے، اور جو شخص اس کی تعلیم کو ذہن نشین نہ کرے وہ عورتوں کی کبھی عزت نہیں کر سکتا۔ اور اُس سے اُنکا حق کبھی ادا نہ ہوگا۔

عورت کو گڑیا تصور کرنا ابسن کے زمانہ یا یوروپین زندگی کی خصوصیت نہیں ہے۔ "عورت"

کے کئی مفہوم ہیں، جن میں سے "گڑیا" بھی ایک ہے، اور ابسن نے اُس کی طرف توجہ اس وجہ سے دلائی ہے کہ بہت سی عورتیں خود گڑیا بننا اور گڑیا کی زندگی بسر کرنا اپنی ہستی کا اصل مقصد سمجھتی ہیں، اور جو مرد اُن کی طبیعت پر تسلط کرنا چاہتے ہیں وہ انہیں بڑی آسانی سے اس وہم میں مبتلا رکھ سکتے ہیں۔ مگر انسانیت کا تقاضہ کچھ اور ہے، اور جس عورت نے اپنے فرائض محسوس نہ کئے وہ محض ایک گڑیا ہے اور اس کی ساری زندگی انسانیت کی تباہی کا ایک دردناک منظر۔ ابسن نے "گڑیا کے گھر" میں ایک ایسی عورت کی تصویر کھینچی ہے جو گڑیا بننے کے لئے بچپن سے تیار کی گئی تھی۔ شادی کے بعد وہ آٹھ برس تک گڑیا بنی رہی اور خوب شاد آباد رہی۔ پھر کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ اُسے تھوڑی دیر کے لئے انسان بننا اور انسانی فرائض ادا کرنے ہوئے مگر یہ قلب ماہیت اُس کے شوہر کو بہت ناگوار گذری، دونوں نے اپنا فلسفۂ زندگی واضح کر دیا، جس کا یہ انجام ہوا کہ گڑیا نے انسان بننے کے لئے گھر بار عیش و آرام، شوہر اور بچوں کو خیرباد کہا، اور اندھیری رات میں اپنی گذشتہ زندگی پر دروازہ بند کر دیا۔

"گڑیا" کے شوہر پر اُس کا اس طرح سے چلا جانا بہت شاق گذرتا ہے، اور ڈرامے کے پڑھنے والے کو بھی تعجب ہوتا ہے کہ خیالات کی تبدیلی "گڑیا" کو ایسے سخت رویہ پر مجبور کرتی ہے۔ ابسن کا مطلب اور اصل گڑیا اور عورت کا فرق دکھانا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے کسی زمانہ میں اپنے پیروؤں سے کہا تھا کہ "جب تک تم دوبارہ پیدا نہ ہو، تم جنت میں داخل ہونے کے لائق نہیں بن سکتے" ابسن ہر گڑیا کو بتانا چاہتا ہے کہ جب تک وہ غربت اور تنہائی کے مرحلے طے نہ کرلے، اور اپنی پچھلی زندگی کی یادگار، پرانی محبتیں، پرانے رشتہ بالکل مٹا نہ دے، وہ گڑیا رہے گی اور عورت نہیں بن سکتی۔ اس لئے جب اسے قطعی احساس ہو کہ وہ ایک گڑیا سمجھی جاتی ہے تو اُس کا فرض ہے کہ عورت بننے کے لئے وہ ہر چیز قربان کر دے، کیونکہ انسانیت ایک ایسا بے بہا جوہر ہے کہ اس کے عوض میں جو دولت بھی قربان کی جائے کم ہے۔

ہماری زندگی میں عورتوں کا دخل اس قدر کم ہے کہ گڑیا اور عورت میں فرق کرنا، یا عورت کو انسان بننے کی ترغیب دینا کچھ سعی لاحاصل سا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر انسان بننے کی

شرط یہ ہے کہ عورت اپنے گھر بار کو چھوڑ کر تجربہ حاصل کرنے کے ارادہ سے نکل کھڑی ہو۔ تو "گڑیا"
کے شوہر کی طرح ہم میں سے اکثر حیرت اور افسوس میں دیوانے ہوجائیں گے، اور عورتوں پر یہ الزام
لگائیں گے کہ وہ انسان بننے کے بہانے سے اپنے فطری فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ مگر
ابسن کی یہ ہرگز تعلیم نہیں ہے کہ عورتوں کو امورخانہ داری یا اولاد کی پرورش سے کنارہ کش ہوجانا
چاہئے۔ ان فرائض کا پورا کرنا مرد اور عورت کی باہمی زندگی کی شرط ہے، مگر عورت کو یہ نہ سمجھ لینا
چاہئے کہ اگر اُس نے گھر کا انتظام کرلیا اور بچے پیدا کرلئے تو اس نے اپنی انسانیت کا حق ادا
کردیا۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ مرد اور عورت کی باہمی زندگی کا ایک نصب العین ہو جس کی تمنا
دونوں کے دلوں میں یکساں ہو۔ دونو ایک ہی کوشش میں مصروف ہوں اور ایک دوسرے
کی ناگذیر ہونے کا اقرار کریں۔ دونو کو اپنا ضمیر بیدار رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ انسانیت ایسی
دولت ہے جو بہت آسانی سے گم ہو جاتی ہے۔ اور اسکا گم ہونا ہر مصیبت سے بدتر ہے۔
ابسن گڑیا کا گھر صرف اس ارادہ سے توڑتا ہے کہ اس کی جگہ پر عورت اپنا گھر بنا سکے، اور
اسے اپنی انسانیت کی رونق سے منور کرے۔

ابسن کے بلند حوصلہ کو دیکھ کر جب ہم اُس کے ہندوستانی قدردانوں کی طرف متوجہ ہوتے
ہیں تو ہمیں کچھ مایوسی ہوتی ہے۔ "گڑیا کا گھر" ایسی تصنیف ہے جسے قومی اصلاح کا محرک بنایا جاسکتا
ہے، عورتوں کے لئے ایک آئینہ جس میں وہ اپنے اصل اور لازوال حسن کا مشاہدہ کریں، مردوں
کے لئے ایک حقیقت نما تصویر جس سے وہ ساری زندگی کے لئے عبرت اور سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ اس
کے ناشرین کو اس سے محض ادبی دلچسپی ہے۔ وہ اس کی اخلاقی تعلیم اور فلسفیانہ نظریوں میں نہیں
الجھنا چاہتے، اسی خیال سے غالباً ڈراما کا "مشرقی چربہ" بھی اتارا گیا یعنی اشخاص کے نام بدل
دئے گئے، کہ ہندوستانی پڑھنے والوں کو کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔ اور وہ بحیثیت ڈراما اور ادبی
کارنامے کے "گڑیا کے گھر" کا پورا لطف اٹھا سکیں۔ یہ طریقہ ہماری رائے میں غلط ہے۔ اگر ہندوستانی
پبلک کی واقفیت بڑھانا مقصود ہے تو ہمیں چاہئے کہ یورپین ماحول کی خصوصیات سمجھائیں نہ کہ

کسی طرح سے بدلنے یا اپنانے کی کوشش نہ کریں ، اس لئے کہ ایسی تبدیلیوں سے اُس کی شخصیت جاتی رہتی ہے ، اور شخصیت کے ساتھ تاثیر بھی ۔

بہر حال ''گڑیا کے گھر'' کے مترجم نے ہندوستانی پبلک اور ابسن کی جو خدمت کی ہے اسکا ہمیں شکرگذار ہونا چاہئے ۔ یوروپین ادب کے جو نمونے ہماری پبلک تک ترجموں کے ذریعہ سے پہونچتے ہیں اُن سے کسی صاحب ذوق کو تسلی نہیں ہوسکتی ، اور یہ نہایت قابل تعریف بات ہے کہ عبدالشکور صاحب نے ہماری پبلک کو مغربی ادب کی ایک واقعی بلند پایہ تصنیف سے مستفید ہونیکا موقع دیا ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالج کی مجلس ادبیہ اس قسم کی مطبوعات کا سلسلہ جاری رکھے گی ، اور اُن ہندوستانیوں کو جو یورپ نہیں جاسکتے ادبی تصانیف کے ذریعہ سے یورپین زندگی کی سچی اور پر معنی تصویریں دکھاتی رہے گی ۔

ناشر : شیخ عبدالرشید صاحب ایم ۔ اے ، ال ال بی ۔ علیگڈھ

شذرات

ایک سال سے کچھ ہی زیادہ ہوا ایک نوجوان بادشاہ ہمارے ملک سے گذرا تھا۔ وہ جس ملک کا تھا وہ کچھ بہت بڑا ملک نہیں بہت مالدار ملک بھی نہیں اور چند سال پہلے تک اس کی کوئی سیاسی حیثیت بھی نہ تھی۔ صرف دو بڑی اور رقیب سلطنتوں کے بیچ میں ہونیکی وجہ سے وہ کبھی ایک کا سہارا لے لیتا تھا کبھی دوسری کا۔ اسے اپنے پڑوسیوں سے روپیہ ملتا تھا۔ اور اس روپیہ کے عوض وہ اپنی سیاسی خودمختاری کے اعلان سے باز رہتا تھا، اس چھوٹے سے 'غریب' کوہستانی ملک کے تخت پر ایک نوجوان متمکن ہوا، جس کا اس پر متمکن ہونا معمولی حالات میں ممکن نہ ہوتا۔ اس کے عہد میں اس غریب ملک نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سے ایک چھوٹی سی جنگ کی اور اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ملک میں جو تھوڑی بہت بے چینی پیدا ہوئی وہ بھی نہایت خوش اسلوبی سے رفع کر دی گئی۔ اور بالآخر حالات میں اس قدر یکسوئی پیدا ہوگئی کہ اس نوجوان بادشاہ نے اپنے ملک کو چھوڑ کر ساری دنیا کے سفر کی ٹھانی۔ اس سفر میں وہ ہمارے ملک سے بھی گذرا۔ یہاں اسکا استقبال جس خلوص سے کیا گیا بہت کم کسی کا کیا گیا ہوگا۔ اس سے زیادہ شان وشوکت کے استقبال تو اس ملک نے بہت دیکھے تھے۔ ایسے پرخلوص بہت کم۔ اس لئے کہ یہ نوجوان صرف بادشاہ نہ تھا، آدمی بھی تھا۔ لوگوں نے اسے لاکھوں کے مجمع میں راہ نکالنے کو اپنی کہنیاں استعمال کرتے بھی دیکھا۔ ایک لڑکے کو قرآن پڑھتے سنکر زار زار روتے بھی دیکھا۔ لاکھوں کے بے ترتیب و بے نظم مجمع میں لوگوں کے ایسے تہنیت نامے بھی قبول کرتے دیکھا جن کے مفہوم کی اطلاع تک اس کے بے خبر سفیر نے اسے نہ دی تھی۔ اپنے ایک ہمراہی سے پنسل مانگ کر کاغذ کے ایک پرزہ پر سب تہنیت ناموں کے نوٹ لکھتے بھی دیکھا اور فی البدیہہ تقریر کرتے بھی سنا، ایک مجمع میں جہاں تک کچھ چپ چپ تھے اس نے تکبیر کے نعرے بھی لگوائے۔ بمبئی کی چوپاٹی پر اس نے مہاتما گاندھی

کی بیوی سے باتیں بھی کرلیں اور مہاتما جی کو اپنا سلام بھی پہنچا دیا۔ اپنے ہموطنوں کے ایک مجمع میں گیا تو سب سے بغلگیر ہوا اور اکثر کی پیشانی پر بوسے دئے۔ لوگوں نے بادشاہوں میں یہ باتیں نہ دیکھی تھیں اس لئے اس نوجوان پر سب کے سب بلا تمیز مذہب وملت عاشق سے ہوگئے۔

اس نوجوان بادشاہ نے یہی نہیں کہ ہندوستانیوں کے دل اپنے قبضہ میں کرلئے۔ یہ ہندوستان سے زیادہ خوش نصیب، زیادہ مالدار، آزاد، بادشاہتوں اور جمہوریتوں میں گیا۔ استعماری اور اشترا کی دولتوں کا مہمان رہا اور ہر جگہ اس نے لوگوں کے دل مسخر کئے۔ یہ کیسے؟ اس لئے کہ یہ آدمی تھا اور اپنی آدمیت کے آگے اپنی بادشاہت کو بھول جاتا تھا۔ اس لئے کہ ایسی ملت کا بادشا تھا جس میں فضیلت کا معیار دولت اور تاج وتخت نہیں بلکہ نیکی ہے۔ جس کے شاہ وغلام دونوں ایک صف میں کھڑے ہوکر اپنے معبود کے آگے سربسجود ہوتے ہیں، اور جس میں "سروری" اور "خدمتگری" مترادف الفاظ ہیں۔ یہ آدمیت اس نے یورپ سے نہیں سیکھی تھی، مغربی انجنیروں، سیاست دانوں، تاجروں سے جن سے اسے کچھ نہ کچھ سابقہ پڑتا رہا تھا اسے اور کچھ سکھایا ہو لیکن آدمیوں میں آدمی بننا نہ سکھایا تھا۔ بیشک یہ یورپ میں مغربی وضع میں اور مغربی لباس پہنکر گیا تھا، لیکن اس کے استقبال کرنے والوں میں لاکھوں اس سے بہتر اور مغربی فیشن کے قریب تر وضع کا لباس پہنتے تھے۔ ان میں کچھ نہیں تو لاکھوں ایسے تھے جو اپنی داڑھی کے مونڈنے میں اس سے زیادہ اہتمام کرتے تھے اس لئے اس کی عزت اس کے مغربی لباس اور مونڈی ہوئی داڑھی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی بےنفس خدمتگذاری، اس کی سیرت، اس کی انسانیت کی وجہ سے ہوئی۔ اور یہ جاہل قوم کا بادشاہ اپنی شخصیت کی وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ ملکوں کے بادشاہوں اور مدبروں پر بھاری پڑا۔

اس نوجوان بادشاہ کے گرد کچھ لوگ تھے جنہوں نے یورپ میں تعلیم پائی تھی۔ جن کے نزدیک یورپ کی ہر چیز مستحسن اور ایشیا کی ہر چیز معیوب ہے۔ انہوں نے اپنے کو اپنی ملت از

ہب کی فضا سے علیحدہ کر لیا تھا اور ابھی کسی دوسری تمدنی سرزمین میں انکی جڑیں مضبوطی سے
م نہ تھیں۔ اور کیسے ہوتیں ؟ تمدنی روایات نہ ایک دن میں بنتی ہیں اور نہ ایک دن میں
نقل ہوتی ہیں۔ کچھ ان مصاحبوں، اور مشیروں کا اثر پیدا نکھوں کو خیرہ کر دینے والی یورپ کی
دی مرفہ الحالی نے اس نیک دل اور اپنی قوم کے عاشق بادشاہ پر یہ اثر ڈالا کہ میری قوم
ی اگر دنیا میں بڑھنا چاہتی ہے تو اسے اس قسم کی مادی ترقی کرنی چاہئے۔ اس کی رگوں میں
ان خون تھا اس نے ان مشیروں کی بات مان لی خود اپنے آثرات سے مغلوب ہو گیا اور
پنے ملک کو ایک جنبش قلم سے ایک جدید، اور متمدن ملک بنانے کی کوشش شروع کر دی۔
دت کے اس شوق نے اس کی نظر کو قوموں کے عروج کی عمیق حقیقتوں اور اخلاقی و
ہبی قوتوں کی طرف سے ہٹا دیا اور ظاہری تبدیلیوں کو غیر ضروری اہمیت دلا دی۔ "تمنا،
ی بے تابی" میں وہ بھول گیا کہ "عاشقی" بہت "صبر طلب" چیز ہے۔ قوم میں قدامت
ستی کے جو عناصر تھے، اس میں بہت سے برے اور تھوڑے ہی سے اچھے سہی، لیکن وہ سب
تمع ہو گئے اور انہوں نے "جدت پسندی" کی اس قوت کو ایک مرتبہ تو ضرور شکست دیدی
ب یہ نوجوان بادشاہ اپنے پایہ تخت سے دور پڑا ہے اور دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے
لئے طرح طرح کی کوششیں کر رہا ہے۔

یہ ہمارے ہمسایہ ملک افغانستان کا قصہ ہے۔ قدامت پرست خوش ہیں کہ جدت
پندی نے منہ کی کھائی۔ لیکن ابھی یہ خوشی ذرا قبل از وقت ہو اس سے کچھ آگے ایک ملک ترکی
بھی ہے اس میں قدامت پرستی ایسی ہی منہ کی کھا چکی ہے۔ اس لئے اس معرکہ کی فتح و شکست
اتنی اہمیت اس وقت نہیں جتنی خود اس معرکہ کی حقیقت کو ہے۔ اس لئے کہ یہ معرکہ ترکی و
نغانستان تک محدود نہیں۔ یہ تمام ایشیا اور افریقہ میں، نہیں ساری دنیا میں ہو رہا ہے اور
آج ہی نہیں ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ دنیا نے اپنی ساری تاریخ سے اس کے
تعلق کوئی عملی سبق نہیں لیا۔ اور ہمیشہ پچھلی غلطیوں کی تکرار ہوتی۔

قوموں اور جماعتوں کی زندگی اور اجسام نامی کی حیات میں بڑی مشابہت ہو۔ باشعور نامی اجسام کی زندگی سے ہمیں جماعتی زندگی کے اس معرکے کے متعلق کچھ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ کوئی باشعور نامی جسم اپنی حالت پر ایک لمحہ بھی قائم نہیں رہتا۔ تغیرات کا جلوہ گاہ ہوتا ہے اور ہر لمحہ یہ جسم پہلے لمحے سے مختلف ہوتا ہے لیکن کیا اس وجہ سے اس کی شعوری زندگی کا تسلسل اور اس کی توحید قائم نہیں رہتی۔ اس موخرالذکر تسلسل و توحید کے ختم ہوتے ہی زندگی ختم ہوجاتی ہے یا کم از کم صحت کی زندگی۔ ماضی کو حال سے مربوط رکھنے اور استقبال کے لئے ان دونوں سے کام لینے تک ہی صحیح زندگی کا قیام ہے۔ قومیں اور جماعتیں بھی اپنی زندگی کے لئے اس تسلسل کی دست نگر ہیں۔ یہ "نغمہائے رمیدہ" ہی سے زندہ اور حفظ ناموس کہن سے باقی رہتی ہیں۔ یہ رشتہ ٹوٹا اور سارا شیرازہ بکھرا۔

حیاتیات اور تاریخ دونوں کا سبق یہی ہے کہ جس طرح تغیر انفرادی اور قومی زندگی کا لازمہ ہے اسی طرح قدامت پسندی بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ ان دونوں میں صحیح تناسب قائم رکھنا قاید کا کام ہے۔ جب قدامت پسندی پرانے اداروں، پرانے معیاروں، پرانی قدروں کو بے جان بنا دیتی ہے اور ان کو محض منوانے کی خاطر منواتی ہے اس وقت قاید کا کام یہی نہیں کہ وہ نئی قدریں، نئے معیار، نئے ادارے پیدا کر دے۔ اس لئے کہ نئی قدریں ہیں کہاں! کونسا معیار ہے جسے انسان نے استعمال نہ کیا ہو؟ کون ادارہ ہے جس کی آزمائش نہ ہوچکی ہو؟ قائد ان قدیم قدروں کو زندہ کر دیتا ہے۔ اپنے دل کی گرمی سے ان اداروں کے مردہ دل پجاریوں کے دل بھی گرما دیتا ہے اور اپنی سینہ کی آگ سے وہ روحانی اور اخلاقی عناصر تیار کرتا ہے جن کے بغیر قومی ترقی اور ملی فلاح کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتے

ترکی اور افغانستان دونوں کے بظاہر متضاد حالات میں ہمیں یہ مایوس کن حقیقت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

جلد ۱۲	ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

سیرتِ نبوی اور مستشرقین

مقدمہ

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ کتاب جسکا یہ مقدمہ ہے مشہور مستشرق ولہاوزن کے اس مضمون کا ترجمہ ہے جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی طبع نہم میں محمڈزم کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس مضمون میں سے بھی صرف اس حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے جو رسول اللہ صلعم سے متعلق ہے۔ مستشرقین نے اسلام اور ہادی اسلام سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے اردو داں طبقہ اور خصوصاً علمائے کرام بہت کم واقف ہیں۔ یہ زہر انگریزی کے ذریعہ سے جدید تعلیمیافتہ جماعت میں پھیلتا جاتا ہے اور جن لوگوں پر دینی ہدایت کی ذمہ داری ہے ان کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مستشرقین کے صحیح خیالات سے اور انکی حقیقت سے لوگ واقف ہو جائیں تاکہ ایک طرف تو علماء کو مسئلے کی اہمیت کا احساس ہو اور دوسری طرف جو لوگ اس قسم کے مضامین پڑھتے ہیں انہیں حقیقت حال کا علم ہو جائے۔ بعض حضرات کا ممکن ہے یہ خیال ہو کہ مستشرقین کے اعتراضات ابتک اردو داں طبقہ تک نہیں پہنچے ہیں اور ان اعتراضات کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا قرین مصلحت نہیں۔ اسمیں تو شک نہیں کہ ابتک اس قسم کے خیالات کا مرکز صرف انگریزی داں طبقہ رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جدید ماحول کے اثر سے یہ زہر تجاوز کرکے نیم انگریزی داں طبقہ تک پہنچ گیا ہے اور یہاں پہنچکر اس کی نزاکت اور بڑھ جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ وہ اعتراضات کی حقیقت سے واقف

نہیں ہوتے بلکہ سنی سنائی باتوں سے انکی طبیعت میں ایک ہیجان پیدا ہوجاتا ہے اور دوسرے اگر شاذ و نادر کبھی انگریزی میں ان اعتراضات کے رد کرنیکی کوشش بھی کیجاتی ہے تو یہ لوگ اس سے بھی ناواقف رہتے ہیں۔ لہذا ان لوگوں کے لئے اور خصوصاً علمائے کرام کے لئے جن میں سے بیشتر السنہ مغربیہ سے نابلد ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اُردو زبان میں پہلے ان اعتراضات کو صحیح طور پر بلا کسی مبالغے کے پیش کیا جائے اور پھر انکی حقیقت بے نقاب کیجائے اس طرح ممکن ہے ہمارے علماء محسوس کریں کہ وقت کی ضرورت اب کیا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ طہارت کے طویل الذیل مسائل اور آمین و رفع یدین پر مناظرہ، دینی خدمت تسلیم کیا جائے بلکہ آجکل تو اصول اسلام اور خود شارع اسلام پر ہر طرف سے اعتراضات کی بارش ہورہی ہے اور اہل نظر کا فرض اور شدید ہوجاتا ہے کہ وہ اسلام کو دنیا کے سامنے پھر اسی رنگ میں پیش کریں جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ یہ ترجمہ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے اور حواشی میں اعتراضات کا جواب دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ مترجم کو اپنی خامیوں کا کامل احساس ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جواب کا پورا حق ادا نہ ہوسکا لیکن اسکا یہ مقصد بھی نہ تھا کہ ہر مسئلے پر آخری فیصلہ صادر کردے۔ اس تالیف کی غرض تو یہ تھی کہ اعتراضات بہ تمام و کمال سامنے آجائیں اور جو لوگ جواب دینے کے اہل ہیں لیکن خواب غفلت میں یا کسی غیر ضروری کام میں پڑے ہوئے ہیں ذرا چونکیں۔ اگر یہ تالیف علماء کرام کے جمود کو توڑ سکے اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کو جن کے قلوب تشکیک کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں غور و فکر کے لئے کچھ مسالہ فراہم کرسکے تو اسکا مقصد حاصل ہوگیا۔ ولہاوزن کے اس مضمون کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس نے اس میں نہایت اختصار کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو جمع کردیا ہے جو مستشرقین عام طور پر سیرت نبوی پر وارد کرتے ہیں اور اس کے مطالعہ کے بعد شاید ہی کوئی اعتراض چھوٹ جائے۔ ایسا مضمون کوئی اور نظر سے نہیں گذرا جس میں مستشرقین کے تمام نظریات بیک وقت موجود ہوں۔ انکے خیالات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ مضمون بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ ولہاوزن کا شمار مستشرقین کے طبقۂ اولیٰ میں ہوتا ہے

اور اس نے جو کچھ لکھا ہو اسے یورپ کے اہل علم بہت مستند اور قابل وثوق سمجھتے ہیں اس لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے لئے خاص طور پر اس سے یہ مضمون لکھوایا گیا تھا اور غالبًا جرمن سے ترجمہ کرا کے اس میں شائع کیا گیا۔

مستشرقین کے اعتراضات سے بحث کرنے سے پہلے اگر ہم ایک سرسری نظر ان خیالات پر ڈالیں جو اہل یورپ کے رسول اللہ صلعم سے متعلق ابتدائے اسلام سے لیکر عہد حاضر تک رہے ہیں تو ہمیں اسکا اندازہ ہو گا کہ آہستہ آہستہ انکے خیالات میں تبدیلی ہو رہی ہے اور وہ لوگ رسول اللہ صلعم کی ذات اور اصول اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ باسورتھ اسمتھ نے اپنی کتاب "محمڈ اینڈ محمڈنزم" میں جو پہلی دفعہ ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی تھی ایک خاکہ اس وقت تک کے خیالات کا کھینچا ہے۔ اسکا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ لفظی ترجمہ طوالت کے خیال سے نہیں کیا گیا۔ اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ "اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں دنیائے عیسائیت کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ تنقید یا توضیح کر سکتی اس کا کام تو صرف لڑنا اور اطاعت کرنا تھا لیکن جب وسط فرانس میں پہلی دفعہ مسلمانوں کا قدم رکا تو ان قوموں نے جو بھاگ رہی تھیں مڑ کر دیکھا۔ اب بھی اگرچہ انکی ہمت جنگ کرنیکی نہ تھی لیکن وہ پیچھے ہٹنے والے دشمن کو گالیاں تو دے سکتی تھیں ٹرپن کے رومان میں محمد (صلعم) کو جو بت پرستی کے شدید ترین مخالف تھے، خود ایک سونے کا بت کہا گیا ہو جس کی پرستش کاڈز میں ہوتی تھی اور جس کا نام مامٹ تھا رولان کے گیت میں جو فرانس کا قومی رزمیہ گیت ہو دکھایا گیا ہو کہ قرطبہ کا خلیفہ مارشل اسی بت کی پرستش کرتا ہے اور اس کی مرغوب قسم یہ ہے "عطارد کی قسم، محمد (صلعم) کی قسم اور اپولو کی قسم[1]"۔ عجیب قلب ماہیت اور عجیب افترا! اس بت کے سامنے انسانی قربانیاں کیجاتی ہیں اگر اور کہیں نہیں تو کم از کم دسویں

---

[1] رولان کے گیت کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ جامعہ جلد نمبر ۹ جس میں یوسف حسین خانصاحب کا ایک سلسلہ مضامین "عرب فرانسیسی ادبیات میں" کے عنوان سے شائع ہوا ہو۔

اور گیارہویں صدی کے مصنفین کے تخیل ہی میں سہی اور اسکا نام کبھی باؤتم ہوتا ہے اور کبھی ماؤمٹ. یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں ابتک عام غلط فہمی کی حامل ہیں فرانسیسی میں لفظ Mahometie اور انگریزی میں Mummery ابتک لغو اور مہمل رسوم کے لئے استعمال ہوتا ہے بارہویں صدی میں بجائے معبود کے محمد (صلعم) کو ایک مرتد اور بے دین کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے دانتے نے انہیں جہنم کے نویں حلقے میں ان لوگوں کے ساتھ رکھا ہے جو مذہبی تفرقے کے بانی ہیں - بانیاں اصلاح (Reformation) نے بھی محمد (صلعم) کی طرف جو سب سے بڑے مصلح تھے کوئی توجہ نہ کی اور انکی نفرت بھی انکے علم کی تعداد کے ساتھ ساتھ قائم رہی مصلحین غالبًا یہ نہ سمجھے تھے کہ پاپائی جماعت دونوں کو عیسائیت کا دشمن ٹھرائے گی اس لئے کہ پادریت اور رسوم پرستی کی مخالفت میں اسلام اور پروٹسٹنٹزم دونوں مشترک ہیں۔ اسی زمانے میں یہ حکایت بھی ایجاد ہوئی کہ ایک کبوتر کو محمد (صلعم) نے سکھایا تھا کہ انکے کان میں سے دانے چنے اس سے موجدین کے خبث سے زیادہ ان کی حماقت کا ثبوت ملتا ہے مگر یہ روایت بھی عام طور پر صحیح تسلیم کیجاتی تھی . اس وقت بھی حالت کچھ بہتر نہیں ہوئی جب یہ محسوس کیا گیا کہ رائے قائم کرنے سے قبل جہانتک ممکن ہو سرچشمے کا مطالعہ کرنا چاہئے - چنانچہ فرانسیسی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۶۴۹ء میں اور دوسرا ۱۶۹۵ء میں ہوا اسی کے بعد ایک شخص الگزنڈر راس نے فرانسیسی سے انگریزی میں اسکا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں کے ساتھ جو مقدمے درج تھے ان میں طرح طرح کی غلط بیانیوں سے کام لیا گیا تھا اس لئے اس کا بھی کوئی اچھا اثر نہ پڑا پھر بھی باوجود ان غلط فہمیوں کے جو ابتک عوام میں رائج ہیں انگلستان اور فرانس ہی کے سر عربی ادب اور عربی تاریخ کو تاریخی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنیکی ابتدا کا سہرا ہے اور اسی ابتدا کی وجہ سے گبن اور ریور، کاسین دی پرسیوال اور سینٹ ہلیر، وائل اور اشپرنگر کے ہاتھوں اب ایسا مسالہ فراہم ہوگیا ہے کہ ہر شخص معقول اور غیر جانبدارانہ رائے قائم کرسکتا ہے۔ اس تحریک کا بانی گیگنیر ہے جو پیدائش کے لحاظ سے تو فرانسیسی تھا لیکن انگلستان کو اس نے اپنا وطن بنالیا تھا۔ آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر مقرر ہونے کے بعد اس نے محمد (صلعم) کی تاریخ لکھنی شروع کی جس کی

بنیا دابو الفدا کی تصنیف پر تھی۔ اسکے بعد ہی سیل اور سیوا ریسے نے دو مختلف یورپی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ انہی تصانیف سے اور خصوصاً سیل کے "تمہیدی مباحث" سے گبن کو جو خود عربی نہ جانتا تھا وہ مسالہ ملا جس سے اس نے وہ باب محمد کی زندگی پر باندھا جن کا جواب سیرت نگاری میں نہیں ملتا۔ لیکن انگریزوں کے خیالات میں جو کچھ بھی تبدیلی ہوئی وہ گبن کی وجہ سے نہیں بلکہ کارلائل کی وجہ سے۔ ہم میں سے کتنے اس تعجب انگیز اور علمی و مذہبی زندگی کے اس یادگار واقعے کو بھول سکتے ہیں کہ کارلائل نے "بطل بصورت رسول" کے لئے نہ موسٰے کا انتخاب کیا نہ ایلیا کیا اور نہ عیسٰی کا بلکہ محمد (صلعم) کو لیا جنہیں عام طور پر لوگ فریبی سمجھتے تھے۔"

یہ تھا باسورتھ اسمتھ کی تحریر کا خلاصہ جس سے اس زمانے تک کے خیالات کا ایک دھندلا سا نقشہ دماغ میں قائم ہو سکتا ہے اس میں بہت سے خیالات ایسے ہیں جنہیں نقل کرتے وقت ایک مسلمان کا قلم کانپ اٹھتا ہے مگر تسکین اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ "نقل کفر کفر نہ باشد" اس کے بعد مستشرقین کا دور شروع ہوتا ہے جن کا ایک نمائندہ ہمارا مضمون نگار رولنا وذن ہے اور جس کے خیالات اگلے صفحات میں مرقوم ہیں۔ مستشرقین نے بھی باوجود کوشش کے رسول صلعم کی شخصیت اور انکی تعلیمات کو کماحقہ نہیں سمجھا، یا اگر سمجھا تو اُسے تحریر میں لانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس مقدمہ میں بعض ان اصولی مسائل سے بحث کی گئی ہے جن کے سمجھنے کے بعد اعتراضات کی حقیقت کھل جائیگی اور جنہیں یا تو مستشرقین سمجھے نہیں ہیں یا دیدہ و دانستہ ان سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

سب سے پہلا مسئلہ وحی کا ہے۔ مستشرقین اسے تسلیم نہیں کرتے کہ رسول اللہ صلعم حامل وحی خداوندی تھے اور خود رسول اللہ صلعم نے صاحب وحی ہونیکا جو دعوے کیا ہے اس کی طرح طرح سے تاویل کرتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ سراسر فریب ہے اور انہیں خود بھی یہ یقین نہ تھا کہ ان پر نزول وحی ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ انہیں صرع کی قسم کا ایک دائمی دورہ ہوتا تھا اور اس دورے کی حالت میں جو خیالات انکے ذہن میں آتے تھے انہی کو وہ منزل من اللہ سمجھ لیتے تھے۔ پھر ان میں بھی دو طبقے ہیں ایک کا خیال ہے کہ وہ آخری وقت تک اسی خود فریبی میں مبتلا رہے

اور دوسرا کہتا ہے کہ مکی زندگی میں تو واقعی انہیں اپنی نبوت کا خود یقین تھا لیکن مدینہ پہنچکر وہ صرف اپنی کامیابی کے لئے ایسا ظاہر کرتے تھے دراصل اب یقین انہیں بھی نہ تھا کہ وہ نبی ہیں۔ لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر تمام علم انہیں کہاں سے حاصل ہوا اس لئے کہ وہ تو اُمی تھے۔ اس کے جواب میں طرح طرح کی خیال آرائیاں کی گئی ہیں جن میں سے اکثر حد درجہ مضحکہ خیز ہیں۔ اسی سوال کے جواب کے لئے بحیرا راہب کے قصے کو اسقدر شہرت دی گئی اور ذرا سی بات کو ایک افسانہ بناکر پیش کیا گیا۔ اسکے علاوہ جیسا خود ولہاوزن نے لکھا ہے یہ بھی کہا گیا کہ یہودیوں سے شروع شروع میں رسول اللہ صلعم کے تعلقات اچھے تھے اور انہیں یہ سب علم انہی سے حاصل ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ماخذ اسلام کے نام سے من چلوں نے ضخیم رسالے لکھ ڈالے اور کس لئے محض اس نظریہ کے ثبوت کے لئے کہ رسول اللہ صاحب وحی نہیں تھے حالانکہ کوئی قطعی ثبوت اب تک یہ لوگ پیش نہ کر سکے۔ محض یہ ثابت کر دینے سے کہ اسلام کا فلاں رکن فلاں مذہب سے ماخوذ ہے یا اس کے مطابق ہے وحی کا انکار لازم نہیں آتا اس لئے کہ اسلام نے کبھی جدت کا دعوی نہیں کیا۔ قرآن تو پکار پکار کر کہتا ہے کہ اسلام تمام انبیاء کا مذہب ہے۔ یہ وہی اصل الاصول ہے جسے تمام مذاہب نے اپنا سنگ بنیاد قرار دیا ہے البتہ زمانے کے لحاظ سے ہر مذہب کچھ اپنی خصوصیات رکھتا ہے اور اسی وجہ سے فروعات میں تمام مذاہب مختلف ہیں۔ ثابت تو یہ کرنا چاہئے کہ رسول اللہ صلعم نے جس دین کی تبلیغ کی اسے انہوں نے کسی انسانی ذریعے سے حاصل کیا تھا اور اسی کو مستشرقین باوجود کوشش کے ثابت نہ کر سکے۔ انہوں نے دور از کار قیاسات اور غلط استنباطات کو تحقیق علمی کی صورت میں پیش کیا حالانکہ اہل نظر پر انکی مضحکہ انگیزی بالکل عیاں ہے۔

رسول اللہ صلعم کے صاحب وحی ہونے سے جو لوگ انکار کرتے ہیں انکی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو عیسائی مشنری یا دوسرے مذاہب کے مبلغین ہیں جو اپنے نبی یا پیغمبر کو تو صاحب وحی سمجھتے ہیں مگر رسول اللہ صلعم کے متعلق اسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ انکے لئے تو تمام دلائل بیکار ہیں اس لئے کہ ان کی رائے کا انحصار دلائل پر نہیں بلکہ جذبات پر ہے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ دوسرا

طبقہ وہ ہے جو وحی کے امکان ہی کو تسلیم نہیں کرتا. اسکے لئے تمام انبیاء اور تمام مذاہب یکساں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ۔ دلائل کی ضرورت اس طبقہ کے لئے ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وحی کا مسئلہ مابعد الطبیعیات کے تمام مسائل کی طرح ظنی ہے ۔ اس کے ثبوت میں کوئی ایسی قطعی دلیل نہیں پیش کیجا سکتی جیسی طبعی علوم سے متعلق کہ مخالف کو انکار کی گنجائش نہ رہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ طبعی علوم میں بھی چند ہی ایسے مسئلے ہونگے جسے بلا استثنا تمام علما تسلیم کرتے ہوں اس لئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ نزول وحی کو اس طرح ثابت کر دیا جائے جس طرح ریاضی کا یہ مسئلہ کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں. منکرین وحی کے پاس انکار کی کوئی وجہ بجز اس کے نہیں کہ سائنس یا عقل کی روسے ایسا ہونا ممکن نہیں ۔ اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو اس استدلال کی کمزوری نمایاں ہو جاتی ہے۔ علوم وفنون میں آئے دن جو ترقی اور نظریات میں جو تغیر و تبدل ہو رہا ہے اس سے یہ حقیقت ناقابل انکار ہوتی جاتی ہے کہ عقل انسانی نہایت درجہ ناقص ہے اور انسانی معلومات یکسر محدود ہیں۔ ہر روز ایک نہ ایک چیز ایسی دریافت ہوتی رہتی ہے جس سے نظریات کی پرانی دیوار مسمار ہو جاتی ہے اور نئی دیوار تعمیر کرنی پڑتی ہے ۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کوئی ذی فہم انسان کسی نظریے کی بابت یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ قطعی ہے اور نہ یہ کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ جب طبعی علوم کا کوئی ایسا میدان نہیں جس کی انتہا تک انسان کا قدم پہنچ چکا ہو تو مابعد الطبیعیات میں اس کا قطعی حکم لگانا کہاں تک مناسب ہے آج سے پچاس برس پہلے کون یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوتا کہ نباتات میں بھی احساس رنج و غم موجود ہے اور وہ بھی حیوانات کی طرح متاثر ہوتے ہیں لیکن سرجے۔ سی بوس کی تحقیقات سے آج یہ تقریباً یقینی ہو گیا ہے پھر ہمارے لئے کیا ایسی مجبوری ہے کہ ہم حواس انسانی کو محض پانچ ملک محدود سمجھ لیں اور قطعی حکم لگا دیں کہ اس کے علاوہ کوئی حاسہ کسی انسان میں موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ نزول وحی پر ایمان رکھتے ہیں وہ یہی تو کہتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام میں عام انسانوں کے خلاف یا ان سے بڑھ کر ایک طاقت یا حاسہ موجود ہوتا تھا جس کی مدد سے وہ ایسی چیزیں دیکھتے تھے جو عام انسان نہیں دیکھتے یا ایسی باتیں سنتے تھے جو عوام الناس نہیں سنتے

انسانی حواس اور قویٰ میں اس قدر فرق اور تدریج نظر آتی ہے کہ اس کا تو منطقی نتیجہ یہی ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہو جس کے حواس اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ گئے ہوں یا جس میں فطری طور پر کوئی ایسا حاسہ موجود ہو جو عوام الناس میں موجود نہیں ہوتا اور خصوصاً ایسی حالت میں جب ہم روز دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جس میں حواس خمسہ میں سے کوئی حاسہ بہت کم یا یکسر ناپید ہے۔ ہمیں اس وقت تو تعجب نہیں ہوتا جب ہم ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو عام انسانوں کی طرح دیکھ نہیں سکتا یا سن نہیں سکتا لیکن اس وقت تعجب ہوتا ہے اور ہم اسے ناممکن بھی کہنے لگتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان نے وہ دیکھا جو ہمیں نظر نہیں آیا اور سنا جو ہمیں سنائی نہیں دیتا تعجب یاشک تو ہو سکتا ہے اس لئے کہ پہلی صورت عامۃ الورود ہے اور دوسری صورت بالکل نادر لیکن اس کے کیا معنی ہیں کہ ہم اسے ناممکن قرار دیں اور قابل التفات ہی نہ سمجھیں مناسب طریقہ تو یہ ہے جہاں تک ممکن ہو صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد نئی صورت حالات پر غور کریں اور ضرورت ہو تو اپنے پرانے نظریہ میں تبدیلی کریں۔ رسول اللہ صلعم کی ابتدائی زندگی کے حالات، آپکی صداقت و راست بازی، پھر وہ کیفیات جو پہلے پہلے نزول وحی کے سلسلے میں ان پر طاری ہوئیں اور حدیث کی مستند کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں اور آخر میں وہ نتائج جو نزول وحی سے مترتب ہوئے ان سب کا مطالعہ کرنے کے بعد بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وحی کے امکان کو تسلیم کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی خداوندی کا نزول ہوتا تھا۔ اس مختصر سے رسالے میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وحی کے تمام دلائل پیش کئے جائیں اور اس کی تمام صورتوں سے بحث کیجائے اس لئے صرف اشارے سے کام لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر عربی کی بہت سی تصانیف میں مفصل بحث موجود ہے۔ انگریزی میں بھی کافی کتابیں ملتی ہیں اور اردو میں بھی باوجود قلت کے اتنا مسالہ مل سکتا ہے کہ طلب صادق رکھنے والے کو تسکین قلب کا سامان فراہم ہو سکے[۵۱]۔

۵۱۔ (نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۱ اصل کتاب کا)

دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد اسلام کی معنویت فنا ہو گئی اور اس میں سیاسی رنگ زیادہ غالب نظر آنے لگا اور شرع شروع میں لوگوں پر جو اثر پڑا تھا اس سے فائدہ اٹھاکر سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے بعد رسول اللہ صلعم نے جو کارروائیاں کی وہ دراصل سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنے کی غرض سے تھیں۔ ولہاوزن نے رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کے تمام اہم واقعات کو اسی رنگ میں پیش کیا ہے اور ہر جگہ یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجرت کے بعد رسول نے مذہبی اثر سے فائدہ اٹھاکر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسی وجہ سے انہیں تلوار اٹھانی پڑی اور خفیہ قتل کا موجب ہونا پڑا۔

غائر نظر سے دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ تعصب کے جس کی ہر جگہ کارفرمائی نظر آتی ہے اس قسم کے اعتراض کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ مذہب کا وہ ناقص تخیل ہے جو معترضین کے ذہن میں جاگزیں ہے۔ عیسائی معترضین اسلام کو بھی عیسائیت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ انکی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ دین کو سیاسی یا معاشی مسائل سے کیا سروکار ہے۔ انکا خیال ہے کہ اس میں صرف عبادات اور عقائد سے بحث ہونی چاہئے اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے اسے بے تعلق رہنا چاہئے۔ خیر اگر عیسائی یہ اعتراض کریں تو سمجھ میں آنے کی بات ہے اس لئے کہ انکا مذہب دنیا سے قطع تعلق اور سیاست اور حکومت سے بے پروائی کی تعلیم دیتا ہے لیکن ہمارا مضمون نگار جو خود یہودی ہے کس طرح یہ اعتراض کر سکتا ہے۔ یہود کے مذہب میں تو سراسر حکومت اور سیاست سے متعلق احکام ہیں اور حضرت موسیٰ کا تو مقصد ہی جہاں تک انکی تعلیمات اور ابتدائی حالات سے معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل کو فراعنہ مصر کی سیاسی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ

وحی کی تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو:۔

۱۔ کتاب دین و دانش ۔ مولوی محمود علی　　۲۔ الکلام ۔ مولنا شبلی نعمانی

۳۔ سیرۃ النبی جلد سوم ۔ مولنا سید سلیمان ندوی　　۴۔ اسرار شریعت جلد سوم ۔ مولوی محمد فضل خاں

ان کی تعلیمات میں بھی عبادات اور عقائد کا کافی ذکر ہے لیکن یہودیت کا اصل الاصول تو قواعد و احکام دنیوی ہی ہیں۔

اسلام کے علاوہ تاریخ سے جتنے مذاہب کا پتہ چلتا ہے انکی دو قسمیں ہو سکتی ہیں ایک کو ہم قومی کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو نزدانی۔ قومی مذاہب سے مراد وہ مذاہب ہیں جن میں زیادہ تر سیاسی معاشی اور معاشرتی زندگی سے متعلق احکام ہیں یوں تو کوئی مذہب بھی ایسا نہ ہوگا جس میں عقائد اور عبادات کا ذکر نہ ہو لیکن مذاہب کی تقسیم یہاں انکے غالب رنگ کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اس تقسیم میں عہد عتیق کے تمام مذاہب۔ یہودیت اور زرتشتی مذہب داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مذاہب ہیں جو عام طور پر مشہور نہیں ہیں۔ دوسری قسم یعنی نزدانی مذاہب سے وہ مذاہب مراد ہیں جن میں سراسر ترک دنیا اور تعبد و تقشف کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں دنیا کے تین بڑے مذاہب یعنی ہندومت، بدھ مت اور عیسائیت داخل ہیں۔ جن لوگوں نے ان مذاہب کی تعلیم کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ انکا غالب عنصر ترک لذات، قطع تعلقات دنیوی، فلسفیانہ غور و فکر اور عبادت و رہبانیت میں انہماک ہے۔ یہ تمام مذاہب اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور اپنے مخصوص عہد اور مخصوص حالات کے لئے بہترین مذاہب تھے لیکن نظر غائر سے دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ ان میں سے ایک بھی کامل مذہب نہیں ہے انسانیت کے ابتدائی دور میں اس میں شخصیت پیدا کرنے کے لئے اور بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کو واضح کرنے کے لئے ایسے مذاہب کی ضرورت تھی جن میں زیادہ زور انہی عناصر پر دیا گیا ہو۔ لیکن انسان تو عجیب قسم کی مخلوق ہے وہ جس طرف جھکتا ہے ادھر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ دوسرے رخ کو بالکل بھول ہی جاتا ہے چنانچہ ان تعلقات کی دیکھ بھال میں اس میں اتنی خود غرضی پیدا ہو گئی اور دنیاوی معاملات سے اس قدر شغف اسے ہو گیا کہ اس کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہونے لگا۔ اب ایسے مذاہب کی ضرورت پیش آئی جن میں زیادہ زور ان تعلقات کے قطع کرنے اپنی ہستی کو گم کرنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے پر دیا گیا ہو۔ اس

ے ردعمل ہوا۔ اور انسان نے روحانیت کیطرف توجہ کی لیکن ایک عرصہ گذرنے کے بعد اس میں بھی وہی ایک طرفہ شدت پیدا ہوگئی اور جائز دنیادی تعلقات سے بے نیازی کے باعث پھر شیرازہ عالم درہم و برہم ہونے لگا۔ اب زندگی کے دونوں پہلو انسان کے سامنے تھے لیکن علیحدہ علیحدہ ایک طرف کچھ لوگ تھے جو سراسر دنیا میں محو تھے اور روحانیت سے بے نیاز۔ دوسری طرف ایک طبقہ تھا جو دنیا کی طرف رخ کرنا بھی حرام سمجھتا تھا اور یکسر تقشف و رہبانیت کی زندگی کو مقصد حیات سمجھتا تھا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو انسان کی تخلیق نہ اس کے لئے ہوئی تھی اور نہ اُس کے لئے۔ اس وقت ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہوئی جو دونوں عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر سکے اور انسان کے لئے ایسا لائحہ عمل پیش کر سکے جس کی پابندی سے اسکی تخلیق کا مقصد حاصل ہو۔ اسلام اسی طاقت کا نام ہے۔ اور اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلام سے یہی مراد ہے۔ تمام دوسرے مذاہب نے اسی دین کے لئے زمین تیار کی تھی اور یہی اصل الاصول تھا جس کے لئے انسانی دماغ کی پرداخت کیجارہی تھی۔ اسلام نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا کہ نہ صرف دنیا سے کام چل سکتا ہے اور نہ صرف دین سے بلکہ ع دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر شود۔ اور جبتک مسلمان اس اصل الاصول کو نہیں بھولے وہ خود بھی کامیاب رہے اور تمام دنیا کو ان سے فائدہ بھی پہنچا۔ اور جیسے ہی انہوں نے اس مرکزی حقیقت کو فراموش کیا انکی ترقی تنزل سے بدل گئی۔ اور اب انکا وجود صفحہ عالم پر حرف غلط کی طرح رہ گیا ہے۔ اگر معترضین ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں اور تعصب کی عینک اتار ڈالیں تو ان پر یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ اسلام نے قدم قدم پر اس ہم آہنگی کے قائم رکھنے کی تائید کی ہے۔ اگر ایک طرف اس نے جائز دنیوی تعلقات کے قائم رکھنے کی تعلیم دی ہے اور ایسے اصول بتائے ہیں جن کی پیروی سے انسان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کی تمام پیچیدگیاں رفع ہو جاتی ہیں تو دوسری طرف اتنے ہی زور سے روحانی زندگی کو قائم رکھنے کی بھی ہدایت کی ہے اور ایسے سامان فراہم کئے ہیں جن سے انسان کی روحانی احتیاج پوری ہو اور اسے ابدی مسرت اور دائمی خوشی حاصل ہو۔ قرآن کا ہر صفحہ اس دعوے کی دلیل ہے اور رسول کی زندگی کا ہر واقعہ اس حقیقت کا شاہد

دلائل وشواہد کی یہ کثرت ہو کہ انکار کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی ۔

حیرت کا مقام ہے کہ معترضین کو رسول اللہ صلعم کی مکی اور مدنی زندگی میں کوئی ربط نہیں نظر آتا اور وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مدینہ میں آکر ان کی زندگی میں کوئی تغیر رونما ہوگیا تھا ۔ مکے کا کام دراصل بنیاد کا حکم رکھتا تھا جس پر مدنی زندگی کی عمارت تعمیر کی گئی تھی ۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ایسی قوم کو جو ضلالت وگمراہی کے عمیق ترین غار میں گری ہوئی ہو صحیح راستے پر لگا دیا جائے اس میں دینی احساس پیدا کیا جائے ۔ اسے سمجھایا جائے کہ ایک اس سے بالا ہستی بھی ہے جس کے سامنے اسے جواب دینا پڑے گا ۔ جب یہ حقیقت ایک گروہ کے ذہن نشین ہوگئی تو انہیں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تمام مسائل کی تعلیم دی گئی اور یہ بتایا گیا کہ انسان کو دنیا میں کس طرح بسر کرنا چاہئے ۔ اگر رسول اللہ صرف عقائد وعبادات کی تعلیم دینے پر اکتفا کرتے اور بنی نوع انسان کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل نہ تیار فرماتے تو اس کا نتیجہ وہی ہوتا جو عیسائیت کا ہوا تھا ۔ سیاست و معاشرت کو دین سے علیحدہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے اس شعبے میں انسان کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے اور اس کے جذبات وعواطف کی ہدایت کے لئے کوئی شمع نہ روشن کی جائے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاملات اور باہمی تعلقات میں انسان انتہائی خود غرضی اور بے رحمی سے کام لے گا اور صورت حالات وہ پیدا ہوگی جو آج کل یورپ میں ہے ۔ عیسائیت کی تعلیم تو یہ ہو کہ اگر کوئی تمہیں ایک طمانچہ مارے تو دوسرے کے لئے بھی اپنے رخسار پیش کردو اور اگر کوئی تمہاری چادر چھین لے تو تم اسے اپنا کرتا بھی اتار کر دیدو لیکن آج عیسائی اقوام کا طرز عمل کیا ہے ۔ بالکل اس کے خلاف ۔ اگر ان کا حق ایک گز زمین پر ہوتا ہے تو وہ اس وقت تک قانع نہیں ہوتیں جب تک ایک میل زمین حاصل نہ کرلیں ۔ یہ کیوں ؟ اس لئے کہ انکے نزدیک دین کو سیاست یا معاشرت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے ۔ یہ خصوصیت صرف اسلام کی ہے کہ اس نے اپنے ابتدائی دور میں ایک ایسی جماعت تیار کردی جو اپنے تمام معاملات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا معاشرتی دین کی روشنی میں دیکھتی تھی اور جس کے باہمی تعلقات میں مساوات واخوت کا اسا خوشنما رنگ جھلکتا

ماجرا تک صفحات تاریخ کی زیب و زینت ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ہدایات موجود ہیں اور کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جو تاریک رہ گیا ہو۔ کامل دین وہی ہے جو انسان کی ہر دشواری میں خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ کام آئے۔ حالات کچھ بھی ہوں۔ ماحول کتنا ہی بدل جائے لیکن انسان کے پاس ایسے اصل الاصول موجود ہوں جن سے سیدھا راستہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اسلام اس ضرورت کو پورا کرتا ہے اور بدرجہ اتم پورا کرتا ہے۔ وہ ایسی شاہ راہ بتا دیتا ہے جس پر چل کر انسان منزل مقصود تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔ اور کمال تو یہ ہے کہ باوجود تمام پہلوؤں پر حاوی ہونے کے کہیں انسانی فکر کو پابند اور محدود نہیں کرتا۔ ہر جگہ انسان کو مناسب آزادی عطا کرتا ہے اور اسے اختیار دیتا ہے کہ مخصوص حالات اور واقعات کی مناسبت سے فروع میں تغیر و تبدل کر سکے اور ظاہر ہے کہ اصول کے تغیر کی تو کوئی دین اجازت دے ہی نہیں سکتا۔

ان سطور کے ملاحظہ سے ایک حد تک واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلام میں آتنی معنویت موجود ہے جتنی انسان کے لئے ضروری ہے اور رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کی تعلیمات عین منشائے تخلیق انسانیت کے موافق ہیں اور معترضین کے اعتراضات مذہب کے ناقص تخیل پر مبنی ہیں۔

تیسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم اور کفار مکہ اور یہود کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان کی ذمہ داری رسول پر ہے اور ہمیشہ پیش قدمی انہیں کی طرف سے ہوئی۔ اسی سلسلے میں یہ الزام بھی ہے کہ بعض یہودیوں کو رسول اللہ صلعم نے خفیہ طور پر قتل کرا دیا۔ ان اعتراضات میں حقیقت کا ذرا سا شائبہ بھی نہیں۔ مندرجہ ذیل سطور کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ قرآن نے صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے اور یہ بھی کہ رسول اللہ صلعم کو مجبوراً اپنی حفاظت اور تبلیغ دین کی آزادی کے لئے ہتھیار اٹھانا پڑا تھا۔

آیت جہاد جس میں مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی اس قدر واضح ہے کہ شک اور شبہے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی :-

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی | انہیں اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی گئی اس لئے کہ ان پر

نصرھم لقدیرہ الذین اخرجوامن دیارھم بغیرحق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز

سورۃ الحج (۲۲) آیت ۴۰ و ۴۱

ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ انکی مدد کرنے پر قادر ہے۔ جو صرف اتنا کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے اور اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے نہ روکتا تو صومعے، گرجا، عبادتگاہ اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے مسمار ہوگئی ہوتیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں۔ بیشک اللہ قوی اور غالب ہے۔

ان آیات کے پڑھنے کے بعد کیا یہ صاف نہیں ہوجاتا کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت محض اس وجہ سے دی گئی تھی کہ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے تھے۔ ناحق انہیں گھروں سے نکال دیا گیا تھا۔ اسپر مستزاد یہ کہ ان سے جنگ بھی کیجاتی تھی اور اگر اس کی اجازت نہ ملتی تو اللہ کے نام لیوا دنیا سے مٹ جاتے۔ یہانتک تو اجازت جنگ کی وجہ بتائی گئی تھی اب اسکا مقصد ملاحظہ ہو:۔

وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین للہ فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظلمین

البقرہ ۔ ۲۵ ۔ آیت ۱۸۹

اور ان سے لڑو یہانتک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہوجائے۔ اور اگر وہ رک جائیں تو زیادتی ظالموں کے سوا کسی پر نہیں ہوسکتی۔

اس سے ایک طرف تو یہ صاف ہوگیا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ دور ہوجائے اور دین میں سوا اللہ کے خیال کے دوسرے کا خوف یا ڈر باقی نہ رہے اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہوگیا کہ فساد کرنے والے اگر باز آجائیں تو پھر جنگ خود بخود ختم ہوجاتی ہے اور مسلمانوں کو لڑائی جاری رکھنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ یہ بھی ملاحظہ ہو کہ کن لوگوں سے جنگ کی اجازت ہے:۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین

(۲۔ ۱۸۶)

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

کیا اب بھی کوئی شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ صرف مدافعانہ جنگ کی اجازت دی گئی ہے اور دفاع سے بڑھ کر
تجاوز کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ قرآن میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں جن میں اسی خیال کی تکرار ہے اور
اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ دین کے معاملے میں نہ تو خود مسلمانوں کو جبر و اکراہ سے کام لینا چاہئے
اور نہ جبر و اکراہ برداشت کرنا چاہئے۔ جنگ کی اجازت انتہائی مجبوری کی حالت میں دی گئی ہے
جب دنیا سے اللہ کے نام لیواؤں کے مٹنے کا خوف ہو۔ جب خدا کے دین کی تبلیغ میں طرح طرح کی
رکاوٹیں ڈالی جاتی ہوں تو خدا کے رسول کے لئے بجز اس کے کیا چارہ ہے کہ کمر ہمت باندھ کر کھڑا
ہو جائے اور راہ حق سے تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ ہاں اگر اس مقصد کے
حاصل ہو جانے کے بعد محض حصول اقتدار یا جلب منفعت کی خاطر رسول لوگوں سے جنگ کرے تو البتہ
وہ مورد الزام ہو سکتا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایسا کیا۔ یا کوئی اس سے انکار
کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے بالکل آخری تدبیر کی صورت میں ہتھیار اٹھایا۔ کے میں ان پر اور
انکے متبعین پر کیا کیا تکلیفوں کے پہاڑ نہ گرائے گئے، کونسا ایسا ظلم باقی رہ گیا جو دین حق کے ماننے
والوں پر نہ ڈھایا گیا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ جب بے خانماں مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر پردیس
میں جا بسے تو وہاں بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ مدینے کے قرب و جوار میں برابر چھوٹے
چھوٹے حملے ہوتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑے حملے کی تیاری بھی جاری رہی۔ حواشی میں
تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ جنگ بدر کے کیا اسباب تھے اور یہ کیسا بے بنیاد الزام ہے کہ رسول
اللہ صلعم اور انکے ساتھی قافلے کو لوٹنے کی غرض سے نکلے تھے یہیں سے باقاعدہ جنگ کا سلسلہ شروع
ہوتا ہے۔ پھر جنگ احد اور جنگ احزاب کہاں ہوئی تھی۔ کیا اسمیں بھی رسول نے ہی پیش قدمی
کی تھی کیا بار بار قریش مکہ اور انکے حلفا نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ مدینہ پر حملہ نہیں کیا اور کیا
مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ انہوں نے اٹھا رکھا۔ اگر خدا کی مدد مسلمانوں
کے شامل حال نہ ہوتی تو انکا نام دنیا سے خارج ہو گیا ہوتا اور اللہ کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہتا
حواشی میں ہر واقعے کے ضمن میں یہ بھی اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ رسول اللہ کی کوئی جنگ جارحانہ

نہیں تھی ۔ ابتدا میں تو انپر پے در پے حملے ہوتے رہے اور انہیں دم لینے کی فرصت ہی نہ ملی اس کے بعد یہ ضرور ہوا کہ انہیں دشمنوں کی تیاریوں کی خبر پہلے سے ملجاتی تھی اور وہ بسلسلہ تقدم بحفظ انکو جڑ ہی سے کاٹ دینے میں کامیاب ہوجاتے تھے ۔ یہ جنگوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک سے دوسرے کا سامان پیدا ہوتا تھا اور ہر جنگ کو علحدہ علحدہ نہیں دیکھا جا سکتا ۔ کفار قریش نے جبتک ان میں کچھ بھی دم باقی رہا اپنی تمام کوششیں رسول اللہ صلعم کی مخالفت میں صرف کردیں ۔ تو کیا رسول اللہ صلعم کو یہ حق نہ تھا کہ ان کی تدابیر کا توڑ کرتے اور اپنی ہستی کو برقرار رکھنے اور اس دین کی تبلیغ کی آزادی کے لئے جس کے وہ حامل تھے کوئی صورت پیدا کرتے ۔ یہ ہے حقیقت اس اعتراض کی کہ اسلام تلوار کے ذریعے سے پھیلا ۔ اب اہل انصاف خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اس میں کہاںتک صحت کو دخل ہے رہا بعض اکابر یہود کے خفیہ قتل کا سوال جسکا الزام رسول اللہ صلعم پر لگایا جاتا ہے اسکی حقیقت بھی ایک افسانے سے زیادہ نہیں ۔ حواشی میں ہر اس واقعے کے سلسلے میں جہاں یہ الزام لگایا جاتا ہے الگ الگ تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور سب کے مطالعے کے بعد یہ صاف ظاہر ہوجائیگا کہ اس اعتراض کی بھی کوئی اصلیت نہیں ۔

چوتھا اور آخری اعتراض جس سے یہاں بحث کرنی منظور ہے یورپ کی نگاہ میں سب سے بڑا اعتراض ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ باوجود نہایت سادہ زندگی بسر کرنے اور لذات کے ترک کردینے کے رسول اللہ صلعم میں ایک کمزوری باقی رہگئی تھی جس کا اظہار یوں ہوا کہ عام مسلمانوں کو انہوں نے صرف چار بیبیوں کی اجازت دی لیکن اپنی ذات کو اس کلیے سے مستثنیٰ کرلیا ۔ معترضین کو اس میں خواہشات نفسانی کی کارفرمائی نظر آتی ہے ۔ نعوذ باللہ من ذٰلک ۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے اعتراضات کی طرح اسکا انحصار بھی تعصب پر ہے اور کسی معترض نے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنیکی کوشش نہیں کی ہے ۔ اگر ازواج رسول اللہ صلعم کی فہرست پر ہم نظر کریں تو یہ اعتراض حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے ۔ بجز حضرت عائشہ رض کے تمام ازواج پہلے کسی نہ کسی کے عقد میں رہ چکی تھیں اور جب رسول اللہ صلعم نے ان

نکاح کیا تو ان کی عمریں شباب سے متجاوز ہو چکی تھیں دوسری طرف حضرت عائشہؓ کی
عقد کے وقت اتنی کم تھی کہ ایک عرصے تک وہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر
ملیں اگر رسول اللہ صلعم واقعی نفسانی جذبے سے متاثر ہوتے تو ان کو جوان اور حسین
نیں عقد کے لئے نہ مل سکتی تھیں؟ عرب میں اس وقت کونسی عورت اس شرف سے
بر سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کے خلاف بیوہ اور سن عورتوں سے شادی کی ۔
کے بعد اگر ہم ان تعلقات پر نگاہ کریں جو رسول اللہ صلعم کے ازواج کے ساتھ تھے
ئلہ اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نفس پرست انسان
ی فکر اور آزادی عمل کھو بیٹھتا ہے اور عورتوں کی خواہشات کا پابند ہو جاتا ہے
بھ حکم دیتی ہیں اس کی تعمیل اسے اپنی فطری کمزوری کی بنا پر لازمی طور پر کرنی پڑتی
۔ برخلاف اس کے رسول اللہ صلعم کی شخصیت کا اثر ان کی ازواج پر بہت زیادہ
ہ نظر آتا ہے ۔ ان خاتونوں کو جن میں سے اکثر ناز و نعم کی خوگر تھیں آپ نے سادہ
بے لذت زندگی کا عادی بنایا اور جب انہیں سے بعض نے زیادہ آرام سے زندگی بسر
خواہش کی تو آپ نے ان سے سخت بیزاری کا اظہار کیا۔ کیا وہ انسان بھی جو
جذبات نفسانی سے مغلوب ہو کبھی ایسا کر سکتا ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اتنی تعداد میں عقد کیوں کئے۔ یہ
ہن میں رکھنی چاہئے کہ عرب میں تعدد ازدواج عام طور پر رائج تھا اور اسے
معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ خاندانی تعلقات کی توسیع اور حلفا پیدا کرنے کا بہترین طریقہ
لہ دوسرے خاندان میں شادی کیجائے۔ بعض اوقات اگر کسی بیوہ کی کفالت
ہوتی تھی تو اس سے عقد کر لیتے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے جو عقد کئے ان میں یہی
پیش نظر تھے اور آپ کی اکثر ازواج ایسی خاتونیں تھیں جو اپنے سابق شوہروں
قال کے بعد کفالت کی مستحق تھیں اور ان کی دلجوئی کی بہترین صورت یہی تھی کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں خود اپنے عقد میں لے لیں۔ کبھی مغلوب قبیلے کا درجہ بلند کرنے کے لئے بھی رسول اللہ نے اس قبیلے میں عقد کیا ہے۔ چنانچہ ام المومنین جویریہ سے اسی مصلحت سے عقد کیا تھا اور اس کا نتیجہ ہوا کہ انکا تمام خاندان آزاد ہوگیا اسی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعثت کے بعد جتنے نکاح کئے ان میں کوئی نہ کوئی اجتماعی مصلحت ضرور تھی اور ان کا محرک ہرگز کوئی ادنےٰ جذبہ نہیں ہوسکتا۔

اب رہا یہ امر کہ جب تحدید تعداد کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ صلعم اس سے مستثنیٰ کیوں ٹھیرے؛ اس میں بھی بے شمار مصالح ہیں اور ہرگز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ رسول اللہ نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس لئے کہ اگر ایک طرف آپ کے لئے یہ رخصت تھی کہ چار سے زائد بیبیوں کو علیحدہ نہ کریں تو دوسری طرف یہ سخت تید تھی کہ آپ کسی صورت میں اس کے بعد کوئی دوسرا نکاح بھی نہیں کرسکتے تھے۔ عام مسلمانوں کو تو یہ اجازت تھی کہ اگر چار کی تعداد میں کمی ہو اور وہ چاہیں تو شرائط کی پابندی کے ساتھ اس تعداد کو پورا کرسکتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلعم کسی حالت میں بھی کوئی عقد نہ کرسکتے تھے خواہ تعداد میں کتنی ہی کمی نہ واقع ہو۔ جدید عقد کی اجازت ختم ہوجانے کی تو یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جن مصالح کی بنا پر آپ عقد کرتے تھے وہ اب مکمل ہوچکے تھے یعنی اسلامی جماعت کی بنیاد خدا کے فضل وکرم سے بہت مستحکم ہوگئی تھی اور مصاہرت کے ذریعے سے کسی نئے قبیلے کو اپنا حلیف بنانے کی ضرورت نہ رہی تھی اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ باقی ازواج کو علیحدہ نہ کرنے میں بھی کوئی اعلےٰ مصلحت ہوگی اور اس میں ذاتی جذبے کو بالکل دخل نہیں ہے۔ اس موقعے پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسی زمانے میں یہ حکم نازل ہوا تھا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات سے کوئی اور شخص عقد نہیں کرسکتا تھا اور انہیں امہات المومنین کا درجہ دیا گیا تھا۔ ظاہر بیں معترض

اس پر بھی اعتراض کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حکم بھی رسول اللہ کے کسی ذاتی جذبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس میں یہ مصلحت تھی کہ ازواج مطہرات رسول اللہ صلعم کے اخلاق، عادات اور انکی تعلیمات کی حامل اور انکا صحیح نمونہ تھیں۔ پھر آپ کے بعد ان کو کسی دوسری ہستی کا پابند نہ ہونا چاہیئے تھا بلکہ آزاد رہکر اس فیض کو جو رسول اللہ صلعم کی صحبت سے انہیں حاصل ہوا تھا عامۃ المسلمین تک پہنچانا چاہیئے تھا اور اسی لئے ان کے متعلق یہ حکم نازل ہوا تھا۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ اس حکم کی موجودگی میں اگر رسول اللہ صلعم علاوہ چار کے باقی ازواج کو علٰحدہ کر دیتے تو ان کی کسقدر حق تلفی ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ رسول اللہ صلعم کے فیض صحبت سے محرومی ان کے لئے کس قدر باعث تکلیف ہوتی۔ یہ تھی مصلحت اس استثنا کی ورنہ حقیقۃً معترضین کے باطل توہمات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ بھلا وہ انسان جو ترک لذات دنیوی کی بہترین مثال ہو اور جسے خلق خدا کی ہدایت تفویض ہوئی ہو کبھی ایسے جذبات سے مغلوب ہوسکتا ہے جو تمام انسانی خوبیوں پر پانی پھیر دینے کو کافی ہیں۔

یہ چار بڑے اعتراضات تھے جو مستشرقین عام طور پر سیرۃ رسول اللہ صلعم پر وارد کرتے ہیں اور انہی سے اس مقدمے میں مختصر طور پر بحث کی گئی ہے۔ اراداتاً تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے اس لئے کہ مقدمے کے از حد طویل ہوجانے کا خطرہ تھا۔ ہر بحث میں اصولی مسائل کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ مقدمہ نگار کو اپنی خامیوں کا کماحقہٗ علم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ترجمے، مقدمے اور حواشی میں بہت سے نقائص ہوں گے۔ اہل نظر سے امید ہے کہ وہ ان سے ہرگز چشم پوشی نہ کریں گے بلکہ ان کو ظاہر کر دیں گے اس لئے کہ اس طرح قارئین بھی غلط فہمیوں سے محفوظ رہیں گے اور خود مولف کو بھی اپنی غلطیوں کا علم ہوجائے گا۔ صحیح تنقید علم کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یہاں پر میں اپنے مکرم استاذ مولنا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے کہ مجھے جو کچھ تھوڑا سا علم عربی ادب اور اسلامیات کا حاصل ہوا ہے وہ انہیں کے فیض سے حاصل ہوا ہے اور یہ تالیف بھی اگر وہ پوری مدونہ کرتے تو کبھی تکمیل کو نہ پہنچتی۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں اپنے تمام ان بزرگوں اور دوستوں کا شکر گذار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی ہدایتوں اور مشوروں سے مجھ سرفراز فرمایا۔

عبدالعلیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی
۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء

رائنر میریا رِلکے ^١

رائنر میریا رِلکے ایک سال سے اوپر ہونے آیا دنیا سے اُٹھ گیا۔ ہندوستان میں اس
م سے آج کون واقف ہے؟ کوئی نہیں۔ لیکن رِلکے جرمنی کے غنائی شعراء کا بادشاہ تھا اور
آجکل کے نقادانِ سخن میں سے اکثر شٹفان گیارگے ^٢ کو شوکت کلام اور پختگی سخن کی بنا پر
لکے سے بہتر جانتے ہیں لیکن وہ زمانہ آئے گا اور ضرور آئے گا جبکہ ذوق و غالب کی طرح ان
نو کے مراتب بھی اپنی صحیح روشنی میں نمایاں ہونگے۔ اس میں شبہ نہیں کہ گیارگے حقیقی
عنوں میں جرمن شاعر ہے اور گوئٹے کا وارث اگر کوئی قرار پاسکتا ہے تو وہ گیارگے ہے۔
نانچہ یہی ہوا بھی کہ گزشتہ سال گیارگے کو جرمنی کے بہترین شاعر کی حیثیت سے ایک کثیر رقم
دی گئی۔ رِلکے کا کلام قومی طرز ادا سے الگ اور بالاتر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ رِلکے
رپ کا پہلا شاعر ہے جس نے تصوف کے راز کو سمجھا ہے اور اس طرح پر نہیں کہ اس پر فارسی
عام طور پر مشرقی شاعری کا اثر ہوا ہو یا زمانۂ متوسطہ کی شاعری میں جو کوششیں اکثر نصرانی
شعراء نے تصوف کے میدان میں کی ہیں اُن کا اس پر کوئی صریحی اثر پڑا ہو۔ مادیت کے
آخری زینوں پر پہنچکر انسان کی روح اپنی خودشکستی و خود فراموشی سے پراگندہ و پریشان ہو جاتی
ہے اور بے قرار ہوکر رِلکے کے قلم و زبان سے آشکار ہوتی ہے۔ اور یہی راز ہے رِلکے کی
روحانی شاعری کی کامیابی کا۔ انسان غلامانہ تقلید سے کوئی بڑی چیز کبھی حاصل نہیں کرسکتا
ی صدی کی مسلسل کوششوں کے باوجود ہندوستان کی کسی زبان نے ایک ناول بھی

---

١ Rainer Maria Rilke

٢ Stefan George

ایسا پیدا نہیں کیا جس پر کوئی سخن سنج فخر کر سکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ناول نویسی ہندوستان کے ادبیات کے ارتقا کا ہنوز تقاضا نہیں اور انگریز ناول نویسوں کے بغیر آہنگ تتبع سے ایک ایسی دوغلی چیز پیدا ہوئی ہے جس کو نہ ناول کہہ سکتے ہیں نہ فسانہ اور نہ جس کی ان دونو حیثیتوں سے جداگانہ طور پر بھی بین الاقوامی معیار نظر سے کوئی وقعت ہو سکتی ہے محض ارتقائے فطری سے جو شے دستیاب ہوتی ہے وہ ایک واقعی حقیقی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ گوئٹے کے دیوانِ مغربی[1] نے جو اس نے فارسی دواوین کے تتبع میں نظم کیا ہے بہت کچھ شہرت حاصل کی۔ گو ہم اس کو ادبی تجربہ کی حیثیت سے ایک دلچسپ چیز مان لیں لیکن نہ تو اس میں سعدی و حافظ کے تغزل کا پتہ ہے نہ اُن کے تصوف کی شان اور ان کی چاشنیٔ کلام سے اس کو کوئی واسطہ۔ ہائنے[2] اکثر ہندوستان کے جذبہ فروش[3] طبائع کو بہت بھاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہائنے کے یہاں ہم کو مشرقی تغزل کی بہت کچھ جھلک نظر آتی ہے لیکن اس بنا پر کہ انسان اس طرز تغزل کا مقابلہ فارسی تغزل سے کئے بغیر نہیں رہتا ہائنے کا کلام اُس شخص کی نظروں میں بہت کم جچتا ہی جو فارسی تغزل کی نیرنگیوں سے آشنا ہے۔ برخلاف انکے رلکے کی شاعری اور شعریت کو فارسی اثرات سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا طرز ادا فارسی اور اردو کے شعرا سے اس قدر جداگانہ ہے کہ موازنہ کا اصلا خیال نہیں گزرتا۔ لیکن باوجود طرز ادا میں انتہائی اختلاف کے ہم رلکے کے یہاں میر کا درد پائینگے، تو درد کا تصوف، انیس کے نوحے کی شان تو غالب کا علو خیال۔ اور جہاں تک شیرینیٔ زبان کا تعلق ہے حافظ شیرازی کے سوا اس کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ سرچشمۂ نبات ہے لیکن اس کے لفظوں میں

---

[1] West - Östlichen Diwan

[2] Heine

[3] جذبہ فروش سے میری مراد Sentimental ہے۔

نجات کی سی ارزانی نہیں۔ اس کا علو خیال اس کے الفاظ کی شیرینی کو بے وقار ہونے نہیں دیتا اور اس کو ارزانی احساسات سے محفوظ رکھتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے کلام کا ترجمہ اردو میں اُسی قدر ناممکن ہے جس قدر حافظ یا سعدی کا ترجمہ جرمن یا انگریزی میں۔ لیکن میں حتی الامکان اس کے کلام کی ایک تھوڑی سی جھلک دکھانے کی خاطر اس کی دو مختصر نظموں کا ترجمہ کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ کوشش میری یہ رہی ہے کہ اس کے الفاظ کا اگر کہیں ترجمہ ممکن نہ ہو تو نہ سہی لیکن اس کے خیال اور طرز ادا کی ترجمانی ہو جائے اور اس کی نظم کی نوعیت میں حتی الوسع فرق نہ آنے پائے۔ اُمید ہے کہ ناظرین پر ترجمہ کا طرز اگر گراں گزرے تو میری ناداری سمجھیں اور شاعر کے کلام کی پستی پر محمول نہ کریں۔

ان ترجموں کو پیش کرنے سے پیشتر ریلکے کے متعلق چند ایسی باتیں بتلا دینا ضروری سمجھتا ہوں جن سے کلام کو پوری طرح سمجھنے اور اُس سے لطف اندوز ہونے میں آسانی ہو۔ ریلکے صریحاً یورپ کے دور جدید کا شاعر ہے اور نیچر پرستی[1] کے خلاف جو ردعمل اواخر انیسویں صدی عیسوی سے وہاں کے فنون لطیفہ میں اکسپریشنزم[2] کی تحریک کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اُسکا اس پر نہایت درجہ اثر ہوا ہے اگو ہم اس کو مخصوص طور پر اکسپریشنی شاعر نہیں کہہ سکتے۔ وہ ذرے ذرے اور قطرے قطرے میں انسان کی روح کا متلاشی ہے اور خود انسان کی روح کا اظہار ہمیشہ سلجھے ہوئے جملوں اور صاف الفاظ میں نہیں کرتا بلکہ اکثر اپنی کج مج زبانی سے وہ کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو الفاظ ناطق و صریح سے ممکن نہیں۔ ریلکے روح انسان کے رنگ و بو کو حتی الامکان بے نقاب پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عام فہم الفاظ میں ایک بات کہتے کہتے کچھ کھو سا جاتا ہے اور دماغ بلا ارادہ جہاں اس کو لے جاتا ہے وہاں جاتا ہے لیکن

---

۱ Naturalism

۲ Expressionism

حسن کلام کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اکثر نظموں میں وہ ایک شخص خاص کی ایک وقت خاص میں پوری پوری دماغی کیفیت کا خاکہ کھینچتا ہے جو اس طور پر ہرگز ممکن نہیں کہ شاعر اس کے جذبۂ مرکزی اور خیالات ارادی کو نظم کردے۔ کچھ تو وہ جان بوجھ کر کرتا ہے اور کچھ بے خبری کے عالم میں اور دوران کیف میں جو اکثر متعلق و غیر متعلق احساسات و ابتلافات دماغ میں گزرتے ہیں اُن کو بھی قلمبند کر دیتا ہے۔ اس کے کلام کی یہ نفسیاتی پیچیدگیاں ہی اس امر کا باعث ہیں کہ وہ غالب کی طرح مقبول عام ہونے سے قاصر ہے اور رہیگا گو جہاں تک زبان کا تعلق ہے رِلکے کا کلام نہایت سادہ اور سہل ہے۔ ایک بات اور قابل غور ہے کہ رِلکے کی شاعری نہایت درجہ انفرادی ہے۔ اس کا "ترانۂ گدا" ہر گداگر کی فریاد نہیں بلکہ اسکے "گدا" میں خود اسی کا سراپا نظر آتا ہے یعنی اگر رِلکے خود محتاج ہو کر دربدر بھیک مانگتا تو اُس کے احساسات یہی ہوتے جو اُس نے اس ترانے میں نظم کئے ہیں۔ اسی طرح اس کی "فریاد" ہر ناامید کی فریاد نہیں بلکہ خود اُس کی ناامیدی کی فریاد ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کے چشموں میں، اس کے نالایوں میں، اس کے پرندوں میں، اس کے پردہ ہائے ساز میں، اس کے مسیح میں، اس کی ام المسیح میں، اس کے ہر ہر ذرہ اور ہر ہر آفتاب میں ہم اسی کی روح متحرک پائیں گے۔

کس قدر انوکھی معلوم ہوگی یہ شخصیت ہندوستان کے رہنے والوں کو جو سالہا سال سے ورڈس ورتھ، ٹے نی سن، اور انگلستان کے اور بے شمار شاعروں کی فطرت پرست ہستیوں سے دوچار رہے ہیں اور اُن کے اتباع میں کوشاں ہیں۔

بڑی چیز تھا رِلکے۔ افسوس دنیا سے چل بسا گو ابھی اُس کے مرنے کے دن نہ تھے۔ یورپ کے باشندوں کے لئے پچاس برس کی عمر کیا ہوتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ خدا مغفرت کرے۔

انہ گدا[1]

انسے دروازسے پھرنا۔
بس دینا۔
ی میں، پانی میں، چلچلاتی دھوپ میں۔
رگی تھک کر کہیں بیٹھ جانا۔
ونے میں، کسی چوکھٹ پر۔
دا اپنا کان اپنے داہنے ہاتھ پر رکھ لینا اور چلّانا۔
، چلّانا، چلّانا۔

پھر
خود اپنی آواز ایک غیر کی سی آواز لگتی ہے۔
مجھکو نہیں معلوم ہوتا کہ یا الٰہی یہ کون حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّاتا ہے۔
، انگوٹی اور م

ا کا ترجمہ "فقیر کی صدا" یا "سائیں کی صدا" میں نے اس لئے نہیں Das Lied des Bettlers
اوّل تو یورپ میں صدا دیکر بھیک مانگنے کا طریقہ نہیں دوسرے شاعر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا گدا گر
ان شاعرانہ خیالات کو چند فلوس سیاہ کے بدلے در در فروخت کرتا پھرتا ہے بلکہ جب وہ تھک کر کسی کونے میں
چوکھٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور چلاتے چلاتے اپنی بے خودی فریاد سے ذرا بیدار ہوتا ہے تو اس کے خیالات واحساسات
ہوتے ہیں جو اس قاشے میں ادا کئے گئے ہیں۔
ماخوذ از "دس بوخ در بلدر" (تصویروں کی کتاب)۔ ان نظموں کو نثر منظوم (Prose poem)
یہ سے سمجھنا چاہئے اور بلینک ورس کی طرح پڑھنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔

میں چلاتا ہوں تو ایک ذرا سی چیز کے لیے۔
لیکن شاعر۔
ایک جلوۂ عالم خیال کی خاطر۔
اور، آخرکار۔
میں اپنا چہرہ اپنی دونوں آنکھوں سے ڈھانپ لیتا ہوں۔
اور اپنے سر کا سارا بوجھ دونوں ہاتھوں پر ٹیک دیتا ہوں۔
جس میں ہنسی کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے آرام کی۔
ہاں!
یہ نہ سمجھیں راہ گزرنے والے۔
کہ مجھ آفت نصیب کے سر کو۔
تکیہ تک نصیب نہ تھا۔

فریاد

کیسی ہر چیز مہمل اور بے بود سی ہے۔
اور مدت کی گزری ہوئی سی ——
شاید وہ ستارہ
جس پر میرے کسب نور کا انحصار ہے
ہزارہا سال ہوئے مر چکا ہے ——
شاید اس کشتی میں
جو ابھی ادھر سے گزری
کسی نے کسی کے کان میں ڈر کر کچھ بات کہی ——

ہیں ایک گھڑی ٹن ٹن بجی......
ں گھر میں ہ......
ی توبہ !
ا چاہتا ہے کہ دل کے اندر سے نکلکر کہیں بھاگ جاتا
ملائے آسمان میں قرار لیتا ۔
ا چاہتا ہے کہ سجدے کرتا ۔

ر !
اروں میں سے ایک
یہ اب تک برقرار ہو'
لکتا ہے کہ مجھے معلوم ہے
ن میں سے، کون، یکہ و تنہا،
ز آشنائے حیات ہے'
نا ایک شہر نور کی طرح
اعوں کی منزل پر آسمانوں میں روشن ہے۔

ل کا شعر ہے ؎
کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں   کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
یہاں ہم ایک آشنائے سجود کی جبین سجدہ خو کو شوقِ شہود میں مبتلا پاتے ہیں۔ ر لکے کی
نظم میں جس کا ترجمہ نے صریحاً خون کر دیا ہے ہم کو ایک مغربی شاعر جسے معشوقِ ازلی کی
نیاز بجائے بجا کا دماغ نہیں، نشۂ الست سے لاچار، تلاشِ حق میں آلامِ نفسی سے
را اپنے مادی ماحول سے پراگندہ و پریشان ہو کر انتہائی اضطراب اور اضطرار کے

ساتھ یک بیک شوق سجود سے مغلوب نظر آتا ہے۔

"جی چاہتا ہے کہ سجدے کرتا"

اب خدا جانے اس پردۂ زنگار کے پیچھے "نہیں" کے سوا اگر کوئی ہے تو اس چیزوں میں سے کون سی زیادہ بھاتی ہے، جبینِ سجدہ خو یا جبینِ سجدہ جو۔



شخصیت اور تاریخ

پروفیسر فریڈرش مائینکے آج کل جرمنی میں تاریخ اور فلسفۂ سیاسیات کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ مضمون اُن کے ایک مشہور خطبے سے ماخوذ ہے جس کا محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اصل میں یہ خطبہ پروفیسر مائینکے نے مرکزی ادارہ تعلیمات برلن کے ایک جلسے میں دیا تھا۔ اُس کے بعد یہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا۔

جب میں نے آج کے خطبے کے لئے یہ مضمون منتخب کیا تو یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اسے فن علم کے عملی مسائل پر منطبق کرنے میں، جو اس کا اصلی مقصد سمجھا جاتا ہے، مجھے توقع سے کم کامیابی گی۔ لیکن یہ موضوع بجائے خود ایسا ہے کہ اس کا سلسلہ اُن مسائل تک پہنچتا ہے جو نہ صرف مورخوں کے لئے بلکہ شخصیت کے سبھی قدردانوں کے لئے دلچسپ ہیں۔ مجھے آپ کے سامنے اس موضوع پر تقریر کرنے کی تجویز اس لئے اور بھی پسند آئی کہ اس پرآشوب زمانے میں ہمیں جس شدید کشمکش و سخت تشویش کا سامنا کرنا پڑا اُس کے سبب سے یقیناً ہمارے دلوں میں مشاہدۂ نفس اور مطالعۂ نفس کی گہری آرزو تازہ ہو گئی ہو گی۔

اصل مسئلہ جس پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ تاریخ شخصیت کی تشکیل میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے بعد آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ کی تعلیم دینے کے اصول اور طریقہ پر اس بحث کا کیا اثر پڑتا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے دل میں سوچنا چاہئے کہ آخر یہ شخصیت کیا چیز ہے اور اس کا مقصد اور منشا کیا ہے؟ گوئٹے کا قول اب تک ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے کہ شخصیت ہم ابنائے جنس کے لئے خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور جب ہم مکروہات زندگی سے پریشان ہو جاتے ہیں تو یہ الفاظ مژدۂ جانفزا بنکر چپکے سے ہمارے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ مگر یہ مژدہ ایک طرح کا

مطالبہ بھی ہے۔ یہ ہم سے اس کا طالب ہے کہ باہر سے جتنے اثرات ہمارے جذبات اور ہماری قوتِ عمل پر پڑتے ہوں اُن سب کے نرغے میں ہم اپنی اندرونی سیرت کو استوار رکھیں اور خارجی اور داخلی زندگی کے درمیان ایک حد قائم رکھیں جس کی حفاظت کرنا ہمارا حق اور ہمارا فرض ہے۔ اس حد بندی سے یہ مراد نہیں کہ داخلی زندگی کسی آہنی کٹہرے میں مقید کر دی جائے بلکہ یہ منشا ہے کہ خارجی دنیا سے اس کے تعلقات ضابطے اور اصول کے ماتحت رکھے جائیں۔ اس حریم باطن میں آنے جانے کی راہیں ہوں لیکن وہ بیرونی زندگی کے شور و شر سے محفوظ ایسی جگہ ہو جہاں ہم دلجمعی سے اپنے نفس کا مشاہدہ کر سکیں، اپنی قوتوں کو مجتمع کر سکیں اور ان سے خارجی زندگی میں کام لے سکیں۔ مختصر یہ کہ یہ بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہو لیکن بڑی دنیا سے وابستہ ہو، اپنا الگ اور مخصوص رنگ رکھتی ہو لیکن اس کی ترکیب انہیں زندگی کی عام قوتوں سے ہوئی ہو؛ سب سے آزاد بھی ہو اور کل کی پابند بھی۔ علاوہ ان باتوں کے یہ ان سب حقیقی اور زندہ کیفیات پر حاوی ہو جن کے وجود میں علیاتی تنقید سے کسی طرح کا شبہ نہ پیدا ہو سکے۔ یہ چیز کیا ہے؟ ایک نفس جسے اپنے آپ پر اعتماد ہو۔ یہ جیتی جاگتی کرامت ہمیں مبدا رفیاض نے عطا کی ہے۔ دوسری کرامت یہ ہے کہ ہم اس نفس خام سے شخصیت کی تعمیر کریں اور یوں اپنی ذات کو فطرتِ محض کی سطح سے بلند کریں لیکن اس کرامت کے لئے خود ہماری سعی کی ضرورت ہے۔ جب انسان کو اس دُہری کرامت کا شعور ہوتا ہے تب اُس کی سمجھ میں آتا ہے کہ واقعی شخصیت زمین والوں کے لئے سب سے بڑی سعادت ہے۔ فطرت نے زندگی کی اور جتنی صورتیں پیدا کی ہیں اُن سب کو ایک معیّنہ سلسلۂ نشو و نما کا پابند کر دیا ہے مگر صرف انسان کے لئے اُس نے یہ امکان رکھا ہے کہ اس زنجیر کو ڈھیلا کر دے، روحانی آزادی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرے اور اس دنیا میں آزادی کا سب سے برتر ثمرہ یعنی ایک مخصوص اور ناقابل تقلید سیرت حاصل کرے مگر اس طرح کہ مجموعی زندگی سے اُس کا رابطہ ٹوٹنے نہ پائے۔ انسان نہ تو بالکل تنہائی میں خوش رہ سکتا ہے اور نہ

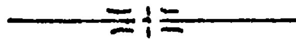
ے آپ کو اپنے ماحول میں محو کر کے۔ اگر انسان حقیقی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُس پر لازم
ہے کہ انفرادی آزادی میں مجموعی تمدنی زندگی کا پابند رہے اور اجتماعی پابندی میں اپنی
ی آزادی اور اپنی مخصوص سیرت کو محفوظ رکھے۔ یہی شخصیت اور عالم خارجی کا تعلق ہر
ول اور قابل زندگی سیاسی اور سماجی دستور کی بنیاد ہے۔ یہی فرد اور جماعت نفس اور
ل کا باہمی تعامل اور اُن کی باہمی کشمکش تاریخی زندگی کا لب لُباب ہے۔

یہی دونوں مسائل ہیں جن پر ہمیں غور کرنا ہے: ایک تو یہ کہ شخصیت کی اہمیت عالم تاریخ
لئے کیا ہے اور دوسرے یہ کہ عالم تاریخ کا اثر شخصیت کی تشکیل پر کیا پڑتا ہے۔ پہلی ہی نظر
ں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اب تک دوسرے مسئلے کے مقابلے میں پہلے مسئلے پر زیادہ
ت سے اور زیادہ دلچسپ طریقے پر بحث کی گئی ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا مسئلہ
سرے سے زیادہ اہم ہے؟ کیا اس میں یہ اعتراف پنہاں ہے کہ کل قدر و قیمت کا حامل فرد
ہے؟ کیا ہمارا اصل کام یہ ہے کہ ہم عالم تاریخ کا اس نظر سے مطالعہ کریں کہ اُس میں اشخاص
جدوجہد کو کہاں تک دخل ہے؟ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے لوگوں
ں جو تاریخی روح سرایت کر گئی تھی اور اِس دور کی تاریخی زندگی کے موضوع کو جو وسعت حاصل
ئی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے مسئلے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ عین پسند فلسفہ کی
بل میں ابتدا سے انتہا تک شخصیت ہی مدنظر رہی اور کانٹ اور فشٹے کی تصانیف میں
ی اخلاقی آزادی کے مسئلہ پر زیادہ زور دیا گیا۔ لیکن ہیگل کی تصانیف میں مجموعی تاریخی
ں کو جو افراد کو چاروناچار اپنے دھارے میں بہالے جاتی ہے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی
ب جدید علم تاریخ کی بنیاد پڑی اور جمہور کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی تو اجتماعیت اور
ادیت میں از سر نو جنگ چھڑ گئی۔ اجتماعیت اُس کی رفیق ثبوتیت اور نئے علم اجتماعیات
باد اس پر تھی کہ جماعت فرد سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ تاریخی انفرادیت اور اُس کی مؤید
انہ تحریک نے بجائے جارحانہ طرز عمل کے مدافعت اختیار کی اور اسی کے ساتھ ایمانداری

سے یہ کوشش کی کہ اجتماعیت پسندوں کے اصولوں میں جو معقول باتیں ہوں اُ
کا اعتراف کرے ۔ اس طرح تاریخ پر اجتماعیت چھا گئی اور چونکہ مجموعی تاریخی
اثرات نے فرد کو ہر طرف سے دبا لیا اس لئے یہ سوال آہستہ آہستہ سرد پڑتا گیا
کا فرد کی آزاد اور مخصوص سیرت کی تربیت میں کیا منشا اور مقصد ہے ۔ اس
کہ فرد کی اہمیت بالکل نہ رہے گی اور وہ بجائے ایک مستقل مقصد ہونے کے
کا ایک ذریعہ بن کے رہ جائے گا ۔ اس طرح شخصیت اور عالم تاریخ میں جو تعلقات
اُن پر بھی ہم نظر ڈالیں گے ۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ یہ دونوں سوال یعنی تا
لیے شخصیت کی اہمیت اور شخصیت کے لئے تاریخ کی اہمیت کیا ہے، ایک
سے تعلق رکھتے ہیں اور جو ایک سوال کا جواب ہوگا اُس کا اثر دوسرے
جواب پر بھی پڑے گا ۔ جو لوگ تاریخ میں شخصیت کی اہمیت پر زور دیتے
اس وجہ سے ایسا کرتے تھے کہ انہیں تاریخی زندگی کا بہت گہرا اثر خود اپنی ذات
ہوتا تھا ۔ انہیں اس مسئلے سے عملی اور اخلاقی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے شرم آ
انھوں نے اسے بالکل نظری رنگ دے دیا ۔ اب ہمارا یہ کام ہے کہ اس
کی اصلی صورت میں پیش کریں اور یہ دکھائیں کہ اجتماعیت اور انفرادیت کے
موضوع بحث کے لئے کیا نتائج اخذ ہو سکتے ہیں ۔

اجتماعیت کی انتہائی شکل اصل میں فرد کو محض مختلف اجتماعی قوتوں کا
ہے ۔ اُس کے خیال میں جماعتوں کے عظیم الشان مستقل نظام، اُن کے رسوم
خیالات فرد پر حاوی ہوتے ہیں جو فطری طور پر قدامت پسند اور سست ہوتا
فطرت نے گلوں میں رہنے والے جانوروں کی سی طبیعت عطا کی ہے ۔ اس
اور تجدید اشخاص کی بدولت نہیں ہوتی بلکہ حالات زندگی کے بدل جانے
ہوتی ہے ۔ افراد جو نظام تجدید کے بانی ہوتے ہیں اصل میں محض عام حا

رجحانات کے مظہر ہوتے ہیں، اس لئے عالم تاریخ جو قدیم آئین و دستور اور زندگی کی قوتوں کا حامل ہے، عملی حیثیت سے بیشک افراد پر بہت بڑا اثر ڈالتا ہے بلکہ اُن پر بالکل چھا جاتا ہے لیکن انہیں اس کا موقع نہیں دیتا کہ ان کی مخصوص سیرتیں نشو و نما پا سکیں۔ جو چیز بظاہر آزاد اور جداگانہ شخصیت معلوم ہوتی ہے وہ اصل میں ماحول کے اثرات سے تعمیر پائی ہے اور اس کی تعمیر میں جتنا مسالہ لگتا ہے سب کا سب خارجی دنیا سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر فرد کے یہاں اس مسالہ کی ترتیب مخصوص اور انوکھی ہوتی ہے لیکن محض اس حد تک جیسے "کلائڈ اسکوپ" یا نیرنگی شیشے میں ہر لمحے رنگوں کا ایک نیا نقشہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح عالم تاریخ کا نظری مطالعہ یعنی زمانہ ماضی کی تحقیق اور مشاہدہ اجتماعیت پسندوں کے نزدیک ارباب فکر پر یہ حقیقت ثابت کر دیتا ہے کہ انسان اسی معمولی آب و گل سے بنا ہے اور اس نے عادت کی گود میں پرورش پائی ہے۔



"اشتراک"

کسی گزشتہ اشاعت میں ہم نے اشتراک اور اسکی مختلف قسموں کی تعریف کی تھی۔ ہ
ناظرین کو یاد ہوگا کہ یہ تعریفیں صرف اشتراک کے معاشی مقاصد کو خصوصاً املاک کے مہ
کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھیں۔ اور یہ اس لئے کہ قیاس و رائے کی بے ترتیبیوں میں
ترتیب پیدا کی جا سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے وسیع معنوں میں اشتراک محض نظام املاً
کی کسی مخصوص شکل سے عبارت نہیں۔ یہ تو حیات اجتماعی کے سب شعبوں اور تمام ادا
پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ یہ ایک بنیادی اصول ہے جس پر جماعت کی زندگی کی سار
عمارت کھڑی کرنی ہے، ایک ذہنیت جو مذہب و اخلاق، معیشت و آئین، فنو
صنعت، غرض تمدنی زندگی کے ہر گوشہ میں جلوہ گری کے لئے بیتاب ہے۔

جماعتی زندگی پر نظر ڈالئے تو جماعت بندی کی مختلف شکلیں نظر آئینگی۔ کہیں ا
بنیاد معاہدہ پر ہوگی، کہیں باہمی ہمدردی پر، کہیں روایات پر کہیں قانون پر، ک
آزادی پر کہیں جبر پر، لیکن ان مختلف شکلوں کی تہ میں ہمیشہ تین اصولوں میں سے
ایک یا کئی کی کارفرمائی دکھلائی دیگی۔ یعنی طاقت، محبت، عقل ـــ جب جماعتی ز
میں انسان کے فطری رجحانات، اور قدرتی محرکات کو اپنا اثر پیدا کرنے کا موقع
ہے اور حیات اجتماعی میں مدارج و مراتب کی تقسیم افراد یا گروہوں کی جسمانی یا
یا روحانی بلندی و پستی کی بنا پر ہوتی ہے تو اُس وقت طاقت کا اصول کارفرما ہو
یہ طاقت چاہے جسمانی ہو، چاہے عقلی و ذہنی۔ "جسکی لاٹھی اُس کی بھینس" یا "جر
بُدھی اُس کی بھینس"، یہ دونوں اصول طاقت کی شکلیں ہیں۔ اِس اصول کے ما

ـت میں پستی و بلندی کی ترتیب طاقت کی تقسیم کی بنا پر ہوتی ہے۔

لیکن جب فطری و قدرتی طاقتوں یا صلاحیتوں کو من مانی شکلیں اختیار کرنے سے ۔ جائے اور جماعت کی شیرازہ بندی افراد سے بالاتر اصولوں کے ماتحت کی جائے ۔س وقت جماعت بندی کو عقلی اصول کا پابند کہیں گے۔ اس میں یہ نہ ہوگا کہ جس پاس طاقت ہے وہ کمزور پر حاوی ہو جائے، یا جس کے پاس دولت ہے وہ مفلس جس کے پاس علم ہے وہ جاہل پر تفوق حاصل کرے۔ بلکہ مثلاً اس قدرتی فرق تب سے قطع نظر یہ اصول بنایا جائے کہ دولت سب کے پاس برابر ہونی چاہیے، ہے سب کو بہرہ یاب ہونا چاہیے، توانا اور ناتوان کا فرق مٹانا چاہیے وغیرہ وغیرہ ۔س وقت حیاتِ اجتماعی مقررہ اصولوں کے تحت میں آجاتی ہے اور اس پر عقل ۔ار فرمائی ہوتی ہے۔

پھر انسانوں کی بعض جماعتیں ایسی بھی بنتی ہیں کہ نہ اُن میں طاقت کا تفوق ہوتا ۔ے نہ اصولوں کی فرمانروائی بلکہ دوست دوست کو "رشتہ در گردن" جدھر چاہتا ہے ۔تا ہے۔ عقل یہاں لاچار ہوتی ہے اور طاقت بے بس۔ عقل اور اس کے خود ساختہ ۔ول یہاں دفترِ بے معنی بن جاتے ہیں، یہاں توانا ناتوان کے آگے اور عالم اُمّی ۔ے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اور سب شاید اپنے مشترک خالق کی وحدت کے پرتو سے ۔ر تا لب لیکن یک جان ہو جاتے ہیں۔ ان جماعتوں کا اصول بنیادی محبت ہوتا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اشتراک کا مجوزہ نظام جماعتی موجودہ نظام سرمایہ داری کی مخالفت ۔ ا پیدا ہوا ہے۔ نظام سرمایہ داری میں عجیب بات یہ ہے کہ اُس میں جماعت بندی ۔ے مذکورہ بالا تینوں اصول کار فرما ہیں۔ اس میں زیادہ تر تو وہی طاقت کا اصول ہے، ۔ا جس کی لاٹھی اُس کی بھینس یا جس کی دولت اُس کی بھینس۔ یہی وہ اصول ہے چند ہزار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کروڑوں محنت کش مزدوروں کے جسم و اور ان کی

روحیں !) دے دیتا ہے۔ اور دولت و اقتدار کے سامنے اسی کی وجہ سے اخلاق و مذہب انصاف و عدل کے تمام اصول ماند پڑ جاتے ہیں لیکن ہر چند کہ زیادہ اثر اس نظام میں طاقت کے فطری اصول ہی کا ہے تاہم یہ نہیں کہ دوسرے اصول بالکل کارفرما نہ ہوں، سرمایہ داری نے اپنے نظام کا ایک گوشہ کو تمامتر اصولِ عقل کے زیرِ فرمان بھی کر دیا ہے۔ اور وہ کاروباری زندگی کا گوشہ ہے۔ سرمایہ دار اپنا تسلط بھی قائم کرنا چاہتا ہے؛ غیر عقلی آرزوؤں کا شکار بھی ہوتا ہے لیکن منافع کے اصول سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا۔ معاشی زندگی کے اس شعبہ میں بہی کھاتہ اس کی کتاب مقدس ہے۔ پھر زندگی کے بعض حصے سرمایہ داری کے نظام میں محبت کے اصول کے لئے بھی وقف ہیں مثلاً خاندانی زندگی سے ابھی اس مقدس اصول کو خارج نہیں کیا گیا ہے۔ یا قومی جنگوں کے وقت اب بھی اس کے مظاہرے دکھائی دیتے ہیں۔

سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں اور محرکات کی اس بوقلمونی کے مقابلہ میں اشتراکیت صرف ایک اصول کی حکومت چاہتا ہے۔ عقل کی! سرمایہ داری نے کاروباری زندگی کے جس گوشہ میں عقل کو فرمانروا بنایا تھا اشتراک اس پر قانع نہیں اور وہ زندگی کے سب شعبوں کو اس کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ طاقت و اقتدار کے اصول کو حرام جانتا ہے اور محبت کے دعاوی کو حرف غلط سمجھتا ہے۔ اسکی صدا ہے عقل، عقل، عقل!

...

یہ اصولِ اعلیٰ جس کے مطابق معاشرتی زندگی کو ترتیب دیا جاتا ہے مختلف لوگ جدا جدا طریق پر نکالتے اور بناتے ہیں۔ کسی کے لئے ان کا مخرج وحی و تنزیل کا سرچشمہ ہوتا ہے کوئی فلسفہ سے یہ اصول نکالتا ہے، کوئی تجربہ سے۔ چنانچہ ان اختلافات کی وجہ سے اشتراک بھی ایک قسم کا نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد اقسام ذہنی اور عملی دنیا کے سامنے پیش ہو چکی ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جس مذہب اشتراک نے فروغ پایا ہے وہ وہ اشتراک

ہے جس کی تعلیم مدون شکل میں مارکس اور اُس کے دوست انگلس نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ زمانۂ حال میں سرمایہ داری کے خلاف جو ردعمل ہوا اور ہر ملک میں مزدوروں اور ناداروں کی جو تحریکیں اٹھیں اُس کی ذہنی ترجمانی اس جدید اشتراک نے کی۔ اور چونکہ یہ تحریکیں خود موجودہ نظام جماعت کی بنیادی خامیوں کے باعث ناگزیر تھیں اسلئے اس ذہنی تعلیم نے بھی جس کا نام ہم "اشتراک جدید" رکھتے ہیں بہت فروغ پایا اور اشتراکی زندگی کے دوسرے نظام بالکل پس پشت پڑگئے۔ ان دوسرے نظاموں کو سمجھنا اس وقت محض تاریخی یا علمی دلچسپی کی چیز ہے۔ لیکن "اشتراک جدید" کا فہم تو موجودہ دنیا کے اہم ترین مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ہم اس سلسلۂ مضامین میں اسی "اشتراک جدید" کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

∴

کسی چیز کو "سمجھنے" کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ آپ اس کے معنی ومفہوم کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں اور متعلقات وزوائد کی الجھنوں میں سے اس کے بنیادی اصولوں کو نکالکر اس کی اصلی غرض وغایت کو اپنے سامنے لاسکتے ہیں۔ یا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اُس کے منبع ومخرج کو معلوم کریں اور اُس کے عالم وجود میں آنے کے اسباب وعلل کو دیکھکر اس کی ہیئت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یا ایک صورت سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ اس چیز کے معنی اور اس کے اسباب کو جانکر آپ اسے بعض مقررہ معیاروں پر پرکھیں یعنی تنقیدی طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

اس مضمون میں ہم اشتراک کو اس کی اصل کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کرینگے ہم اس جگہ اس ماحول کا مختصر سا ذکر ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں اشتراک کے مسلک نے جنم پایا۔ اس کے بعد ان شخصیتوں کا حال بیان کریں گے جنکی کاوشوں نے اس ذہنی پودے کی آبیاری کی اور ان رائج الوقت تصورات وخیالات کا جو

نے اِس کی نشو و نما میں حصہ لیا ۔ اوراس طرح مذہب اشتراک کی موجودہ شکل یہ رونما ہونے کے اسباب تین حصوں میں ہمارے سامنے آجائیں گے یعنی جماعتی حالا رائج الوقت تصورات اور بانیوں کی ذہنی کیفیات ۔

جماعتی حالات

اشتراک جدید کا مسلک مغربی تاریخ کے اُس عہد کی پیداوار ہے جبکہ قرد وسطیٰ کے قائم کردہ تمام جماعتی بندھن کٹ رہے تھے، تمام وہ جماعتی ادارے جن میں فرد پناہ لیتا تھا منتشر ہو رہے تھے، تمدنی زندگی کے معیار بدل رہے تھے، ایمان تھا، علم آرہا تھا، بندشوں کی جگہ آزادیوں اور یقین کی جگہ شک کو مل رہی تھی اس عام انتشار اور بند کشائی کے عہد میں خاص طور پر ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۸ء تک زمانہ وہ زمانہ ہے جب مسلک اشتراکیت کے تبج یورپ کی ذہنی زمین میں بو گئے ۔جن کی آبیاری نہایت کاوش کے ساتھ دو شخصوں نے ۱۸۴۸ء سے ۱۸۸۳ء تک کی یعنی مارکس اور انگلس نے ۔ ۱۸۴۸ء میں جبکہ کمیونسٹ منی فسٹو شائع ہے اشتراک کی کشت زار تیار تھی ۔ اوراس سال کے بعد کوئی نیا ذہنی پودا میں نہیں لگا ۔صرف جین بندی کے سلسلہ میں کچھ کانٹ چھانٹ ہوتی رہی اس ہمیں ۱۸۳۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان کے زمانہ کے حالات پر نظر ڈالنی چاہئے

معاشی حالات

اِس زمانہ کی معاشی حالت میں سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ سرمایہ داری کا نظا عرصہ سے اپنے مدارج عروج پر پہونچ چکا تھا ۔ اس کی اچھائیاں اور برائیاں سب

سامنے آچکی تھیں۔ دنیا اس نئے دیوسے بھی ہو گئی تھی۔ اس کی تباہ کاریاں اور ہلاکت خیزیاں ہر ایک کی نظر پڑ رہی تھی۔ اس کی ریل پیل سے ہر کہ و مہ پریشان تھا اب یہ نہ تھا کہ معاشی اور جماعتی مسائل پر صرف ایوانِ حکومت میں بحث مباحثہ ہوتا ہو۔ ہر راہ چلتا اس نئی مصیبت کا احساس رکھتا تھا اور اس کا حل سوچتا تھا۔ اس زمانہ کی تصانیف کی فہرست اُٹھا کر دیکھو مغربی یورپ کے ہر ملک میں بے شمار سرکاری تحقیقاتوں کی رپورٹیں ملیں گی جن میں مزدوروں کی حالت پر بحث ہے۔ ہر ملک میں اسی موضوع پر اچھی بڑی بے تعداد کتابیں ملیں گی۔ انگلستان میں ۱۸۳۹ء میں کارلائل نے اپنی کتاب Chartism لکھی اور ۱۸۴۳ء میں Past & Present ۔ ۱۸۴۴ء میں کنگسلے نے Village Sermons شائع کی؛ ۱۸۴۵ء میں دسرائیلی نے Sybill or the two Nations ۔ فرانس اور جرمنی میں بھی کثرت سے تصانیف نکلیں۔ اس مسئلہ پر غور و بحث کے لئے ہر طرف انجمنیں قائم ہوئیں۔

دیکھنے والے دیکھتے تھے اور لکھتے تھے کہ نئی صنعت نے خصوصاً ریل اور تار نے سارے جماعتی نظام کی شکل ہی بدل دی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ سرمایہ دار کے وجود اور اس کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ روز تغیر ہو روز تبدل۔ لوگوں نے پیدائش دولت کے طریقوں کی نت نئی تبدیلیوں کو محسوس کیا، ہر وقت دہلے کے عدم تیقن و گھبراہٹ سے پریشان ہوئے، آدمی آدمی کے درمیان تمام قدیم رشتوں کے کٹنے اور صرف خودغرضی کے رشتہ کے باقی رہ جانے پر مرثیہ خوانی کی، نو دولتیوں کی بدتمیزیوں پر چلا اُٹھے لیکن سب سے زیادہ یہ زمانہ متاثر تھا افلاس و فلاکت کے اس منظر سے جو روز افزوں دولت و مرفہ الحالی کے دوش بدوش ابرِ غم کی طرح ملکوں کے ملکوں پر چھایا جا رہا تھا۔ اگر دیہاتوں میں زراعتی مزدوروں کی مصیبت تھی، تو صنعتی کام کرنے والوں پر بھی آبنی تھی۔ کھیت بھی روتا تھا اور جولاہا بھی۔ کانوں کے علاقوں میں صنعت کو فروغ

تھا لیکن بے گھر بے در مزدوروں کی فوج میں انسانوں کے غول کے غول داخل ہو جاتے تھے، شہروں میں سر بفلک عمارتیں بن رہی تھیں، لیکن جن کے خون کو پسینہ کر کے یہ سب کچھ ممکن ہوا تھا ان کی جسمانی و روحانی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سختی سے کام لینے کی شرمناک سے شرمناک صورتیں موجود تھیں۔ لوگ یہ سب کچھ دیکھتے تھے اور یہ بھی کہ خود کام کی نوعیت بدل گئی، پہلے کام ہر مزدور کی شخصیت سے ایک گہرا تعلق رکھتا تھا، اب مشینوں کی ایجاد اور تقسیم عمل کے اصول نے اسے ایک غیر دلچسپ اور بے روح مشغلہ بنا دیا۔
ایک طرف دولت بڑھ رہی تھی دوسری طرف افلاس، ایک طرف مرفہ الحالی حکومت تھی دوسری جانب فلاکت و ادبار کی۔ صنعت ترقی کر رہی تھی لیکن لوگ اور غریب ہوتے جاتے تھے، مشینیں اتنا مال بنا دیتی تھیں کہ خریدنے والے نہ ملتے۔ کارلائل نے لکھا ہے: "تمہارے بُنے ہوئے قمیص کس کام کے؟ اُدھر دو کانوں میں دیکھو لاکھوں کی تعداد میں رکھے ہیں اور اِدھر لاکھوں محنت کش برہنہ تن ان کے انتظار میں ہیں لیکن یہ انہیں نہیں ملتیں۔" ضرورت سے زیادہ اشیاء کے پیدا ہونے سے جلد کاروباری دنیا میں بحرانی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ وبائی مرض کی طرح یہ معبد نہایت پابندی سے کچھ کچھ سال بعد رونما ہوئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۱۵ء میں آئی پھر ۱۸۲۵ء ۱۸۳۶ء میں ظاہر ہوئی پھر ۱۸۴۷ء میں۔ مال بہت، خریدنے والے ندارد۔ کارخانے بند کیے جاتے تھے، مزدور کے لئے مزد نہ تھی۔ محنت کش کے لئے محنت کا دروازہ بند فاقہ اور موت کی راہ کھلی ہوئی۔

سیاسی حالات

سیاسی حالات میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ نپولیانی جنگوں کے بعد سے لوگ امن سے بسر کر رہے تھے۔ اور امن کی زندگی نے امن پسندی کا جذبہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ تو

اور ریاستوں کی نظر اپنے رعب و داب، فتوحات و جنگ آزمائی کی طرف سے ہٹی ہوئی تھی بجائے اس کے کہ ریاستیں اپنے اپنے اغراض کی فکر میں پڑی ہوں اور اپنی ہی غرض کو فلسفہ سیاسی کا اصول اعلیٰ قرار دیتی ہوں اب اغراض ملکی و سیاسی سے بالاتر اصولوں کی حمایت شروع ہو گئی تھی مثلاً آزاد تجارت کا اصول۔ غرض اس عہد کی خصوصیت یہ تھی کہ ملکی اور خارجی سیاست کا صحیح احساس بہت کم ہو گیا تھا اور اس عہد کو "غیر سیاسی عہد" کہہ سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ قومیت کے اصول پر اس زمانہ میں خاصہ زور دیا گیا لیکن یہ ہمیشہ ملکوں کے داخلی اور اندرونی مسئلہ کی حیثیت سے اور انقلابی خیالات کے ساتھ ساتھ۔ اصول قومیت اور انقلاب کا تعلق یونان، پولینڈ، بلجیم کے معاملوں میں نظر آتا ہے۔ اُدھر انگلستان میں چارٹسٹ تحریک سراسر انقلابی تحریک تھی۔ فرانس میں بھی دنیا بھر کے خارج البلد انقلابی اور خود فرانس کے اشتراکی اور کمیونسٹ انتہا پسند انقلابی تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے کافی تھے۔ اٹلی میں اسی انقلاب کا مجسمہ میزینی تھا۔ جرمنی میں بھی انقلابی پارٹی موجود تھی اور اگرچہ بہت قوی نہ سہی لیکن پروشیا کی احمق حکومت اس سے اس درجہ خائف تھی کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بس دو چار ہی مہینہ میں کمیونسٹ حکومت قایم ہو جائے گی۔

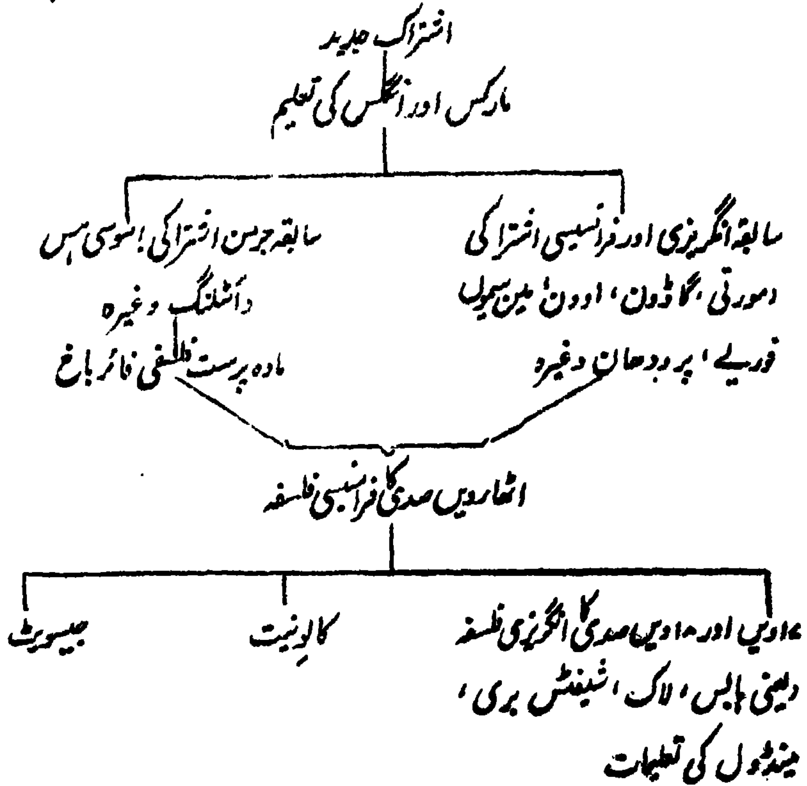
سرمایہ داری نظام سے بے اطمینانی و بیزاری، فکر سیاسی کے انحطاط اور انقلاب و تغیر کی خواہش کی فضا میں اشتراک کے مسلک نے نشو و نما پائی۔ ذہنی اعتبار سے مختلف تصوراتِ رائج کا اس پر اثر پڑا۔ لیکن اس کا صحیح تعین کہ کن خیالات اور کس فلسفہ نے اس پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ظاہر ہے کہ بہت مشکل کام ہے۔ کسی نے اسے پروٹسٹنٹ ذہنیت کا نتیجہ قرار دیا ہے[1]، کسی نے کیتھولک خصوصاً فرانسیسی کیتھولک مذہب کا[2]، اکثر مورخین

---

[1] Pelia — Cathrein — Masaryk

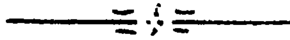
[2] Dostojewski

نے غلطی سے اسے جرمن کلاسکی فلسفہ سے مشتق گردانا ہے اور مارکس و انگلس کی تعلیمات اور کانٹ، فشٹے، اور ہیگل کے فلسفہ میں نہایت گہرا تعلق جتلایا ہے۔ یہ آخری رائے اب تک بہت عام تھی لیکن جرمنی کے مشہور معاشی ورنر زومبارٹ نے حال میں اسے غلط ثابت کردیا ہے اور واضح طور پر بتلا دیا ہے کہ اشتراک جدید کو جرمن کلاسکی فلسفہ سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اس مصنف کی رائے میں اشتراکِ جدید کا ذہنی شجرۂ نسب یہ ہے:۔



ہم نے سطور بالا میں ان عام جماعتی حالات کا ایک خاکہ پیش کردیا ہے جن میں اشتراک کی تدوین ہوئی اور ان ذہنی تحریکوں اور تعلیموں کا ذکر جن سے یہ مشتق ہے۔ لیکن اشتراک

کے تاریخی فہم کے لئے ماحول مادی و ذہنی کا یہ بیان کافی نہیں۔ خیالات و مذاہب بیشک اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن باوجود اس تمام تاثر کے وہ پھر بھی اپنے بانیوں کی نفسی کیفیت اور اُنکی ذہنیت سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ شاید بڑے سے بڑا آدمی اپنے خیالات میں ماحول سے غیر متاثر نہ رہتا ہو لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ کسی بڑے آدمی کی تعلیم محض ماحول کے اثرات کا مکانیکی نتیجہ نہیں قرار دی جاسکتی۔ اس لئے اِن حالات گرد و پیش کے علاوہ ہمیں اشتراک جدید کی اصل کو سمجھنے کے لئے اِس کے بانیوں کی کیفیات نفسی پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔ یہ کام ہم انشاراللہ کسی آیندہ مضمون میں انجام دینے کی کوشش کرینگے۔



نئی دہلی

رہتے رہتے حیدرآباد اب ہمارا وطن نہیں تو مسافر کا گھر ضرور ہو گیا ہے۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی ضرورت سے دہلی جانا ہو ہی جاتا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے اپریل میں کچھ دنوں کے لئے دہلی گیا تھا۔ گرمی کا پورا زور تو نہ تھا، ہاں مزا آنے لگا تھا۔ لاٹ صاحب کے کچھ دفتر شملہ جا چکے تھے۔ کچھ جا رہے تھے۔ نئی دہلی چوپٹ تھی۔ مگر اصلی دلّی میں وہی چہل پہل تھی۔ دس دن ٹھیرا۔ عزیزوں سے ملا، دوستوں سے ملا۔ بنواری لال کا مکان دیکھا۔ نانک چند کی کوٹھی دیکھی۔ لالہ سری رام کا حال دیکھا واحدی صاحب کے ہاں دعوت کھائی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے دہلی کے اہل قلم سے ملاقات کرائی۔ ہر چیز دیکھتا اور خوش ہوتا۔ ہر شخص سے ملتا اور لطف اٹھاتا دل باغ باغ تھا کہ دلی پھر نئے سرے سے دلی ہو رہی تھی۔ مگر چلنے سے ایک دن پہلے مرزا قمر دے سے جو باتیں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہوئیں اُس سے سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا دل بیٹھ گیا اور اس وقت سمجھ میں آیا کہ دلی کیا تھی اور کیا ہو گئی۔

مرزا قمر دے کو مرزا قمر دے کہوں تو دلی والا تو کوئی نہ سمجھے۔ ہاں مرزا جھکڑا کہوں تو سب سمجھ جائیں۔ ان کو بھی پرانی دلی کا ایک کھنڈر سمجھو۔ چند روز کی ہوا کھا رہے ہیں۔ زمانہ کا ایک آدھ تھپیڑا اپڑا اور ان کا خاتمہ ہے۔ پہلے اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں تھے۔ ساٹھ ستر ہزار کی جائداد تو دو ہزار کے تمسک میں برابر ہو گئی۔ کچھ بچی کھچی رہ گئی ہے، ٹوٹ پھوٹ کر ٹھیکرا ہے۔ انھوں نے اپنے خرچ کم نہیں کئے۔ زمانہ نے سوا، ان کی جائداد کے ہر چیز کی قیمت بڑھا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جائداد کو بھی گروی ڈالنا پڑا نالش ہوئی ہے۔ کوئی دن میں وہ بھی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہی یہ مرجائیں تو

اچھا ہے۔

نام تو ان کا مرزا قمرالدین ہے مگر ان کی وضع قطع، ان کے بھاری بھرکم جسم اور ان کی ٹھمک چال کی وجہ سے ساری دلی ان کو مرزا جھگڑا کہتی ہے۔ پڑھے لکھے خاک نہیں۔ پھر بھی اپنے کو شاعر سمجھتے ہیں اور ایک چھوڑ دو دو تخلص خیالؔ اور دِلؔ رکھ لئے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی استعمال میں تو آتا نہیں۔ ہاں یونہی شوق میں ایک نام کے تین نام کر لئے ہیں۔ خیر یہ جتنے چاہیں نام رکھ لیں دلی والے تو ان کو مرزا جھگڑا کہتے ہیں اور یہی کہیں گے۔ تمام دلی کی وضع بدل گئی اور نہ بدلی تو ان کی اور بھلے کیوں لگی۔ دلی کے جو جھگڑے پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ رتی برابر فرق نہیں ہوا جب وہ نہ بدلے تو یہ کیوں بدلنے لگے۔ پُرانی وضع پر جان دیتے ہیں، نئی وضع پر لعنت بھیجتے ہیں۔ آج کل کی کسی بات کی تعریف سنی اور پیچھے پڑ گئے۔ لوگوں کو مذاق ہاتھ آگیا ہے۔ ایک آیا لاٹ صاحب کی کوٹھی کی تعریف کر گیا، انہوں نے مذمت شروع کی۔ ابھی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ دوسرے نے آکر کسی اور چیز کی تعریف کر دی۔ یہ پہلا سلسلہ چھوڑ دوسرے کے پیچھے پڑ گئے۔ لوگ بیچارے کو بہت ستانے لگے ہیں۔ میں نے دس برس پہلے بھی ان کو دیکھا تھا اس وقت یہ حالت نہ تھی۔ اب کچھ باؤلے سے ہو گئے ہیں۔ اسی برس کی عمر ہے آخر دماغ کہاں تک کام دے۔ یہ دوسروں پر بگڑتے ہیں دماغ ان سے بگڑ بیٹھا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ نئی دہلی کے یہ ایسے دشمن ہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو بیچارے کو ناحق کیوں پریشان کرتا۔ چلنے سے ایک دن پہلے شام کوئی ساڑھے پانچ بجے گھر سے ٹہلنے نکلا۔ جامع مسجد قریب ہی ہے خود بخود پاؤں اِدھر اُٹھے کیا دیکھتا ہوں کہ شربت والے کی دوکان کے قریب رومال بچھائے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر مرزا صاحب بیٹھے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا، پہلے تو آنکھوں کو چندھیا کر ذرا نشست لگائی۔ جب یوں کام نہ چلا تو آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجہ بنا کر غور سے

دیکھا اور ایک دفعہ ہی گھبرا کر کھڑے ہو گئے " او ہو ! میاں فرحت ہیں۔ کہو بیٹا تم یہاں
کہاں - ہم تو سمجھے تھے کہ تم حیدرآباد ہی کے ہو لئے۔ آخر آئے مگر بیٹا بہت دنوں م
آئے " میں نے کہا " مرزا صاحب کیوں نہ آتا دلی کہیں ہم سے چھوٹ سکتی ہے " کہ
لگے " دلی - بیٹا ! دلی تو بہت دن ہوئے جنت کو سدھاری ۔ اب یہ دتی تھوڑی ہے
یہ تو لاہور کی اماں ہے - جاؤ جاؤ ندا دنبی کرکہیں اور جا بسو - اب یہ تمہاری دلی نہیں ر
یہ دوسروں کی دلی ہو گئی " مجھے کیا معلوم تھا کہ نئی دہلی کی تعریف سن کر ان کے آگ
لگ جاتی ہے - میرے منہ سے نکل گیا " واہ مرزا صاحب واہ - دلی تو اب دلہن بن
گئی ہے اور ابھی کیا۔ تھوڑے دنوں میں دیکھنا کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ کبھی وہاں
بھی گئے ہو یا یونہی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے نئی دہلی کو صلواتیں سناتے ہو
میرا اتنا کہنا تھا کہ بپھر گئے - ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا - کہا " آ - بیٹھ - میں تجھے تیری دلی کی
تعریف سناؤں - تجھے معلوم بھی ہے کہ دتی کا دل کیا تھا ؟ میں نے کہا " چاندنی چوک
کہنے لگے " ہٹ تیرے جھوٹے کی - شرماتا کیوں ہے - چاوڑی کیوں نہیں کہتا - کہیں
بڑی جگہ نوکر ہو گیا ہے جو چاوڑی کو چھوڑ چاندنی چوک کی تعریف پر اتر آیا ہے - بیٹ
دلی کا دل چاوڑی ہے - اب تو جا کر چاوڑی کو دیکھ کیا رنگ ہے - جب دل ہی
گیا تو شہر کیا رہا - اب جامع مسجد سے لگا کر اجمیری دروازہ تک چلا جا - وہ وہ شکلیں
آئیں گی کہ خدا کی پناہ - نہ وہ اللہ دی غازی آباد والی رہیں ، نہ نور جہاں ، نہ وہ حشمد
ہے ، نہ وہ میرٹھ والی زہرہ - زہرہ تو تجھے یاد ہو گی - اب اس کے قاضی حوض وا
کوٹھے کو جا کر دیکھ ایک پہلوان بیٹھے ہیں ' تھوبڑا سا منہ ، بیل کے سے دیدے ، یہ مو
ناک - ڈھیلا ڈھالا شہ زوروں کا سا لباس - منہ کے سامنے بجلی کا لیمپ رکھا ہے - یہ
یہ ہیں بی صاحبہ اور کس جگہ آ کر بیٹھی ہیں کہ بی زہرہ جان کی جگہ - اوپر جائیے تو نہ سا
نہ مزاج پرسی - نہ پان ہے نہ چھالیہ - جاتے ہی مطلب کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں ا

ماشاءاللہ گفتگو ایسی شستہ زبان میں کی کہ منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ گالی بغیر تو بات ہی نہیں ہوتی۔ بھلا ان کے ہاں پان کہاں۔ یہ نہ پان کھائیں نہ پان بنانا جانیں۔ کسی نے بے حیا بنکر پان مانگا تو دو پیسے نکال پھینکدئے۔ نیچے پنواڑی کے ہاں سے پان منگئے۔ ہاں حقہ بہت پیتی ہیں۔ حقہ آیا تو وہ آیا کہ گنوار بھی اس کو منہ لگاتے ذرا گھبرائیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سارے کا سارا مل کر کوئی دس سیر کا ہوگا۔ نیچہ پر بان لپٹا ہوا۔ نے اتنی موٹی جیسے پھکنی۔ چلم ایسی کہ سوا پاؤ تمباکو آئے۔ لیجئے حقہ حاضر ہے۔ حقہ کا پانی ٹپکتا چلا آرہا ہے۔ یہ بھی کوئی نہیں دیکھتا کہ چاندنی پر رکھا گیا تو دھبہ پڑجائے گا۔ اب ہے کوئی ہمت والا جو اس حقہ کا ایک دم بھی لگائے۔ کھانستے کھانستے دم نہ نکل جائے تو میرا ذمہ۔ اب فرمارہی ہیں "پیجئے۔ پیجئے۔ امبرسر کا تمباکو ہے۔ کل ہی سردار صاحب نے لاکر دیا ہے"۔ بھلا کس کی شامت آئی ہے جو اس حقہ کا دم لگا کر مفت میں اپنی جان کو مصیبت میں ڈالے اور خود بی جان نے جو دم لگایا تو حقہ بھی چیخ اٹھا۔ منہ اوپر کرکے جو دھواں چھوڑا تو معلوم ہوا کہ قطب کی لاٹ کمرہ میں آکر کھڑی ہوگئی۔ یہ میں نے اس رنڈی کا ذکر کیا ہے جو اس وقت چاوڑی کی ناک کہی جاتی ہے۔ دوسروں کی کچھ نہ پوچھو۔ ان کے ہاں تو دروازہ ہی پر ٹکٹ بٹتا ہے۔ پہلے زمانہ کی چاوڑی تو تجھے یاد ہوگی گرمی کا موسم ہے۔ ادھر شام ہوئی ادھر سب کمرے روشن ہوگئے۔ یہاں گانا ہو رہا ہے، وہاں گانا ہو رہا ہے، شوقین بیٹھے سن رہے ہیں۔ شریف لوگ سفید براق کپڑے پہنے، موتیا کے گجرے گلے میں ڈالے، مولسری کی لڑیاں ہاتھوں میں لپیٹے سڑک پر ٹہل رہے ہیں، چہل قدمی بھی ہو رہی ہے، گانے کا لطف بھی آرہا ہے۔ بارہ ایک بجے تک یہی گھما گھمی رہی۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو جا آرام سے سوئے۔ پھولوالوں میں رات کو جائیے تو دوسرا ہی رنگ نظر آتا ہے۔ ہم آسودوں میں کھمبوں سے لگی تنٹناں منتی ہیں۔ ابھی اندر گئیں، ابھی باہر آئیں، پھر گئیں، پھر آئیں۔ ایک

آدہ کوٹھے پر رُوں رُوں رُوں رُوں بھی ہو رہی ہے۔ مگر گانا کیا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بی جان اپنی اماں کو یاد کرکے رو رہی ہیں۔ سنتا ہوں اب سب کی سب چاوڑی سے نکالی جانے والی ہیں۔ اچھا ہوگا خس کم جہاں پاک۔"

مَیں نے کہا "مرزا صاحب، بھلا رنڈیوں سے اور دلی کے اچھے بُرے ہونے سے کیا واسطہ؟" کہنے لگے "واہ۔ بیٹا۔ واہ۔ خوب سمجھے۔ اور ننھے بن جاؤ۔ یار عزیز انہیں سے تو دِلّی دِلّی تھی نہیں تو دلّی میں رکھا ہی کیا تھا۔ ذرا حکیموں کے مطب میں جاکر دیکھئے تو معلوم ہوتا کہ دلی کی زبان کا سنبھالنے والا کون ہے۔ کبھی کسی کوٹھے پر گئے ہوتے تو کھلتا کہ آدابِ مجلس کس کو کہتے ہیں۔ ذرا ان کے بننے سنورنے کو دیکھتے تو پتہ چلتا کہ لباس کس کو کہتے ہیں۔ ذرا ان کے کمروں کو دیکھا ہوتا تو سمجھتے کہ سلیقہ کس کو کہتے ہیں۔ میاں رنڈیاں دلّی کی تہذیب کا نمونہ تھیں۔ لاکھ عورتوں میں سے الگ نکال لوں کہ یہ دلی کی رنڈی ہے۔ اب جیسی روح ہے ویسے فرشتے ہیں۔ خیر تم بڑے متقی پرہیزگار سہی رنڈیوں کو چھوڑو۔ . . . شہر والوں کو لو۔ لعنت ہے ان کی شکل پر۔ یہ دلی والے ہیں۔ خدا کے لئے سچ کہنا۔ کیا ان کو کوئی دِلّی والا کہیگا۔ بال دیکھو تو جھاڑ جھنکار، منہ دیکھو تو ہیجڑوں کا سا۔ لباس دیکھو تو سبحان اللہ۔ نیچے قمیص ہے اوپر کرشانوں، جیسا چھوٹا کوٹ، ٹانگوں میں دو تھیلے چڑھائے کُٹ پٹ کھٹ پٹ کرتے چلے آتے ہیں۔ لیجئے یہ ہیں آپ کے دلی والے۔ یہ تو یہ کمبخت عورتوں نے بھی کچھ اپنی عجب وضع بنالی ہے۔ انگیا، کرتی اور ڈھیلے پیجامے تو غدر کے ساتھ گئے۔ چوڑی دار تنگ پیجامے اور کرتے دربار کے ساتھ رخصت ہوئے۔ اب لباس کیا ہے بس یہ سمجھ لو کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ سلیقہ کا یہ حال ہے کہ بچوں کی مالک آیا، باورچی خانہ کی مالک ماما، سینے پرونے کے ذمہ دار درزی، دھندی نبیر ماسٹر ٹیلر۔ اب ان کو گھر والیاں کون کہے گا۔ شام ہوئی اور بیگم صاحبہ ہوا خوری کو نکلیں

جب ایک طرف گئے بیم صاحب دوسری طرف گئیں۔ اب نہ اُن کو اِن کی خبر اور
اِن کو اُن کی۔ سمجھئے یہ آپ کی دلی کی حیا و شرم رہ گئی ہے۔ کچھ بچے کچھے گھرانے اپنی
انی چال پر چل رہے ہیں لیکن کب تک۔ خربوزہ کو دیکھکر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ وہ
ں یا اِسی بھیڑیا چال کو اختیار کریں گے یا نکو بن جائینگے! میں نے کہا مرزا صاحب
تو نہ کہو۔ پردہ تو اب بھی دلی میں خاصہ ہے! کہنے لگے "اوہو۔ تو ماشاءاللہ آپکے
یاں کچھ اس سے بھی زیادہ تیز رنگ ہے۔ بندۂ خدا۔ یہ کوئی پردہ میں پردہ ہے۔ پہلے
ہر پھرنے والیاں بھی نکلتی تھیں تو اوڑھے پہنے، برقع اوڑھتی تھیں تو اس طرح کہ
ف ایک آنکھ باہر رہے' نہ اس طرح جیسے اب پھرتی ہیں۔ برقع تو اب بھی اِن کے
ر پر ہے لیکن پلو ہیں کہ ہوا میں اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں۔ خود ہیں کہ برقع سے دو
م آگے مردمیدان بنی چلی آرہی ہیں۔ اب برقع کو برقع سمجھ کر تھوڑئی اوڑھا جاتا
ہے۔ صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ رسم چلی آتی ہے اس کو پورا کر رہے
یں۔ جب اپنے ہی بُرے ہو گئے تو دوسری قوم والوں کو میں کیا کہوں۔ بس یہ
مجھ لو کہ پہلے جن کی آنگلی نہیں دکھائی دیتی تھی اب اُن کی پنڈلیاں دکھائی
یتی ہیں۔ ارے بھئی یہ تو جو کچھ تھا سو تھا۔ اب دل بھی تو صاف نہیں رہے ہیں۔
ک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں سے بیزار' مسلمان ہندوؤں سے
یزار۔ بات بات پر کٹے مرتے ہیں۔ خدا نکو نے ملو کو گالی دی یا ملو نے کلو کو مارا تو
مجھ لو کہ قیامت آگئی۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ میاں معاملہ کیا ہے۔ آخر لڑنے کا سبب
یا تھا۔ مسلمانوں سے پوچھو تو کہتے ہیں ہم کچھ نہیں جانتے مسلمان کو ہندو نے کیوں مارا
ہندوؤں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں میاں پرے ہٹو۔ ہم کو اس سے غرض نہیں کہ
یا ہوا۔ ہندو کو مسلمان نے کیوں گالی دی۔ جو ہے آپے سے باہر ہوا جاتا ہے۔ جس کو
جو بھوکے فقیر کی طرح پھیر رہا ہے۔ آج اس کا سر پھوٹا۔ کل اُس کا خاتمہ ہوا۔ اسپتال

بھرے چلے جا رہے ہیں۔ ولایت سے دواؤں پر دوائیں چلی آ رہی ہیں۔ ڈاکٹروں کی فیس بھرتے بھرتے دیوالہ نکلا چلا جاتا ہے۔ اور ہے کیا کہ کلو نے ملو کو مارا۔ گوتزوں سے موٹریں اِدھر سے اُدھر یوں پوں کرتی چلی جا رہی ہیں۔ توپیں کھڑا کھڑ کرتی اِدھر۔ اُدھر دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز چیلوں کی طرح سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ فوج پرا باندھے یہاں کھڑی ہیں وہاں کھڑی ہیں۔ تلاشیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ پکڑے جا رہے ہیں۔ جیل خانے بھر رہے ہیں۔ مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔ کسی کو جنم قید ہے۔ کوئی پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے اور یہ سب کس لئے کہ ملو نے کلو کو گالی دی لیجئے یہ آپ کی دلی ہے اور یہ آپ کے دلی والے ہیں۔ کل ہی کا قصہ ہے میں کے کرہ سے قاضی کے حوض آ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پنڈت کے کوچہ کے قریب دو بجار[1] لڑ رہے ہیں۔ سب راستے ہیں کہ بند ہیں۔ موٹریں، گاڑیاں، تانگے، ٹرام غرض سارا راستہ کا راستہ رکا کھڑا ہے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ آگے بڑھکر لٹھ مار کر انکو علیحدہ کرے۔ آخر جب لڑتے لڑتے خود ہی تھک گئے اس وقت بھاگا۔ دوسرا اُس کے پیچھے بھاگا۔ دو تین آدمی چپیٹ میں آگئے۔ جب کہیں راستہ کھلا۔" میں نے کہا "مرزا صاحب آخر مار کر بھگا دینے میں کیا ہرج تھا۔" لگے "میاں۔ ابھی تم نے دلی دیکھی کیا ہے۔ ہٹانے میں ہرج۔ ارے بھائی خرابے ہو جاتے وہ کیا لفظ ہے تصادم۔ ہاں تصادم ہو جاتا۔ بین الاقوامی تصادم ہو جاتا۔" میں نے کہا "ہیں.... بین الاقوامی تصادم۔ یہ بھی آپ نے خوب کہنے لگے "ہاں۔ میاں۔ تم پڑھنے لکھنے ہو۔ ہماری زبان میں مین میخ نکالتے ہو۔

---

[1] دلی میں اُن بیلوں کو بجار کہتے ہیں جو کسی دیوتا کے نام پر چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اُن کو سانڈ کہتے ہیں مگر بجار (ب۔ ج۔ ا۔ ر) کا لفظ زیادہ مستعمل ہے۔

اب یہی سنتے ہیں کہ جب دو قومیں لڑتی ہیں تو اخبار والے اس کو بین الاقوامی تصادم کہتے ہیں۔ اب جانے ہماری بلا۔ وہ صحیح کہتے ہیں یا غلط۔ انہی سے جا کر پوچھو کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہمارے زمانہ میں تو بڑے بڑے واقعات ہو جاتے تھے تو بین الاقوامی تصادم نہیں ہوتا تھا۔ کوئی پچیس تیس برس کی بات ہے کہ ہم پھول والوں کی سیر کو جا رہے تھے ہمکو یاد ہو گا سیدھی سڑک قطب کو جاتی تھی۔ اب یہی کبھی ادھر گئے ہو۔ خدا نہ لیجائے۔ قطب جانا مشکل ہو گیا ہے۔ چاروں طرف سڑکیں ہی سڑکیں ہیں۔ بے لکھا پڑھا آدمی صبح کو چلے تو کہیں شام کو جا کر قطب پہنچے۔ اب ادھر چلو۔ اب ادھر مڑو۔ اب ادھر گھومو۔ اب ادھر جاؤ۔ ہر موڑ پر تختی لگی ہوئی ہے۔ پڑھنے والے پڑھ لیتے ہوں گے، ہمارے تو خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں دیکھو تختی پر ہاتھ بنا ہے۔ ایک انگلی آگے کو نکلی ہے یعنی ادھر جاؤ۔ آخر ادھر جاؤ تو کہاں جاؤ۔ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ادھر بھی سڑک ہے کہیں جاتی ہی ہو گی لیکن جاتی کہاں ہے یہ کیونکر معلوم ہو۔ اگر ہاتھ کی جگہ قطب کی لاٹھ بنا دیتے تو سب سمجھ جاتے کہ یہ سڑک قطب جاتی ہے۔ مقبرہ بنا دیتے تو جان جاتے کہ یہ سڑک مدرسہ* کو جاتی ہے۔ سڑکیں کیا ہیں خاصی بھول بھلیاں ہو گئی ہیں۔ سڑک پر یہاں، وہاں جہاں دیکھو سپاہی کھڑے تھرک رہے ہیں۔ کبھی یہ ہاتھ اونچا کرتے ہیں کبھی وہ۔ کبھی ادھر پھیر جاتے ہیں کبھی اُدھر۔ غرض کیا کہوں دلی کی سڑکیں بھی تماشہ ہو گئی ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک دفعہ ہم قطب جا رہے تھے منصور کے مقبرہ کے پاس جو پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اونٹ گاڑی چلی آ رہی ہے۔ اندر بیسیوں آدمی ٹھنسا ٹھس بھرے ہیں۔ چھت پر بوریاں لدی ہیں۔ ان کے بیچ میں بھی پانچ چھ گنوار دبکے دبکائے بیٹھے ہیں۔ میاں میواتی اونٹ کی نکیل تھامے سامنے کے تختے پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔

---

* ہمایوں اور منصور کے مقبروں کو مدرسہ بھی کہتے ہیں۔

خدا کی قدرت دیکھو دوسری طرف سے ایک یکہ آرہا تھا یکہ میں تین سیلانی ایک بیچ میں دو ادہر ادہر، ایک ہاتھ سے چھتری کے ڈنڈے پکڑے دوسرا ہاتھ ٹوپی سنبھالنے کے لئے سر پر دھرے صاف ستھرے کپڑے پہنے چلے آرہے ہیں۔ یکہ والے نے ہری گھاس چھتری کے اندر باندہ رکھی تھی کہ قطب میں کام آئے گی۔ یکہ جو اونٹ گاڑی کے پاس سے گزرا تو میاں اونٹ کی نظر گھاس پر پڑی۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنی گردن بڑھا چھتری میں داخل کردی۔ سیلانیوں نے ہشت ہشت کی۔ اونٹ نے جو گھبرا کر گردن سیدھی کی تو یکہ گردن میں اٹک گیا۔ بھئی مزہ آگیا۔ اونٹ کے گلے میں بلی تو سنی تھی یہ اونٹ کے گلے میں یکہ اسی دن دیکھا۔ خیر ادہر ٹٹو انی نے ہاتھ پاؤں مارے، ادہر یکہ والے نے غل مچایا، کچھ راہگیروں نے گڑبڑ کی۔ اونٹ نے جو گردن کو جھٹکا دیا تو یکہ، ٹٹو، سیلانی سب وہ جا کر گرے، چوٹیں بھی آئیں، کپڑے بھی خاک میں سنے، نقصان بھی ہوا، مگر نہ کچھ جھگڑا ہوا نہ ٹنٹا۔ یکہ والے نے کچھ گڑبڑ شروع کی تھی اس کو لوگوں نے ڈانٹ دیا کہ چل بے یہ ہوتا ہی ہے، نہ چھتری میں گھاس باندہ کر لاتا، نہ اونٹ گردن ڈالتا، نہ یہ تماشہ ہوتا۔ لیجیے معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ خدانخواستہ اگر آجکل یہ واقعہ پیش آجاتا تو بات کہیں کی کہیں پہنچتی، خوب کٹم کٹا ہوتی، لکڑی چلتی، نالشا نالشی ہوتی اور کیوں نہ ہوتی؟ کسی مسلمان کے اونٹ کا کسی ہندو کے ٹٹو کو زخمی کرنا کوئی معمولی بات ہے؟ میں نے کہا "تو مرزا صاحب آپ دلی کی عورتوں سے تو خفا تھے ہی، مردوں سے بھی صاف نہیں؟" کہنے لگے "مرد عورت کیا میں تو دلی کی ہر بات سے خفا ہوں۔ اب اس گھڑی ہی کو دیکھ لو۔ اب یہ گھڑی تھوڑی رہی ہے خاصہ بزازہ ہوگیا ہے جو مال شہر میں نہ ملے یہاں لے لو۔ سودے والے ہیں وہ نئی نئی آوازیں نکالتے ہیں۔ اب جو یہ بی۔ اے۔ بی۔ اے پکار رہا ہے۔ جانتے ہو کیا بیچ رہا ہے۔ میاں کھیر بیچ رہا

ہے۔ بھلا اس آواز پر کوئی کیا آئے گا۔ کاہے سب گونگے ہو گئے۔ ہاں کسی زمانہ میں گرمی کا موسم ہے تو آوازیں آ رہی ہیں کالے اودے لگا دئے ہیں شربت کو، ساونے سلونے لگا دئے ہیں شربت کو۔ جاڑا ہے تو آوازیں آ رہی ہیں گھونگھٹ والی نے توڑے ہیں بیر۔ لاڈو پیاری نے توڑے ہیں بیر۔ اب کاہے تو دلی سے ناپید ہو گئے۔ ہاں فتحپوری کے نیچے کچھ میوہ والے بیٹھے ہیں۔ وہ ٹھیرے کابلی۔ اُردو بھی کچھ یوں ہی سی جانتے ہیں۔ آوازیں کیا لگائیں گے اور لگائیں بھی تو لوگ ڈر کر بھاگ جائیں۔ پہلے چاندنی چوک میں یہاں سے وہاں تک میوہ والوں کی دوکانیں تھیں۔ نیچے نہر، اوپر درختوں کا سایہ، جابجا فالودے والوں کی دوکانیں۔ دوکانوں کے سامنے کہیں بنچ بچھے ہیں کہیں مونڈھے پڑے ہیں۔ لوگ آئے، بیٹھے، اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، پیسے دو پیسے کا شربت پیا، اُٹھے، چلے گئے۔ اب نہ وہ نہر ہے نہ درخت۔ فتح پوری سے لا قلعہ تک صفا چٹ میدان ہے۔ گرمی میں یہاں سے وہاں جاؤ تو فشار ہو جائے یاد زمانہ تھا کہ دوپہر کو بھی اس سڑک پر بہار رہتی تھی، گھر میں وہ آرام نہ ملتا تھا جو یہاں ملتا تھا۔ اور اس چاندنی چوک کی سڑک تو دیکھو، کیا کالی بھٹ ہوئی ہے ایک چکر لگا کر جاؤ تو یہ معلوم ہو کہ ابھی کوئلے بیچ کر آ رہے ہو اور گرم ایسی کہ تنور بھی کیا ہو گا۔ دوپہر کو روٹیاں پکا لو۔ کہتے ہیں سب سے زیادہ قیمتی سڑک یہی ہوتی ہے۔ ہاں بھائی ہو گی، ولایت کا مال لگا ہے، قیمتی کیوں نہ ہو گی۔ ایک دن رام لیلا دیکھنے نکلا تھا رات کے بارہ بجے تک تو یہ سڑک ٹھنڈی ہوئی نہ تھی۔ اور ہاں میاں فرحت، کبھی تم رام لیلا کے زمانہ میں بھی دلی آئے ہو۔ میں نے کہا جی نہیں۔ وہ کہنے لگے "ارے بھئی کیا کہوں۔ اس میلہ کے ٹوٹنے کا جتنا رنج کیا جائے کم ہے۔ پہلے جو سواری نکلتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے بادشاہ کا جلوس جا رہا ہے۔ ہندو، مسلمان، امیر، غریب، شریف، رذیل، سب کے سب کھاتا [illegible] گلا، [illegible] جاوڑی

ملتا شام ہی سے نکل آتے۔ کوٹھے ہیں کہ روشنی سے بھٹے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔
رنڈیاں ہیں کہ بنی سنوری گاؤتکیوں سے لگی برآمدوں میں بیٹھی ہیں۔ نیچے سے کچھ بات
ہوتی ہے اُوپر سے جواب ملتا ہے۔ اُدھر سے پان آ رہے ہیں اِدھر سے روپے جا رہے
ہیں۔ بھیڑ کا یہ عالم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے، روشنی کا یہ عالم ہے جیسے دن نکلا
ہو۔ سواری اس شان سے آتی کہ کیا کہوں۔ ہنسی خوشی چار پانچ گھنٹے گزار گھروں پر
جا پڑے۔ اور اب کی سواری دیکھو تو واہ۔ واہ۔ واہ آگے توپ ہے پیچھے توپ
ہے۔ سامنے فوج ہے، پیچھے فوج ہے۔ سپاہی ہیں کہ ڈنڈے بجا رہے ہیں۔ ایک
غل مچ رہا ہے کہ بڑھے چلو بڑھے چلو۔ کوٹھے بند ہیں اور ان کا بند ہونا ہی اچھا۔
بھلا آجکل کی کوٹھے والیوں سے میلے کی کیا شان بڑھ سکتی ہے۔ کوٹھوں کی چھتوں
پر پولیس والے چڑھے ہوئے ہیں۔ جہاں چار آدمی جمع ہوئے اور سپاہی نے ڈانٹا
کہ آگے بڑھو۔ ذرا بھیڑ بھیڑ کی تو پکڑ تھانہ میں لے گئے۔ بھلا اس مصیبت میں کون پڑے
بھلے آدمیوں نے تو جانا ہی چھوڑ دیا۔ اب ایک مذہبی رسم ہے، وہ پوری ہو جاتی
ہے۔ اس میں بھی کبھی کبھی مارکٹائی کی نوبت آجاتی ہے اور ہم سے پوچھو تو نہ اب
وہ رام لیلا ہے اور نہ رام لیلا کا مزا۔ اس سے بدتر حال پھول والوں کی سیر کا ہے۔ بس
یہی دو میلے دلّی کے ایسے تھے کہ سارے جہان میں لاجواب تھے۔ اب نہ رام لیلا
وہ رام لیلا ہے اور نہ پھول والوں کی سیر وہ پھول والوں کی سیر ہے۔ پہلے بھادوں
آیا، سیر کی تاریخ مقرر ہوئی، نفیری بج گئی، مہرولی آباد ہونی شروع ہو گئی۔ مکانوں
میں سفیدی ہو رہی ہے، کمرے سجائے جا رہے ہیں۔ کرایہ کا یہ حال ہے کہ پہلے جو
کمرہ دو روپئے مہینہ کو ملے وہ سو روپئے روز پر ملنا مشکل ہے۔ رنڈیاں رتھوں پر
بیٹھی جا رہی ہیں، امیر فینسیں اڑائے چلے جاتے ہیں۔ غریب غربا مٹکے سروں پر
اوندھائے، لنگوٹ کسے، پتنگیں اڑاتے، گاتے، بجاتے چلے جا رہے ہیں قطب

کی لاٹھ تک آدمی ہی آدمی ہوتا تھا۔ بڑے لوگ تو اپنے گردوں پر جا، نہا، دھو، کپڑے بدل نکل آئے، غریبوں نے جھرنے پر جا دو تین غوطے مارے، مٹکے میں سے تحفہ تحفہ کپڑے نکالے، کارچوبی ٹوپی، ٹاٹ بافی جوتی، شربتی ململ کا کرتا انگرکھا، ٹٹ مارتے کا پاجامہ پہن ایسے نکلے جیسے چاند گہن سے نکلتا ہے۔ بھلا دیکھ کر کوئی کہہ تو دے کہ یہ میاں قادر سقہ ہیں اور یہ نتھو کمہار۔ مہرولی میں اس سرے سے اس سرے تک دکانیں لگی ہیں، لوگ بیٹھے ہیں، کھا رہے ہیں، باتیں ہو رہی ہیں، ادھر گانا ہو رہا ہے، ادھر دف بج رہا ہے۔ باریک باریک پھوار پڑ رہی ہے کہ ایک دفعہ ہی نفیری کی آواز آئی لیجئے جوگ مایا جی کا پنکھا آگیا، سب کے سب اس میں جا شریک ہوئے، عبدالوہاب گلورہ بجا رہا ہے، نفیری کے کمال دکھا رہا ہے، بیلیں مل رہی ہیں، کوئی روپیہ دیتا ہے کوئی دوشالہ۔ رات کے ایک دو بجے تک یہی چہل پہل رہی۔ دوسرے دن درگاہ شریف میں پنکھا چڑھا، وہاں اس سے زیادہ دھوم دھام رہی۔ چار پانچ روز ۴ نکھ ہنڈ کرتے گزر گئے، ہنسی خوشی گھر آئے، قطب کے پراٹھے لائے، چاندی کے چھلے لائے، اب گھر گھر پراٹھے اور چھلے بٹ رہے ہیں۔ اور اب کی پھول والوں کی سیر خدا نہ دکھائے۔ شریف لوگ تو وہاں کیوں جانے لگے۔ جاتے ڈرتے ہیں کہ کہیں بین الاقوامی تصادم نہ ہو جائے۔" میں نے کہا "مرزا صاحب بین الاقوامی تصادم نہیں۔ فرقہ واری جنگ!" کہنے لگے "چل ہٹ۔ جو بین الاقوامی تصادم وہی فرقہ واری جنگ، نہ اس کے کچھ معنی، نہ اس کے کچھ معنی۔ خواہ مخواہ اخبار والوں نے نئے نئے لفظ گھڑ ڈالے ہیں اور تونے یہاں کی زبان بھی سنی۔ سبحان اللہ کیا زبان ہے اور ابھی ہر مرے جاتے ہیں کہ اردو ہماری زبان ہے۔ لکھنؤ کا حال تو مجھے معلوم نہیں، ہاں دلی کی زبان تو اب کچھ نئی زبان ہو گئی ہے، وہ وہ لفظ سننے میں آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ اور ان پڑھے لکھے لوگوں نے تو زبان کو اور بھی غارت کر دیا ہے۔ ایک

لفظ اردو کا بولینگے تو دو لفظ انگریزی کے۔ بھئی مجھے تو میاں کی زبان سے بھی نفرت ہوگئی ہے۔ پرسوں ہی جمعہ کو جامع مسجد میں ایک مولوی صاحب وعظ بیان کر رہے تھے ماشاءاللہ کیوں نہ ہو مولوی تھے۔ چھانٹ چھانٹ کر وہ وہ لفظ حلق سے نکالے ہیں کہ سبحان اللہ۔ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ یہ تو رہے مسلمان۔ اب ہندوؤں کی گفتگو سنو تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم ہندی بولتے ہیں۔ جو وہ بولتے ہیں اگر اسی کا نام ہندی ہے تو میاں ہم تو مرتے جائیں گے یہ زبان نہ آئیگی اچھا بھئی ہم عربی بولیں، تم ہندی بولو مگر اسطرح کہ جو لفظ ہماری تمہاری اُردو میں نہیں ہے اُس کے لیے مولوی صاحب عربی کا لفظ استعمال کریں، پنڈت جی سنسکرت کا لفظ بولیں یہ کیا ہے کہ اردو میں لفظ موجود ہے اور اس کی جگہ ایک صاحب سنسکرت کا یہ موٹا لفظ لائیں اور دوسرے صاحب عربی کا یہ بڑا لفظ قاموس میں سے نکالکر استعمال کریں۔ ایے بھئی سنتا ہوں تمہارے ہاں بھی تو اُردو کا کوئی بڑا مدرسہ کھُلا ہے۔ سب علم اُردو ہی میں پڑھایا جاتا ہے"۔ میں نے کہا "جی ہاں۔ کلیہ جامعۂ عثمانیہ"۔ مرزا صاحب بڑے زور سے قہقہہ مار کر کہنے لگے "اوہو! یہ نام اور اُردو کا مدرسہ۔ معلوم ہوتا ہے وہاں بھی مولویوں کا زور ہے۔ خیر جامعہ تو یہ جیسے جامع مسجد، عثمانیہ تمہارے بادشاہ کا نام ہوا اور میاں یہ کلیہ کیا بلا ہوئی"۔ میں نے کہا "آپ اِس بحث کو چھوڑیے۔ دلی کی کچھ اور سُنائیے۔ جب دلی کی ہر چیز سے آپ کو نفرت ہے تو گزرتی کیسے ہوگی"۔ کہنے لگے "میاں بہت ہوگئی تھوڑی رہی ہے۔ صبح ہی اُٹھتا ہوں۔ نماز پڑھ کبھی مہندیوں[1] میں چلا جاتا ہوں کبھی کلو کے تکیہ۔ پُرانی دلی والے وہاں آرام کر رہے ہیں۔ اُنکی قبروں پر جا بیٹھتا ہوں، ان کو اور اُن کی دلی کو یاد کر کے دو آنسو بہا لیتا ہوں، جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ شام

---

[1] مہندیاں اور کلو کا تکیہ دلی کے دو بڑے قبرستان ہیں۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر آ بیٹھتا ہوں اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھتا ہوں کہ پہلے دتی کیا تھی اور اب کیا ہو گئی ۔" اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی مرزا صاحب رومال جھاڑ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے " میاں فرحت ! میاں بس اس لئے آتا ہوں ۔ اگر دلی میں کچھ لطف رہ گیا ہے تو جامع مسجد میں مغرب اور عشاء کی نماز میں رہ گیا ہے ۔ یہ بھی نہ ہوتا تو کچھ کھا کر سو رہتا ۔"

دوسرے دن میں حیدر آباد چلا آیا ۔ سارے راستے مرزا صاحب کی باتوں کا خیال رہا ۔ جو خوشی دلی جا کر ہوئی تھی وہ مرزا صاحب کی باتوں نے خاک میں ملا دی ۔ یہ تو میں بھی کہوں گا کہ دلی مجھ کو بھی کچھ نئی نئی معلوم ہونے لگی ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کا نام نئی دلی رکھا گیا ہے ۔ جو دلی ہمارے زمانہ میں تھی وہ تو اب نہیں رہی ۔ اب چاہے دلی والے اس کو مانیں یا نہ مانیں ۔

دلاری

گو وہ لونڈی بچپن سے اس گھر میں رہی اور پلی مگر سولہ سترہ برس کی عمر میں بھاگ گئی۔ اس کی ماں کا پتہ نہ تھا، اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس گھر والے۔ شیخ ناظم علی صاحب خوشحال آدمی تھے، خاندان میں کئی بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ بیگم صاحب بھی زندہ تھیں اور زنانہ میں ان کا پورا راج تھا۔ دلاری خاص ان کی لونڈی تھی۔ گھر میں اور نوکرانیاں مامائیں آئیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کریں اس کے بعد چھوڑ کر چلی جاتیں۔ اس کی وجہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتی تھی کہ ان کے ساتھ سلوک برا ہوتا یا دوسری جگہ انہیں تنخواہیں اچھی ملتیں، بلکہ غالباً یہ وجہ تھی کہ وہ ایک جگہ رہتے رہتے گھبرا جاتیں اور آخر کار کسی معمولی سی بات پر جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتیں۔ مگر دلاری کے لئے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانا تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اسے کھانے اور کپڑے کی کوئی شکایت نہ تھی، دوسری نوکرانیوں کے مقابلہ میں اس کی حالت اچھی تھی مگر باوجود اس کے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اور اس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سنتی "میں تیری طرح کوئی لونڈی تھوڑی ہوں۔" اس کا دلاری کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا مرتبہ گھر کی بیبیوں سے پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجہ میں ہوئی تھی۔ خدا جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کا رونا کیا! دلاری کو اپنی پستی کی کوئی شکایت نہ تھی مگر جب اس کی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے، دل کی گہری اور اندھیری بے چینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں، تو وہ اکثر مغموم سی رہنے لگی لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاحبزادی حسینہ بیگم

ری دونوں قریب قریب ہم سن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔ مگر جوں جوں ان کا سن بڑھتا
ں توں دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔ صاجزادی کا وقت پڑھنے، پڑھنے،
لکھنے میں صرف ہونے لگا۔ دلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، گھڑوں میں پانی
، چھوٹے برتن دھوتی۔ وہ خوبصورت تھی لمبے لمبے ہاتھ پیر، بھرا جسم، مگر عام طور سے
کے کپڑے میلے چکیلے ہوتے اور اس کے بدن سے بو آتی۔ تیوہار کے دنوں البتہ وہ
اُجلے کپڑے نکالکر پہنتی اور سنگار کرتی۔ یا اگر کبھی شاذ و نادر اسے بیگم صاحب یا صاجزادی کے
اتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اِسے صاف کپڑے پہننا ہوتے۔

شب برات تھی، دلاری گڑیا بنی تھی، زنانے کے صحن میں آتش بازی چھوٹ
ی۔ سب گھر والے، نوکر چاکر، کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بچے غل مچا رہے تھے، بڑے
دے کاظم بھی موجود تھے جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم
ہوا ہے تھے۔ بیگم صاحب انہیں بہت چاہتی تھیں، مگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے،
تنگ خیال اور جاہل سمجھتے۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کی بحث ہی کرتے گزر جاتی
ب قریب ہر پرانی رسم کے خلاف تھے۔ مگر اظہار ناراضی کر کے سب کچھ برداشت
۔ آخر کرتے کیا! انہیں پیاس لگی اور انہوں نے اپنی ماں کے کاندھے پر سر رکھکر
می جان! پیاس لگی ہے۔"
بیگم صاحب نے محبت بھرے لہجہ میں جواب دیا "بیٹا شربت پیو، میں ابھی منگواتی
۔ اور یہ کہکر دلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے۔
کاظم بولے "جی نہیں امی، اسے تماشہ دیکھنے دیجیے، میں خود اندر جا کر پانی پی لونگا۔"
مگر دلاری حکم سنتے ہی اندر کی طرف چل دی۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے۔ دلاری
سا اندھیری سی کوٹھری میں شربت کی بوتل اُتار رہی تھی۔ کاظم بھی وہیں پہونچکر

سکے۔ دلاری نے مڑکر پوچھا "آپ کے لئے کونسا شربت تیار کروں؟" مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے اسے ایک نظر دیکھکر گردن جھکالی۔ دلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ایک بوتل اٹھالی اور دروازہ کی طرف بڑھی۔ کاظم نے بڑھکر بوتل اس کے ہاتھ سے لیکر الگ رکھدی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے تن من کو اُس کی گود میں دیدیا۔ اُمڈی ہوئی گھٹائیں آخر برس پڑیں۔ دو ہستیوں نے جن کی ذہنی حالت میں زمین و آسمان کا فرق تھا یکایک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزوؤں کے ساحل پر آگئیں۔ دراصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہی چلی جارہی تھیں۔ اکثر پریم کا میٹھا گیت دیپک اگ میں گایا جاتا ہے۔

ایک سال گزر گیا۔ کاظم کی شادی ٹھیر گئی۔ شادی کے دن آگئے۔ چار پانچ دن میں گھر میں دلہن آجائیگی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے۔ ایک جشن ہے۔ کام کی کثرت ہے۔ دلاری ایک دن رات کو غائب ہوگئی، بہت چھان بین ہوئی، پولیس کو اطلاع دی گئی، مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک نوکر پر سب کا شبہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اسی کی مدد سے دلاری بھاگی، اور وہی اسے چھپائے ہوئے ہے۔ وہ نوکر نکال دیا گیا۔ درحقیقت دلاری اسی کے پاس نکلی مگر اُس نے واپس جانے سے صاف انکار کردیا۔

تین چار مہینہ بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے دلاری کو شہر کی غریب رنڈیوں کے محلہ میں دیکھا۔ بڈھا بیچارا بچپن سے دلاری کو جانتا تھا۔ وہ اُس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے۔ وہ راضی ہوگئی۔ بڈھا سمجھتا تھا کہ اسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے بچیگی۔

دلاری کی واپسی نے سارے گھر میں کھلبلی ڈال دی۔ وہ گردن جھکائے

ے سفید چادر سر سے پیر تک اوڑھے، پریشان صورت اندر داخل ہوئی اور سائبان کے
نے میں زمین پر جا کر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں، وہ دور سے کھڑی ہو کر اسے
یتیں اور افسوس کر کے چلی جاتیں۔ اتنے میں ناظم علی صاحب زنانہ میں تشریف
ئے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ دلاری واپس آ گئی ہے تو وہ باہر نکلے جہاں دلاری
بی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے، گھر کے معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے، انہیں
ن باتوں کی فرصت ہی نہیں تھی۔ دلاری کو دور سے پکار کر کہا "بے وقوف! اب
بی حرکت نہ کرنا" اور یہ کہکر اپنے کام پر چلے گئے۔ اس کے بعد چھوٹی صاحبزادی،
ے قدم، اندر سے برآمد ہوئیں اور دلاری کے پاس پہونچیں، مگر بہت قریب نہیں
ن وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ وہ دلاری کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھیں۔ دلاری
ے بھاگنے کا انہیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس
ب بیچاری پر بہت ترس آ رہا تھا مگر اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے
ے گھر کا سہارا چھوڑ کر جہاں اُس کی ساری زندگی بسر ہوئی ہو باہر قدم تک رکھ سکتی
ے۔ اور پھر نتیجہ کیا ہوا؟ عصمت فروشی، غربت، ذلت۔ یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی
ا گر بھاگنے سے اس کی حالت بہتر کیسے ہوئی۔ دلاری گردن جھکائے بیٹھی تھی
ینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا جس میں وہ
ا احسان فراموشی تھی۔ مگر اسے اس کی کافی سزا مل گئی۔ خدا بھی گنہگاروں کی
قبول کر لیتا ہے۔ گو کہ اس کی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کے لئے یہ
ا اہم چیز نہیں جتنی ایک شریف زادی کے لئے۔ کسی نوکر سے اس کی شادی
ی جائے گی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے آہستہ سے نرم لہجے
ا کہا "دلاری یہ تو نے کیا کیا؟" دلاری نے گردن اُٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں
ایک لمحہ کے لئے اپنی بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اسی طرح سے سر جھکا لیا

حسینہ بیگم واپس جا ہی رہی تھیں کہ خود بیگم صاحب آ گئیں۔ اُن کے چہرہ پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، وہ دُلاری کے بالکل پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ دلاری اسی طرح چپ، گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحب نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔

"بے حیا! آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ۔ مگر منہ کالا کرکے۔ سارا زمانہ تجھ پر تھوڑی تھوڑی کرتا ہے۔ بُرے فعل کا یہی انجام ہے۔......" مگر باوجود ان سب باتوں کے بیگم صاحب اس کے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دلاری بھاگی تھی گھر کا کام اتنی اچھی طرح نہیں ہوتا تھا۔

اس لعن طعن کا تماشہ دیکھنے سب گھر والے بیگم صاحب اور دلاری کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھکر سب کے سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔

یکایک ایک بغل کے کمرے سے کاظم اپنی خوبصورت دلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دلاری پر نظر نہیں ڈالی۔ ان کے چہرے سے غصہ نمایاں تھا۔ انہوں نے اپنی والدہ سے درشت لہجے میں کہا: "اے خدا کے لیئے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجئے۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں اس کی حالت کیا ہو رہی ہے؟" یہ کہکر وہ فوراً واپس چلے گئے۔

لڑکی اس آواز کو سنکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کرکے سب نے ہٹنا شروع کیا۔ مگر یہ ایک مجروح، پر شکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔ اُسی دن رات کو وہ پھر غائب ہو گئی۔

غزل

(مولانا آزاد سبحانی صاحب)

تمہاری زلفِ مشکیں سے بندھی ہے زندگی اپنی
نہ مرنا ہے خوشی اپنی نہ جینا ہے خوشی اپنی

سبھی پژمردہ بیٹھے رہ گئے حتیٰ کہ ساقی بھی
کچھ ایسی چھا گئی اس انجمن میں بیدلی اپنی

ل بے ظرف نے بے ظرفیاں کیں وائے نادانی
اڑائی طبقۂ عشاق میں اس نے ہنسی اپنی

ہاں تک کہتے پھرے قصۂ بیچارگی اپنا
کہاں تک اپنے ہاتھوں کیجئے پردہ دری اپنی

وشا تقدیر جو رہزن مسلّم ہیں زمانہ کے
انہیں کے ہاتھ میں سونپی گئی ہے رہبری اپنی

ہاں زورِ جنوں میں رہ سکے بخیہ گری باقی
محض دیوانگی تھی کوشش بخیہ گری اپنی

دا کے نام پہ ہم نے بہت سے بُت تراشے ہیں
حرم کو بھی لئے ہے دائرہ میں بُت گری اپنی

سی کا کیا ہے کل سامان حسن و عشق اپنے ہیں
دل اپنا، حسن دلبر اپنا، طرز دلبری اپنی

ل پُر حوصلہ نے کر لیا خود راستہ پیدا
نہ چھوڑی چرخ کج رفتار نے گو کجروی اپنی

ہت مشہور ہے تو سنگدل اے آسماں لیکن
ہلا دیگی تجھے بھی داستانِ بے کسی اپنی

ہے رازِ زندگی پوشیدہ قربانی میں سبحانی
اگر تم چاہتے ہو زندگی دو زندگی اپنی

نوائے محوی

(از حضرت محوی صدیقی لکھنوی)

اُف مرے چارہ گروں کا یہ ہراساں ہونا
آج دشوار ہے صبح شب ہجراں ہونا

قیس کا جوش جنوں مفت میں بدنام ہوا
اُس کی تقدیر میں تھا خاک بیاباں ہونا

تجھ سے رنگین ہے افسانۂ حسرت میرا
میرے دل سے نہ جدا ای غم جاناں ہونا

ہے پشیمان اجل، روح پریشاں میری
ہائے اُس شوخ کا انگشت بدنداں ہونا

غیرتِ دل کو نہیں منتِ خنجر منظور
ورنہ مشکل نہیں مشکل مری آساں ہونا

نگہِ دوست کا ہدیہ ہے یہ ناسورِ جگر
ہم نہیں چاہتے شرمندۂ درماں ہونا

گر گئے دامن پہ ترے بن گیا افسانۂ شوق
ورنہ اس خون کے آنسو کو تھا طوفاں ہونا

چپ ہی بیمار، سحر دور، ہی غمخوار اُداس
مفت بدنام نہ تو ای شبِ ہجراں ہونا

دل کے اِک جذبۂ پنہاں کا مرقع سمجھو!
شمع کا پردۂ فانوس میں عریاں ہونا

دیکھ لو گریۂ خونیں اگی چمن آرائی
دیکھ لو گوشۂ دامن کا گلستاں ہونا

جان لے کر ہی غم دوست نے چھوڑا آخر
دِل کی تقدیر میں تھا کشتۂ مہماں ہونا

اپنی تقدیر ہے ورنہ کوئی دشوار نہ تھا
دِل کے ہر داغ کا اک شمع فروزاں ہونا

میں نہیں تو مری تربت ہے ٹھکانا تیرا
بیکسی! تو نہ مرے بعد ہراساں ہونا

دل میں روشن ہے جو تا لای مری شمع اُمید
غیر ممکن ہے مرا کشتۂ حرماں ہونا

ہونہ ہو خون تمنا کا پتہ دیتا ہے
اشک خونیں کا نمایاں سر مژگاں ہونا

دیکھ کر حسن کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو
عشق کا خاک بسر، چاک گریباں ہونا

دیدۂ شوق ہے اور جلوۂ فردوس جمال
اب کسے چاہئے منت کش رضواں ہونا

ہو الگ سب سے ترا طرز سخن اے محوی
تو نہ دلدادۂ انداز حریفاں ہونا

غزل

(مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی)

نہ تھا اور، وعظ کے سلسلۂ دراز میں
راب موجزن، جنت خانہ ساز میں

یارب اثر تھا کون سا، آہ جگر گداز میں
کوندرہی ہیں بجلیاں، ایک حریم ناز میں

ے درِ حبیب کے جذب کی، کوئی حد نہیں
اُٹھا جو سر جھکا، سجدہ گہِ نیاز میں

ہجر وطن ہے اک عذاب کیوں نہ تڑپ کے جان دے
صید حقیقت آشنا، دامگہِ مجاز میں

ہے منتہائے علم، عقل ہے اسکی معترف
بلبل! شک نہ کر، قدرتِ کارساز میں

عمرِ دو روزہ کاٹ دی، شیب میں اُٹھتے بیٹھتے
فرض ہیں دو ہی رکعتیں، وقت سحر نماز میں

آبِ زندگی آپ نے کیوں جناب خضر!
ات الجھ گئی، سلسلۂ دراز میں

ایسے محل پہ دوستو! رخنہ گری ہے، خودکشی
ہم بھی اُسی جہاز میں، تم بھی اُسی جہاز میں

مستِ صبوحِ الست تھے جو متقی، بہک گئے
کیف شراب دیکھکر، نرگسِ نیم باز میں

اقتباسات

رُوس کی تعلیمی ترقی | جنگ عظیم کے بعد روس کی سیاسی اور معاشی نظام میں جو انقلاب ہوا ہے اور جو تجربات ہو رہے ہیں اُس کے متعلق کوئی رائے ابھی آسانی کے ساتھ نہیں قائم کی جا سکتی۔ البتہ وہاں کی تعلیمی حالت میں جو عظیم الشان ترقی ہو رہی ہے وہ ضرور قابل لحاظ ہے خصوصاً ہندوستان کیلئے ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے مطابق اُس مُلک میں پڑھے لکھے مرد اور عورتوں کی تعداد کا اوسط فی ہزار ۳۰۵ تھا، لیکن اشترا کی جمہوریت کے قیام کے بعد سے جو اصلاح وہاں کے نظام تعلیم میں کی گئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پڑھے لکھوں کی تعداد میں تقریباً ۴ فی صدی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اتنی قلیل مدت میں اتنی ترقی یقیناً حیرت انگیز اور قابل داد ہے۔

روسی جمہوریت کے تمام تعلیمی امور جس جماعت کے متعلق ہیں اُسکو People's Commissariat کہتے ہیں اور اس کے سات شعبہ ہیں۔ ایک شعبہ کے متعلق انتظامی امور ہیں مثلاً تعمیرات اور مصارف وغیرہ۔ دوسرے شعبہ کے متعلق ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی نگرانی ہے۔ تیسرے شعبہ کے متعلق حرفتی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ چوتھے کے متعلق غیر روسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ چونکہ رُوس میں تقریباً سو سے زائد مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں اور اُن کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اس لئے اُن کی مادری زبان میں تعلیم کے انتظام کے لئے اس شعبہ کی خصوصیت کے ساتھ ضرورت تھی۔ یہ شعبہ مختلف اقوام کی معاشرتی اور تمدنی ضروریات کا لحاظ رکھ کر ہر ایک کی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کرتا ہے۔ پانچواں شعبہ ایک علمی جماعت ہے جو طریق تعلیم کا مطالعہ اور تحقیق کرتی ہے اور تمام تعلیمی اور صنعتی مدارس کے لئے نصاب تعلیم تیار کرتی ہے۔ چھٹا

دارہ ہے جو اکیڈمی اور تحقیقی کام کرنے والی جماعتوں کی نگرانی کرتا ہے۔ یہی شعبہ
ے کے اندر تمام آثار قدیمہ، فنون لطیفہ کے عجائب خانوں، موسیقی کی درسگاہوں
ری تھیٹروں کی نگرانی بھی کرتا ہے۔ ساتویں شعبہ کے متعلق اشاعت علوم
ے چاہے وہ کتب کے ذریعہ سے ہو یا رسائل کے ذریعہ یا سینما کے ذریعہ سے۔
ابتدائی تعلیم کی مدت چار سال رکھی گئی ہے اور ثانوی کی پانچ سال، اس
یونیورسٹی کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ جو لوگ عمر کی زیادتی کی وجہ سے یا کارو
ں کی مشغولیت کی وجہ سے، یا غربت کی وجہ سے مدارس میں باقاعدہ تعلیم نہیں
سکتے، اُن کے لئے مدارس شبینہ، صنعتی مدارس، مدرسہ بالغین قائم کئے گئے
وس میں سب سے زیادہ قابل تعریف اُن کے وہ مکتب ہیں جہاں ۳ برس سے
تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم و تربیت کنڈر گارٹن کے اصول پر کیجاتی ہے۔ حکومت
ب، لاوارث، اور یتیم بچوں کے لئے جگہ جگہ دارالاقامہ قائم کئے ہیں، اور
طرف سے ان کی تعلیم اور تربیت کا معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ طلبار کے
ں نگرانی کے لئے انسپکٹر مقرر ہیں جو بازاروں میں، ریلوے اسٹیشن پر اور دیگر
پر نوجوانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ابتدائی مدارس کی تعداد
اا تھی اور طلبار کی تعداد ۱۱۰۰۰۰۰ تھی۔
مدارس بالغین تین قسم کے ہیں، دن کے مدرسے، مدارس حرفہ، اور سیاسی
۔ دن کے مدرسے یا تو صنعتی ہوتے ہیں یا زراعتی جیسی ضرورت مقامی حالات
سے ہو، مدت تعلیم ۲ سال عام طور پر ہوتی ہے لیکن اگر کسی خاص فن کے کسی
بہ میں مہارت تامہ پیدا کرنا ہو تو ایک سال تعلیمی مدت میں اور بڑھ جاتا ہے۔
رفہ میں حرفہ کی تعلیم کے ساتھ ادبی تعلیم بھی رکھی گئی ہے۔ بڑے بڑے ملکوں
اص مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن ان مدارس کی تعداد اب روز بروز کم

ہوتی جاتی ہے اس لئے کہ لوگ پڑھنا لکھنا سیکھتے جاتے ہیں۔ سیاسی تعلیم کے لئے مدارس روس کے تعلیمی نظام کی ایک خصوصیت ہیں اور ان مدارس کا مقصد ایسے اشخاص پیدا کرنا ہے جو بالشویک اصول کی تبلیغ و اشاعت کا کام کریں۔ ۱۹۲۳ء میں اس قسم کے سیاسی مدارس کی تعداد ۲۳۲ تھی جن میں ۱۶۰۰۰ طالبعلم تھے۔ ان کے علاوہ کمیونسٹ جماعت کی یونیورسٹیاں ہیں جنکی تعداد ۱۹۲۶ء میں کل پندرہ تھی اور طالب علموں کی تعداد چھ ہزار سے زائد تھی۔ ملک کی عام تمدنی و معاشرتی اصلاح اور باشندوں میں شہریت کا احساس اور عام بیداری پیدا کرنے کے لئے انجمنیں قائم کیگئی ہیں جن کی تعداد ۱۹۲۶ء میں ۲۰ ہزار سے زیادہ تھی۔

روس میں یونیورسٹیاں دو قسم کی ہیں ایک کا مقصد جدید امریکی طریقہ پر کسانوں اور مزدوروں کی تعلیم ہے اس لئے ٹریڈ یونین اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ان یونیورسٹیوں کی امداد میں صرف کرتی ہے۔ ان یونیورسٹیوں کی طرف سے شام کے وقت مختلف علمی، ادبی اور فنی مضامین پر قابل اساتذہ تقریر کے ذریعہ درس دیتے ہیں۔ اس طریقہ سے صرف ماسکو میں اس وقت تقریباً دس ہزار طلبا ۱۶ مختلف مضامین کے درس میں شریک ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کی یونیورسٹیاں جو باقاعدہ مختلف علوم و فنون کی اور مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتی ہیں ان کی تعداد اس وقت سوا سو کے قریب ہے اور طلبا کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہے۔ ان یونیورسٹیوں کے علاوہ سائنس کی تعلیم اور تحقیقی کام کے لئے معمل گاہیں قائم کی گئی ہیں جن کی تعداد ۳۵ ہے۔ ان میں مختلف کیمیائی، طبعی اور برقی تجربات کئے جاتے ہیں جن سے ملک کی صنعت، حرفت اور تجارت کی ترقی کی راہیں نکلیں۔

یونیورسٹی، مدرسہ اور معمل گاہوں اور انجمنوں کے ذریعہ جو تعلیم ہوتی ہے اس کے علاوہ کتب خانہ، سنما، عجائب خانہ بھی تعلیم کے لئے بہت مفید ذریعہ ثابت

ے ہیں چنانچہ اِس وقت جمہوریت روس میں ۲۰ ہزار مستقل کتب خانے ہیں اور ۵۰ ہزار
ہری کتب خانے جو روس کے ساڑھے پانچ لاکھ دیہاتوں میں وقتاً فوقتاً دورہ
نے رہتے ہیں، بصر ۱/۲ ۵ ہزار مستقل سنما اور ۱/۲ ۱ ہزار سفری سنما بھی تعلیمی کام کے لئے
عمال کئے جاتے ہیں۔ Broad Casting کے ذریعہ سے بھی تعلیم دینے کا
اب حکومت نے شروع کیا ہے۔

سطور بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سال کے اندر روسی
ہوریت نے اپنی قوم کی تعلیم میں کس قدر سرگرمی سے کام کیا اور کیسی حیرت انگیز ترقی
مل کی ہے۔ اس دس سال کی مدت میں ہندوستان نے جو ترقی کی ہے اُس کا
ت بھی عنقریب ہارٹوگ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہو جانے کے بعد ملجائے گا۔

تنقید و تبصرہ

کتب

آرنسٹ ۔ مخزن نجات ۔ مہمات الصرف و النحو ۔ مبادی نباتات

آرنسٹ (مصنفہ آسکر وائلڈ مترجمہ مولوی سید تمکین کاظمی صاحب و مولوی عبدالمنعم صاحب حجم ۱۰۹ صفحہ تقطیع ٢٠×٣٠/١٦ ۔ لکھائی معمولی چھپائی اوسط درجے کی کاغذ اچھا ۔ قیمت ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن)

آسکر وائلڈ کا یہ ڈراما اُس کی تصانیف میں معنوی خوبیوں کے لحاظ سے سب سے ہلکا مگر اسلوب بیان کی شوخی اور ظرافت کے چٹخارے کے اعتبار سے سب پر بھاری ہے ۔ اِس کا ترجمہ اُسی صورت میں جائز تھا کہ جو دلچسپی اصل میں ہے وہی ترجمے میں پیدا کر دی جائے ۔ افسوس ہے کہ ترجمہ کرنے والوں کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی ۔ ترجمہ صحیح ہے مگر یہ کافی نہیں ۔

کتاب میں پہلے ایک "تقدیم" ہے، پھر مصنف کی اور دونوں مترجموں کی تصویریں پھر سلطان حیدر صاحب جوش کا "پیش لفظ"، پھر شبیر حسن صاحب جوش کا تاثر، پھر مسعود حسن صاحب ذوقی کا "تعارف"، پھر انیس مجتبیٰ صاحب کا "اعلام" پھر تمکین کاظمی صاحب کی "تقریب"۔ ان چیزوں سے علاوہ مصنف کی صورت اور سیرت کے ناظرین مترجموں کی شکل سے، اُن کے لباس سے، اُن کی زندگی کے حالات سے اور کتاب کی طباعت کی مختصر روداد سے بھی واقف ہو جائیں گے، اور جو باتیں دریافت کرنا ہوں وہ غالباً خط و کتابت سے معلوم ہو سکتی ہیں ۔

ترجمے میں طباعت کی غلطیاں کثرت سے ہیں جن میں سے بعض کا لمبی چوڑی "تصیح" میں بھی ذکر نہیں مثلاً صفحہ ۲۴، سطر ۱۱ اور ۱۳ میں "شکر" کی جگہ "شکریہ"۔ چند غیر مانوس انگریزی الفاظ بجنسہ رکھدئے گئے ہیں اور ان کے معنی حاشیے میں بھی نہیں بتائے گئے مثلاً "کریپٹ" "مفن"۔ بعض انگریزی الفاظ ایسے ہیں جو غیر مانوس تو نہیں مگر ان کا ترجمہ اُردو میں ہو سکتا تھا مثلاً "میڈم" "کمپنی" "ببینی صحبت"۔ خیر یہ بھی سہی مگر خدا جانے Handle کا تلفظ "ہانڈل" ، Hand-bag کا "ہانڈ بیاگ" اور Cloak Room کا "کلاک ردم" کیوں ہو گیا۔

باوجود اِن باتوں کے کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔

مخزن نجات (پہلا حصّہ) (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ۔ حجم ۱۶ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶۔ لکھائی، چھپائی کاغذ خوشنما۔ قیمت ۴ر

عرب کے معجز بیان کی چالیس حدیثیں مولانا جامی کی منتخب کی ہوئی اور اُن کے منظوم ترجمے کے ساتھ۔ ایسا دینی تبرک اور ایسی ازلی دولت ہر مسلمان اور ہر شائق ادب کے لیے زر و جواہر سے زیادہ قیمتی ہے۔ شرف الدین احمد خاں صاحب نے اُردو میں بہت عمدہ ترجمہ کر کے اِس کے فیض کے دائرے کو اور وسیع کر دیا ہے۔

سہات الصرف والنحو (مؤلفہ حکیم شیخ عبدالوحید صاحب ندوی شائع کردہ شبلی بک ڈپو، لکھنؤ۔ حجم ۳۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ ، لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ۲ر)۔

افعال کی خاصیتیں خوبی اور اختصار سے سمجھائی گئی ہیں۔ آخر میں نحو کی اصطلاحات کی ایک فرہنگ ہے۔ عربی کے طلبہ کے لئے مفید چیز ہے۔

مبادی نباتات | (از مگوہن لال صاحب چترویدی ۔ حجم ۱۰۳ صفحہ ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ چھپائی معمولی، کاغذ اوسط درجے کا قیمت عہ ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد روڈ ۔ لاہور) ۔

نباتیات کے ابتدائی مسائل سہل اور سلیس عبارت میں سمجھائے گئے کو واضح کرنے کے لئے سادی تصویریں بھی دی گئی ہیں ۔ نہ صرف طلبہ کے شائقین علم کے لئے مفید چیز ہے ۔

کتاب کا نام مبادی علم نباتات یا مبادی نباتیات ہوتا تو اچھا تھا

شذرات

افسوس ہے کہ رسالہ کو وقت پر لانے میں اتنی جلدی نہیں ہوسکتی جتنی ہم چاہتے ہیں
پھر بھی اُمید ہے کہ اگست سے ہر مہینہ کا رسالہ اُسی مہینہ میں شائع ہونے لگے گا۔ انشاء اللہ

کارکنان جامعہ ملیہ کی تجویز ہے کہ آئندہ سال اپنے معلمین کی دلچسپی اور فائدے کے لئے ماہرین تعلیم کے لکچروں کا انتظام کریں۔ مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے پرنسپل صاحب اور دوسرے اساتذہ نے ازراہ عنایت وعدہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً خود تشریف لاکر لکچر دیا کریں گے اور ہر طرح سے اس تجویز کو کامیاب بنانے میں مدد دیں گے۔ ابھی پروگرام مرتب نہیں ہوا جب ہو جائے گا تو جامعہ اور پیام تعلیم میں شائع کر دیا جائے گا۔

امیر امان اللہ خاں کا افغانستان کے تخت سے دست بردار ہو کر یورپ چلا جانا نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام ایشیا والوں کے لئے صدمے اور عبرت کا باعث ہے۔ امیر صاحب کی نسبت بدقسمتی سے پچھلے دنوں یہ خیال قائم ہوگیا ہے اور قائم کرایا گیا ہے کہ اُن کی زندگی کے سارے کارنامے مغربی تہذیب کی اوچھی تقلید تک محدود ہیں اور اب کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ افغان قوم نے دینی جوش اور قومی غیرت سے کام لے کر اُس شخص کو جو اُن کے دین کو ضعیف اور اُن کے شعار قومی کو معدوم کرنا چاہتا تھا ملک بدر کر دیا ہے اور اب وہ امیر حبیب اللہ کے زیر حکومت سچی اسلامی زندگی بسر کریگی۔
جو لوگ یہ خیالات رکھتے ہیں اور دوسروں میں پھیلاتے ہیں اُن کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض جان بوجھ کر اپنے ذاتی فائدے یا ملکی مصالح کی خاطر سچائی کا خون کرتے ہیں

بعض نیک نیتی اور سادہ لوحی سے سنی سنائی باتوں پر بے سمجھے بوجھے ایمان لے آئے ہیں اور بعض صحیح واقعات کا علم رکھنے کے باوجود اپنی تنگ نظری اور تاریک خیالی سے نتیجے اُلٹے نکالتے ہیں۔

... ...

لیکن جو شخص ذاتی اغراض سے پاک ہے اور تھوڑی سی سمجھ اور وسعت نظر رکھتا ہے وہ افغانستان کے حالات پر نظر ڈالتے ہی یہ رائے قائم کریگا کہ امان اللہ خاں کی ذات اُن کی قوم کے لئے بہت بڑی نعمت تھی جسے کھوکر وہ بہت جلد پچھتائے گی۔ امیر صاحب کا یورپ کی ظاہری زندگی کی تقلید پر اس قدر زور دینا بجائے خود قابل اعتراض ہو لیکن اس کی وجہ سے اُن کی گراں قدر قومی اور ملکی خدمت کو یک قلم فراموش کردینا انتہائی بے ایمانی، یا تعصب، یا جہالت ہے۔

... ...

یورپ کی تقلید کا مسئلہ بہت طویل بحث کا محتاج ہے۔ اس وقت ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ ہمیں اس وقت دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ایک تو یہ کہ یورپ کے لباس وغیرہ کا رائج کرنا امیر امان اللہ خاں کے کام کا صرف ایک پہلو ہے جس سے اُن کی مجموعی خدمات پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ جو قومیں اُنکی مخالف ہیں انہیں دینی جوش یا قومی غیرت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان کی مخالفت کی وجوہ بالکل دوسری ہیں۔

... ...

امیر امان اللہ خاں نے جو مفید اصلاحات اپنے ملک میں کیں اُنکی مختصر فہرست حسب ذیل ہے :-

(۱) صنعت و حرفت کو فروغ دینا۔

(۲) لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیمی ترقی میں انتہائی کوشش کرنا اور طلبہ کو وظیفے دیکر مغربی ممالک اور ٹر کی بھیجنا۔

(۳) باضابطہ اور منظم فوج تیار کرنا۔

(۴) امرا کی قوت کو کم کرکے بادشاہ کی مرکزی حکومت کو مضبوط کرنا اور اس طرح افغانوں کو مختلف جرگوں کے مجموعے کی جگہ ایک قوم بنانے کی کوشش کرنا۔

(۵) اصلاح معاشرت خصوصاً عورتوں کی اصلاح و ترقی کی تدابیر اختیار کرنا۔

... ...

ان میں سے نمبر ۵ کو مابہ النزاع سمجھکر چھوڑ دیا جائے تب بھی ایسی چیزیں باقی رہتی ہیں جن کی بنا پر تاریخ امان اللہ خاں کا شمار افغانستان کے سچے خادموں اور محسنوں اور دنیا کے قابل ترین حکمرانوں میں کریگی۔

... ...

اب رہے ناکامی کے اسباب تو اُن میں سب سے بڑا سبب اُمرا کی غداری ہے جب انہوں نے اپنی دولت اور حکومت کو خطرے میں دیکھا تو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے امیر صاحب کی مخالفت شروع کی اور بھولی بھالی رعایا کو اُن کے خلاف اُبھارنا شروع کیا۔ انہوں نے ایک طرف تو افغانستان کے بیرونی دشمنوں سے اور دوسری طرف اُسکے اندرونی دشمنوں یعنی ملاؤں سے سازباز کرکے اپنی قوت کو اور مضبوط کر لیا۔

... ...

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان لوگوں کو اپنی کوششوں میں خود امیر صاحب کی ناعاقبت اندیشی سے بڑی مدد ملی۔ امیر صاحب نے اصلاحات کے معاملہ میں عجلت اور بیصبری سے کام لیا۔ ملک کی اقتصادی حالت سنبھلنے سے پہلے انہوں نے اس پر اتنا مالی بوجھ ڈال دیا جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ یورپ کی تقلید میں سب سے بڑی غلطی جس کے

ایشیائی ممالک ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ اختلاف حالات پر غور کئے بغیر وہ یورپ والوں کی طرح فضول خرچی پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم کی ترقی کے لئے شاندار مدرسے، روشن خیالی کیلئے بجلی کی روشنی، ذہنی ترقی کے لئے قیمتی سازوسامان ضروری ہے کیونکہ یورپ میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ یورپ نے یہ مرفہ الحالی دوسری قوموں کو لوٹ کر اور غلام بنا کر حاصل کی ہے۔ اس لئے ہم لوگ اس معاملہ میں اسکی ریس نہیں کر سکتے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ مادی فلاح کا موجودہ معیار ذہنی ترقی کا آئینہ نہیں ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ یورپ میں بھی جو قومیں ذہنی دولت سے مالا مال ہیں انہیں دولت دنیا میں دوسروں سے کم حصہ ملا ہے۔

... ...

یہی غلطی امیر امان اللہ خاں سے بھی سرزد ہوئی۔ انہوں نے اپنے اور اپنی قوم کے معیار زندگی کو بڑھانے کی کوشش میں بھاری محصول لگائے اور ان کے وصول کرنے میں سختی کی۔ اس سے ملک میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی جس سے امرا اور ملاؤں نے فائدہ اٹھایا اور چونکہ امیر صاحب نے یورپ سے واپسی کے بعد اصلاح معاشرت میں بہت شدت شروع کردی تھی اس لئے ان لوگوں نے حامئ دین بن کر جہلا کے قدامت پرستانہ جذبات کو ابھارنا شروع کیا۔

... ...

ان سب باتوں کے ملجانے سے ملک میں ایسی آگ لگ گئی جسے امیر امان اللہ خاں نہ بجھا سکے اور آخر انہیں اپنے ملک کو طوائف الملوکی کی حالت میں چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہیں پھر افغانستان کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ افغانستان کے بہی خواہ سوائے اس کے کیا کر سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ سے امیر صاحب کی واپسی ان کی اصلاح اور انکی کامیابی کی دعا کریں۔

سیرۃ نبوی پر مستند و مفید کتابیں

علامہ شبلی مرحوم کی شہرۂ آفاق اور مقتدر تصنیف :-

سیرۃ النبی حصہ اول للعہ حصہ دوم ہے حصہ سوم صہ

سیرۃ نبوی پر مولانا سید سلیمان ندوی کے گرانقدر، بصیرت افروز

خطبات مدراس اور پرکیف آٹھ مفید و موثر لیکچر۔ قیمت عہ

قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی مشہور اور مقبول ترین کتاب

رحمۃ للعالمین حصہ اول عہ حصہ دوم للعہ

سیرۃ خیر البشر - از مولانا محمد علی امیر شریعت احمدیہ لاہور۔ قیمت ۶

علامہ ابن قیم شاگرد رشید امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب زاد المعاد کے اختصار

اسوۂ حسنہ کتاب ہدی الرسول کا اردو ترجمہ از مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی۔ عہ

تذکرۃ المصطفیٰ - از پروفیسر سید نواب علی صاحب پرنسپل جوناگڈھ کالج قیمت عہ

نشر الطیب - از مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی۔ قیمت عہ

لڑکے، لڑکیوں، عورتوں اور عام مطالعہ کے لئے

ہمارے نبیؐ

از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے قیمت عہ

ہمارے رسولؐ

از مولانا خواجہ عبد الحی استاذ جامعہ ملیہ قیمت مہ

سرکار کا دربار

از احمد الیاس صاحب مجیبی قیمت عہ

سیرۃ الرسولؐ

از مولانا محمد اسلم جیراجپوری استاذ جامعہ عہ

مکتبہ جامعہ ملیہ - دہلی

سلسلہ سیر الصحابہؓ پر چند مستند و اعلیٰ پایہ کتابیں

خلفائے راشدین ۔ از مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی ۔ قیمت سے ر

مہاجرین ۔ (حصہ اول) " " " قیمت للعہ ر

اسوۂ صحابہ صحابہ رضؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق و معاشرت کی صحیح تصویر، قرون اولیٰ کے اسلام کا عملی خاکہ، اور صحابہ رضؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل از مولنا عبد السلام ندوی ۔ قیمت حصہ اول و دوم (کامل) ۵ئے

سیر الانصار انصار کرام رضؓ کی مستند سوانح عمریاں اور اُنکے اخلاق اور مذہبی کارنامے ۔ فضائل و کمالات کا سبق آموز مستند تذکرہ ۔ از مولوی سعید صاحب انصاری ۔ قیمت جلد اول و دوم سے ر

سیر الصحابیات ازواج مطہرات، بنات طیبات اور عام صحابیات کی سوانحعمریاں اور انکے علمی و اخلاقی کارنامے ۔ از مولوی سعید انصاری صاحب قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۸ر)

اسوۂ صحابیات صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کا مرقع ۔ از مولنا عبد السلام ندوی ۔ قیمت عہ ر

سیرۃ عمر بن عبد العزیز عمرؓ ثانی حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ اموی کے سوانح حیات اور مجددانہ کارنامے ۔ قیمت عہ ر

سیرۃ عائشہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے سوانح حیات، مناقب و فضائل اور اخلاق، علمی کارنامے اور اجتہادات، اور صنف نازک پر اُنکے احسانات، اسلام کے متعلق اُنکی نکتہ سنجیاں وغیرہ وغیرہ از مولنا سید سلیمان ندوی قیمت ۱۲ئے

ملنے کا پتہ ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ ۔ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم-اے-پی ایچ-ڈی

جلد ۲	بابتہ ماہ مئی ۱۹۲۹ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

(۱)

تمہید

تباہی اور بے رحمی کے جس انتشار میں نوع انسانی نے اب تک دن گزارے ہیں تخیل میں جماعت انسانی کے اس سے بہتر نظام کے تصور کی کوشش کچھ نئی چیز نہیں ہے۔ یہ کہے کم اتنی ہی قدیم ہے جتنا افلاطون جس کی "ریاست" نے بعد میں آنے والے فلسفیوں کی خیالی یوٹوپیا کے لئے نمونہ کا کام دیا۔ جو شخص بھی دنیا کو ایک نصب العین کی روشنی میں دیکھتا ہے ــــ خواہ اُسے جس چیز کی تلاش ہے وہ ذہنیت ہو یا فن، محبت ہو یا سیدھی سادی خوشی و مسرت یا ان سب کا مجموعہ ــــ اُس کے دل کو ان بُرائیوں سے ضرور دُکھ پہنچنا چاہیئے جنھیں انسان بلا ضرورت جاری رہنے دیتا ہے اور اگر یہ زوردار آدمی ہے اور قوت حیات اپنے اندر رکھتا ہے تو ضرور اُس میں یہ شدید آرزو پیدا ہوگی کہ وہ انسانوں کو اس خیر کی تکمیل کی طرف لے جائے جو اُس کے تخلیقی تصور میں ساری ہے۔ یہی آرزو وہ اصلی قوت ہے جس نے اشتراک اور نراج کے ہراولوں کو تحریک دی ہے، جیسے کہ اس سے قبل اسی نے گزشتہ خیالی نظامہائے ریاست کے مخترعین کے لئے محرک کا کام دیا تھا۔ اس میں کوئی بات نئی نہیں۔ اشتراک اور نراج میں جو بات نئی ہے وہ نصب العین کا وہ قریبی تعلق ہے موجودہ مصائب انسانی سے جس نے تنہا فلسفیوں کی اُمیدوں سے طاقتور سیاسی تحریکوں کی پیدائش ممکن کر دی۔ یہ ہے جو اشتراک اور نراج کو اس قدر اہم بناتا ہے اور یہی بات ہے جو انھیں ان لوگوں کے لئے خطرناک بناتی ہے جو جان کر یا بے جانے موجودہ نظام جماعت کی بُرائیوں پر پل رہے ہیں۔

معمولاً مرد عورتوں کی بڑی اکثریت زندگی سے خود اپنے حالات یا اور ساری دنیا کی حالت پر بہ حیثیت کلی غور یا تنقید کئے بغیر گزر جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ جماعت میں کسی خاص جگہ پر پیدا ہوئے ہیں اور ہر نیا دن اپنے ساتھ جو کچھ لاتا ہے اُسے قبول کر لیتے ہیں بلا اس کے کہ محض وقتی ضرورت سے آگے اپنے خیال کو ذرا بھی کام میں لائیں۔ کم و بیش کھیت کے مویشیوں کی طرح جبلی طور پر یہ بس آنی ضروریات کی تسکین چاہتے ہیں، بلا پیش بینی اور بلا اس بات پر دھیان دئے ہوئے کہ کافی کوشش سے ان کی زندگی کے سارے حالات بدل سکتے ہیں۔ ان میں سے فی صدی چند ذاتی حوصلہ کے اثر سے خیال اور ارادہ کی وہ سعی گوارا کرتے ہیں جو انہیں جماعت کے زیادہ خوش نصیب اراکین میں شامل ہونے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ان میں سے بہت ہی کم کو اس سے سروکار ہوتا ہے کہ جو فائدے یہ خود اپنے لئے ڈھونڈتے ہیں وہ دوسروں کے لئے بھی مہیا کریں۔ بس چند ہی کمیاب اور غیر معمولی آدمی ایسے ہوتے ہیں جنہیں ساری نوع انسانی سے وہ محبت ہوتی ہے جو انہیں برائی اور فلاکت کے مجموعہ کو صبر سے برداشت نہیں کرنے دیتی بلا لحاظ اس کے کہ اس کو خود ان کی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ یہ چند لوگ ہمدردانہ دکھ کے اثر سے پہلے اپنے خیال میں اور پھر عمل میں رہائی کی کوئی راہ ڈھونڈتے ہیں، جماعت کا کوئی ایسا نظام جس سے زندگی زیادہ مالا مال، خوشیوں سے زیادہ پُر، اور بہ مقابلہ حال قابل اصلاح برائیوں سے کم ملو ہو۔ لیکن زمانہ گزشتہ میں یہ حضرات خود اُن لوگوں میں اپنے خیالات سے دلچسپی نہیں پیدا کرا سکے جو ان ناانصافیوں کا شکار رہتے جنکی اصلاح کی انہیں خواہش تھی۔

آبادی کے زیادہ بد نصیب حصے جاہل تھے، مشقت اور تکان کی زیادتی سے بے حس، ارباب قوت کے ہاتھوں فوری سزا پانے کے ڈر سے بزدل اور دبو، اور اپنی تذلیل کے باعث احساس نفس کھو کر اخلاقاً ناقابل اعتماد۔ ان طبقوں میں عام بہبودی کے لئے کسی جانی بوجھی، بالارادہ کوشش کا پیدا کرنا ایک ناممکن کام معلوم ہوتا ہوگا اور حقاً تھا پچھلے زمانہ میں ہونا ایسا ہی

نہایت ہی بڑھا۔ لیکن تعلیم کی فراوانی اور مزدوروں میں معیارِ آرام کے بلند ہو جانے سے موجودہ دنیا میں ایسے نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں جو بالکل بنیادی تعمیرِ نو کے مطالبہ کے لئے پہلے سے بہت زیادہ موافق ہیں۔ سب سے زیادہ تو اشتراکی اور ان سے کم درجہ پر نراجی (خصوصاً وہ لوگ جو پیشہ وارانہ پنچایت بندی کے حامی ہیں) اس مطالبہ کے حامل بن گئے ہیں۔

اشتراک اور نراج دونوں کے متعلق سب سے زیادہ قابلِ غور بات شاید یہ ہے کہ ایک بہتر دنیا کے نصب العین کے ساتھ وسیع عام تحریکیں منسوب ہیں۔ یہ نصب العین اوّل اوّل کتابوں کے گوشہ نشین مصنفوں نے ترتیب دیئے اور تاہم مزدور طبقہ کے طاقتور حصوں نے دنیا کے عملی معاملات میں انہیں اپنا راہنما تسلیم کیا۔ اشتراک کے بارہ میں تو یہ صورت بالکل ظاہر ہے، البتہ نراج کا جہاں تک تعلق ہے یہ بات صرف کچھ تبدیلی کے بعد صحیح کہی جا سکتی ہے۔ نراج بجائے خود کبھی زیادہ پھیلا ہوا مذہب نہیں رہا صرف پنچایت بندی کی تبدیل شدہ شکل میں اسے ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے۔ برخلاف اشتراک اور نراج کے پنچایت بندی اصلاً کسی نصب العین کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک نظام کا۔ اہلِ حرفہ کی جماعت بندی کا نظام پہلے قائم ہوا اور پنچایت بندی کے خیالات دراصل وہ خیالات ہیں جو زیادہ ترقی یافتہ فرانسیسی جماعتوں کے نزدیک اس نظام کے لئے مناسب تھے۔ لیکن زیادہ تر یہ خیالات نراج سے لئے گئے ہیں، وہ لوگ جنہوں نے ان خیالات کے لئے قبولیت حاصل کی زیادہ تر نراجی تھے چنانچہ ہم پنچایت بندی کو بازاری نراج خیال کر سکتے ہیں جو ان مختلف تنہا افراد کے نراج سے الگ ہے جس نے پچھلے زمانہ میں بڑی غیر یقینی اور ڈانواڈول زندگی گزاری تھی۔ اس خیال کی رو سے ہم نراجی پنچایت بندی میں بھی نصب العین اور تنظیم کا ویسا ہی مجموعہ پاتے ہیں جیسا کہ اشتراکی سیاسی جماعتوں میں۔ چنانچہ ہم اسی نقطۂ نظر سے ان تحریکوں کا مطالعہ کریں گے۔

اپنی موجودہ شکل میں اشتراک اور نراج دو شخصوں سے شروع ہوتے ہیں یعنی مارکس اور باکونین جو ساری عمر باہم برسرِ پیکار رہے اور جن کا انجام بالآخر پہلی انٹرنیشنل کا افتراق تھا

ہم پہلا مطالعہ انہیں دو شخصوں سے شروع کریں گے! پہلے ان کی تعلیم اور پھر وہ جماعتیں جو انہوں نے قائم کیں یا جن پر ان کا اثر تھا۔ اسکے بعد ہم زمانہ حال میں اشتراک کی اشاعت کا ذکر کریں گے اور پھر اشتراک نے ریاست اور سیاسی کاروائی پر جو زور دیا تھا اُس کے خلاف پنچایت بندی کی بغاوت کا اور نیز بعض ان تحریکوں کا جو فرانس کے باہر رونما ہوئیں لیکن جنہیں پنچایت بندی کی تحریک سے کچھ تعلق ہے — خصوصاً امریکہ کی تحریک "صنعتی کارکنانِ عالم" (I.W.W.) اور انگلستان کا پیشہ وارانہ اشتراک۔ اس تاریخی تبصرہ کے بعد ہم مستقبل کے بعض ضروری مسائل پر نظر ڈالیں گے اور فیصلہ کرنے کی کوشش کریں گے کہ اگر اشتراکی یا پنچایت بندی کے مقاصد حاصل ہو جائیں تو دنیا کو کن کن باتوں کے اعتبار سے خوشی نصیب ہوگی۔

میری ذاتی رائے — جس کا اظہار بہتر ہے کہ میں شروع ہی میں کر دوں — یہ ہے کہ اگرچہ خالص نراج ہمارا آخری نصب العین ہونا چاہیے جس سے قریب تر ہونے کی کوشش جماعت انسانی کو دائمی طور پر جاری رکھنی چاہیے تاہم یہ فی الحال ناممکن ہے اور اگر اسے اختیار کیا گیا تو زیادہ سے زیادہ ایک یا دو سال سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتا۔ برخلاف اس کے میرے نزدیک باوجود بہت سے نقائص کے اشتراک اور پنچایت بندی سے ایک ایسی دنیا کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے جو اس دنیا سے بہتر اور خوشتر ہوگی جس میں ہم لوگ زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن میں ان میں سے کسی کو بھی بہترین قابل عمل نظام نہیں مانتا۔ مارکسی اشتراک سے مجھے ڈر ہے کہ یہ ریاست کو بہت زیادہ قوت دیدیگا اور پنچایت بندی جو ریاست کو مٹانا چاہتی ہے یہ میں سمجھتا ہوں کہ مختلف پیشہ وار گروہوں کی رقابت کو ختم کرنے کے لئے ایک مرکزی قوت (یا اختیار) کی از سر نو ترتیب پر مجبور ہوگی۔ بہترین قابل عمل طریقہ میرے نزدیک پیشہ وارانہ اشتراک کا ہے جو ریاست والے اشتراکیوں کے مطالبات و پنچایت بندی والوں کی مخالفت ریاست دونوں کی معقول بات کو یوں تسلیم کرتا ہے کہ مختلف حرفوں میں ایک نظام اتحادی اختیار کرتا ہے۔ حرفوں کے مابین اس نظام اتحادی کی موافقت بعینہٖ وہی وجوہ ہیں جو قوموں کے مابین اس تحریک کو پیش پیش کر رہے ہیں۔ ان

نتائج کے وجوہ جوں جوں ہم آگے بڑھینگے واضح ہوتے جائیں گے۔

بنیادی تعمیر نو کی جدید تحریکوں کی تاریخ شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان خصوصیات سیرت پر نظر ڈالی جائے جو اکثر سیاسی پیشواؤں کو ممتاز کرتی ہیں اور جن کے متعلق علاوہ تعصب کے اور بعض دیگر وجوہ سے بھی بڑی غلط فہمی ہوتی ہے۔ میں ان وجوہ کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہوں تاکہ یوں اور بھی مؤثر طور پر بتا سکوں کہ انہیں کیوں اس معاملہ میں دخل نہ ہونا چاہیئے۔

زیادہ ترقی یافتہ تحریکوں کے پیشوا اکثر نہایت غیر معمولی بے نفسی کے لوگ ہوتے ہیں جیسا کہ اُن کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ان میں اتنی ہی قابلیت ہوتی ہے جتنی کہ اکثر ان لوگوں میں جو بڑے اقتدار کی جگہیں حاصل کر لیتے ہیں تاہم یہ خود واقعات عصر کے حَکَم نہیں بنتے، نہ دولت حاصل کرتے ہیں اور نہ اپنے انبوہ معاصرین کی مدح سرائی۔ یہ لوگ جنہیں ان انعامات کے حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اور جو کم از کم اتنا ہی کام کرتے ہیں جتنا کہ ان انعاموں کے حاصل کرنے والے لیکن پھر بھی جان بوجھکر ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جس سے ان کا حصول ناممکن ہو جائے ان کے متعلق ضرور یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ اپنی زندگی کے لئے ذاتی ترقی کے علاوہ کوئی اور مقصد رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انکی زندگی کی جزویات میں نفس پرستی کا بھی کچھ میل ہو مگر اس زندگی کا محرک اصلی یقیناً ان کے نفس سے باہر کوئی چیز ہے۔ اشتراک، نراج اور پنچایت بندی کے ہراولوں نے قید، جلاوطنی اور افلاس کی تکلیفیں سہی ہیں اور جان بوجھکر کیونکہ یہ اپنی تبلیغ سے باز نہیں آنا چاہتے تھے۔ اپنے اس رویہ سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ جو امید انہیں سہارا دیتی تھی وہ خود اُن کی ذات کے لئے نہ تھی بلکہ نوع انسانی کے لئے۔

ہر چند ان لوگوں کی زندگی کی تہ میں زیادہ تر انسانی فلاح کی خواہش ہی کیوں نہ ہو اکثر یہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریر و تقریر کی جزویات میں محبت کے مقابلہ میں نفرت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ بے صبر مثالیت پسند۔ اور بلا تھوڑی سی بے صبری کے انسان مشکل ہی سے مثالیت پسند ثابت ہو سکتا ہے۔ جب دنیا کو مسرت و خوشی دینے کی کوشش میں مخالفت اور مایوسیوں سے دوچار ہو

ہ تو یہ چیزیں تقریباً یقینی طور پر اسے نفرت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اسے اپنی خلوص نیت اور اپنی تعلیم
کے حق ہونے کا جس قدر یقین ہوتا ہے اُسی قدر اس غلط تعلیم پر یہ برافروختہ ہوگا۔ عوام کی
بے توجہی اور حالات موجودہ کے حامیوں کی ملی مخالفت کی طرف سے تو یہ اکثر کامیابی کے ساتھ
ایک فلسفیانہ رواداری کا رویہ اختیار کرے گا، لیکن اُن لوگوں کو وہ ہرگز معاف نہیں کر سکتا جو
اجتماعی بہبود کی خواہش کے اُسی طرح دعویدار ہیں جیسے یہ خود لیکن اس مقصد کے حصول
کے لئے اس کے طریقہ کو قبول نہیں کرتے۔ اس کا وہ شدید یقین جو اُسے اپنے عقاید کی خاطر
تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے وہی اس کی نظر میں ان عقاید کو اس درجہ روشن و
بین ثابت کرنے دیتا ہے کہ اس کے خیال میں ہر سمجھدار آدمی جو انہیں رد کرے لازماً بے ایمان ہو اور نیک
سے مقصد کے خلاف دغا کرنا چاہتا ہے۔ یہاں سے تراوش کرتی ہے فرقہ بندی کی روح،
وہ تلخ و تنگ اذعانیت جو غیر مردم عزیز عقیدے میں غلو کرنے والوں پر ایک عذاب کی طرح مسلط
ہو جاتی ہے۔ دغابازی کے لئے واقعی اتنی لالچیں موجود ہوتی ہیں کہ شبہ کرنا بالکل فطری بات
ہے۔ اور قاید جس جاہ پرستی کو اپنی راہ زندگی کے انتخاب میں دبا دیتے ہیں وہ ضرور دوسری شکل میں
رونما ہوتی ہے یعنی فرقہ کے اندر ذہنی اقتدار اور استبدادی طاقت کی خواہش کی شکل میں۔ ان
اسباب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنیادی اصلاح کے حامی مختلف مخالف گروہوں میں تقسیم ہو جاتے
ہیں جن میں باہم نہایت تلخ نفرت ہوتی ہے، جو ایک دوسرے پر اس قسم کے الزام لگاتے ہیں
کہ پولیس کا تنخواہ دار ہے، جس مقرر یا مصنف کی یہ تعریف کریں اُس سے مطالبہ ہوتا ہے
کہ ان کے تعصبات کی من وعن مطابقت کرے اور اپنی ساری تعلیم کو اُن کے اس عقیدہ کا
عین بنائے کہ اصلی حقیقت صرف ان کے مذہب کی حدود ہی میں مل سکتی ہے۔ اس کیفیت
کانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ
جنہوں نے نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے کے لئے سب سے زیادہ قربانی کی ہے بہت سے
زیادہ نفرت کے مستحق ہیں۔ اور اذعانیت کا مطالبہ ذہن کے آزادو فعل کے لئے گویا موت

ہی۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ معاشی تعصبات کے باعث ارباب فکر کے لئے یہ بات مشکل ہے کہ ان انتہا پسند مصلحین کا اعتراف دے سکیں چاہے انہیں ان کے خاص مقاصد سے اور خود ان کے لائحۂ عمل کے دس میں نو حصوں سے کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ ہو۔

ایک اور سبب جس کی وجہ سے عام لوگ ان بنیادی مصلحوں پر غلط حکم لگاتے ہیں یہ ہے کہ یہ موجودہ نظام جماعت کو باہر سے دیکھتے اور اس کی رسوم کی طرف مخالفانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ اکثر انہیں اپنے ہمسایوں کے مقابلہ میں اصلاح و ترقی کے لئے فطرت انسانی کی واقعی صلاحیت پر زیادہ یقین ہوتا ہے تاہم یہ موجودہ رسوم سے پیدا ہونے والی بے رحمی اور تشدد کا اس درجہ احساس رکھتے ہیں کہ دوسرے پر یہ بالکل غلط اثر پڑتا ہے کہ یہ لوگ نیکی سے بیزار ہیں۔ اکثر انسان عام رویہ کے دو مختلف قانون رکھتے ہیں۔ ایک اُن کے لئے جنہیں یہ ساتھی یا ہمسر یا دوست یا اور کسی طرح "اپنے گلہ" سے متعلق سمجھتے ہوں اور دوسرا اُن کے لئے جنہیں یہ دشمن یا ذات باہر یا جماعت کے لئے خطرہ جانتے ہوں۔ بنیادی مصلح اکثر اپنی تمام تر توجہ جماعت کے اس رویہ پر مجتمع کر دیتے ہیں جو یہ مؤخر الذکر طبقہ کے ساتھ رکھتی ہے یعنی وہ طبقہ جس کے ساتھ "گلہ" بد ظنی رکھتا ہے۔ اس طبقہ میں جنگ کرنے والے دشمن بھی شامل ہوتے ہیں اور مجرم بھی۔ ان لوگوں کے ذہن میں، جو موجودہ نظام کا قیام اپنی سلامتی اور اپنے ذاتی حقوق کے لئے لازمی جانتے ہیں، اس طبقہ میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو کسی بڑی معاشی یا سیاسی تبدیلی کے حامی ہوں نیز وہ ساری جماعتیں جن میں اپنے افلاس یا کسی اور وجہ سے خطرناک درجہ تک بے چینی کے احساس کا احتمال ہو۔ معمولی شہری غالباً شاذ و نادر ہی ایسے افراد یا طبقوں پر دھیان کرتا ہے اور زندگی بھر یہ یقین کر کے گزار دیتا ہے کہ وہ خود اور اس کے احباب بھلے آدمی ہیں کیونکہ یہ کسی کو جس سے جماعت کو مخالفت نہ ہو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ لیکن جس شخص کے پیش نظر ان لوگوں کی مصیبتیں ہیں جن سے یہ گروہ نفرت کرتا اور ڈرتا ہے وہ تو بالکل دوسرا حکم لگائے گا۔ ان تعلقات سے حیرت خیز سنگ دلی پیدا ہو سکتی ہے اور فطرت انسانی کا ایک نہایت بدنما پہلو نمودار ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے مخالف بعض اوقات

کے مطالعہ سے دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داروں اور ریاست نے مزدوروں کے طبقہ کے ساتھ اکثر یہ سفاکی برتی ہے خصوصاً جب کبھی انہوں نے اس ناقابل بیان مصیبت کے احتجاج کی جرات کی ہے جس میں موجودہ نظام صنعتی نے انہیں عموماً ڈال دیا ہے۔ چنانچہ معمولی کھاتے پیتے شہری کا جو رویہ موجودہ نظام جماعت کی طرف ہے اُس سے بالکل مختلف صورت یہاں پیدا ہوگئی ہے۔ یہ رویہ اتنا ہی صحیح ہوتا ہے جتنا کہ اول الذکر کا، شاید اُسی قدر غلط بھی لیکن اسی طرح واقعات پر مبنی۔ البتہ اس کی بنا اُن واقعات پر ہوتی ہے جن میں جماعت کے تعلقات دوستوں کے ساتھ نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

قوم کے طبقوں کی جنگ خود قوموں کی جنگ کی طرح دو مخالف خیال پیدا کرتی ہے اور یہ دونوں یکساں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ ایک مشغول جنگ قوم کا شہری جب اپنے ہم وطنوں کا خیال کرتا ہے تو زیادہ تر اس حیثیت سے خیال کرتا ہے جس میں اسے ان کا تجربہ ہوا ہے یعنی دوستوں سے برتاؤ، خاندان سے تعلقات وغیرہ کے اعتبار سے۔ یہ اسے مجموعی طور پر نیک اور بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن جس قوم سے اس کا ملک برسر جنگ ہے وہ اس کے ہم وطنوں کو بالکل مختلف تجربوں کی روشنی میں دیکھتی ہے: جیسے یہ جنگ کی سفاکی، مخالف علاقوں پر حملہ و تسلط، یا سیاسی بازیگری کے ہتھکنڈوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جن انسانوں کے متعلق یہ باتیں صحیح ہیں وہ وہی لوگ ہیں جنہیں ان کے ہم وطن شوہر، باپ یا دوست کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن اسکے متعلق بالکل دوسری رائے اس لئے قائم کی جاتی ہے کہ حکم لگانے کی بنیاد بالکل دوسری ہے چنانچہ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو سرمایہ دار کو انقلاب جو مزدور کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ سرمایہ دار کے خلاف بے حد سخت اور غلط حکم لگاتے ہیں کیوں کہ جن واقعات پر انہوں نے اس کے متعلق اپنی رائے قائم کی ہے وہ ایسے واقعات ہیں جنہیں یہ یا تو جانتا نہیں یا عادتاً نظر انداز کر دیتا ہے۔ تاہم رائے جو باہر سے قائم کی جاتی ہے اتنی ہی صحیح ہے جتنی وہ رائے جو اندر سے قائم کی جائے۔ کامل ... کے لئے دونوں ضروری ہیں۔ اور وہ اشتراکی جو خارجی رائے پر زور دیتا ہو دنیا کی بہتری نہیں بلکہ محض

مزدوروں کا ہمدرد ہے جو اس غیر ضروری مصیبت کے منظر سے پراگندہ دماغ ہو گیا ہے جو سرمایہ داری کی بدولت ان مزدوروں پہ پڑتی ہے۔

میں نے یہ عام ملاحظات اپنے مطالعہ کے شروع میں اس لئے رکھ دئے ہیں تاکہ یہ مضمون واضح کردوں کہ ہم جن تحریکوں کی تحقیق کرنے والے ہیں ان میں کتنی ہی تلخی اور نفرت کیوں نہ پائی جائے ان کا اصلی سرچشمہ تلخی و نفرت نہیں بلکہ محبت ہے۔ اپنے محبوب کو عذاب و تکلیف پہنچانے والے سے نفرت نہ کرنا بہت دشوار ہے لیکن دشوار ہی ہے، ناممکن نہیں، البتہ اس کے لئے ضرورت ہے ایک ایسی وسعت نظر اور ذہن کی ایسی ہمہ گیری کی جس کا قائم رکھنا شدید مقابلہ و مجادلہ کی حالت میں آسان کام نہیں۔ اگر اشتراکی اور نراجی معقولیت تام قائم نہیں رکھ سکے ہیں تو وہ اس بارہ میں اپنے مخالفوں سے کچھ مختلف نہیں اور اپنے خیالات کے سرچشمہ کے اعتبار سے انہوں نے اپنے کو ان لوگوں سے افضل ثابت کیا ہے جو لاعلمی یا کاہلی کے باعث ان ناانصافیوں اور ظلموں کو تسلیم کرتے ہیں جن سے موجودہ نظام قائم ہے۔

(باقی آئندہ)

عربوں کا تمدن

رسالہ معارف کی پچھلی اشاعت میں ڈاکٹر لی بان کی کتاب "عربوں کا تمدن" کا ایک طویل
نامہ شائع ہوا ہے۔ سترہ اٹھارہ صفحے کا مضمون، شروع سے لیکر آخر تک نکتہ چینیوں سے پُر
ہوا کہ ایک معمولی سی بات کے لئے جناب "تنقید نگار" نے اس قدر زحمت کیوں اٹھائی۔
کا تمدن" کوئی محققانہ یا تنقیدی تصنیف تو تھی نہیں۔ اس کے متعلق شروع ہی میں عرض کر دیا
ا کہ یہ عربی تمدن پر ایک مختصر مگر دلچسپ رسالہ ہے جس میں بہت کم باتیں قابل اعتراض ہیں
ید نگار صاحب اگر اس بات کو سمجھ لیتے تو معاملہ اس قدر طول نہ کھینچتا۔

لیکن تنقید نگار صاحب مصنف اور مترجم دونوں سے خفا ہیں۔ مصنف سے اس لئے کہ
نے دیدہ و دانستہ غلط بیانیوں سے کام لیا اور مترجم سے اس لئے کہ اُس نے مصنف کو ان
یانیوں پر مناسب تنبیہ نہیں کی بلکہ اپنے جوش خوش اعتقادی میں یہاں تک لکھ دیا کہ "سوائے
دو بات کے ساری کتاب مصنف کی دقت نظر، اصابت رائے اور وسیع الخیالی کا ثبوت ہے"
مصنف نے جا بجا واقعات میں رنگ آمیزی کی ہے، غلط قیاسات اور تدلیس سے کام لیا ہے
کتاب کے دوسرے باب کی تو ایک ایک سطر میں "زہر" بھرا ہے۔ بدقسمتی سے مترجم کو
یہ و تنقید کا کوئی خاص شوق تھا نہ یہ مناسب معلوم ہوتا تھا کہ جناب ناقد کی طرح مصنف کے
ن کی جائز و ناجائز تاویل سے خواہ مخواہ تنبیہ کا موقع پیدا کیا جائے۔ ہماری رائے میں یہ طرز عمل
ت زیادہ مستحسن نہیں اس لئے کہ جو لوگ دوسروں کی عیب جوئی کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں وہ
ی ہی تنگ نظری اور خوئے اعتراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے غلط
۔ جناب ناقد کے تمام اعتراضات پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انہوں نے حسن
یان کی غلط ترجمانی کی ہے۔ البتہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے ان کا مطلب کیا تھا؟

کہ ایسا کرنے میں نہ تو انھوں نے کوئی علمی خدمت سرانجام دی ہے اور نہ اپنی معارف پروری کا کوئی بہتر ثبوت پیش کیا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں تھی لیکن ہمارے تنقید نگار صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو "مستشرقانہ فضیلت" کے سرے ہی سے قائل نہیں۔ فرماتے ہیں:-

"کتاب کے پہلے باب میں جغرافیۂ عرب، عرب کی قدیم مشہور حکومتوں ...... کا تذکرہ ہے ...... عربوں کی ان مختلف حکومتوں کے زمانۂ عروج کی تعیین ارباب تاریخ و ماہرین کتبات کا ایک مستقل موضوع رہا ہے اور اس کے متعلق اہل علم کے مختلف نظریے معروف ہیں۔ اس موقع پر اگر مصنف نے اپنے دیگر ہم وطن جرمن ماہرین آثار و کتبات کے نظریوں کو اختیار کیا ہے تو کوئی حیرت انگیز امر نہیں (حیرت انگیز امر یہ ہے کہ آپ نے اپنے نظریوں کا اظہار نہیں فرمایا۔ نیازی) لیکن اس موقع پر مصنف کے اس نظریے پر خاص توجہ کی ضرورت تھی کہ عربوں میں فقدانِ وحدت اور ایک قوم ہونے کے نہ (۱) احساس رکھنے سے یہ نتیجہ کیونکر اخذ ہوتا ہے کہ ان میں اطاعت و فرمانبرداری کا مادہ موجود نہ تھا (محض اس لئے کہ یہ ایک مستشرق کا خیال ہے۔ نیازی) یہاں تک کہ وہ اپنے سرداروں کی اطاعت بھی نہیں کرتے (مصنف نے کہیں یہ نہیں لکھا۔ نیازی) پھر مصنف نے اپنے اسی نظریے سے (جناب ناقد کے نزدیک۔ نیازی) آگے چلکر (یعنی دوسرے باب میں نیازی) یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے ان میں اسی وصف کو پیدا کرکے اپنی اشاعت کی (گویا یہ خیال غلط ہے کہ اسلام نے عربوں میں اطاعت و فرمانبرداری کی روح پیدا کی۔ نیازی) حالانکہ عربوں کا اپنے سرداروں کی اطاعت ایک نمایاں وصف کے طور پر مخصوص شیوہ سمجھا جاتا ہے۔ عہدِ جاہلیت کا وہ زمانہ جو اسلام سے قریب تر تھا اس میں ان کے فقدانِ وحدت اور ایک قوم ہونے کے نہ (۱) احساس رکھنے سے اگر کوئی نقص تھا تو یہ تھا کہ حکومت کے فرائض کسی مرکزی شخصیت یا جماعت کے سپرد ہونے کی بجائے قبائل کے سرداروں کے ہاتھ میں تھے اور اُس وقت حکومت کی کوئی تشکیل نہیں تھی

(بہت خوب! حکومت کی کوئی تشکیل ہی نہیں تھی اور حکومت کے فرائض سرداران قبائل کے ہاتھ میں تھے۔ نیازی) ورنہ جہاں تک سرداروں کے اقتدار کا تعلق ہے وہ اپنے قبائل کے ایک ایک فرد پر مطلق العنان حاکم تھے اور بچہ بچہ ان کی اطاعت پر تیار رہتا۔ اسلئے اگر واقعی آنحضرت صلعم کے پیش نظر دعوت اسلام پیش کرتے وقت بقول مصنف کسی متحدہ حکومت کا خاکہ ہوتا (نہ مصنف نے کہیں یہ کہا ہے کہ دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرت صلعم کا یہ مقصد تھا نہ وہ تنقید نگار صاحب کی "متحدہ حکومت" کا مطلب سمجھتا ہے۔ نیازی) تو آنحضرت صلعم غلاموں، لاوارثوں اور غربا میں دعوت اسلام پیش فرمانے کی بجائے (آنحضرت صلعم نے امیر وغریب کسی کو اپنی دعوت سے محروم نہیں رکھا۔ نیازی) سرداران عرب کو اتحاد باہمی کی دعوت دے کر کسی ایک نقطے پر جمع فرماتے (یہ "کوئی ایک نقطہ" خود بخود کہاں سے آجاتا؟ نیازی) اور نہایت آسانی سے متحدہ عربی حکومت کی بناڈال سکتے تھے خصوصاً جبکہ قبائل عرب پر خاندان عبدالمطلب کو ایک عام تفوق حاصل تھا اور عبدالمطلب واقعہ فیل میں عرب کی (عرب کی؟ نیازی) رہنمائی کر چکے تھے (تنقید نگار صاحب کو یقین ہے کہ سرداران عرب بغیر کسی مزاحمت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کو قبول کر لیتے اور چونکہ ہر سردار اپنے قبیلے کا مطلق العنان حاکم تھا اس لئے بغیر کسی سیاسی اور ذہنی انقلاب کے تمام عرب میں "متحدہ عربی حکومت" قائم ہو جاتی۔ نیازی)۔

یہ نتائج صرف تنقید نگار صاحب کے قائم کردہ ہیں، مصنف کی تحریر سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ ہم قارئین کرام کی توجہ کتاب کی اصلی عبارت کی طرف منعطف کرائیں گے:۔

"عربوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ وحدت قومی کا خیال ہے۔ ان کو خاندان اور قبیلے کا وجود تو نظر آتا تھا لیکن ایک قوم ہونے کا احساس نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان میں یہ نقص تھا کہ ان میں اطاعت کا مادہ موجود نہیں تھا (یعنی اسی ایک قوم ہونے کے سلسلے میں۔ نیازی) ان کے اندر کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ اطاعت ضروری ہے بلکہ بعض موقعوں پر ایک طرح کی

قوبی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا تھا جس کی وہ عزت و احترام بھی کرتے تھے لیکن نہ کسی سردار کو حکومت کرنے کا حق حاصل تھا نہ ان کی اطاعت کرنا کسی کا فرض تھا۔" (صفحہ ۲۰)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کو صرف عربوں کی سیاسی پستی کی طرف اشارہ کر: تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر فرد قبیلہ کو اپنے سردار سے جو تعلق تھا وہ کسی سیاسی، پر مبنی نہیں تھا۔ نہ وہ اس وسیع مفہوم میں انضباط جماعت اور اطاعت کی خوبیوں سے آشنا۔ تنقید نگار صاحب کے نزدیک ان میں یہ سب اوصاف موجود تھے البتہ "ایک قوم ہونے احساس رکھنے سے ان میں کوئی نقص تھا تو یہ تھا کہ حکومت کے فرائض کسی مرکزی شخصیت کے سپرد ہونے کی بجائے سرداران قبائل کے ہاتھ میں تھے" حقیقت تو یہ ہے کہ عربوں قسم کے سیاسی اور اجتماعی ادارات کا احساس ہی نہیں تھا ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں تک قو عصبیت کا تعلق ہے مصنف کو اس سے انکار نہیں۔ مصنف نے لکھا ہے "ان میں ایک علاج مخصوصیت پیدا ہو گئی تھی جس کے ماتحت ہر قبیلہ اپنے آپ کو کافی بالذات سمجھتا تھا صفحہ "ابتک وہاں جو عصبیت پائی جاتی تھی اس کا تعلق صرف خاندان سے تھا۔ صفحہ ۲۶"۔ چل کر جہاں مصنف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے (دوسرے باب میں۔ نیازی) کہ نماز کے اثرات سے مسلمانوں میں مساوات انسانی کا احساس پیدا ہوا اور اس سے عرب اطا فرمانبرداری کی خوبیوں سے واقف ہوئے اور اس طرح اس نے اسلام کے مقاصد عا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اسلام کی ابتدا ہی سے یہ خواہش تھی کہ وہ خاندان اور قو کے تنگ رشتوں کو توڑ ڈالے" تو اس سے ناقد صاحب نے محض اس لئے انکار کر دیا کہ ایک مستشرق نے ظاہر کئے ہیں اور اگر انہوں نے خدانخواستہ یہ تسلیم کر لیا کہ اسلام نے عر اطاعت و فرمانبرداری سکھائی، ان میں نظم و انضباط کا مادہ پیدا کیا تو اس سے غالباً یہ لازم آجائیگا کہ "دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرت صلعم کے پیش نظر متحدہ عربی

۔ان کی رائے میں اگر آگے چلکر "متحدہ عربی حکومت" قائم ہوئی تو اس میں رسول اللہ صلعم
خل نہیں تھا۔ بہرحال مصنف نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ "دعوت اسلام پیش کرتے وقت
صلعم کے سامنے "متحدہ عربی حکومت" کا خاکہ موجود تھا" لیکن جس طرح اس "متحدہ
ت کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی اسی طرح یہ بھی پتہ نہ چلا کہ اگر اسلام کی بدولت
یں اطاعت و فرمانبرداری کے اوصاف پیدا ہوئے اور ان سے اسلام کی اشاعت میں
ہوئی تو اس میں کونسی عیب کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے تنقید نگار صاحب جہاد بالقلم
تھے اور بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ اسلام کی حمایت و مدافعت کا فریضہ ادا کر رہے
نہیں اس امر کا مطلق خیال نہیں تھا کہ اپنے استدلالات پر تھوڑا سا غور بھی فرما لیتے۔
تقریباً یہی کیفیت ان اعتراضات کی ہے جو جناب ناقد صاحب نے "عہد رسالت کے
تبصرے" پر فرمائے ہیں۔ افسوس ہے انہوں نے مصنف کی "زہر چکانی" اور مترجم
پر تو اظہار افسوس فرمایا لیکن اپنی مناظرانہ شان کا مطلق خیال نہیں کیا۔ مصنف نے
"چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں وسطی عرب اور اس کے مرکزی علاقہ حجاز میں جہاں
یہ مشتر مذہب پر کوئی غور نہیں کرتا تھا لوگوں کے اندر ایک بہتر مذہب کی جستجو کا شوق
پکا تھا۔ وہ نہ صرف یہودیت اور عیسائیت سے واقف تھے بلکہ ان میں سے بعض ان
کو قبول بھی کر چکے تھے" صفحہ ۴۲ "عرب اور بالخصوص مکہ کے کچھ لوگ اس وقت کے
سے غیر مطمئن ہو کر یہودیت اور عیسائیت میں ہدایت ڈھونڈتے تھے۔ انہوں نے ایک
ابی مذہب قائم کر لیا تھا..... یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلعم کا ظہور ہوا اور لوگوں
کا شمار انہیں متلاشیان حق میں کیا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی" صفحہ ۱۱۔ مصنف کے
مانہ کی انضباطی اور تعلیمی قدر کا اندازہ اس امر سے کرنا چاہئے کہ "اس کا آغاز ان منفرد
ں ہوا..... جن کو اطاعت اور فرمانبرداری کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اگر ہم اتنا خیال
ن سے یہ بات سمجھ میں آ جائیگی کہ ضوابط کے احساس اور ان کے قیام میں اس طریق

عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ...... نماز باجماعت سے ..... مسلمانوں میں عصبیت پیدا ہو
...... ان میں مساوات انسانی کا احساس قائم ہوا" صفحہ ۲۶ - اس کی رائے میں اہل مکہ
آنحضرت صلعم کی مخالفت کی تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ "مکہ کے حکمراں قبائل کو آنحضرت صلعم
تعلیمات کی مخالفت کا اس قدر خیال نہیں تھا جس قدر وہ ان معاشرتی اور سیاسی انقلابات
خائف تھے جو ان سے مترتب ہو رہے تھے" صفحہ ۲۰ - آنحضرتؐ کی ہجرت کا حال بیان کرتے ہو
مصنف نے لکھا ہے "آنحضرت صلعم تبلیغ اسلام کی خاطر کئی سال سے عکاظ کے میلے میں شریک
ہو رہے تھے ..... یہ درست ہے کہ آنحضرتؐ کو اس قدر کامیابی نہیں ہوئی جیسی کہ آپ کو
تھی - بایں ہمہ ان میں سے بعض کو رفتہ رفتہ آپ کی تعلیمات سے ہمدردی پیدا ہو گئی - یہ اہل
تھے ..... ان لوگوں نے آنحضرت صلعم کی باتوں کو بڑی ہمدردی اور توجہ سے سنا ۶۲۱ء
ان کے چند آدمی آنحضرتؐ کے مقاصد کے حامی بن گئے" صفحہ ۲۰ - لیکن جناب تنقید نگار صاحب
نے اس سے جو نتائج مترتب کئے ہیں ان سے ان کی دیانت تنقید کا راز فاش ہو جاتا ہے
فرماتے ہیں :-

"مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عربوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کے
اختلاط سے ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو دین حق کی جستجو میں سرگرداں تھا - آنحضرت صلعم اسی گروہ میں
پیدا ہوئے اور آپ حالات وقت کے مناسب ایک مذہب کی دعوت دیتے ہیں (تنقید نگار صاحب
اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ مصنف کے نزدیک دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرتؐ کے
پیش نظر "متحدہ عربی حکومت" کا خاکہ تھا - نیازی) عربوں میں اطاعت و انضباط کی کمی تھی -
آپ اپنی دور اندیشی سے اس کمی کو نماز باجماعت سے پورا کرتے ہیں جس سے امام کی اطاعت کا
جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ مساوات انسانی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور مکہ میں ایک
مضبوط جماعت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی دین اسلام کی اساس ہوتی ہے لیکن شرفائے مکہ اس
تحریک کو پھولنے پھلنے نہیں دیتے - آپ حج کے موقع سے فائدہ اٹھا کر یثرب کی خانہ جنگیوں کو

(نعوذ باللہ) جانتے ہیں اور ایک داعیِ امن کی حیثیت سے اپنی جماعت کے ساتھ مدینہ میں پہنچتے ہیں "

یہ صحیح ہے کہ آنحضرت صلعم کی مدنی زندگی پر مصنف نے چند ناروا الزامات قائم کئے ہیں۔ بایں ہمہ اسے اعتراف کرنا پڑا ہے کہ "عرب کے ہر حصے سے سفارتیں آئیں تاکہ وہ سیاسی نقطۂ نظر سے قبولیت اسلام کے مسئلے پر غور کریں لیکن آنحضرتؐ نے اپنے اصلی مذہبی مقصد کو نہیں چھوڑا..... آپ چاہتے تھے کہ لوگ صرف اِن اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس کریں جو خدا کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں..... آپ نے خدا کے نام پر شرک کو مٹایا..... صفحہ ۴۴۔ بہرحال مترجم نے مصنف کی ان تمام غلط خیالات کی نفی کردی تھی جو اُس نے آنحضرت صلعم کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ مگر تنقید نگار صاحب اِس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ غالباً وہ یہ چاہتے تھے کہ مترجم حواشی کی بجائے مصنف کے اعتراضات کی تردید میں ترجمے کے ساتھ ساتھ ایک جدید تصنیف کا آغاز کر دیتا چنانچہ انھوں نے مصنف کے ان الزامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"انگریزی مترجم نے اِس موقع پر گبن اور جسٹس امیر علی کی تاریخ کے مختلف اقتباسات جابجا درج کئے ہیں جو مصنف کے بیانات سے مختلف ہیں (تنقید نگار صاحب کا خیال غلط ہے۔ گبن اور جسٹس امیر علی کی تاریخ کے اقتباسات بھی "نیازی صاحب" ہی کے پیش کردہ ہیں ۔ نیازی) اور نیازی صاحب نے اپنے حاشیہ میں سلسلۂ غزوات کے وجوہ مولینا شبلی کی سیرت النبی سے اخذ کرکے پیش کر دئے۔ پھر مصنف کے چند فقروں اور خیالات کو نقل کرکے اپنی ان سے برأت کردی جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض تھے لیکن اول تو جس قدر فقرے نقل کئے گئے ہیں اُن کے ماسوا اس باب میں جابجا زہر موجود ہے۔ اِس کے علاوہ جو فقرے نقل کئے گئے ہیں وہ تو محض واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں (اگر فقروں سے تنقید نگار صاحب کی مراد وہ فقرے ہیں جو مترجم نے مصنف کے غلط بیانات کی تردید میں اس کی تحریر سے اقتباس کئے ہیں تو اس سے پھر مصنف کی غلط بیانی کے ازالہ کی امداد

کیا صورت ہو سکتی تھی۔ تنقید نگار صاحب کو اس امر پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ اگر بقول ان کے "یہ فقرے واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں" ــــ ہم تنقید نگار صاحب کی عبارت بعینہٖ نقل کر رہے ہیں ــــ تو ظاہر ہے کہ مصنف کو آنحضرت صلعم کی صداقت کا اعتراف ہے۔ (نیازی) ہمارا ان نتائج سے انکار کرنا اس وقت تک قطعی بے سود ہے جبتک ہم نفس واقعات کی تصدیق یا تکذیب نہ کر لیں۔ (عبارت کی ترتیب مدنظر رہے۔ ایک ہی جملے میں پہلے مصنف کے فقروں کی حیثیت نتائج کی سی تھی۔ ایسے نتائج جو مترجم نے تسلیم کئے اور ان کو مصنف کی غلط بیانی کے جواب میں نقل کیا لیکن اب دفعۃً اس کے معنی ان نتائج کے ہو جاتے ہیں جو واقعات سے پیدا کردہ ہیں اور جن سے مترجم انکار کر رہا ہے پوری عبارت ملاحظہ ہو" اس کے علاوہ جو فقرے نقل کئے گئے ہیں وہ تو محض واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں ہمارا ان نتائج سے انکار کرنا اس وقت تک قطعی بے سود ہے"۔ نیازی) جن سے وہ نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ اس لئے نیازی صاحب کو صرف ان چند فقروں سے (وہی جو واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں) اور جن سے ہم انکار بھی کر رہے ہیں مگر جن کو ہم نے نقل بھی کیا ہے۔ (نیازی) محض اسلامی نقطۂ نظر کی بنا پر بے زاری ظاہر کرنا ان کے پہلو کو اور بھی کمزور کر دیتا ہے (یہ کیسے؟) اور وہ گبن، جسٹس امیر علی مرحوم اور سلسلۂ غزوات کے وجوہ جو مولانا شبلی کی سیرت النبی سے ماخوذ ہیں کیا بیکار ہی ثابت ہوئے۔ کیا گبن، امیر علی اور شبلی کو واقعات کی تصدیق و تکذیب سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس بیچیدان کی طرح ان کا پہلو بھی کمزور ہو گیا ہے؟ پھر یہ فقروں کا گورکھ دھندا ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ یہ پتہ نہ چلا کہ ان سے تنقید نگار صاحب کا مطلب آیا ان فقروں سے ہے جن سے ہم انکار کر رہے ہیں یا جن کو ہم مصنف کی غلط بیانی کی تردید میں نقل کر رہے ہیں۔ بہرکیف ہماری حیثیت ظاہر ہے۔ ہم نے کہیں بھی مصنف کے ایسے فقرے نقل نہیں کئے جو قابل اعتراض ہوں۔ ہم نے صرف دو حاشیوں میں مصنف کے وہ "فقرے" نقل کئے ہیں جن سے خود اُس کے قائم کردہ اتہامات کی تردید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳ حاشیہ (۲)

"مصنف نے ابھی یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آنحضرت صرف یہ چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو اور اپنے پیرؤوں کو اہل مکہ کے تشدد سے محفوظ رکھیں۔ اس حالت میں یہ کہنا کہ آنحضرت مکہ پر فتح کرنی کرنا چاہتے تھے کس قدر ناانصافی ہے" اور صفحہ ۴۴ حاشیہ (۱) "یہاں مصنف نے خود — یہی یہ لکھکر کہ آنحضرت نے اپنے اصلی مذہبی مقصد کو نہیں چھوڑا — اپنے سابقہ بیان کی کہ وہ شخص جس نے مکہ سے ہجرت کی اور وہ شخص جو اب مدینہ میں داخل ہوا دو بالکل مختلف آدمی معلوم ہوتے ہیں ..... کی تردید کی ہے"۔ نیازی) ضرورت تو اس کی تھی کہ نفس؟ ان واقعات کی صحت، ترتیب وقوع اور اُن کے اسباب وعلل پر اپنے ذاتی مذہبی جذبہ سے علیحدہ ہو کر محض تحقیقی نقطۂ نظر سے غور کرتے اور پھر اسی معیار پر مصنف کے قائم کردہ نظریوں اور پیش کردہ نتائج کو جانچتے (اب اس تحقیقی نقطۂ نظر اور واقعات کی جانچ کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ نیازی) مثلاً مصنف نے مکہ میں اسلام کی کامیابی اور پھر عام عربوں میں قبول اسلام کا راز نماز باجماعت کو قرار دیا ہے اور لکھتا ہے :۔"

"نماز باجماعت ..... ایسی ہی قدیم ہے جیسا کہ خود اسلام ......اس کا آغاز ان مغرز (متن میں مغزز کی بجائے مغرور ہے۔ نیازی) لوگوں میں ہوا جنہوں نے آج تک کسی اجنبی کے سامنے گردن نہیں جھکائی ..... اگر ہم اتنا خیال کرلیں تو یہ بات سمجھ میں آجائیگی کہ ضوابط کے احساس اور اُن کے قیام میں اس طریق عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ... ... نماز باجماعت میں باقاعدہ اجتماع سے مسلمانوں کے اندر عصبیت پیدا ہوئی اور ان میں مساوات انسانی کا احساس ہوا ...... اور اس سے خاندان اور قبائل کے تنگ اتحاد پر ایک کاری ضرب پڑی (کیا اس سے ہم یہ نتیجہ مترتب کریں کہ اس طرح اسلام کی اشاعت ہوئی؟ نیازی)۔

"آخر نماز باجماعت کا نتیجہ مصنف کے خیال کے مطابق یہ ہوا کہ :۔

"مکہ کی اس جماعت میں نہ صرف قبیلہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے بلکہ آقا و غلام

کا قدیم امتیاز ہی عرصے میں تھا" (شاید ان الفاظ سے یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ نماز باجماعت کی بدولت عام عربوں میں اسلام پھیلا - نیازی)

مترجم کا خیال تھا کہ اب عنقریب تنقید نگار صاحب کی تحقیق و اجتہاد کے طفیل ایک ایسے نکتے کا انکشاف ہوگا جس سے اس کا پہلو مضبوط ہو جائے گا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ یہی ایک عبارت ہے جس کے جزوی اقتباسات سے تنقید نگار صاحب بار بار نئے نتائج مترتب کرتے ہیں - پہلے انہوں نے اُس کا جوڑ "عربوں کے ایک قوم ہونے کے احساس نہ رکھنے" سے مترتب شدہ نتائج سے ملایا تھا - اب ان کے نزدیک اس عبارت کے معنی یہ ہیں :-

"اب دیکھیے مصنف نے یہ تمام قیاسات و نتائج صرف اس پر استنباط کیے کہ آنحضرت صلعم نے مکہ میں نماز باجماعت قائم کی اور اسی سے اسلام نے ترقی کا راستہ دیکھا .... حالانکہ ..... نماز باجماعت کا حکم ...... اُس وقت ہوا .... جب آپ مکہ سے مدینہ تشریف لا چکے تھے ...... یہ صحیح ہے کہ نماز باجماعت سے عبادت کے ماسوا انسان کی اخلاقی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے اور اس سے عصبیت کے دائرے کو توڑنے اور مساوات انسانی کا احساس پیدا کرنے کے اثرات بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن نماز باجماعت کے یہ اثرات مدینہ کی زندگی کے واقعات ہیں نہ مکہ کی (گویا جب تک مسلمانوں نے ہجرت نہیں کی تھی جب تک ان میں یہ اوصاف موجود نہیں تھے ، نیازی) وہاں تو ایک آدمی کا بھی نماز پڑھنا مشکل تھا چہ جائیکہ ایک جماعت (کیا تنقید نگار صاحب کا یہ مطلب ہے کہ مکہ میں لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے اور اگر پڑھتے تھے تو اس کا ان کی اخلاقی زندگی پر کوئی گہرا اثر نہیں پڑتا تھا ، نیازی) لیکن مصنف نے اس موقع پر تدلیس سے کام لے کر نماز باجماعت کو مدنی احکام میں شمار کرنے کی بجائے اُسی قدر قدیم بتایا ہے جس قدر اسلام ...... اس کے خیال کے مطابق آپ چاہتے تھے کہ مدینہ کی ہر جماعت کو اپنا ہمدرد بنالیں (کیا تنقید نگار

صاحب کے نزدیک آنحضرت صلعم ایسا نہیں چاہتے تھے؟ نیازی ان حالات میں مصنف سے سوال ہو سکتا ہے ایسی حالت میں مدینہ میں آکر غلاموں کا آقا سے آزاد کرنا۔ قبائل کو اپنی عصبیت سے روکنا کیا نعوذ باللہ آپ کے مدنی اصول سیاست کے برخلاف ثابت نہ ہوگا؟ کیا آپ اپنے اس طرز عمل سے مدینہ کی تمام جماعت کو اپنا ہمنوا بنا سکتے تھے..... کیا آپ کو اسے ملتوی کر دینا نہ تھا۔ لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ میں جہاں مصنف کے خیال کے مطابق اس کی ضرورت تھی آپ اس کو قائم کرنے کا موقع نہیں پاتے اور مدینہ میں جہاں مصنف کے نظریوں کے مطابق اس کو روکنے کی ضرورت تھی آپ جاری فرماتے ہیں۔"

اس عبارت کا مطلب تو کچھ تنقید نگار صاحب ہی خوب سمجھتے ہونگے البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ ایک لمحے کے لئے مصنف کے انہی "نظریوں" کو صحیح مان لیا جائے جو تنقید نگار صاحب کے ذہن میں ہیں تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ مدنی زندگی میں نماز با جماعت معہ اپنے تمام اخلاقی ات کے آنحضرت صلعم کے اصول سیاست کے برخلاف ثابت ہوتی۔ نماز کا مسلمانوں میں عصبیت، اوات انسانی کا احساس اور نظم و انضباط پیدا کرنا اسی طرح آنحضرت صلعم کے مقصد سیاست کے مفید ثابت ہوتا جس طرح (نعوذ باللہ) "نبوت سے آپ کی شان ریاست میں اضافہ ہو رہا۔" بہرکیف مصنف کی اصلی عبارت یہ ہے:۔

"نماز یا نماز با جماعت ..... ایسی ہی قدیم ہے جیسا کہ خود اسلام۔ غالباً اس طریق عبادت کا خیال یہودیت اور عیسائیت کا پیدا کردہ ہے لیکن اس کی اصلیت کچھ بھی ہو مسلمانوں میں اسے خاص قوت اور اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کی اس خواہش سے کہ مفروضہ رکوع و سجود ٹھیک طور سے ادا ہوں نماز با جماعت کا آغاز ہوا..... جس کسی نے مسلمانوں کو باقاعدہ صفوں میں ..... نماز ادا کرتے دیکھا ہے وہ اس انضباطی عبادت کی تعلیمی قدر کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے..... اس کا آغاز ان منفرد لوگوں میں ہوا..... جن کو اطاعت و فرمانبرداری کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اگر ہم اتنا خیال کرلیں تو یہ بات کچھ.....

میں آجائیگی کہ ضوابط کے احساس اور ان کے قیام میں اس طریق عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ...... نماز باجماعت سے ...... مسلمانوں میں عصبیت پیدا ہوئی اور ان میں مساوات انسانی کا احساس قائم ہوا۔ عرب میں یہ خیالات نہایت عجیب تھے۔ اب تک وہاں جو عصبیت تھی اس کا تعلق صرف خاندان سے تھا ہر شخص کو اپنی دولت و قوت پر ناز تھا...... اپنے سے کم رتبہ لوگوں سے نفرت کرتا تھا۔ عربوں کی زندگی کے یہ دو نمایاں پہلو تھے۔ لہذا جب آنحضرتؐ نے ایک ایسا اتحاد قائم کردیا جس میں امیر و غریب سب کو مساویانہ حیثیت حاصل تھی تو اس سے متفرق و منتشر عربوں کے اتحاد و اتفاق کا دروازہ کھل گیا۔ اسلام کی ابتدا ہی سے یہ خواہش تھی کہ وہ خاندان اور قبائل کے تنگ رشتوں کو توڑ ڈالے .....

نماز باجماعت کے علاوہ معاشرتی مساوات کا احساس بھی اسلام کا پیدا کردہ ہے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غربا کی امداد اور اُن کی کفالت نے ایک مذہبی فریضہ کی شکل اختیار کرلی ...... بلکہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہر مسلمان پر فرض قرار پائی" صفحہ ۲۶

سطور بالا سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے کہیں بھی نماز و زکوٰۃ کی تاریخ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف اس اخلاقی انقلاب کی طرف اشارہ کررہا ہے جو اسلام کا مرہون منت ہے۔ آنحضرت صلعم کی مکی زندگی کے حالات مصنف نے آگے چلکر بیان کرنا شروع کئے ہیں جیسا صفحہ ۲۶ کے آخری پیراگراف کے ابتدائی الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے "بدقسمتی سے آنحضرت صلعم کے پہلے دس سال کی زندگی ...... کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں" اسی سلسلے میں اس نے قریش کی مخالفت کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "اہل مکہ ان معاشرتی اور سیاسی انقلابات سے خائف تھے جو آنحضرت صلعم کی تعلیمات سے مترتب ہو رہے تھے .... مکہ کی اس جدید جماعت میں نہ صرف قبیلہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے بلکہ آقا و غلام کا قدیم امتیاز خطرے میں تھا" صفحہ ۲۷ مصنف نے اس دوران میں کہیں نماز باجماعت کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ تنقید نگار نے اس موقع پر "تدلیس" سے کام لیکر موضوع

کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

اس کے بعد جناب ناقد صاحب آنحضرت صلعم کی سادہ زندگی اور بنائے منبر کی بحث چھیڑتے ہوئے مصنف کو ناجائز تاویلات کا ملزم ٹھہراتے ہیں حالانکہ مصنف کے الفاظ صرف اس قدر ہیں "لوگوں سے ملنے جلنے میں آنحضرت صلعم نے یہاں تک سادگی اور انکسار سے کام لیا کہ آپ نے نماز میں بھی اپنے لئے کوئی خاص جگہ معین نہیں کی۔ جب آپ مسلمانوں سے خطاب کرتے کھجور کے تنوں میں سے کسی ایک سے ٹیک لگا لیتے۔ البتہ وفات سے دو برس پہلے آپ نے اپنے لئے ایک اونچی نشست تعمیر کرائی جس پر آپ اُس وقت بیٹھتے جب آپ کو کسی ایلچی یا سفیر سے ملنا ہوتا تھا یا جب آپ جماعتی امور پر غور فرماتے یا مقدمات کا فیصلہ کرتے۔ یہ منبر ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا ...... اس نہایت سادہ نشست سے رفتہ رفتہ عیسائی اثر کی بنا پر منبر کی بنا پڑی۔"

صفحہ ۱۳۱۔ تنقید نگار صاحب کہتے ہیں کہ مصنف کو اس میں ترفع اور تفوق کی جھلک نظر آتی ہے اور پھر اس مفروضہ الزام کی تردید میں مختلف روایات کا اقتباس پیش کرتے ہوئے بیکار اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہے جناب ناقد صاحب کا باب التقریظ والانتقاد؟

اسی طرح مصنف کے دوسرے بیانات کے متعلق تنقید نگار صاحب نے جس بدگمانی اور بدظنی سے کام لیا ہے اس سے ہمیں نہایت افسوس ہوا۔ اختصار بیان کی کوشش میں کہیں کہیں مصنف سے کچھ فروگزاشتیں ہو گئی ہیں۔ پانچویں باب میں بہت سی بحثیں تشنہ رہ گئی ہیں۔ بہت سی باتوں میں سلسلہ تحقیق و تفتیش مکمل نہیں ہوا۔ کلیسائے یوحنا اور ہیکل سلیمانی کے متعلق بھی مصنف کی روایات صحیح نہیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق اگرچہ مصنف کا یہ خیال صحیح ہے کہ "آپ کسی عرب کو عرب کے برابر نہیں سمجھتے تھے" لیکن یہ صحیح نہیں کہ "آپ بالقصد عربیت کو فروغ دینا چاہتے تھے یا آپ نے اُن معاہدوں کا خیال نہیں کیا جو یہود و نصاریٰ سے ہوئے"۔ بایں ہمہ مترجم نے مصنف کی ان لغزشوں کو کچھ بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بعض ضروری فروگزاشتوں پر حاشیہ میں گرفت کر دی گئی ہے لیکن بعض غلطیوں کو محض اس لئے نظر انداز کر دیا کہ ان کی

حیثیت جزوی اور ضمنی باتوں کی سی تھی اور کتاب کے اصلی مباحث پر ان کا چنداں اثر نہیں پڑ
تھا لیکن تنقید نگار صاحب مترجم کے اس انداز سے خوش نہیں ہوئے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ مترجم
ذرا ذرا سی بات پر مصنف سے دست و گریباں ہو جاتا۔ اتفاق سے ان کو بعض فتوحات کے
سنین میں اختلاف ہے۔ ان کی رائے میں:۔

"بیت المقدس کی فتح ۱۵ھ میں بتائی گئی ہے حالانکہ صحیح روایت رجب ۱۶ھ ہے۔
قادسیہ کی جنگ کو ۱۵ھ میں بتایا ہے حالانکہ وہ محرم ۱۴ھ میں پیش آئی۔۔۔۔۔۔ برقہ کی فتح
کو ۲۲ھ میں قرار دیا ہے حالانکہ ۲۱ھ میں واقع ہوئی۔ سب سے پرلطف قبرس کی فتح کا
سنہ ہے صفحہ ۱۰۶ پر ہے ۲۸ھ میں۔۔۔۔۔ قبرس فتح کر لیا آگے چل کر یہی ۳۳ھ ہو جاتا ہے
۔۔۔۔۔ ۳۳ھ میں قبرس فتح ہو گیا تھا۔ ہم دونوں واقعات میں تطبیق دینے کے لئے اس کی توجیہ
میں اس تاریخی حقیقت کی طرف رجوع کریں کہ ۲۸ھ میں قبرس فتح ہوا۔۔۔۔۔۔ چند سال
کے بعد بدعہدی کی۔۔۔۔۔۔ امیر معاویہ نے دوبارہ فوج کشی کی۔۔۔۔۔۔ یہ واقعہ ۳۲ھ کی
بجائے ۳۳ھ کا ہے۔۔۔۔۔"

اس ذرا سی بات پر تنقید نگار صاحب بے قابو ہو گئے اور بڑے مزے لے لیکر یہ کہنا شروع
کیا کہ "کیا ہم ان غلط بیانیوں کو اس لئے تسلیم کر لیں کہ یہ ایک مستشرق کی شان تحقیق ہے؟"
ناقد صاحب سے بادب گزارش ہے کہ مستشرقانہ شان تحقیق کی بنیادیں اس قدر ناپائدار نہیں
وہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اُن کو شاید خیال ہو گا کہ ایسی فحش غلطیوں کے ہوتے ہوئے مصنف کے
علم پر کس کو ہنسی نہیں آئیگی لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اول تو ترتیب سنین کے متعلق ہم کو ڈاکٹر
کے دلائل کا علم نہیں پھر سنین کے بارے میں اختلاف کی بہت کافی گنجائش موجود ہے۔ اتفاق سے
بیت المقدس اور جنگ قادسیہ دونوں کا سنہ ۱۵ھ بتایا ہے۔ برقہ اس کے نزدیک
میں فتح ہوا۔ اس کو بھی جانے دیجئے تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر تنقید نگار صاحب اس قدر
مسرت کا اظہار کرتے۔ کیا وہ محسوس نہیں کرتے کہ اس قسم کے معمولی گناہ کبھی کبھی اُن کے ش

بھی سرزد ہو جایا کرتے ہیں۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

بہرکیف یہ امر غور طلب ہے کہ مصنف نے کہیں مسلمانوں پر کلیسائے یوحنا سے تعارض کرنے کا الزام قائم نہیں کیا۔ مصنف لکھتا ہے "خلافت راشدہ کے آخری عہد میں مکہ و مدینہ عربی نغمہ و ساز کا گہوارہ بن گئے" "تنقید نگار صاحب ان باتوں کو مزخرفات قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں" خلافت راشدہ اور عہد نبوی میں جو کچھ موسیقی تھی وہ اس قدر تھی جو شاعری کا لازمہ ہوتی ہے .... اس عہد کے چند مغنیوں کے نام بھی ملتے ہیں ......" اور اس طرح خود ہی ان "مزخرفات" کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ مصنف نے آویزش خلافت کی تاریخ میں مکی اور مدنی گروہوں کی تقسیم قائم کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "اہل مدینہ کا فریق جمہوری نصب العین رکھتا تھا اور اہل مکہ خاندان اور قبیلوں کی حمایت پر قائم رہے"۔ تنقید نگار صاحب خفا ہیں کہ مصنف نے اس عہد کی تاریخ کو مکی اور مدنی تفریق سے ملوث کیوں کیا۔ ان کی رائے میں یہ سب کچھ قبائلی عصبیت کا نتیجہ تھا۔ تنقید نگار صاحب اگر غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ ان کا یہ خیال صحیح نہیں۔ بہرکیف مصنف کا مطلب تو صرف اس قدر تھا کہ مدینہ اور اہل مدینہ سے اسلامی اور جمہوری روح کا اظہار ہوتا رہا یہ مکہ کی ذہنیت تھی جو پادشاہت اور سلطنت کی صورت میں خلافت پر حاوی ہو گئی۔ اسی طرح تنقید نگار صاحب کو مصنف کے اس بیان پر بھی اظہار تعجب کی ضرورت نہیں تھی کہ "امویوں کے زمانۂ حکومت کے وسط ہی میں عباسیوں نے ...... راسخ الاعتقاد مسلمانوں میں عزت و اعتماد حاصل کر لیا تھا" اس لئے کہ اگر لوگوں میں عباس اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اولاد کا احترام موجود تھا تو یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں تھی جس پر جناب ناقد صاحب اظہار تعجب فرماتے۔ ان کا یہ کہہ کر مصنف کی تاریخ دانی پر حملہ کرنا کہ "بنو امیہ کے مقابلہ خلافت کا دعویدار جو گروہ تھا وہ علوی اور شیعان علی کی جماعت تھی...... اتفاقی واقعات کی بنا پر زمام حکومت عباسیوں کے ہاتھ میں چلی گئی" کچھ بہت زیادہ ٹھیک نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بنو امیہ کے مقابلے پر علوی اور

شیعان علی کی جماعت موجود تھی لیکن بنو امیہ کے زوال میں محمد عباسی کا جو حصہ ہے اسے کوئی اہل نظر فراموش نہیں کر سکتا۔ ابراہیم عباسی بھی جسے بعد میں اموی حکومت نے قتل کی سزا دی ائمہ عباسیہ ہی سے تھا۔ سلیمان اور ابو مسلم بھی محمد ہی کے داعیوں میں سے تھے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جسے تاریخ دانی سے ذرا بھی بہرہ ملا ہے ان باتوں سے بے خبر نہیں۔

تنقید نگار صاحب کو شکایت ہے کہ مصنف نے اسلامی فن تعمیر کے سلسلے میں صقلیہ کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مصنف کو عربی تعمیرات کے صرف بڑے بڑے اسالیب اور ان کے نمونوں کا تذکرہ کرنا مقصود تھا اور ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے صقلیہ کی عمارات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں البتہ تنقید نگار صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ نوکدار محرابوں نیز کے زمانے کی تعین میں مصنف سے تسامح ہوا ہے۔ بارہویں صدی سے مصنف کا مطلب بارہویں صدی مسیحی ہے۔ تنقید نگار صاحب نے دائرۃ المعارف برطانیہ کے حوالے سے ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری بتایا ہے یعنی گیارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی۔ صفحہ ۴۷ پر مصنف نے لکھا ہے "المرابطین کے عہد میں جامع تلمسان تعمیر ہوئی (۱۱۳۵ - ۳۰) جس سے عربوں کی اس ترقی کا پتہ چلتا ہے جو انھوں نے فن تعمیر میں حاصل کی تھی...... اب ...... اور بیضاوی محرابوں کی بجائے نوکدار محرابیں وجود میں آئیں"۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں اول تو یہ کہ مصنف محض نوکدار محرابوں کی ابتدا سے بحث نہیں کر رہا ہے ثانیاً (۱۱۳۵ - ۳۰) جامع تلمسان کی تعمیر کی تاریخ ہے جو اُس کے نزدیک فن تعمیر کے اس بدلے ہوئے اسلوب کا ایک نمونہ ہے۔

قرطبہ کی علمی ترقیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے اتفاق سے لکھ دیا تھا "سرزمین قرطبہ نے علم کا خیر مقدم بڑی گرمجوشی سے کیا...... ہر شخص کو کتابوں کی فراہمی ...... کا شوق تھا...... قیصر روم کو بھی ...... عبدالرحمٰن ثالث کے لئے دیاسقوریدس کی کتاب دواسازی کے ایک خوبصورت نسخے سے بہتر اور کوئی تحفہ نہیں ملا" تنقید نگار صاحب بگڑ بیٹھے۔ سب سے پہلے انھوں

نے مغربی اور مشرقی فضیلت کی تقسیم قائم کی۔ پھر مغربی فضیلت کو مبالغہ آمیزی کا طعنہ دیتے ہوئے فرمایا "دیاسقوریداس کی تصنیف عربوں کے لئے کوئی نایاب کتاب نہیں تھی ...... اس کا ترجمہ متوکل کے عہد میں ہوا ...... حسن اتفاق سے قیصر روم نے دوسرے تحائف کے ساتھ کتاب دیاسقوریداس بھیجدی ...... اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تصاویر سے مزین تھی ...... نکولس نے اس کا ترجمہ لاطینی میں کیا عربی میں نہیں کیا" تنقید نگار صاحب غور کریں کہ مصنف نے عربوں کی شان میں کوئی ایسی گستاخی نہیں کی۔ نہ اس نے کتاب کے متعلق ان جزوی بحثوں کو چھیڑا جنہیں ناحق آپ الجھ گئے۔ ممکن ہے کسی لاطینی کتاب میں یہی مذکور ہو کہ نکولس نے کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا۔ بہرکیف مصنف کا مطلب تو صرف قرطبہ کے ذوق علم کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

یہاں تک تو مصنف کے جرائم کی بحث تھی۔ اب مترجم کے گناہوں کی فہرست شروع ہوتی ہے۔ تنقید نگار صاحب نے مارک انٹنی کی طرح جو جولیس سیزر کی لاش کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہوئے اُس کے اُن احسانات کا تذکرہ کرتا جاتا تھا جو اُس نے اہل روما پر کئے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ اسے بروٹس کی شرافت کا اعتراف ہے مصنف کی غلط بیانیوں اور ان سے مترجم کی بے اعتنائی کی شکایت کرتے ہوئے بین السطور میں کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ ہم تنقید نگار صاحب کو اس حسن بیان پر مبارکباد دیتے ہیں۔

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

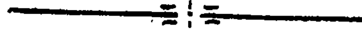
تنقید نگار صاحب کا خیال ہے کہ مترجم کا ضمیمہ بیشتر مستشرقین کی تحریروں کا رہین منت ہے۔ یہ صحیح ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے میں ہم نے کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا اس لئے کہ مترجم کی حیثیت میں ہمارے پیش نظر ایک مستشرق کی تصنیف تھی اور اس لحاظ سے یہی مناسب معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس پر کچھ اضافہ کیا جائے تو مستشرقین ہی کی تحریروں سے کیا جائے۔ البتہ تنقید نگار صاحب ہمارے اس مستشرقانہ انداز سے خفا ہو گئے جس میں ہم نے بغاوت فقہا پر تبصرہ کیا ہے

لیکن انھوں نے یہ نہیں بیان کیا کہ ان کی خفگی کے کیا وجوہ ہیں۔ بہرکیف ہم اس کے لیے ا
معافی کے خواستگار ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ آیندہ مترجم سے فقہا کی شان پر
کی کوئی گستاخی نہیں ہوگی (انشاءاللہ)۔ اس خیال کی تردید میں کہ تصوف ویدانت کا
منت ہے یا یہ کہ اسے خالص ایرانی چیز سمجھنا چاہئے مترجم نے لکھا تھا کہ "بیرونی سے قبل
اور عالم اسلامی میں کوئی علمی تعلق قائم نہیں تھا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ تصوف محض ایرانیوا
پیداوار ہے اس لئے کہ اس میں ابن عربی اور ابن فارض ایسے خالص عرب شامل۔
تنقید نگار صاحب نے اسے مترجم کی ذاتی تحقیق ٹھہراکر اس کی اس طرح تغلیط شروع کی "
.... ہارون مامون..... خصوصاً برامکہ کے دور اقتدار میں بہت سے اہل علم ہندوستان آ
اور ہندوستان کے اطبا، فلاسفر اور پنڈت بغداد بُلائے گئے..... ابن عربی اور ابن فارض
اس وقت پیدا ہوئے جب تصوف کی نشوونما کامل طور پر ہو چکی تھی" تنقید نگار صاحب مت
جس عبارت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ پروفیسر براؤن کے بیان سے ماخوذ ہے۔ ۲۱
سے یہ اجتہاد مترجم کا نہیں ہے بلکہ پروفیسر براؤن کا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمیں تنقید نگار صا
کا اجتہاد کچھ بہت زیادہ پسند نہیں آیا اس لئے کہ ان کی طرح پروفیسر براؤن کو بھی معلو
کہ برامکہ کے دور اقتدار میں بہت سے...... پنڈت بغداد آئے" بایں ہمہ ان کو اپنے
پر اصرار تھا۔ تنقید نگار صاحب اگر ان کے دلائل کو قبول نہیں کرتے تو کوئی مضائقہ نہیں
مرحوم کو خوب معلوم تھا کہ ہندوستان کے پنڈتوں کے ورود بغداد کے باوجود تحریک تص
اس زمانے میں ان کا کوئی اثر نہیں پڑا اسی طرح وہ تصوف کے نشوونما میں ابن عربی
زبردست شخصیت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے تھے۔

افسوس ہے ہمیں جناب ناقد صاحب کے انداز تنقید سے کوئی خاص مسرت
ہوئی۔ ہمارا خیال تھا کہ اٹھارہ صفحوں کی نکتہ چینیوں کے بعد دس بیس نہیں تو کم از
چار صفحے مصنف کی مدح و ستائش میں بھی صرف کرینگے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ان کے پیش

کوئی علمی مقصد نہ تھا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے مترجم کی چند غلطیوں پر گرفت کی ہے اور بعض ناموں کی تصحیح میں اسے غیر معمولی مدد دی ہے۔ کتابوں کی عدم موجودگی اور کتابت و طباعت کی دشواریوں سے خود مترجم کو اس بارے میں بے حد دقتیں پیش آچکی تھیں اور اس کا دل کسی طرح بھی کتاب کی ترتیب سے مطمئن نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ تنقید نگار صاحب اسی طرح ہماری بعض فروگذاشتوں کے متعلق بھی ہمیں قابل قدر مشورہ دینگے۔ بدقسمتی سے اُن کی ساری توجہ کتاب کی خامیوں پر رہی یہاں تک کہ وہ اپنی غلط فہمی میں کتاب کے اصلی اور جزدی مباحث میں بھی کوئی امتیاز قائم نہیں کر سکے۔ تنقید نگار صاحب کا یہ انداز نہایت مایوس کن ہے۔ انہوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ دنیا کا ہر مصنف جسد اسلامی میں زہر رسانی کی کوشش کرتا ہے اور یہ خدمت انھیں کے حصے میں آئی ہے کہ وہ اس کے ازالہ کی کوشش کریں۔ اس سے پہلے ان کو اس امر کا فیصلہ کرلینا چاہیئے کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔ اگر تنقید کی انتہا یہی ہے کہ ہم مستشرقین کے ہر بیان کی تردید کردیں اور کسی طرح بھی تاریخ کے اُس اعلیٰ نصب العین کی طرف قدم نہ اُٹھائیں جس کے ماتحت ہمیں اقوام و ملل کی صحیح زندگی کا علم حاصل ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا دماغ ایک ناقابل علاج مرض کا شکار ہو چکا ہے اور ہم خواہ مخواہ اپنی نادانی اور پستی کے احساس سے دوسروں کے نفوق پر حملہ کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے منفیانہ رویے سے ہماری علمی زندگی پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا۔ ہمیں اس کا خیال نہ کرنا چاہیئے کہ مصنف زدیر ہے یا شبلی، امیر علی ہو یا دل ورنلو ہمارے پاس اگر واقعی کوئی چیز موجود ہے تو ہمیں نہایت جسارت کے ساتھ اسے پیش کر دینا چاہیئے تحقیق و اجتہاد کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہے۔ ہمارے یہ کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا کہ مستشرقین کو آنحضرت صلعم کی فلاں حیثیت کا علم نہیں۔ اُن کی سمجھ میں اسلام کی یہ خصوصیت نہیں آتی اور وہ خصوصیت نہیں آتی۔ کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن کی مجموعی خوبیوں اور اُن کی علمی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ کیا تنقید نگار صاحب اتنا نہیں سمجھتے کہ دنیا کے بہتر سے بہتر اداروں سے بھی جو کتابیں شائع ہوتی ہیں اُن کا مطالعہ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ ان کی ایک ایک سطر صحیح ہوتی ہے یا اسلئے

کہ وہ ہماری ہر علمی ضرورت کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ ان کی خوبیاں ہی ان کے مجموعی محاسن میں مضمر ہیں۔ ہماری رائے میں علم کا منشا مغربی اور مشرقی فضیلتوں کی تقسیم سے کہیں زیادہ بالاتر ہے اور اگر کسی مستشرق کی تصنیف میں تھوڑی بہت خامیوں کے باوجود عالمانہ شان موجود ہے تو ہمیں اس سے استفادہ حاصل کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیئے۔



مجذوب کی بڑ

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف + آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس مرتبہ گرمیوں کی چھٹیوں میں مجھے کئی سال بعد وطن جانے کا اتفاق ہوا کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر کہنا پڑتا ہے کہ نہ مجھے اپنا گاؤں ملک سلیمان سے بہتر معلوم ہوا اور نہ وہاں کے کھیتوں میں سنبل و ریحان سے زیادہ دلکشی محسوس ہوئی۔ شاید اس کا یہ سبب ہو کہ میں بچپن سے اپنے والد کے ساتھ رہا اور وہ ملازمت کے سلسلے میں شہر شہر پھرتے رہے اس لئے میرے دل میں حُب وطن کا جذبہ دب کر رہ گیا یا یہ ہو کہ مجھے خلیل آباد میں کبھی وہ محبت نصیب نہیں ہوئی جس کا پَرتو مٹی پتھر اور درختوں کو زندگی اور کشش بخشتا ہے اور وطن کو وطن بناتا ہے۔ یہ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ میرے دل میں حُب وطن نہ سہی مگر اُس سے ملتی جلتی ایک چیز ضرور موجود ہے۔ میں جس کالج میں تعلیم پاتا ہوں اُس سے مجھے عزیز دوستوں اور شفیق اُستادوں کی بدولت بیحد اُنس ہے۔ جب میں وہاں سے کہیں جاتا ہوں تو دل میں درد جدائی کی کسک لئے ہوئے اور جب لوٹ کر آتا ہوں تو جوش مسرت میں ڈوبا ہوا مگر خلیل آباد سے مجھے کوئی قلبی رشتہ محسوس نہیں ہوتا۔ میں دو برس کا تھا کہ میری والدہ اور پھپھی کا انتقال ہو گیا اور اُسی سال میرے چچا وطن کی سکونت ترک کر کے بمبئی چلے گئے۔ خلیل آباد میں چند دور کے عزیزوں کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ اس لئے میں کبھی تعطیل کے دنوں میں وہاں جاتا ہوں تو محض ایک فرض سمجھ کر۔ جب تک وہاں رہتا ہوں صبر کی نیکی روزانہ میرے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے اور جب وہاں سے رخصت ہوتا ہوں تو میرا شمار شکر گزاروں میں ہوتا ہے۔

اس بار خلیل آباد میں میرے محسنوں میں سے کوئی موجود نہ تھا اس لئے مجھے وہاں قیام اور بھی کھل گیا صبح سے شام تک میرا وقت اس طرح گزرتا تھا کہ کبھی اپنے خاندانی کتبخانے

میں جاکر کرم خوردہ کتابوں کی گرد جھاڑی اور ورق گردانی کی، کبھی زنانے مکان میں جاکر عورتوں کے آپس کے جھگڑے اور ہمسایوں کی شکایتیں سنیں، کبھی کھیتوں کی طرف چلا گیا، کبھی آم کے باغ میں جاکر بیٹھ گیا۔ ممکن ہے کہ فلسفیانہ طبیعت والوں کو تنہائی کی زندگی میں غور و فکر کا بہت اچھا موقع ملتا ہو اور نظر ہوشیار کو درختوں کے پتوں میں معرفت کردگار کے دفتر نظر آتے ہوں لیکن میرے جیسے لوگ جو تنہائی میں اونگھتے ہیں اور پتوں کی دفتری زبان سے ناواقف ہیں اس موقعے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجھے تو پہلے ہی دن سے فکر تھی کہ کوئی انسان ملے جس سے باتیں کرکے دو گھڑی دل بہلا سکوں مگر ہمارے گھر میں کیا سارے گاؤں میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے سوائے کھیتی، مویشی، پٹواری وغیرہ کے کسی چیز سے دلچسپی ہو۔ مجھے گاؤں کے ہر آدمی سے وحشت تھی خصوصاً ایک صاحب سے تو ڈر سا لگتا تھا۔ ان بزرگ کا نام مجھے معلوم نہیں مگر یہ مجذوب کہلاتے ہیں اور ہمارے گھر کے قریب ایک مسجد میں رہتے ہیں۔ یہ مجھے اکثر راہ میں ملا کرتے تھے کبھی مسجد میں جھاڑو دیتے ہوئے، کبھی کسی درخت کے تلے بیٹھے ہوئے کبھی کھیتوں کے بیچ میں منڈیر پر لیٹے ہوئے۔ مگر ان کی بے تصنع ہیئت اور ان کا بے تکلف لباس دیکھ کر میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان کے قریب جاؤں یا ان سے بات کروں۔ ایک دن کیا اتفاق ہوا کہ میں سیر کرنے نکلا اور بستی سے باہر جاکر ریل کی پٹڑی کے پاس ایک آم کے باغ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے قریب ہی ایک بڑے سے پیڑ کی آڑ میں حضرت مجذوب بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں سر جھکائے تالاب کی موجوں کا شمار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سر جو اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میاں مجذوب پاس کھڑے ہیں۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ اٹھ کر غیر معمولی تیزی سے قطع مسافت کرتا ہوا چلدوں لیکن خیال ہوا کہ شاید کوئی دیکھ لے اور اس فعل کو بھاگنا سمجھے اس لئے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا مگر دل میں دعا مانگتا جاتا تھا کہ خدا کرے خود ان حضرت کے دل میں اس وقت ذوقِ سفر بلطفِ مقام

مگر دعا کا اثر الٹا ہوا۔ مجذوب صاحب اور قریب آئے اور مجھ سے کوئی ایک گز کے فاصلے پر منہ میں پیر پھیلا کر بیٹھ گئے۔ میں سہم کر تھوڑا سا پیچھے کھسکا۔ اس حرکت سے وہ میری طرف متوجہ ہو گئے اور غصے کے لہجے میں پوچھنے لگے "تو تیرنا جانتا ہے؟" مجھے واحد حاضر کی ضمیر زیادہ مرغوب نہیں مگر اس وقت مصلحتاً میں نے اسے سہہ لیا اور آہستہ سے جواب دیا "جی نہیں"۔ کہنے لگے "تو پھر تو اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا؟" یہ مجذوبانہ منطق مجھے بہت مہلک معلوم ہوئی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس خوف سے کہ کہیں یہ اس سلسلے میں کوئی عملی دلیل نہ دے بیٹھیں میں سنبھل کر بیٹھ گیا کہ ضرورت ہو تو بے اجازت رخصت ہو کر گھر کی راہ لوں۔

مجذوب صاحب نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھا "کیا تو دنیا سے نرالا ہے، سب یہی کرتے ہیں، ہر مسلمان یہی کرتا ہے۔ مسلمان مسلمان سب برابر ہیں۔ کوئی غریب ہے کوئی امیر ہے، کوئی عالم ہے کوئی جاہل ہے، مگر ہیں سب مسلمان، سب بے صبر سب غافل، سب ناعاقبت اندیش، سب اس کے موجی، سب جذبات کے غلام۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ مسلمان جو اپنے نفس پر، اپنے دل پر، اپنی زبان پر، اپنے ارادوں پر، اپنی خواہشات پر، اپنے خیالات پر قابو نہیں رکھتے رہنما بن کر قوم کی رہنمائی کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں؛ وہ مسلمان جو سچے علم و فضل سے، مطالعہ فطرت سے، مشاہدۂ زندگی سے، حق کی محبت سے بیگانہ محض ہوتے ہیں عالم دین بن کر تعلیم و تلقین کے مسند پر بیٹھ جاتے ہیں، وہ مسلمان جو لذت بے خودی سے، کیف تسلیم سے، ذوق درد سے، ہمدردی اور خدمت کے جذبات سے ناآشنا ہوتے ہیں پیر روشن ضمیر بن کر رشد و ہدایت کا باب کھول دیتے ہیں؟ اگر تو نے اس کا مشاہدہ کیا ہے تو پھر تو جو تیرنا نہیں جانتا اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا؟...... کیا تو نہیں جانتا کہ مسلمان مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر ذرائع سے بے نیاز ہیں، سفر کرنا چاہتے ہیں لیکن زادِ سفر سے مستغنی ہیں، فصل کاٹنا چاہتے ہیں لیکن بونے جوتنے سے بے پروا ہیں؟ کیا تجھے معلوم

نہیں کہ مسلمان ایک طلسمی دنیا میں رہتے ہیں جہاں قول کے معنی فعل، ارادے کے معنی عمل، دعوے کے معنی دلیل، خواہش کے معنی واقعہ سمجھے جاتے ہیں جہاں آنکھ صرف اُن چیزوں کو دیکھتی ہے جو اُسے پسند آئیں، کان صرف ان باتوں کو سنتا ہے جو اُسے مرغوب ہوں اور ذہن صرف ان معروضات کا ادراک کرتا ہے جو اُسے گوارا ہوں؟ اگر تجھے یہ علم ہے کہ پھر تو کیوں بیکار عقل سے کام لیتا ہے اور کیوں اس تالاب میں کود نہیں پڑتا؟...... معلوم ہوتا ہے تو باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کی اصلی حالت سے واقف نہیں۔ سُن میں تجھے سناتا ہوں: دیکھ، میں تجھے دکھاتا ہوں۔ یہ پیکرِ خیالی جو تیری چشمِ باطن کے سامنے ہے ہندوستان کا مسلمان ہے۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو دیکھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور سنا کہ اس کے بزرگوں کے پاس سب کچھ تھا۔ اس کے بزرگ ہندوستان پر حکومت کرتے تھے، قوت وسطوت، جاہ وحشمت، مال و دولت کے مالک تھے۔ زراعت، تجارت، لین دین یہ چیزیں ان کے پاس نہ تھیں اور انکی انھیں ضرورت بھی نہ تھی۔ سلامت روی، مسکنت، تحمل، جفاکشی کی صفات یہ لوگ نہیں رکھتے تھے اور یہ اُن کے شایان شان بھی نہ تھیں۔ دفعتہً ہوا بدلی، زمانہ پلٹا، ہندوستان میں انقلاب ہو گیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہی اور اس کے ساتھ وہ باتیں بھی جو حکومت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ قصرِ زندگی کی بنیادیں پہلے ہی سے ان کی نہ تھیں؛ اب اُسکی دیواریں اُسکی چھتیں، اُس کے کنگرے، اُس کے گنبد بھی چھن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیچارے مسلمان کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ سر پر سائے کا تو کیا ذکر ہے پیر تلے سے زمین بھی نکل گئی۔ اب یہ اللہ کا بندہ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ اُس کی زندگی خیالی دنیا میں بسر ہونے لگی۔ کون سی خیالی دنیا؟ وہ نہیں جو ایمان و یقین، وسعت نظر اور قوت عمل بخشتی ہے بلکہ وہ جو حواس ظاہری و باطنی کو نیم بیداری کی حالت میں رکھتی ہے، جو جسم و جان پر ایک کابوس مسلط کر دیتی ہے۔ وہ نہیں جو انسان کو اُبھار کر مشاہدۂ و عرفان کی بلندی پر لے جاتی ہے بلکہ وہ جو اُسے گرا کر جمود و غفلت کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ اُسے زندگی کی حقیقتوں سے وحشت ہونے لگی وہ واہمہ کی

بنائی ہوئی تصویروں سے دل بہلانے لگا۔ کاہلی کا نام اُس نے قناعت رکھ لیا، بے عملی کا توکل، بے بسی کا صبر، بے حسی کا زہد...... یہ غنودگی، یہ غفلت اس پر ہمیشہ طاری نہیں رہتی بلکہ اکثر وہ چونکتا ہے، سر اُٹھاتا ہے، اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، کبھی کبھی وہ اُٹھتا ہے، دوڑتا ہے اور اتنا دوڑتا ہے کہ تھک کر گر پڑتا ہے۔ لیکن کیا چونکنے کے بعد اُسے زندگی کی حقیقتیں نظر آتی ہیں؛ کیا دوڑنے کے بعد وہ منزل مقصود سے قریب تر ہو جاتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ چونکنا محض خواب پریشاں کا نتیجہ ہے اور یہ دوڑنا محض وحشت کی دلیل...... یہ حقیقت سے بیخودی، یہ واہمہ کی غلامی، یہ غفلت اور وحشت کا تضاد مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ سے نمایاں ہے۔ مذہب کو اُس نے زندگی کے واقعات سے، دنیا کے حالات سے، زمانے کی رفتار سے جدا کر لیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دینداری نام ہے ہر زندہ قوت سے ڈرنے کا، ہر تغیر کی طرف سے آنکھ بند کر لینے کا، ہر نئی چیز سے نفرت کرنے کا۔ وہ خود نا تمام اور نیم گرم عقیدہ رکھتا ہے، بے توجہی اور بے دلی سے عبادت کرتا ہے مگر جب کسی دوسرا عقیدہ رکھنے والے یا دوسرے طریقے سے عبادت کرنیوالے کو دیکھتا ہے تو بادل کی طرح اُٹھتا ہے، گرجتا ہے اور برس پڑتا ہے۔ شاعری کو اُس نے سچے مشاہدات، واردات اور جذبات سے بے تعلق کر کے بیرنگ حسن، بے کیف عشق، بے ثمر وصل، اور بے تمکین ہجر کے دائرے میں گھیر لیا ہے۔ اُس کے نزدیک شاعری حقیقت کو تخیل کی آنکھ سے دیکھنے اور جذبات میں خوشنما حرکت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کو نہیں کہتے بلکہ خارجی اور عینی دنیا سے منہ موڑ کر اپنے نفس کی اندھیری کوٹھری میں بھٹکنے، اِدھر اُدھر ٹٹولنے اور کچھ نہ پاکر کفِ افسوس ملنے کو۔ اُس کے خیال میں شاعر وہ نہیں جس کا دل کائنات کے درد سے دکھتا ہے اور جس کا ذہن حسن ازلی اور عشق ابدی کی رسائی میں اس درد کی دوا ڈھونڈھتا ہے بلکہ وہ ہے جو اپنے ہاتھوں ادنیٰ خواہشات اور جذبات کے دلدل میں پھنس جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ باہر نکلنے کی کوشش کرے روتا ہے، چلاتا ہے، تڑپتا ہے۔ اُس نے اقتصاد و سیاست کی طرف سے انتہا میں ایسی غفلت

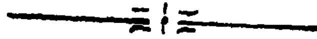
ہوتی کہ وہ مال و زر سے بالکل خالی اور قوت و سطوت سے قطعاً محروم ہو گیا اور اب جو ذرا چیتا ہے تو اُس نے اُن چیزوں کو جن میں فکر و عمل کی ضرورت ہے جذبات کا کھیل بنا دیا ہے۔ اپنے بوتے کھڑا نہیں ہو سکتا دوسروں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے، آج ایک کا کل دوسرے کا پھر جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں تو طیش میں اپنے آپ سے لڑتا ہے، جھنجھلاہٹ میں اپنی بوٹیاں چباتا ہے .... اگر اس خیالی تصویر پر تیری نظر نہ جمتی ہو تو مجھے دیکھ میں تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ ایک دن تھا کہ میں بھی انسان تھا، میں بھی مسلمان تھا۔ میں نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اس عرصۂ جد و جہد سے اس جہان گیر و دار سے الگ ایک طلسمی دنیا میں پرورش پائی تھی: مذہب کے پردے میں کاہلی، بے عملی، بے بسی، بے حسی سیکھی تھی، شاعری کے نام سے نفس پرستی، حقیقت فراموشی، جذبات فراموشی کی تعلیم پائی تھی، سیاست و اقتصاد کے دھوکے میں شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے اور آخر میں مایوس ہو کر تقدیر سے، دنیا سے، اور اپنے آپ سے لڑنے کی مشق کی تھی۔ میری زندگی بھی غفلت اور وحشت، جمود اور اضطراب کا تضاد تھی۔ مگر میرا تخیل دوسروں سے زیادہ قوی تھا اور میرا دل و دماغ دوسروں سے زیادہ کمزور۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے قوائے ذہنی میں باہمی ربط کے رشتے ٹوٹ گئے، میری محدود خیالی زندگی کا سلسلہ بھی میری آنکھوں کے سامنے الگ الگ کڑیوں میں بکھر گیا جن کو ملانے کی میں کوشش کیا کرتا ہوں مگر بہت کم کامیاب ہوتا ہوں۔ لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں مگر چونکہ میری پچھلی زندگی میں مذہبیت غالب تھی اور اب بھی اس کا شائبہ موجود ہے اس لئے اخلاقاً مجذوب کہتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مجھ پر حقیقت کے بھید اور معرفت کے اسرار کھل گئے ہیں مگر میں انہیں برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ آہ انہیں کیا معلوم کہ راز حقیقت اور اسرار معرفت تو درکنار میں معمولی ذی فہم انسانوں کے مربوط ادراک، احساس اور عمل کے لئے تڑپتا ہوں۔ مگر کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے مسلمانوں کی حالت مجھ سے کچھ بہتر ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ سب میری

طرح مجذوب ہیں۔ اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ میں کھلا ہوا مجذوب ہوں، وہ چھپے ہوئے مجذوب ہیں، میں نے زندگی کی بازی میں ہار مان لی اور وہ ہاری ہوئی بازی کھیل رہے ہیں ..... خیر مجھے اس وقت سب سے غرض نہیں، میں تو تجھ سے وہ بھید کہنا چاہتا ہوں جو میں نے سب کچھ کھو کے پایا ہے۔ میرے ذہن کی تاریکی میں اس وقت جو عارضی روشنی آ گئی ہے اُسے غنیمت سمجھ اور میری بات غور سے سُن۔ تو ابھی نوجوان ہے اور زندگی کے گھنے اور تاریک جنگل میں قدم رکھ رہا ہے جس میں میں سیدھی راہ چھوڑ کر بھٹک گیا ہوں۔ تیرے پاس ابھی عقل کا چراغ موجود ہے جس میں عقیدے کا تیل جلتا ہے۔ تیری رگوں میں ابھی شوق اور ولولے کا خون دوڑ رہا ہے اور تیرے پیروں میں رہ نوردی کی قوت موج زن ہے۔ اگر تو منزل مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے تو پہلے اُس منزل کو متعین کرلے۔ پہلا قدم اُٹھانے سے پہلے بیٹھ کر اچھی طرح سوچ لے کہ تجھے کہاں جانا ہے۔ اُس آسمانی چراغ کی روشنی میں جو تیرے پاس ہے اس جنگل کے بھیجے ہوئے نقشہ کا خوب مطالعہ کرلے اور منزل رسیدہ مسافروں کے سفرناموں کو غور سے پڑھ لے۔ جب یہ کر چکے تو استقلال اور استقامت کو اپنا رفیق راہ بنا اور خدا کا نام لے کر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں داخل ہو جا۔ اگر راہ میں تیرے پیر تھک جائیں تو قدم اور تیزی کر بڑھا، اگر تجھ پر نیند غالب ہو تو آنکھیں اور اچھی طرح کھول لے، اگر روشنی چھپ جائے اور اندھیرا چھا جائے تو اپنے چراغ کی بتی کو اور اُکسا لے۔ جب تجھے دوسرے رہ نورد نظر آئیں تو ان سے گریز نہ کر کیونکہ وہ تیرے رفیق سفر ہیں، ان کی مدد کرنا تیرا فرض ہے اور اُن سے مدد لینا حق ہے۔ لیکن سہارا لینا ہو تو اُس کا لے جو سیدھے راستہ پر چل رہا ہے، سہارا دینا ہو تو سے دے جو سیدھے راستہ پر چلنا چاہتا ہے ...... اگر تجھے یہ باتیں منظور ہیں تو جا خدا حافظ ورنہ اُٹھ اور اس تالاب میں کود پڑ۔ اگر تیرا بھی وہی انجام ہونا ہے جو میرا ہوا تو رہے کہ تو اپنے وجود سے دنیا کو پاک کر دے ۔"

میں تصویرِ حیرت بنا ہوا مجذوب صاحب کی گفتگو سن رہا تھا۔ اُن کے آخری الفاظ

سن کر میں چونک پڑا مگر قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں وہ اُٹھے اور بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔

خدا جانے انہیں مجھ پر رحم آگیا یا اُن کے دل میں میری طرف سے کچھ امید پیدا ہو گئی۔



جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے

ہندوستان میں برطانوی راج کی برکات و انعامات، انصاف اور حسن انتظام کی داستانیں سنتے سنتے کئی نسلیں گزر چکی ہیں، اگر کبھی کسی غریب ہندوستانی نے ان خداوندان ارضی کی حکومت کے برکات سے انکار کیا تو اس کفران نعمت پر قوم نے اُسے مجنون اور شوریدہ سر کا لقب دیا اور ارباب حکومت کی طرف سے کبھی حبس دوام کبھی عبور دریائے شور اور کبھی سولی کی سزا دی گئی! ظلم و ستم کی انتہا کہئے یا زمانہ کا انقلاب کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اب سوائے چند کاسہ لیسان حکومت کے کوئی نہیں جو برطانوی حکومت کو ظلم و استبداد کا مرادف نہ سمجھتا ہو یا حکومت کے "حسن انتظام" کا قائل ہو، لیکن مظلوم اور دل جلے ہندوستانیوں کی زبان سے نہیں بلکہ خود انگریزوں کی زبان اور قلم نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے متعلق جو کچھ کہا ہے یا لکھا ہے اُس کا کچھ نمونہ بلا کسی اضافہ، ترمیم یا حاشیہ کے نذر کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین بھی اس کو پڑھکر یہی کہنے پر مجبور ہونگے کہ "جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔"

۱۔ ہندوستان کے ایک سابق وائسرائے لارڈ لٹن ۱۸۷۸ء میں بصیغۂ راز اپنے ایک مراسلہ میں وزیر ہند کو تحریر فرماتے ہیں:۔

> "ایک طرف یہ ایکٹ (انڈیا ایکٹ بابتہ ۱۸۳۳ء) منظور ہوا اور دوسری طرف حکومت نے ایسی تدابیر سوچنا شروع کر دیں کہ جس سے عملاً اس ایکٹ کا نفاذ کسی طرح ٹل جائے! اس ایکٹ کے ایک ایک لفظ کو تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے بغور مطالعہ کرکے ذہن نشین کر لیا ہے۔ یہ تعلیم یافتہ طبقہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور خود حکومت اس کو ترقی دینے کی کوشش کرتی ہے حالانکہ حکومت اس طبقہ کے موجودہ افراد کے حوصلوں اور ان کے مطالبات کے پورا کرنے کی بھی گنجائش نہیں رکھتی ہے۔ ہر ہندوستانی جو ایکمرتبہ سرکاری ملازمت میں کسی ایسی

جگہ پر مقرر ہو جائے جو پہلے صرف انگریزوں کے لئے مخصوص ہوتی تھیں تو اس کو حق ہے کہ وہ یہ توقع رکھے اور اس کا مطالبہ کرے کہ قاعدہ کے مطابق ترقی کرتے کرتے اس کو اس صیغہ کی سب سے بڑی ملازمت ملجائیگی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ توقعات اور مطالبات نہ کبھی پورے ہوسکتے ہیں اور نہ ہونے پائینگے۔ ہمارے سامنے دو راستے تھے یا تو صاف طور پر بڑی بڑی ملازمتوں پر ترقی دینے سے ان کو روک دیں یا ان کو دھوکہ دیں۔ ان دونوں طریقوں میں سے ہم نے دوسرا پسند کیا جو سب سے زیادہ نامناسب تھا۔ امتحان مقابلہ کا جو طریقہ انگلستان میں رائج ہے اُس کا ہندوستانیوں پر عمل درآمد یا جس عمر تک امیدوار مقابلہ میں شریک ہوسکتے ہیں اُس میں جو تخفیف حال ہی میں کیگئی ہے یہ سب دانستہ اور کھلی ہوئی دھوکہ بازی ہے تاکہ اس ایکٹ کو بے معنی اور حرف غلط بنا دیا جائے۔ چونکہ میری یہ تحریر راز کی ہے اس لئے مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ میرے نزدیک حکومت انگلستان اور حکومت ہند اس وقت تک اُس الزام کا قابل اطمینان جواب دینے سے قاصر ہیں کہ انہوں نے اپنے مواعید کو توڑنے کے لئے کوئی دقیقہ جو اُن کے اختیار میں تھا نہیں اُٹھا رکھا؟

۲۔ مارکوئس آف سیلسبری سابق وزیراعظم انگلستان ۲۹ اپریل ۱۸۷۵ء کو اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرماتے ہیں:۔

"اگر ہندوستان کا خون چوسنا ہی ہے تو نشتر ایسی جگہ لگایا جائے جہاں خون جمع ہوگیا ہے یا کم از کم موجود تو ہے نہ کہ ایسے حصوں میں جو خون کی کمی کی وجہ سے پہلے ہی سے کمزور ہوچکے ہیں۔"

۳۔ آنریبل ٹی۔ آئی۔ شور اپنی تصنیف مسمی "معاملات ہند پر حاشیہ" کی دوسری جلد کے صفحہ ۵۱۶ پر لکھتے ہیں:۔

"انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اور ہر حیثیت سے پوری ہندوستانی قوم کو اپنے مفاد کا تابع اور محکوم بنالے۔ ان پر زیادہ سے زیادہ ٹکس لگایا جائے۔

چنانچہ جو صوبہ یکے بعد دیگرے ہمارے قبضہ میں آیا ہے وہ اضافۂ محصولات کے لئے ایک نیا میدان سمجھا گیا۔ اس کے بعد ہم اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ہم نے محاصل کی رقم اس سے کئی گنی زیادہ کردی جتنی دیسی راجہ وصول کیا کرتے تھے۔ پھر ہندوستانیوں کو ہر اُس اعزاز اور جائے شرف اور عہدہ سے محروم کردیا گیا جس کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو قبول کرنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔"

۴۔ اڈمنڈ برک نے ۱۷۸۳ء میں فاکس کے ایسٹ انڈیا بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"......لیکن برطانوی حکومت کے ماتحت یہ ترتیب بالکل بدل جاتی ہے۔ تاتاریوں کا حملہ تباہ کن تھا لیکن اب یہ ہمارا سایۂ عاطفت ہے جو ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے۔ ان کی دشمنی نے جو نہ کیا تھا وہ اب ہماری دوستی سے ہو رہا ہے۔ آج بیس برس بعد ہمارا قبضہ اسی طرح بے آئین ہے جیسے اول روز تھا، ہندوستانی لوگ مشکل ہی سے کبھی کسی انگریز کی صورت دیکھنا جانتے ہونگے۔ نوجوان بلکہ لونڈے ان پر حکومت کرنے کے لئے جاتے ہیں جنہیں نہ ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ کوئی ہمدردی ہوتی ہے نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا میل جول۔ گویا وہ اب بھی انگلستان ہی میں رہتے ہیں۔ اگر کچھ تعلقات ہیں تو اس قدر کہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرلی جائے تاکہ یہ دولت آئندہ کسی دور دراز ملک میں جاکر کام آئے۔ جوانی میں جو دولت کی حرص اور جو تیز مزاجی ہوتی ہے اُس سے بھرے ہوئے نوجوان حکمراں یکے بعد دیگرے اُمڈے چلے جاتے ہیں اور ہندوستانیوں کی نظروں میں ان کی حیثیت سوا اس کے کچھ نہیں کہ چڑیوں اور چیلوں کا ایک جھنڈ ہے جو بھوک کی شدت میں اُڑا اُڑ کر برابر جانہ گھاس کی تلاش میں آتا ہے اور پیٹ بھر کرلے جاتا ہے۔"

۵۔ سر طامس منرو اپنی سوانح حیات کی تیسری جلد میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"بادشاہی راج میں ایک طبقہ امرا اور رؤسا کا تھا جس میں جاگیردار، انعام دار، اور اہل احکام عدالت اور افسران فوج شامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ اور دوسرے پیشے تاجر

اس کا شتکار طبقہ ایک ایسی جماعت بن گئی تھی جو محنت سے کما سکتے تھے بلکہ اس کو خوش حال اور فارغ البال ضرور تھے ...... تمام فوائد ہماری حکومت میں جاتے رہے۔ تمام فوجی اور عدالتی عہدے انگریزوں کے ہاتھ میں جن کی اندوختہ رقم خود اُن کے ملک میں چلی جاتی ہیں ...... پھر ایسے نظام حکومت کو جاری رکھتے ہوئے جس کا رجحان ساری قوم کی سیرت کو ارذل بنانا ہے ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تعلیم کے ذریعہ ان کی سیرت کو بہتر اور اصلیٰ بنانے کی ہم کو بڑی فکر ہے۔"

۶۔ سر ہنری کاٹن اپنی تصنیف "نیو انڈیا" کے صفحہ ۱۱۳ اور ۱۱۵ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے روز افزوں افلاس اور غربت کے بہت سے اسباب ہیں لیکن اصلی سبب جو میں نے تلاش کیا ہے وہ دیسی صنعتوں کی تباہی اور اُن کی بجائے بدیسی صنعتوں کا فروغ پانا ہے۔ ایک اور سبب ہندوستان کی غربت کا وہ 'خراج' بھی ہے جو ہر سال یہاں سے جاتا رہتا ہے۔ 'مطالبات وطن' سال بسال بڑھتے جاتے ہیں۔ سب باتوں کا لحاظ رکھ کر اگر اُس رقم کا اندازہ لگایا جائے جو سالانہ ہندوستان سے برطانیہ عظمیٰ کو د مختلف صورتوں اور مختلف ناموں سے جاتی ہے تو اُس کی میزان کم از کم ۳۰ کروڑ روپیہ ہوگی۔"

۷۔ دارالعوام میں معاملات ہند پر ایک مباحثہ کے دوران میں جان برائٹ نے ۱۸۵۳ء میں کہا تھا کہ:۔

"دیسی تعلیم کا جو نظام ہمارے ملک میں عام طور پر رائج تھا کہ ہر گاؤں میں ایک مدرسہ ہوتا اُسی طرح ضروری تھا جیسے ایک پٹیل یا ایک مکھیا کا ہونا۔ اس نظام تعلیم کو حکومت نے تباہ کر دیا لیکن اس کے بدلے میں ابھی یا تو کسی قسم کا بھی انتظام نہیں کیا گیا کہ اس کمی کو پورا کیا جاتا؟"

۸۔ 'دامن مشرق پر ایک سیاہ دھبہ' کے دیباچہ میں سر والٹر اسٹرک لینڈ لکھتے ہیں:۔

٭ راقم الحروف نے [illegible]

ایشیائی اور پردہ نشین لوگوں کے ساتھ بود و باش رکھی لیکن جو تجربات اس طرح حاصل ہوئے ان سے معلوم ہوئے اس عقیدہ میں کوئی بھی واقعیت نہیں ہوتی کہ مشرق میں بدعنوانی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت بدعنوانی رشوت ستانی اور جبلی حکومت ہے جو محض اس قوم کو تباہ کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے جن کے مفاد کا خیال رکھنے کا بظاہر دعویٰ کیا جاتا ہے"

۹۔ اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ مصنف مذکور تحریر فرماتے ہیں:۔

"جو انگریز ان سطور کا مطالعہ کرے اس کو غور کرنا چاہئے کہ جب وہ سیلون کی سستی چائے کا کوئی گھونٹ پیتا ہے تو وہ اس حد تک انسان کا خون پیتا ہے۔ واضح ہو چائے نہیں ہے جو پی جاتی ہے بلکہ غریب اور مفلس غلاموں کا خون ہے جس میں سے زندگی اور حیات کا سرخ رنگ اڑ گیا ہے! اگر خدا انصاف کرتا تو ہر قطرہ جو ان کے حلق سے اترتا ہے وہ ایک زہر بن کر اس ساری قوم کے جسم سے قوت اور مردانگی کو زائل کر کے اس کو ارذل نامرد اور ناکارہ قوم بنا دیتا"



سیّد قاسم آذربائیجانیؒ

قاسم انوارنام، قاسم تخلص، آذربائیجان کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے دو مرتبہ پیا
حج کیا ہے۔ ہرات میں لبسلسلہ تلقین ارباب یقین کچھ عرصہ تک قیام رہا، پھر سمرقند چلے آئے ا
میں بمقام جام انتقال کیا۔ مجھے اپنے والد کے کتب خانے میں ان کا قلمی دیوان ملا ہے
خوش نویس کا قلمی ہے جس کو اُس نے ۱۰۲۱ھ میں گویا سید قاسم کے انتقال کے ۲۶۶
بعد لکھا تھا۔ باقی صحیح حالات تاریکی میں ہیں۔ کلام میں نہ صرف زور اور مستی پائی جاتی۔
سوز و گداز سے بھی بھرا ہوا ہے۔ بعض غزلیں خواجہ حافظ کی غزلوں کے جواب میں ہیں
حافظ کی غزل ہے ؎ "تا زمیخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود۔ سید قاسم نے اس زمیں
دو غزلہ لکھا ہے اس کے علاوہ قافیہ بدل کے بھی دو غزلیں لکھی ہیں۔ خواجہ حافظ کا شعر

تا زمیخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود — سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

پہلی غزل میں سید قاسم نے حافظ کے مصرعہ پر یہ گرہ لگائی ہے ؎

ما دریں دیرِ مغاں بہرِ نیاز آمدہ ایم — سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

دوسری غزل میں "پیرِ مغاں" کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

عاشقاں تو من و ایمان شہادت آنکہ — ایں ہم از دولتِ آں پیرِ مغاں خواہد بود

اس میں "من" کے بعد "و" ہے اس وجہ سے مصرعہ موزوں نہیں ہوتا اس کے علا
میں بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔

نہاں۔ خواجہ صاحب نے یہ قافیہ اس طرح باندھا ہے ؎

برو اے زاہد خود بیں کہ زچشمِ من و تو — رازِ ایں پردہ نہاں ست نہاں خواہد بود

سید قاسم نے اس کو صوفیانہ رنگ میں اس طرح نظم کیا ہے ؎

من رأنی و انا لحق چه سخن می گویم — تا تو بیدا نشوی یار نہاں خواہد بود

اس کے بعد سید قاسم نے حافظ کے قافیوں میں کوئی شعر نہیں لکھا ہے بلکہ طبع زاد قافیوں میں غزل کو پیدا کیا ہے۔ وحشت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ؎

تا تو از خلوتِ غیر عازمِ خلوت نشوی — دل ما نعرہ زناں جامہ دراں خواہد بود

مگر پہلے مصرعہ میں لفظ "غیر" کی "ر" یا لفظ "عازم" کا "ع" گرتا ہے۔

دوسری غزل میں اسی مضمون کو کسی تبدیلی کے ساتھ باندھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

دل اگر روئے ترا باز نہ بیند ہیہات — دائما نعرہ زناں جامہ دراں خواہد بود

خفقان کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

تا نہ بینم رُخِ زیبائے تو شاداں نشوم — سینہ پُرسوز ، دلم پُر خفقاں خواہد بود

"سر بارگراں ہے" اس مضمون کو اس طرح باندھا ہے ؎

قاسمی سر بفدائے تو کند روزِ وصال — سرِ ما برتنِ ما بارگراں خواہد بود

نگراں۔ خواجہ حافظ نے یہ قافیہ اس طرح لکھا ہے ؎

چشمم آں دم کہ زشوق تو نہد سر بہ لحد — تا دمِ صبحِ قیامت نگراں خواہد بود

سید قاسم نے اپنی دوسری غزل کے مقطع میں نگراں کا قافیہ اس طرح نظم کیا ہے لیکن مضمون کچھ دلچسپ اور شگفتہ نہیں ہے ؎

عشق می گفت کہ قاسم بچہ کارست دریغ — خبر خیر کہ خاطر نگراں خواہد بود

دوائے دارد۔ اس میں خواجہ حافظ کے دو شعر قابل ذکر ہیں ؎

اشک خونیں بطبیباں بنمودم گفتند — دردِ عشق ست و جگر سوز دوائے دارد

نغز گفت آں بت ترسا بچۂ بادہ فروش — شادی روئے کسے جو کہ صفائے دارد

سید قاسم نے بھی اس زمین میں غزل لکھی ہے اور نہایت خوبی سے انہیں قافیوں کو اس طرح نظم کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

جانم از دولت درد تو دوائے دارد   دلم از صیقل ذکر تو صفائے دارد

خواجہ حافظ نے "شادی روئے کسے" کو "صفائے دارد" سے ممتاز کیا تھا لیکن سید قاسم "صیقل ذکر" سے مصرعہ کو لبند کر دیا۔ شاہ تراب علی قلندر کاکوروی نے بھی اس زمین میں غزل لکھا ہے۔ مطلع خوب ہی کہا ہے ؎

عشق دردیست کہ ہرگز نہ دوائے دارد   ہر کہ دارد دل پُر درد بلائے دارد۔

دلبری داند۔ اس میں خواجہ حافظ کی مشہور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

سید قاسم نے دلبری کا قافیہ ایک نئے انداز سے باندھا ہے ؎

چنانکہ چشم تو در غمزہ دلبری داند   سواد زلف سیاہت ستمگری داند

خواجہ حافظ کا مقطع ہے ؎

ز شعر دلکش حافظ کسے شود آگاہ   کہ لطف طبع و سخن گفتن دری داند

سید قاسم مقطع ہی میں اس کا جواب دیتے ہیں ؎

حدیث وصف نعت بجو قاسمی گوید   بوجہ احسن اگر کس سخنوری داند

پروانہ قافیہ۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ آگ وہ نہیں ہے کہ جس کے شعلہ پر شمع ہنسے! آگ وہ ہے جو بھڑک کر پروانہ کے خرمن میں جا لگی ؎

آتش آن نیست کہ بر شعلۂ او خندد شمع   آتش آن ست کہ بر خرمن پروانہ زدند

سید قاسم نے اسی مضمون کو نہایت دلکش انداز میں اس طرح لکھا ہے کہتے ہیں کہ ساقی نے عشاق میخانہ کی دعوت نہیں دی بلکہ پروانہ کے دل میں آگ لگا دی ؎

عاشقان را چو صلا جانب میخانہ زدند   آتشے بود کہ سوز دل پروانہ زدند

میرا جہاں تک خیال ہے سید قاسم کا شعر خواجہ حافظ سے بڑھ گیا ہے۔

پیمانہ زدند۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند — گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

سید قاسم کہتے ہیں ؎

عکس ساقی چو دریں بادۂ صافی افتاد — عاشقاں از ہوس ساغر و پیمانہ زدند

بکام ست امروز ۔ اس میں خواجہ حافظ کا شعر ہے ؎

روز عیش و طرب و ماہ صیام است امروز — کام دل حاصل ایام بکام ست امروز

سید قاسم جواب میں مطلع لکھتے ہیں ؎

از لب لعل تو ام کار بکام ست امروز — فلکم بندہ و خورشید غلام ست امروز

دوسرے مصرعے نے شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے ۔

خواجہ حافظ کا شعر ہے ؎

گو عروس فلکی رخ منما از مشرق — کہ مرا دیدن آں ماہ تمام ست امروز

سید قاسم کہتے ہیں ؎

ہر کہ قانون شفائے دل خود می طلبد — ز اشارات نفس کار تمام ست امروز

غماز قافیہ ۔ اس میں خواجہ حافظ لکھتے ہیں ؎

چگویمت کہ ز سوز دروں چہ می بینم — ز اشک پرس حکایت کہ من نیم غماز

سید قاسم نے "غماز" کا قافیہ اس طرح لکھا ہے ؎

ز چشم مست تو ستم کہ اہل صومعہ را — رسیدہ پند تو تقوی بغمزۂ غماز

ایاز ۔ اس قافیہ میں خواجہ حافظ نے زلف ایاز کو کرشمۂ حسن کی غرض ثابت کیا ہے ؎

غرض کرشمۂ حسن ست ورنہ حاجت نیست — جمال دولت محمود را بزلف ایاز

سید قاسم نے بجائے زلف ایاز کے حسن ایاز نظم کر کے [illegible]

دیا ہے ؎

[illegible] — [illegible] جمال حسن ایاز

دوسرے مصرعہ میں لمعات سے پہلے جو لفظ ہے اُس مصرعہ میں باعتبار موزونیت ایک قسم کی ثقالت پائی جاتی ہے کیونکہ بغیر مشدد کئے مصرعہ موزوں نہیں ہوتا ممکن ہے کہ سہو کتابت ہو اور اس جگہ کوئی اور لفظ ہو۔

چاک ۔ خواجہ حافظ معشوق کی خوشبو سونگھ کر گریبان چاک کرتے ہیں ؎

نفس نفس اگر از باد نشنوم بویت — زماں زماں کنم از غم چو گل گریباں چاک

دونوں مصرعوں میں تکرار نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ سید قاسم نے چاک کا قافیہ لکھا ہے لیکن نہایت کمزور ؎

چہ بود قصہ لیلیٰ دریں نشیمن خاک — چہ بود حالت مجنوں ست دامن چاک

حاشاک ۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں اگر تیرے خیال میں دونوں آنکھیں سو جائیں یا تیرے فراق میں دل کو صبر آ جائے کیا ایسا ممکن ہے ؟ ہرگز نہیں۔

رود بخواب دو چشم از خیال تو ہیہات — بود صبور دل اندر فراق تو حاشاک

سید قاسم معشوق سے کہتے ہیں کہ تو اس درجہ لطیف و ظریف ہے کہ لطافت حسن کی وجہ سے تیسے کلبۂ احزاں میں قدم رکھنا ہی دور از قیاس ہے ؎

چناں لطیف و ظریفی کہ از لطافت حسن — قدم بکلبۂ احزان من نہی حاشاک

"حاشاک" کے قافیہ کا سید قاسم نے ایک شعر اور بھی لکھا ہے مگر اس کا پہلا مصرعہ موزوں نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے کہ کوئی لفظ چھوٹ گیا ہو ؎

ولی منظر انساں کہ مظہر خاص ست — قیاس مظہر دیگر مکن مگو حاشاک

ادراک ۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ ہر شخص کی نظر اپنی عقل و ادراک کے موافق تجھے دیکھتی ہے لیکن جیسا کہ تو ہے ویسا کہاں دیکھ سکتی ہے ؎

ترا چنانکہ توئی ہر نظر کجا بیند — بقدر بینش خود ہر کسے کند ادراک

سید قاسم کہتے ہیں کہ ضد کے نور سے جہان بھرا پڑا ہے لیکن اندھی آنکھیں اس کا کیسے ادراک

تا ہیں ؎

جہاں پرست زنور خدائے عز وجل   ولیک دیدۂ اعمش نمی کند ادراک

سید قاسم نے فقر و شاہی کا نہایت دلچسپ مکالمہ لکھا ہے۔ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں:

مکالمۂ فقر و شاہی

فقر می گفت کہ من افسر جا دیدانم   شاہ می گفت کہ من سایۂ آں سلطانم
فقر می گفت بہر جائے منم شمس منیر   شاہ می گفت چنین ست ولے نتوانم
شاہ می گفت کہ من حاکم بر و بحرم   فقر می گفت کہ ہر دو بجوے نستانم
شاہ می گفت کہ من ملک جہانی دارم   فقر می گفت کہ من جنت جاودیدانم
فقر می گفت کہ فردا کہ قیامت گردد   نہ غم از پل صراط ست نہ از میزانم
شاہ می گفت کہ صد درد دریغست مرا   آں زمانے کہ بہ بدکردۂ خود درمانم
شاہ را گفتم چونے بقیامت گفتہ   ایں سخن از دگرے پرس کہ من حیرانم

یں پہلا مصرعہ غیر موزوں ہے۔

اندراں روز من محنت و غم افزا دم   مرکب جاں بسر کوئے یقیں می رانم

اس مکالمہ کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ شاہ نہایت عاجزی سے شہنشاہ حقیقی کی بارگاہ میں سربسجود

ور اس طرح عرض پرداز ہے:-

بادشاہا بسر کوئے نیاز آمدہ ام   سر بکوے تو کہ عید دگہ قربانم
شہریارا بکرم عذر دل من بپذیر   کہ بدرگاہ تو ہم بو ذرو ہم سلمانم
قاسمی عمر گرامیست بغفلت مگذار   عمر برباد شد اکنوں چہ بود درمانم

ایک بہت مشہور غزل ہے جس کا پہلا مطلع یہ ہے ؎ قصر جنت چہ کنم کوچۂ یارے دارم

نرس دو نرخ نکنم روئے نگارے دارم ۔ سید قاسم نے اس طرح پر بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ منتخب دو شعر یہ ہیں :-

چشم گریان و دل زار و نزارے دارم　　　　درنہاں خانۂ دل نقش و نگارے دارم

ہمچو بلبل کہ بنالد بہ ہوائے گل مست　　　　با خیالش ہمہ شب نالۂ زارے دارم

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ جن کا کلام " دیوان شمس تبریز " کے نام سے چھپا ہے ان کے دیوان کے صفحہ ۲۰۰ میں ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

با روئے تو ز گلشن و گلزار فارغیم　　　　با چشم تو ز بادۂ و خمار فارغیم

سید قاسم نے اس زمین جو غزل لکھی ہے اُس میں ہو بہو یہی مطلع موجود ہے ۔ صرف دو لفظوں " بادہ " اور " خانہ " کا فرق ہے بس دیکھئے ؎

با روئے تو ز بادۂ و گلزار فارغیم　　　　با چشم تو ز خانۂ خمار فارغیم

اسی طرح مولانا روم رح کا شعر ہے کہ

ما لاف می زنی و تو انکار می کنی　　　　ز اقرار جملہ عالم و انکار فارغیم

سید قاسم کی غزل میں یہ شعر بھی موجود ہے لیکن کسی قدر تبدیلی سے ؎

ما درد دوست را بدو عالم نمی دہیم　　　　ز اقرار ہر دو عالم و انکار فارغیم

حقیقت یہ ہے کہ پہلے مصرعہ نے مضمون بہت بلند کر دیا ہے ۔

مولانا روم رح نے " غمخوار " قافیہ اس طرح لکھا ہے اور خوب ہی لکھا ہے ؎

غم را چہ زہرہ باشد تا نام ما برد　　　　دستے بزن کہ از غم و غمخوار فارغیم

سید قاسم اسی قافیہ کو ایک دوسرے عنوان سے اس طرح باندھتے ہیں ؎

اے جان من اسیر مشو در طریق غم　　　　رقصے بکن کہ از غم و غمخوار فارغیم

اب ہم سید قاسم کے کچھ منتخب شعر لکھتے ہیں ۔

حمد

من بے چارۂ سودا زدہ سرگردانم — کہ باوصاف خداوند سخن چوں رانم
من و توحید تو ہیہات قلم می لرزد — اینقدر بس کہ حدیثت بزباں می رانم
من بپایان صفات تو کجا رہ یابم — عاجزم نعت قلم بے سر و بے سامانم

نعت

علیہ الصّلٰوت و علیہ السّلامی — امینی زمینی امانی زمانی

ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

ای صبح سعادت ز جبین تو ہویدا — ایں حسن چہ حسن ست تقدس تعالیٰ

نعت میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے دو شعر قابل ذکر ہیں۔ ایک مطلع ہے جسمیں تنہائی اور سوز و گداز کی تصویر کھینچی ہے ؎

جگر پر درد دل پر خوں امان حسرتا یارا — دریں حالت نمی آید دو عالم در نظر مارا

دوسرا شعر یہ ہے ؎

محمد را ہمائی کنار خوان احساں بر — شراب از جام سبحاں بر کہ سبحان الذی اسریٰ

۸۳۷ھ میں سید قاسم نے انتقال اور مولانا جامیؒ نے ۸۹۸ھ میں وفات پائی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا جامیؒ نے اسی قصیدہ پر وہ غزل لکھی ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

ز روح سینہاش جامی الم نشرح لک برخواں — ز معراجش چو میخوانی کہ سبحان الذی اسریٰ

مولانا جامیؒ نے جس خوبی سے "سبحان الذی اسریٰ" نظم کیا ہے سید قاسم اس جدت سے نظم نہ کر سکے۔ سچ ہے "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء"۔ اب سید قاسم کے قصیدہ کے کچھ شعر اور سن لیجئے جو دلچسپی اور خوبی سے خالی نہیں ہیں۔

تو خار رہ سے سیمدں را بر افشاں جعد مشکیں را — کہ ای پیام نو رسیدہ و نسیم جنت المادیٰ

اگر از اسم قہاری تجلی می کند ما رے　　بگو کر مرد اقراری نشان طامۃ الکبریٰ
پس آنگہ عالم افعال و آثار ست پیوستہ　　زہے حکمت زہے قدرت تعالیٰ ربنا الاعلیٰ
ز خورشید جمال او بہر وصفے می گویم　　ہمہ ذرات می گویند شہدنا بعد آمنّا
بباید رفتن و خفتن حدیث عشق بنہفتن　　سخن گفتن ز اوصاف گہ او صاف لا تخفیٰ
بیا اے جان خوش سودا بہ بیں نور تجلی را　　خطاب مستطاب را بگو لبیک ما او حیٰ
توئی مومن توئی ایماں توئی سرچشمۂ حیواں　　توئی سلطان جاویداں توئی مقصد توئی ملجا
شریعت از تو روشن شد طریقتہا مبرہن شد　　حقیقتہا معین شد زہے یٰسں زہے طٰہٰ
الا اے احمد مرسل چراغ مسجد و منبر　　توئی سید توئی سرور توئی از مسجد اقصیٰ

ایک موقع پر عاشقانہ انداز میں اپنی بیقراری اس طرح دکھاتے ہیں ؎

از حد گذشت قصۂ درد نہان ما　　ترسم کہ نالہ فاش کند راز جان ما

معشوق کے بغیر زندگی تلخ ہے اس کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

بے جمالت بوستان عشق ما را نور نیست　　بیو صالت خاطر مہجور ما مسرور نیست

ہجر میں معشوق کا تصور ہے پھر اس سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

اے دل و دلدار من راہ بوصل آنچہ روست　　اے بت عیار من راہ بوصل آنچہ روست

توحید وجودی میں کہتے ہیں ؎

بچشم وحدت مطلق بدیدم روئے جاناں را　　دریں حالت نمی آید دو عالم در نظر ما را

ایک عاشقانہ سلام لکھا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہے جس کے نمونتاً چار شعر لکھے جاتے ہیں۔

نور ولایت توئی شاہ سلامٌ علیک　　شمع ہدایت توئی شاہ سلامٌ علیک
[illegible]　　[illegible] شاہ سلام علیک

درج دربلا فیٔ برج مہ حسل الیٰ — انت ولی الولا شاہ سلامٌ علیک

غیر ولایت توئی حسن ملاحت توئی — غایت غایت توئی شاہ سلامٌ علیک

مذکورالصدر شعر قافیہ کی قید سے آزاد ہے۔ اسی طرح یہ شعر ہے ؎

حیدر صفدر توئی ساقی کوثر توئی — خواجہ قنبر توئی شاہ سلامٌ علیک

ایک ایک شعر سے عقیدت ٹپک رہی ہے۔ کیوں نہ ہو آخر صوفی مشرب ہیں۔ ایک سلام اور لکھا ہے جس کے دو شعر نہایت ہی دلکش ہیں۔

اے زلف و رخت میگوں ای دوست سلام علیک — دے شیوۂ تو موزوں ای دوست سلام علیک

دریا ہمہ ہاموں شد دلہا ہمگی خوں شد — جاں جانب بیچوں شد ای دوست سلام علیک

طالب و مطلوب دونوں کا کمال اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

عشق بغمزہ فال داد بوجہ کمال — عشق مرا لم یزل۔ حسن ترا لا زوال

ش میں آکے کہتے ہیں ؎

مائیم کہ چوں بادۂ گلرنگ بنوشیم — گہ بادہ بنوشیم گہے بادہ فروشیم

ایک جگہ دیدار میں انتہائی شغف کی حالت اس طرح دکھاتے ہیں ؎

دینار نمی خواہم من عاشق دیدارم — اغیار نمی خواہم من شیفتۂ یارم

رد فراق میں بحالت تنہائی معشوق سے اس طرح کہہ رہے ہیں ؎

از نائرۂ شوقت در دل شررے دارم — با طلعت خورشیدت عشق و نظری دارم

شوق کے تصور میں مگن ہیں۔ اس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

از دولت او شادم وز بند غم آزادم — در خلوت جان و دل زیبا قمری دارم

، و اثبات کے شغل کی اس طرح تعلیم دیتے ہیں ؎

لا زنم لا لا زنم لا بر سر الا زنم — من بیخ لا ما بر کنم بیچون ثارم انا الا نشاں

ہیں اگر میرے دل پر معشوق غمزوں کے تیر مار رہا ہے تو کیا پروا۔ ابھی وہ اس سے بھی زیادہ

جفا کرے تب بھی میرا کام صدق و صفا رہنا چاہیئے ؎

ناوک غمزہ می زند بر دل مسکین من　　صد رہ اگر جفا کند صدق و صفاست کار من

انسان میں تجلی الٰہی موجود ہے اس کو نہایت مدلل طریقہ سے بیان کرتے ہیں ؎

گر نبودے نور حق در ما و طین　　کے بدے ادراک در سمع و بصر

حقائق میں اپنا تحیر دکھاتے ہیں ؎

بچہ نسبت کند جاں کہ نشست در تو حیراں　　نبود ہیچ کس نہ ماند تو بہ ہیچ کس نماند

رباعیاں

آشفتہ‌ام بملاقات تو چندانکہ مپرس　　احتیاجم براعات تو چندانکہ مپرس

دارم امید عنایات تو چندانکہ مپرس　　شادم از ذوق مناجات تو چندانکہ مپرس

من بندۂ شیوہ ہائے شیرین تو ام　　آشفتۂ طرہ ہاے مشکین تو ام

گفتی کہ بگو تا چہ کسی در رہ ما　　مسکین تو مسکین تو مسکین تو ام

اے دلبر دلدار طلب گار تو ایم　　اے منبع انوار طلب گار تو ایم

اے سالک اطوار طلب گار تو ایم　　اے واقف اسرار طلب گار تو ایم

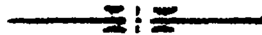
ہرچند کہ در زمانہ یک محرم نیست　　بنیاد و اساس دوستی محکم نیست

ما در ہمہ حال در غمش دلشادیم　　چوں غم بملامت است دیگر غم نیست

دل عاشق چشم مست ترکانهٔ تست — تو شمعی و عالم همه پروانهٔ تست
جان و دل ما عاشق دیوانهٔ تست — تو خانهٔ دل شدی و دل خانهٔ تست

در دیدهٔ چون سحاب (خونباری) من رحمت کن — بر فقر و نکوساریٔ من رحمت کن
بر گریهٔ بیداریٔ من رحمت کن — بر مفلسی و خواریٔ من رحمت کن

تا بر سر کوی عاشقی منزل ماست — سرّی ز ابدی و ازلی منزل ماست
تا نشأ عشق تو ز آسایش ماست — سرنامهٔ نامها بنام دل ماست



یادگارِ اساتذہ حضرت اثر رودولوی

فصلِ بہار آئی مسرت کا جوش ہے — ہنگامہ سازِ انجمن نای و نوش ہے
کیا خوش نوائی قلقلِ مینا گیوش ہے — بے بادہ مست خاطرِ ہر بادہ نوش ہے
مرکر بھی پردہ داری سوزِ نہاں رہی — گو شمع ہے مزار پہ لیکن خموش ہے
اے چشمِ خونفشاں کوئی رنگ اپنا تو دکھا — سنتے ہیں اب فسانۂ غم بار گوش ہے
اے شوقِ بےخبر نگہہ نازِ فتنہ زا — صد برقِ خرمنِ خرد و عقل و ہوش ہے
مایوسیوں سے آہ تمنائیں مٹ گئیں — اب وہ نہ ذوق و شوق نہ جوش و خروش ہے
کیونکر طلسم جلوہ گہہ راز کھل سکے — ہر کامیاب اہلِ تماشا خموش ہے
پھر دلفریب و روح فزا ہو دہی صدا — پھر محوِ اضطراب تمنائے گوش ہے
دیکھی ہے جس نے صورتِ حیرت فزا کوئی — شکلِ شبیہ آئینہ ہر دم خموش ہے
پھولے پھلے نہالِ تمنائے باغباں — ہر گوشۂ قفس سبدِ گل فروش ہے

ہاں اے اثر سنا کوئی روداد خونچکاں
مشتاق بگوش قصۂ عبرت نیوش ہے

محبت کی جیت

فرانس کے مشہور انشاپرداز و افسانہ نویس موپسان کا یہ ایک دل پذیر* افسانہ ہے جسے مصر کے مشہور مرحوم و مغفور ادیب محمد تیمور نے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں عربی کا جامہ پہنایا۔ مترجم کا بیان ہے کہ "اس نے اس افسانے کے اشخاص اور زمان و مکان کو بدل دیا ہے اور اس کے ہر جزو میں مصریت پیدا کر دی ہے۔ اب اس میں روح کے سوا اصلی کاتب کی کوئی شے باقی نہیں ہے۔ یعنی روح فرانسیسی ہے اور قالب مصری! اس بات میں مترجم نے ٹالسٹائے کے نقش قدم کی پیروی کی ہے جو اس نے موپسان کے ایک قصہ کے ترجمے میں اختیار کیا تھا" میں نے اسے بجنسہ عربی سے اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور لفظی و معنوی کوئی تغیر نہیں کیا۔

محوی

محمد بک عبدالقادر ایک پچپن سالہ شخص ہے، اس کی آنکھیں سیاہ، ناک لمبی، بھویں جڑواں ہیں۔ مونچھیں ترشواتا ہے، داڑھی چھوڑ رکھی ہے۔ جب چلتا ہے تو آہستہ آہستہ سکون و وقار کے ساتھ، اور جب بیٹھتا ہے تو اپنی کرسی پر پالتی مار کر، اپنے موزے اتار کر، یہ لمبا کوٹ پہنتا ہے، اس کے سوا یورپ کے لباس میں سے کوئی چیز پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ لباس بظاہر اپنی وضع قطع اور صورت شکل کے لحاظ سے ثقاہت لئے ہوئے ہے اور پرہیزگاری و تقوے کا لباس معلوم ہوتا ہے۔

محمد بک اپنی تمام بات چیت اور قول و فعل میں ایک پکا مسلمان ہے، وہ مذہب کے لئے گھلا جاتا ہے، اگر کسی ایسے بد دین، ملحد سے مقابلہ ہو جائے جو خدا کو

ڈرتا ہو نہ رسول سے تو پوری مدافعت سے کام لیتا ہے ، پردۂ نسوان کی ہر مجلس میں تائید کرتا ہے ، خاصکر جہاں قدیم عادات کے پیرو اور پرانی روشنی کی تقلید کے موافق و طرفدار لوگ ہوں تو اُن کی تائید کرتا ہے کسی نئی روشنی کے مسلمان نوجوان کو جب کسی دکان پر بیٹھا ہوا جام شراب کے دور میں مصروف دیکھتا ہے تو اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے ، پھر غصّے میں زمین پر نفرت سے تھوکتا ہوا چلدیتا ہے ۔ قرآنی آیات پڑھتا جاتا ہے ۔ کریوں بنک میں تقریباً بیس ہزار پونڈ اُس کے جمع ہیں ۔ مگر اس کا سود وغیرہ نہیں لیتا ، خدائے عزوجل کے اس ارشاد کی پیروی میں کہ " احل اللہ البیع وحرم الربوٰا" (خدا نے لین دین کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام) وہ اسے ناجائز بلکہ حرام جانتا ہے ۔

محمد بک ایک خوبصورت محل میں رہتا ہے ، جو دریائے نیل کے کنارے پر بنا ہوا ہے ، اور جسے ایک دل کشا باغ اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے ۔ اس کے درخت جھوم جھوم پڑتے ہیں ، جب نسیم خوشگوار انہیں دھیمے دھیمے ہچکولے دیتی ہے ۔ اس میں ننھی ننھی خوبصورت چڑیوں کے جان نواز نغمے سننے میں آتے ہیں ، جو نیل کی موجوں کے نغموں سے ملے جلے ہوتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسین و پرسکون موسیقی ایک عاشق مایوس کے کانوں کے لئے نوائے نغمۂ محبت ہے ۔ جس وقت مغرب سے کچھ پہلے درختوں کی آڑ سے شفق سرخ نمودار ہوتی ہے ، اور آسمان اپنا لال جوڑا پہنتا ہے تو دیکھنے والا یہ تصوّر کرتا ہے کہ یہ سرخی رات کے آنسوؤں کی ہے ، جو دن کی روشنی کو وداع کرنے کے لئے نکل آئے ہیں ۔ جس وقت اس گنبد نیلی فام پر چاند کسی رات جلوہ پیرا ہوتا ہے ، خاصکر جب کہ رات بھی موسم گرما کی ہو ، تو دلکشی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ طلوع فجر تک دیکھنے والے کا جی باغ سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا ۔ یہ ایک بڑی خوش نصیبی ہے جو خدائے برتر نے اس نیک بخت بوڑھے کو اپنے خزانہ قدرت سے عطا کر رکھی ہے ۔ اس کی نیک بختی ، پرہیزگاری

اور اس کی عبادت و ریاضت کے صلے ہیں۔ اس کی بدولت بک کا دل مسرور اور آنکھیں ٹھنڈی رہتی ہیں۔ اس کے چہرے پر خوشی و مسرت کی چمک ہوتی ہے، جب وہ خدا کا نام لیتا ہے اور اس کی پیشانی پر نور مسرت نمایاں ہوتا ہے، جب وہ اپنے نبی کریم پر درود بھیجتا ہے۔ یا کوئی دُعا پڑھتا ہے۔

مگر محمد بک عبدالقادر کی اولاد صرف ایک حسین صورت، خوش کلام، خوش اندام دوشیزہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ یہ دوشیزہ گلستان شعر کی وہ نرگس جمیلہ ہے جس کے آگے ہر بلند خیال و بدیع فکر شاعر ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ وہ کچھ اوپر بیس سال کی عمر کو پہنچ چکی ہے، اور اب اُس کے شفیق باپ کو زیادہ تر اُسی کے بیاہ شادی کی فکر دامنگیر رہتی ہے، وہ اپنی شریک زندگی بیوی سے اس بارے میں بارہا بات چیت بھی کر چکا ہے، نیز کئی ایک امیر خاندان کے نوجوانوں کے نام بھی بتا چکا ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک نوجوان کو انتخاب کرتے ہیں جس میں انہوں نے مطلوبہ اوصاف پائے ہیں مگر لڑکی اس نوجوان سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیتی ہے، ماں بیٹی میں جو کچھ بات چیت ہوئی تھی، اس کی اطلاع ماں نے اپنے شوہر کو دی۔ یہ انکار اُسے سخت ناگوار ہوا اور اس نے بہت کچھ افسوس کیا تھا ایک دوسرا لڑکا انتخاب کیا اور ماں کے ذریعے لڑکی کو اطلاع دی۔ مگر لڑکی نے اس نسبت سے بھی نارضامندی ظاہر کی بلکہ شادی ہی سے انکار کر دیا۔ نوجوان لڑکی کے شادی سے اظہار بیزاری نے باپ کو سخت غضب ناک کر دیا۔ ماں باپ کے حکم سے بیٹی کی اس نافرمانی نے سارے گھر میں ایک قیامت برپا کر دی۔ غصے میں جو کچھ بک کے دل اور منہ میں آیا اس نے اپنی بیٹی کو کہہ سنایا، خوب ڈانٹا ڈپٹا اور نہایت درجہ ناراضی کا اظہار کیا۔ محمد بک کی اس بیجا سختی نے جو اسے ہر قدیم عقیدے کے ساتھ

تھی، خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا۔ اُسے پہلے نوجوان کے ساتھ لڑکی کو بیاہ دینے پرآمادہ کردیا۔ اور اس نے اپنا یہ حکم ناطق لڑکی کے کانوں تک پہنچا دیا۔ وہ بھی اس سختی کے ساتھ جو اس سے پہلے اس نازپروردہ بیٹی نے اپنے نیک بخت باپ کی جانب سے کبھی نہیں دیکھی تھی مگر لڑکی نے صبروخاموشی اور آنسوؤں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔

(۲)

ماں ایک آنکھ یہ نہ دیکھ سکی کہ اس کی پیاری بیٹی زار زار روئے، اُسے یہ گوارا نہ ہوا کہ اس دوشیزہ کی جوانی یوں خاک میں ملے، اور اس کا جائز حق چھین لیا جائے اُس کی شباب کی امیدوں کو پامال کیا جائے، وہ اس کی حسرتوں کو یوں ساحل یاس پر چھوڑ دے۔ ماں ایک روز سویرے اپنی بیٹی کے پاس تنہائی میں گئی، جبکہ اُس کا باپ کسی دوست سے ملنے کے لئے گھر سے باہر گیا ہوا تھا اُس نے پہلے تو یہ عہد کیا کہ اپنے شوہر کے ہر ظلم وستم کے مقابلے میں وہ ایک قوی بازو معاون ہوگی پھر قسم دے کر لڑکی سے شادی کے بارے میں گفتگو کی۔ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر ماں کے آگے رونے لگی، اور رو رو کر اس سے رحم وامداد کی طالب ہوئی۔ مگر زبان سے اس نے کچھ نہ کہا۔

آخر یہ لڑکی اس قدر بلک بلک کر کیوں روئی؟ اتنی بیتاب اور بے قرار کیوں ہوئی؟ آخر وہ کیا بلا ہے، جس نے اس کے پاک دل میں یہ چھپی ہوئی آگ بھڑکائی؟ ہر دوشیزہ شادی کی آرزومند ہوتی ہے، امیر اور حسین نوجوان کو پسند کرتی ہے، اس کے باپ نے جو لڑکا اس کی شادی کے لئے انتخاب کیا ہے، وہ خوش اخلاق ہے، شریف النسب بھی ہے، خوش اندام اور خوبصورت بھی، روپے والا بھی ہے اس کے ساتھ شادی کرنے سے کیوں انکار کرتی ہے؟ غالباً اس میں کوئی اور راز

ہے! یہ باتیں تھیں جو اُس کی ماں اپنے دل سے کر رہی تھی۔ اور اپنی بیٹی کے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ جب لڑکی سسکیاں لیتے لیتے ذرا رُکی تو اس کی ماں نے اپنی شفقت اور رحم سے بھری ہوئی آواز میں اس سے کہا:

بیٹی! میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اُسی لڑکے کے ساتھ تیری شادی کروں گی جس کے لئے تو اپنی جان دے دیتی ہے، مگر یہ تو بتا کہ وہ ہے کون؟

لڑکی نے اپنا سر جھکا لیا اور کچھ اس انداز سے آہستہ آہستہ مسکرائی کہ جو راز اب تک اُس کے دل میں دفن تھا، وہ اس کی ماں پر آئینہ ہوگیا۔ ماں نے اُسے پیار کر کے کہا:

آخر وہ ہے کون؟

لڑکی خاموش رہی، اور اپنا سر ماں کے کاندھے پر رکھ دیا۔ ماں نے نہ چاہا کہ اب زیادہ سوالات کی بوچھار سے اپنی بیٹی کے نازک دل کو پریشان کرے، جو کچھ وہ سمجھ چکی تھی، اُس پر اکتفا کی۔

(۳)

محمد بک اپنے گھر آیا، اس کی بیوی اُس سے تنہائی میں ملی، اور اپنے شوہر سے درخواست کی کہ اس نامبارک شادی کو تھوڑے دنوں کے لئے ملتوی رکھے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ماں نے بہت عاجزی کے ساتھ رحم و کرم کے ہر دروازے کو کھڑکھڑایا لیکن کوئی نہ کھلا۔ بک کو یہ امر سخت ناگوار تھا کہ وہ اس معرکے میں مغلوب ہو۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ آج اس کی شکست اُس کی جیت سے بہتر ہے۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا:

غالباً لڑکی کسی اور لڑکے کو پسند کرتی ہے اور اُسی سے نکاح کرنا چاہتی ہے؟

ماں نے بگڑ کر کہا: اگر ایسا ہے بھی تو ہمارے لئے نقصان کی کیا بات ہے،

"نقصان کی کیا بات ہے! یہ خوب کہی۔ ناسمجھ عورت! تو آگ کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ میں اس لڑکی پر آسمان کی شفاف فضا اور سورج کی روشنی تک حرام کردونگا میں اُسے ایک اندھیری کوٹھری میں قید رکھوں گا اور جب تک میں زندہ ہوں، یہ ایک راہبہ کی زندگی بسر کرے گی۔"

وہ کمرے سے نکلا، جیسے کوئی دیوانہ، اور اپنی لڑکی کو آواز دی۔ لڑکی فوراً ایک فرماں بردار بیٹی کی طرح آئی، محمد بک نے آتے ہی گالیوں کی بوچھار شروع کردی اور برا بھلا کہتے کہتے اتنا طیش میں آیا کہ اگر اس کی بیوی بیچ میں نہ آجاتی تو غالباً جوان لڑکی کو وہ مار بیٹھتا۔ وہ اب گھر سے نکلا، اُس کے چہرے سے غصے کے آثار نمایاں تھے۔

اس واقعے کو دو ماہ گزر گئے، اس، اثنا میں کوئی نئی بات پیش نہ آئی۔ اس گھر پر ایک سناٹا چھایا رہا، محمد بک بالکل چپ تھا۔ اس نے آئندہ اس ناخوش گوار موضوع پر ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا، لیکن غصے کی آگ اس کے دل میں شعلہ زن تھی، اس کی بیوی بھی خاموش تھی، مگر حقیقت میں وہ اپنی بیٹی کے رنج وغم پر دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی، وہ بہت اداس اور غمگین رہتی تھی، ادھر نوجوان لڑکی تمام تمام دن اور ساری ساری رات رو رو کر گزارتی، بغیر اس کے کہ کسی پر بھی اس کا دکھ درد ظاہر ہو وہ اس مصیبت کو استقلال سے برداشت کر رہی تھی۔ وہ چپکے چپکے راتوں کو بستر پر رو رو کر اپنی بھڑاس نکالتی تھی، اس کے لئے صرف آرزو کی ایک دھندلی سی روشنی زندگی کا سہارا تھا۔ مگر وہ روشنی بھی جھوٹی ثابت ہوئی، امیدوں اور حسرتوں کا ایک عارضی جلوہ تھا مگر وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا! سلام ہو اس کی گزشتہ خوش نصیبی پر اور سلام ہو اس کی ہر مردہ امید و آرزو پر!

ایک روز کا واقعہ ہے کہ محمد بک نے اپنی عادت کے موافق رات کا کھانا کھایا، قہوے کی دو پیالیاں پیں، پھر سگار سلگایا، اور اُسے ختم کرکے نماز عشا پڑھی۔ نماز پڑھکر وہ اپنی جانماز سے دو گھنٹے کے بعد اٹھا، جس میں اس نے چالیس وظائف پڑھ ڈالے، اٹھکر وہ ذرا دیر ٹہلتا رہا۔ پھر اپنے سونے کے کمرے میں داخل ہوا پلنگ پر لیٹ کر دیر تک آنکھیں بند کئے اس کوشش میں رہا کہ نیند آجائے لیکن اس ارادے میں کامیاب نہ ہوا۔ آخر چپکے سے اپنے باغ کیطرف نکل آیا، اس طرح کہ کسی کو اُس کے آنے کی خبر نہ ہو،

محمد بک اپنے شاداب و سرسبز باغ میں ٹہلنے لگا، اس نے اس خاموش رات میں نہایت فروتنی اور عاجزانہ بندگی کے ساتھ ایک نگاہ آسمان پر ڈالی، اُس نے دیکھا کہ معصوم چاندنی پھیلی ہوئی ہے، صاف اور شفاف چاند نکلا ہوا ہے جگمگاتے تارے چھٹکے ہوئے ہیں، اس منظر سے وہ بہت متاثر ہوا! ور خدا کو مخاطب کرکے کہنے لگا "یارب! تونے یہ نعمت کس کے لے پیدا کی ہے؟۔ پھر اُس نے درختوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ دیکھا کہ وہ بھی مزے لے لیکر کبھی داہنے کبھی بائیں کو جھوم رہے ہیں، نسیم بہار چل رہی ہے، اور گلاب کے پھولوں کی دو چار پنکھڑیاں، چمیلی کے پھولوں کی دو چار نرم و نازک پتیاں لا لاکر اس کے سامنے ڈالدیتی ہے۔ پھر محمد بک نے اپنے معبود کو پکار کر کہا: "خدایا یہ جنت تونے کس کے لئے پیدا کی ہے؟"

پھر اُس نے نہر کو دیکھا چاندکی نقرئی کرنیں نیل کی موجوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کررہی ہیں، اور دیکھا کہ ایک کشتی چند لوگوں کو اپنی گود میں لئے تیرتی چلی جارہی ہے یہ لوگ گاتے بجاتے، ہنستے ہنساتے، کشتی میں بیٹھے، نیل کی معصوم موجوں کو روندتے اور سطح آب کو پامال کرتے چلے جارہے ہیں۔ اسی دوران میں اُس نے ایک پرندے کی دلکش آواز سنی، جو اس خاموش رات کے سناٹے میں دیوانہ وار چہچہا رہا تھا۔

بک نے پھر اپنے خالق کو پکار کر کہا: الٰہی! یہ نعمت تو نے کس کے لئے پیدا کی ہے؟"
اب وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور ہر شے کو دیکھنے لگا، فطرت کی ہر اُس تصویر کو جو کائنات کے مصوّرِ ازل نے اپنے ہاتھ سے صفحۂ ہستی پر بنائی تھی۔ وہ دیکھنے لگا اس جمالِ قدرت کو جو خالقِ برتر کی عظمت و جلال کا پردہ فاش کر رہا تھا، اور اُس کی قوت، اُس کی شفقت کا راز آشکارا کر رہا تھا۔ اس جنت کو جو محبت کا گہوارہ اور جو لذت و نعیم کی ایک جلوت گاہ ہے اس نے پھر اپنے حقیقی آقا کو مخاطب کر کے کہا: میرے معبود! تو نے یہ نعمتیں کس کے لئے پیدا کی ہیں؟" محمد بک کو اب اپنا وہ زمانہ یاد آگیا جب کہ وہ نوجوان تھا، اس کا دل یہ جمیل مناظر دیکھ کر دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں، قرآن کریم کی کچھ آیتیں اور رسول اللہ کی کچھ حدیثیں پڑھنے لگا۔ پھر آنکھیں کھول کر بولا: بیشک جنت صرف ......" اور نہ سمجھ سکا کہ اب کون لفظ ہوگا جس سے جملہ پورا ہو سکتا ہے، وہ حیران تھا، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں، اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ دو انسانی پیکر اُسی کی طرف بڑھتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ وہ ایک بڑے درخت کی آڑ میں چھپ گیا کہ دیکھنے والوں کی نظروں سے اپنے آپ کو پنہاں رکھ سکے، اس کا دل دھڑکنے لگا، اور وہ اپنے جی میں کہنے لگا: "آخر یہ کون اجنبی ہے جس نے میرے باغ میں یوں پھرنے کی جرأت کی اور وہ بھی آدھی رات کے قریب" دونوں مورتیں اس سے بالکل پاس آگئیں۔ وہ غور سے دونوں کو تاڑنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کی حسین نوجوان بیٹی ایک خوبصورت نوجوان کے پہلو بہ پہلو چلی آرہی ہے اور اس نے اپنا سر اس نوجوان کے کاندھے پر رکھدیا ہے۔ نوجوان کی صورت خوب غور سے دیکھنے کے بعد محمد بک نے اُسے پہچان لیا، اور اپنے جی میں کہنے لگا "ارے یہ تو وہی مفلس جوان ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتا تھا، جب ہم محلہ حمزادی میں مقیم تھے۔ یہ دونوں مورتیں اس درخت کے قریب

ٹھہر کر باتیں کرنے لگیں ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر کہ بک ان کی باتیں خوب سن سکتا تھا۔
نوجوان نے کہا: "میری محبوبہ! میں تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر آمادہ ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ اپنی پاک اور شریفانہ محبت کے سچے عہد پر قائم رہوں گا، یہاں تک کہ میری ہڈیاں سپرد خاک ہوں"

دوشیزہ نے جواب دیا: "اور میں بھی قسم کھا کر تم سے یہی عہد کرتی ہوں"
نوجوان نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ باغ کے دروازے کیطرف چلا تا کہ اپنے گھر کو رخصت ہو۔

اب بک اپنی کمیں گاہ سے نکلا، وہ بالکل خاموش اور سناٹے میں تھا۔ دیر تک چُپ کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ اُس نے پھر آسمان، نہر اور باغ کے درختوں کو دیکھا، اُس نے قدرت کے حسن کو، اس انسانی نعیم کو پھر ایک نگاہ دیکھا اور جو کچھ سنا اور دیکھا تھا، تھوڑی دیر اس پر سوچ کر بولا: "میرے آقا! بیشک یہ نعمت تو نے اہل محبت ہی کے لئے پیدا کی ہے اور میری جان عزیز کی قسم یہ محبت ہی کی جنت ہے" اب اس نے چند آیتیں تلاوت کیں، پھر اپنے گھر میں داخل ہوا، اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جو اس کے سکون اور اطمینان، اس کی کامگاری اور رفع پریشانی کی معنی خیز عبارت تھی۔

اس واقع کو ایک مہینے کی مدت گزر گئی، اس مہینے کے آخر میں ایک شادی کی شاندار تقریب عمل میں آئی۔ یہ تقریب تھی، ایک امیرزادی کی ایک غریب لڑکے کے ساتھ شادی کی! اور یہ شادی حقیقت میں دنیا کی ہر مشکل اور ہر چیز پر محبت کی جیت تھی!!

خمسہ بر غزل حکیم سنائی

رہی دن رات ظرافت میں بہت ہرزہ سرائی　　نہ ہوئی ذہن کو جس سے رہ عقبیٰ میں ر
مگر اب غیب سے یہ بات مرے جی میں ہے آئی　　ملکا ذکر تو گویم کہ تو پاکی و خدا
نروم من بجز آں رہ کہ تو آں راہ نمائی

طلب وصل میں تیری میں بنوں عشق مجسم　　سر شوریدہ سے یارب نہ یہ سودا ہو کبھی
یہ تمنا ہے کہ جبتک کہ رہے دم میں مرے دم　　ہمہ درگاہ تو جویم۔ ہمہ در راہ تو پو
ہمہ توحید تو گویم کہ بتوحید سزائی

کوئی کعبہ کا ہے ساکن تو گیا کا کوئی باشی　　کوئی گرجا کا ہے شیدا کوئی دل دادہ کا
ہے وے متفق اس بات پہ ہر ایک متلاشی　　نہ بدے خلق تو بودی۔ نہ بود خلق تو با
نتو خیزی نہ نشینی۔ نتو کاہی نہ فزائی

تو ہے ادراک سے بالا تو ہے اندیشہ سے فایق　　نہ کھلے بحث و دلائل سے کبھی تیرے حقا
وہ تجھے دل ہی میں پالیتے ہیں جو تیرے ہیں شایق　　نہ سپہری۔ نہ کواکب۔ نہ بروجی۔ نہ دقایق
نہ مقامی۔ نہ منازل۔ نہ نشینی۔ نہ بپائی

کوئی ہندی ہو کہ شامی، عجمی ہو کہ حجازی　　وہ ہو سرمد کہ ہو منصور۔ وہ طوسی ہو
جو ہے اس راز سے واقف وہی لیجائیگا بازی　　بری از چون و چرائی بری از عجز و نیا
بری از صورت رنگیں بری از عیب خطائی

نہ تو ہے جان سے زندہ نہ تو رکھتا ہے کوئی تن　　نہ تو اعضا نہ جوارح نہ لباس اور نہ دا
نہ تو فرزند ہے تیرے نہ کفو ہے نہ کوئی زن　　بری از خفتن و خوردن بری از تہمت

بری از بیم و امیدی ۔ بری از رنج و بلائی

کروں ہر لحظہ ثنا تیری یہی چاہتا ہے جی | مگر عاجز ہوں پیمبر تو بھلا کیا مری ہستی
نہ یہ قدرت ہے قلم کی نہ یہ طاقت ہے زبانکی | نتواں وصف تو گفتن کہ تو در وصف نگنجی
نتواں شرح تو کردن کہ تو در شرح نیائی

نہ چھپی تجھسے تھی کیفیت یوسفؑ باسیری | جو تھی ادہم کو تری دھن انہیں دوائی فقیری
یہی فاروقؓ سمجھتے تھے باین شان امیری | تو علیمی ۔ تو حکیمی ۔ تو خبیری ۔ تو بصیری
تو نمائندۂ فضلی تو سزاوار خدائی

وہی ہم تھے نہ سوا تیرے کسی سے بھی ملی | وہی ہم ہیں کہ صفت ایک بھی باقی نہیں اگلی
تری رحمت سے پھر اب عود کرے حالت اصلی | احد ایس کمثلی ۔ صمد ایس کفضلی
لمن الملک تو گوئی کہ سزاوار خدائی

یہی شاپور گنہگار کو مرشد سے ملا پند | کہ کرے ذکر خداوند جہاں گر ہے خردمند
رہے ہر وقت یہی دھن نہو جبتک کہ زبان بند | لب و دنداں سنائی ہمہ توحید تو گویند
مگر از آتش دوزخ بودش زود رہائی

شاپور کرمانی وکیل

غزل

ہے مرے واسطے پھر دامن صحرا بیتاب

کب سے ہے دیدۂ مضطر میں تمنا بیتاب　　اور ہے تیری تمنا میں کلیجہ بیتاب
جاذبہ موج تنفس کا خبر دیتا ہے　　کہ ہے قطرہ کے لئے دامن دریا بیتاب
میں وہ میکش ہوں، ازل ہی سے مری واسطے تھو　　ساقی و جام و صراحی مے و مینا بیتاب
مستیاں کہتی ہیں ساقی تری آنکھوں کی یہی　　بہر میکش ہے ہر اک قطرۂ صہبا بیتاب
آج اُسی حسن خود آرا کا ہوں آئینہ میں　　تھا مرے واسطے کل جس کا تماشا بیتاب
دیکھئے بحر حقیقت کا ملے کب ساحل　　ہے مرے قلب میں پھر موج تمنا بیتاب
در حقیقت میں وہ خاکہ ہوں کہ تھا روز ازل　　خود حقیقت کا مرے واسطے نقشا بیتاب
دیکھئے روح تجلی کی وہ کب تک پھونکیں　　عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب

اس لئے جی نہیں گلشن میں بہلتا اے دردؔ
ہے مرے واسطے پھر دامن صحرا بیتاب

دردؔ کاکوروی

اقتباسات

اقلیتوں کے مسئلہ کو یورپ نے کیونکر حل کیا؟ | لکھنؤ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر رادھا کمُد مکرجی نے مندرجہ بالا عنوان پر ایک قابلانہ مضمون ۲۶ر فروری ۱۹۲۹ء کو اراکین کونسل صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے سامنے پڑھا تھا، پھر اسی مضمون کو ۲ر اپریل ۱۹۲۹ء کو اراکین لیجسلیٹو اسمبلی کے سامنے پڑھا۔ اس مضمون میں قابل پروفیسر نے یہ واضح کیا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے میں جو دشواریاں اقلیتوں کے حقوق طے کرنے میں اس وقت پیش آرہی ہیں یہ کچھ ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ اقلیتوں کا مسئلہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ جنگ عظیم کے بعد یورپ میں بہت سی نئی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کے قیام کی اصل وجہ اگر تلاش کیجائے تو یہی اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ تھا، اور اگر ان نئی ریاستوں کے دستور اساسی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

جنگ عظیم کے بعد جب صلح کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی تو فاتح اقوام کے نمائندے اس اصول پر متفق تھے کہ مختلف اقوام جن کی زبان ایک ہو اور ایک نسل سے ہیں لیکن سیاسی حیثیت سے مختلف ریاستوں میں بٹی ہوئی ہیں انکو ایک ریاست میں متحد کر کے سیاسی حیثیت سے خود مختار تسلیم کرلیا جائے۔ اس لئے کہ یورپ کی خانہ جنگیوں میں ہمیشہ سے اسی تفرق کی وجہ سے ابتری رہی ہے۔ اس اصول سے بہرحال کسی کو اختلاف نہ تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس پر کلیتہً عملدرآمد ممکن العمل نہ تھا۔ یہ مشکل تھا کہ ہر نسل کی چھوٹی سے چھوٹی آبادی کو ایک علٰحدہ خود مختار ریاست بنا دیا جائے اور یہ بھی دشوار تھا کہ مختلف النسل آبادیوں کو ایک ہی ریاست کے اندر

یکجا ہونے سے قطعاً روک دیا جائے۔ اس لئے (سیلف ڈٹر مینیشن)
یعنی خودمختاری کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے "تحفظ حقوق اقلیت" کے
اصول کو بھی تسلیم کرنا پڑا تاکہ اس کی بنیاد پر مختلف عنصر، مختلف تمدن اور مختلف
جماعتوں کو ایک مشترکہ خودمختار حکومت کے ماتحت یکجا کیا جا سکے۔

چنانچہ انہیں دو اصولوں یعنی "تحفظ حقوق اقلیت" اور "خودمختاری"
کے ماتحت یورپ کی از سر نو تعمیر کی گئی اور مختلف ریاستوں کے حدود اربعہ میں وہ اہم
تبدیلیاں واقع ہوئیں جن کی وجہ سے قدیم ریاستوں کا نقشہ بالکل بدل گیا اور بہت سی
جدید چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ وہ قدیم ریاستیں جن میں سے اقلیتوں
کو علٰحدہ کر کے کوئی جدید ریاست نہیں قائم کی گئی وہ آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ اور
ترکی ہیں۔ ان حکومتوں سے جو معاہدے اتحادیوں نے بعد از جنگ کئے ہیں ان سب
میں خصوصیت اور اہمیت کے ساتھ ایک دفعہ تحفظ اقلیت کے لئے رکھی گئی ہے چاہے
یہ اقلیت بربنائے مذہب ہو یا بربنائے نسل و زبان۔ انکے علاوہ جو جدید ریاستیں
قائم کی گئی ہیں مثلاً پولینڈ زیکوسلوویکا، سرب کروٹ سلوین، وغیرہ، ان سے اتحادیوں
نے علٰحدہ اور مخصوص طور پر معاہدے لئے ہیں جو "معاہدہ برائے تحفظ حقوق اقلیت"
کے نام سے مشہور ہیں۔

انجمن بین الاقوامی نے ان معاہدوں کے مطابق اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ
کی نگرانی کے لئے ایک خاص شعبہ قائم کیا ہے اور انجمن میں داخلہ کی یہ ایک شرط قرار
دی گئی ہے کہ داخلہ سے قبل ہر ریاست کو اپنی اقلیتوں کے تحفظ حقوق کے مسئلہ پر
انجمن کو ہر طرح کا اطمینان دلانا ہوگا۔ انجمن نے یہ بھی صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ
یہ تحفظ صرف مذہبی اور لسانی اقلیتوں تک محدود ہوگا۔ سیاسی اور دیگر سماجی
اقلیتوں کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

مختلف جدید ریاستوں نے اپنی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ جس طریقہ پر کیا ہے اس کا اندازہ انکے دستور اساسی کے مختلف دفعات سے ہوتا ہے۔ اور پروفسر ممدوح نے ان دفعات کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً حکومت سرب کروٹ سلوین "کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۲ قابل ذکر ہے جس میں مذہب اور ضمیر کی آزادی ہر شخص کو دی گئی ہے۔ یا ایک دوسری دفعہ میں نسلی اور لسانی اقلیتوں کے ابتدائی تعلیم انہیں کی مادری زبان میں دیئے جانیکا قاعدہ رکھا گیا۔ ریاست پولینڈ کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۱ میں تمام مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو حق دیا گیا ہے کہ اگر چاہیں تو اپنے مصارف سے خیراتی اور مذہبی تعلیم گاہیں اور دیگر سماجی ادارے قائم کریں۔ ان میں اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کریں اور مادری زبان کو ترقی دیں۔ ان اداروں اور تعلیم گاہوں کے انتظام اور انصرام میں حکومت کوئی مداخلت نہ کرے گی۔ کچھ عرصہ ہوا جب جرمنی اور روسی حکومت نے اس امر کی شکایت کی تھی کہ پولش حکومت غیر پولش اقوام کے ساتھ جو قلیت میں ہیں۔ "معاہدہ تحفظ اقلیت" کے مطابق برتاؤ نہیں کرتی ہے چنانچہ ۱۹۲۴ء میں گرابسکی کی وزارت نے چند نئے قوانین اقلیتوں کے اطمینان کے لئے بنائے تھے ان میں سے ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جن علاقوں میں غیر پولش اقلیتیں آبادی کی ۲۵ فیصدی ہوں وہاں کے مدارس میں ۴۰ بچوں کے والدین کی درخواست پر اس اقلیت کی مادری زبان میں تعلیم ہو سکتی ہے۔ زیکوسلووک جمہوریت کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۳۲ میں یہ قاعدہ رکھا گیا ہے کہ سرکاری خزانہ کی منظور شدہ رقوم میں سے ایک معقول اور معتدبہ رقم اقلیتوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ اور مخصوص کر دیجائے گی۔ اسی طرح اسٹریا اور ہنگری کے دستور اساسی اور معاہدوں میں یا ترکی کے ساتھ جو معاہدہ لوزان میں کیا گیا تھا اقلیتوں کی تعلیم کے لئے مخصوص انتظام اور دیگر امور کے متعلق صاف اور صریح دفعات موجود ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں جن دفعات اور معاہدوں کا ذکر کیا گیا انہیں طریقوں پر ہندوستان میں اقلیتوں کے مسئلہ کو حل کرنیکی کوشش کرنی چاہئے۔ یورپ میں جن ممالک کو اقلیتوں کے معاملہ میں بین الاقوامی تصفیہ کا پابند بنایا گیا ہے انکا اگر ہندوستان کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو حسب ذیل امور قابل لحاظ ہونگے ۔

(۱) ۔ جو نئی ریاستیں صلح کانفرنس کے معاہدہ کے بعد اتحادیوں نے قائم کی ہیں ان میں کہیں کسی ایک قوم کی اکثریت اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی کہ ہندو اکثریت ہندوستان میں ہے ۔ مثلاً پولش اکثریت کا تناسب ۶۹ فیصدی ہے ۔ زیکو سلووک کا ۶۴ فیصدی، سرب کروٹ کا ۴۰ فیصدی اور ہندو اکثریت کا ۷۵ فیصدی ۔

(۲) اقلیتوں کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور دشوار زیکو سلووک کا ہے جہاں جرمن متمدن تعلیمیافتہ اور طاقتور اقلیت سے سابقہ ہے ۔ جرمن اقلیت کا تناسب ۲۳ فیصدی ہے ۔ ہندوستان میں اسی طرح مسلمان اقلیتوں کا معاملہ ہے جن کی آبادی کا تناسب ۲۴ فیصدی ہے لیکن حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ ریاست زیکو سلووکا نے اپنے ملک کی اقلیتوں کے مسئلہ کو حل کیا ہے ۔

(۳) کوئی اقلیت اس وقت تک سیاسی حیثیت سے نہیں تسلیم کیجاتی ہے جب تک کہ وہ ایک خاص تناسب میں نہو ۔ بعض دستور اساسی میں یہ تناسب مقرر کردیا گیا ہے اور جہاں نہیں مقرر کیا گیا ہے وہاں پڑوس کی ریاستوں کے مسلمہ معیار کو تسلیم کرلیا جاتا ہے پولینڈ میں کسی اقلیت کو سیاسی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لئے اسکا تناسب کم از کم ۲۵ فیصدی ہونا چاہئے ۔ زیکوسلوا میں ۲۳ فیصدی اور ہنگری میں ۲۰ فیصدی ۔

اب اگر اس بین الاقوامی معیار تناسب کا اطلاق ہندوستان پر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کا تناسب ۲۵ فیصدی ہے اس لئے بین الاقوامی معیار کے مطابق جہانتک ہندوستان کا کلی حیثیت سے تعلق ہے مسلمانوں کے مخصوص حقوق کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر علٰحدہ علٰحدہ صوبوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بعض صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور دیگر صوبجات میں انکی اقلیت ہے جہاں وہ اتنی قلت میں ہیں کہ بین الاقوامی تناسب سے گر گئے ہیں۔ آخرالذکر صوبجات میں جہاں انکی اقلیت سب سے زیادہ طاقتور ہے وہ صوبہ متحدہ آگرہ اور اودھ ہے۔ اور یہاں بھی انکی اقلیت کا تناسب ۱۵ فیصدی ہے۔ اس لئے بین الاقوامی تصفیہ کی روشنی میں جہانتک صوبجات کا تعلق ہے اقلیت کا مسئلہ حقیقۃً ایک ہندو اقلیت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں میں ہندوؤں کی اقلیت کا تناسب ۴۴ اور ۴۶ فیصدی ہے جو بین الاقوامی تناسب کے مقررہ معیار سے کہیں زیادہ ہے البتہ مرکزی حکومت کا جہانتک تعلق ہے مسلمانوں کی اقلیت کا مسئلہ البتہ قابل غور ہے۔

۴) کسی ریاست میں مقامی طور پر بھی اقلیتوں کی آبادی کی تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کہ ان کی تعداد اکثریت کے مقابلہ میں بہت زیادہ نہ گھٹ جائے ورنہ اقلیت کے ساتھ وہ خاص مراعات نہیں کئے جا سکتے۔ جن کی پابندی ازروے معاہدہ یا دستور اساسی کی دفعات کے مطابق عائد ہوتی ہے۔

۵) اقلیتوں کے مذہبی اور لسانی مفاد کے تحفظ کے لئے اکثر ریاستوں کے دستور اساسی میں اقلیتوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق آسانیاں فراہم کرنے کے لئے صاف اور صریح طور پر ذکر ہے نیز آبادی کے تناسب اور اسی لحاظ سے سرکاری مدارس میں طلبہ کی تعداد یا کسی اقلیت کے لئے علٰحدہ مخصوص

سرکاری مدارس قائم کرنیکے لئے قاعدے مقرر کردئے گئے ہیں۔

(۶) کسی دستور اساسی یا کسی معاہدے میں جو مراعات کسی اقلیت کے ساتھ کی گئی ہے وہ صرف اُنکی مذہبی، لسانی اور نسلی خصوصیات یا مخصوص رسم ورواج کے لحاظ سے کی گئی ہے ۔

(۷) سیاسی اقلیت (مثلاً لبرل یا اشتراکی جماعت) یا سماجی اقلیت (برہمن اور غیر برہمن یا اچھوت کے) حقوق کے تحفظ کا اصول کسی دستور اساسی میں تسلیم نہیں کیا گیا ہے

(۸) کسی دستور اساسی میں تحفظ حقوق اقلیت کے لئے فرقہ وارانہ حلقہائے انتخاب کا اصول نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔ بلکہ بنیادی اصول یہ قرار پایا ہے کہ ریاست کے اندر صرف ایک ہی قومیت ہوگی نیز یہ کہ مذہب، نسل اور زبان سے قطع نظر ہر شخص کو کامل مساوی سیاسی اور شہری حقوق حاصل ہونگے

(۹) تحفظ حقوق اقلیت دستور اساسی کی صاف اور صریح دفعات کے ذریعہ کیا گیا ہے اور جمہوری نظام حکومت کے انتخابات اور دیگر سیاسی تغیرات سے ان کا کوئی تعلق نہیں رکھا گیا ہے۔

(۱۰) نمائندگی، سرکاری ملازمت، اور انتظام حکومت کے معاملہ میں اقلیتوں کے مخصوص مفاد کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے ۔

غرض اقلیتوں کے اہم مسئلہ کو انجمن بین الاقوامی نے حل کرنیکی کوشش کی ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ پھر ہندوستان جو اس انجمن کا ایک رکن ہے کیوں نہ بین الاقوامی اصول اور معیار کے مطابق اور ان تجربات کی روشنی میں جو یورپ کی مختلف ریاستوں کو گذشتہ ۲۰ سال کے اندر ہوئے ہیں۔ اپنے اقلیتوں کے تحفظ حقوق کے مسئلے کو طے کرے ۔

شذرات

امریکہ کے مشہور رجبز اینڈریو کارنیگی نے جہاں بنی نوع کی فلاح وبہبود کے لئے اور بہت سے ادارے قائم کئے وہاں کلیسائی انجمن حامی امن کی بھی بنا ڈالی۔ اس انجمن نے ۱۹۲۷ء میں اعلان کیا کہ وہ دنیا کے مذاہب کی ایک کانفرنس منعقد کرنا چاہتی ہے جس میں اس پر غور کیا جائے کہ مذہبی قوت سے کس حد تک جنگ کے انسداد اور امن کے قیام میں کام لیا جا سکتا ہے۔ ستمبر ۱۹۲۸ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں ایک ابتدائی کانفرنس کا اجلاس ہوا جس کی کارروائی ایک رسالے کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔

... ...

اس رسالے کا نام ہے "مذاہب عالم جنگ کے خلاف" اور یہ کانفرنس کی شاخ بمبئی کی طرف سے ہمارے پاس بھیجا گیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنیوا کی ابتدائی کانفرنس میں مختلف ممالک کے ایک سو نواسی نمائندے جمع ہوئے تھے جنہوں نے یہ طے کیا کہ سو آدمیوں کی ایک مجلس منتظمہ منتخب کی جائے جس کے صدر ڈاکٹر شیلر میتھوز اور سکریٹری ڈاکٹر اٹکنسن ہوں اور یہ مجلس ۱۹۳۰ء میں کسی مناسب مقام پر ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد کرے اور اس میں اپنی تجویز سے تمام اکناف عالم سے مختلف مذاہب کے نمائندوں کو بلائے۔ یہ سب کے سب جمع ہو کر اس بات کا فیصلہ کریں کہ مختلف مذاہب میں کہاں تک جنگ کو روکنے اور امن قائم کرنے کی صلاحیت ہے۔

... ...

ابتدائی کانفرنس میں تقریباً تمام مذاہب کے نمائندے موجود تھے اور ان کے خطبوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم دنیا کے مذہبی لوگ دل سے کشت وخون کے مخالف ہیں

اہل مشرق سے مغرب تک امن و امان کا دور دورہ دیکھنا چاہتے ہیں لیکن یورپ اور امریکہ کے اکثر ممبروں کا رویہ دیکھتے ہوئے یہ اُمید نہیں ہوتی کہ یہ کانفرنس اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی جرمنی کے ڈاکٹر ہاؤ ایر، پادری سی۔ ایف اینڈریوز اور متعدد ایشیائی نمائندوں کی یہ رائے تھی کہ دنیا میں امن کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جبتک نسلی مساوات، بین الاقوامی انصاف اور عالمگیر برادری کو قوموں کے عقیدے اور عمل میں مناسب جگہ نہ مل جائے۔ چنانچہ اینڈریوز صاحب نے اس مضمون کی ایک تحریک پیش کی کہ کانفرنس کی مجلس منتظمہ کو سچا اور پائدار امن قائم کرنے کے لیے ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہیے جن سے قوموں میں بھائی چارہ پیدا ہو اور وہ ایک دوسرے سے مساوات اور انصاف کا برتاؤ کریں۔ اس تحریک کی تائید ڈاکٹر ہاؤ ایر (جرمنی)، چٹرجی صاحب اور ایس۔ کے۔ دت صاحب نے کی۔ ان حضرات نے اپنی تقریروں میں اس پر زور دیا کہ ہندوستان والے اور دوسرے ایشیائی قدرتی طور پر ان سب انجمنوں اور کانفرنسوں سے بدظن ہیں جنھیں یورپ والے قائم کرتے ہیں۔ انھیں یہ خوف ہے کہ یورپ کے ارباب سیاست جہاں ایشیا کی قومیت کے اُٹھتے ہوئے جوش کو اور طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے دبانا چاہتے ہیں وہاں انھوں نے یہ عامی امن کانفرنس بھی قائم کردی ہے کہ مذہب کی آڑ لے کر مغلوب قوموں کو جنگ سے روکے اور غالب قوموں کی حکومت کی بنیاد مضبوط کرے۔ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے مناسب ہے کہ کانفرنس اینڈریوز صاحب کی تحریک کو منظور کرلے۔ مگر یورپ اور امریکہ کے کئی ممبروں نے نہایت زور وشور سے اس تحریک کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ اس کانفرنس کا کام تو محض یہ ہے کہ مذہب کی مدد سے جنگ کا سد باب کرے اور امن کے قیام کی کوشش کرے۔ اگر وہ بین الاقوامی مساوات اور برادری اور انصاف کے انتظار میں رہے گی تو خدا جانے کب تک اصل مقصد کو ملتوی کرنا پڑیگا۔ غرض نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک مسترد کردی گئی۔

ہمیں اس کا کوئی حق نہیں کہ بغیر کسی ثبوت کے کانفرنس کے بانیوں اور حامیوں کی نیت پر شبہ کریں اور یہ سمجھیں کہ یہ لوگ بھی انجمن اقوام والوں کی طرح یورپ کی بڑی طاقتوں کے آلۂ کار ہیں اور اُن کے سیاسی مقاصد میں جان بوجھ کر یا لاعلمی کی حالت میں مدد دے رہے ہیں۔ لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ان حضرات نے مغرب والوں کے عمل تجزیہ کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ مغرب کے لوگوں میں یہ عام رجحان ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے کو بالکل جداگانہ چیز سمجھتے ہیں اور اس پر اس حیثیت سے غور کرتے ہیں جیسے اِسے بقیہ زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اسی اصول پر وہ سمجھتے ہیں کہ امن اور چیز ہے اور مساوات، برادری، اور انصاف کچھ اور۔ پہلے امن قائم کر لیا جائے پھر یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی یا کم سے کم ان کے حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

... ...

ہمیں ان حضرات سے یہ عرض کرنا ہے کہ انسان کا نفس ایک واحد مرکز ہے جس میں انسان کی تمام ذہنی قوتیں، اُس کے تمام جذبات اور خیالات جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ حقیقت میں علمائے اخلاق نے ہمیشہ اس نکتے کو سمجھا ہے کہ انسان کی زندگی کے کسی ایک پہلو کی اصلاح بجائے خود نہیں ہو سکتی جب تک اس کے نفس کی بہ ہیئت مجموعی اصلاح نہ ہو۔ پیمبروں اور ولیوں کی قوت اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ انسان کے منفرد خیالات، جذبات یا اعمال کو متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی پوری شخصیت پر اثر ڈالتے ہیں۔ ہمیں اس سے بالکل اتفاق ہے کہ دنیا میں اگر امن قائم ہو سکتا ہے تو محض مذہب کے ذریعے سے۔ لیکن مذہب انسان کے دل سے جنگ وجدل کے شوق کو اسی طرح دور کر سکتا ہے کہ پہلے اسے نفرت، تکبر، طمع اور ظلم سے پاک کر دے۔ اگر یہ جذبات باقی رہیں گے تو کانفرنسوں لیگوں، تقریروں اور پمفلٹوں کے باوجود لوگ ہمیشہ اپنے ناجائز مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے یا دوسروں کے ناجائز مقاصد کی مخالفت کے لئے جنگ وجدل سے کام لیں گے۔

... ...

اس لئے ہماری رائے میں کانفرنس کو چاہئے کہ اینڈریوز صاحب کے مشورے کے مطابق بین الاقوامی مساوات، برادری اور انصاف کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کرلے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی خاص قوم یا چند خاص اقوام کی حمایت کرنے لگے کیونکہ یہ ایک سیاسی کام ہے جو اسے اپنے راستے سے دور ہٹالے جائیگا بلکہ برابری، آزادی، اخوت اور عدالت کے عام اصولوں کو لوگوں میں ہردلعزیز بنانے کے لئے انہیں تمام تدابیر سے کام لے جن سے وہ امن کا ڈھنڈورا پیٹنے کی بے نتیجہ کوشش کرنا چاہتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے کورٹ نے اپنے ۱ر جولائی کے جلسے میں پٹنہ کالج کے پرنسپل مسٹر ہارن کو پرو وائس چانسلر مقرر کردیا۔ جتنے مسلمانوں میں قومی غیرت اور قومی مصلحتوں کا احساس موجود ہے وہ سب ابتدا سے اس کے مخالف تھے کہ کسی انگریز کو مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی درسگاہ کا تعلیمی نگراں بنایا جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شامتِ اعمال سے علیگڈھ والوں میں ذاتی مناقشات اور پارٹی بندیاں اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ بغیر سیاست فرنگ کے انکی اصلاح ناممکن تھی۔ بہرحال کورٹ کو اور نئے پرو وائس چانسلر کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ عام مسلمان اگر اس انتخاب کو قبول بھی کرتے ہیں تو محض مجبوری سے اور محض عارضی حیثیت سے۔ اور اس عرصے میں بھی اگر مسٹر ہارن یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ذمہ دار افراد انکی مخالفت نہ کریں تو انہیں چند باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس خاص مقصد سے ان کا انتخاب ہوا ہے یعنی سیاست فرنگ کو کام میں لانا۔ اس پر وہ پورا زور دیں مگر نہایت ایمانداری اور احتیاط کے ساتھ۔ دوسرے یہ کہ اپنے یا اپنے مربیوں کے سیاسی خیالات کو یونیورسٹی میں پھیلانے سے پرہیز کریں۔ تیسرے یہ کہ وائس چانسلر اور مجلس منتظمہ کے ساتھ پورے اتحادِ عمل کا ثبوت دیں۔ اُن کی خوش قسمتی سے وائس چانسلر ایسا شخص [illegible] ہوا ہے جو [illegible] مسائل [illegible] کو [illegible] ملت کو اعتماد [illegible] اور اگر [illegible] کا استحکام ثابت ہوا تو

ہے گا۔ مسٹر ہادن کو وائس چانسلر کی مدد اور مشورے سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے تاکہ وہ اپنے
ذک فرائض کو مقررہ میعاد تک کامیابی سے ادا کرتے رہیں اور جاتے وقت نیک نامی کے
ساتھ رخصت ہوں۔

... ...

اس سلسلے میں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب قائم مقام
وائس چانسلر کے فرائض نہایت خوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت مسلم یونیورسٹی
کے کام کا بوجھ اُٹھانا بڑی ہمت اور حوصلے کا کام تھا۔ ایک تو سابق وائس چانسلر کے زمانے سے
بیشمار معاملات ایسے چلے آتے تھے جنہیں طے کرنے کے لئے بڑی محنت اور عرق ریزی کی
ضرورت تھی۔ دوسرے پارٹی بندی کی گرم بازاری میں اپنے دامن کو بے لوث رکھنا دشوار
اور بدنامی سے بچنا دشوار تر۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان مراحل سے بہت آسانی
سے ۔۔۔ ور اب انہوں نے دفتری کام کو اتنا صاف کر دیا ہے کہ آنے والے وائس چانسلر
اصلاحات کا پورا موقع ملے گا۔ حکومت نے ڈاکٹر صاحب کی ۔۔۔ ی خدمات
۱۔ آزادی کی ر ۔۔۔ خطاب ادا کیا ہے۔ اب قوم کو جا ۔۔۔ ئے انہیں قومی خدمات کے صلے میں
۲۔ ہندوستان میں تو ۔۔۔ مگر قومی معاوضہ خطاب یا دولت یا جاہ و منصب کی شکل میں نہیں ملا
۳۔ ٹالسٹائے اور ۔۔۔ ئے کام اچھی طرح کرے اُسے دوسرا کام دیا جاتا ہے جو ایک خدمت
۴۔ ع ۔۔۔ سے انجام دے اُس سے دوسری خدمت لی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی ایسے ہی
۵۔ ۔۔۔ نے کے مستحق ہیں۔

جامعہ ملیہ یکم اگست کو کھل جائیگی۔ طلبہ کی درخواستیں داخلے کے لئے آرہی ہیں۔ ان کی
اقامت کا مناسب انتظام کرنے کی پوری کوشش کیجارہی ہے۔ ایک بہت بڑی دو منزلہ
عمارت جو نئی سڑک پر واقع ہے اور ابھی بن کر تیار ہوئی ہے کرائے پر لے لی گئی ہے۔ اور جو

حضرات اپنے بچوں کو جامعہ میں داخل کرانا چاہتے ہوں وہ اس مہینہ کے آخر تک اطلاع دید
تاکہ اور عمارتیں کرائے پر لی جائیں ورنہ یکم اگست کے بعد اچھے مکانوں کا ملنا مشکل ہوجا
بچوں کے سرپرستوں کو ہم مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو بچوں کو اپنے ساتھ لاکر
کر دیا کریں تاکہ دارالاقامہ کے منتظم تعلیم اور تربیت کے معاملہ میں ان سے تبادلۂ خیالات کر
اگر کسی وجہ سے خود نہ آسکتے ہوں تو ایک مفصل تحریر شیخ الجامعہ کے نام بھیجدیا کریں جس
بچے کے عادات و خصائل، اُس کی صحت، اُس کی کمزوریوں اور اُس کے عام رجحا
کی تفصیل ہو۔

... ...

اس سال جامعہ کے لڑکوں کے لئے حفظانِ صحت کا خاص انتظام کیا جا رہا۔
طبیہ کالج کے لائق اور ہمدرد ہاؤس سرجن ڈاکٹر ظفریاب حسین صاحب نے جو دو سال
ڈاکٹر شرما صاحب کے ساتھ جامعہ کے بچوں کا علاج بلا معاوضہ کرتے ہیں وہیلڈہ والوا
اس سال داخلہ کے وقت تمام طلبہ کا طبی معائنہ کریں گے، دارالاقامہ فرنگ کے
حفظانِ صحت، غذا، دوا وغیرہ کے متعلق مفصل ہدایات دیدینگے اور طرح سمجھ لینا چا
رہیں گے کہ ان ہدایات پر کہاں تک عمل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اور بعض عارضی حیثیت
کا مستحق ہے۔ ہے ذمہ دار افراد

حمد، خام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ جون ۱۹۲۹ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب اول

مارکس اور مذہب اشتراک

ہر اس چیز کی طرح جو زندگی رکھتی ہو اشتراک بھی ایک رجحان ہے نہ کہ بندھی ٹکی اصولوں کا ایک معین اور تعریف پذیر مجموعہ۔ اگر اشتراک کی تعریف کیجائے تو یقینی ہے کہ اس میں بعض خیالات شامل ہو جائیں گے جو اکثر لوگوں کے نزدیک غیر اشتراکی ہیں اور دوسرے ایسے خیالات خارج ہو جائیں گے جو شامل ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اشتراک کی اصلیت سے سب سے زیادہ قریب تر ہونگے، اگر ہم اس کی تعریف یہ کریں کہ یہ زمین اور سرمایہ کے اجتماعی ملک ہونیکی حمایت کا نام ہے۔ اجتماعی ملک کے معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک جمہوری ریاست کی ملک، لیکن اس میں کسی ایسی ریاست کی ملک شامل نہیں سمجھی جا سکتی جو جمہوری نہ ہو۔ اجتماعی ملک کے معنی جیسا کہ نراجی اشتراکی سمجھتے ہیں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ایک گروہ کے مرد اور عورتوں کی آزاد جماعت مالک ہو بلا ان جبری قوتوں کے جو ریاست بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ بعض اشتراکی توقع کرتے ہیں کہ یہ اجتماعی ملک یک بیک اور اپنی کامل صورت میں ایک تباہ کن انقلاب کے ساتھ ساتھ آجائے گی، دوسرے امید کرتے ہیں کہ یہ رفتہ رفتہ آئے گی، پہلے ایک صنعت میں بعد کو دوسری میں۔ بعض اصرار کرتے ہیں کہ زمین اور سرمایہ کا یہ تمام وکمال جمہور کے ہاتھ میں آنا لازمی ہے، دوسرے

اس پر قانع ہیں کہ کہیں کہیں ملکیت شخصی کے جزیرہ سے باقی رہجائیں بشرطیکہ یہ بہت وسیع اور طاقتور نہ ہوں - ان سب شکلوں میں جو چیز مشترک ہو وہ ہر جمہوریت اور موجودہ نظام سرمایہ داری کا کامل یا تقریباً کامل انہدام۔ اشتراکیوں، نراجیوں اور سنڈکلیوں کا باہمی فرق زیادہ تر اس امر پر منحصر ہے کہ یہ جمہوریت ہو کس قسم کی۔ اصلی، اشتراکی حکومت کے میدان میں جمہوریت مشورتی کو کافی سمجھتے ہیں اور اُن کا خیال ہو کہ دستور ریاست کی اس شکل میں جو خرابیاں آجکل معلوم ہوتی ہیں وہ سرمایہ داری کے مٹ جانے سے خود مٹ جائیں گی۔ برخلاف اس کے نراجی اور سنڈکلی سارے کے سارے مشوری نظام کے خلاف ہیں اور جماعت کے سیاسی معاملات کے انضباط کے لئے یہ ایک دوسرا طریقہ چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب جمہوری اس معنی میں ہیں کہ سب ہر قسم کی مراعات اور ہر نوع کی مصنوعی عدم مساوات کو مٹانا چاہتے ہیں۔ سب کے سب موجودہ جماعت میں مزدور کے حامی ہیں۔ تینوں کے معاشی مذہب میں بھی بہت کچھ مشترک ہو۔ تینوں سرمایہ داری اور نظام مزدوری کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ یہ مالک طبقوں کے اغراض کے لئے مزدور سے بیجا فائدہ اٹھانے کے ذرایع ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ (دولت) پیدا کرنے والوں کو آزادی دلانے کا بس ایک ہی ذریعہ ہے یعنی کسی نہ کسی شکل میں ملکیت اجتماعی کا قیام۔ لیکن اس مشترک مذہب کے ڈھانچے کے اندر بہت سے تبرقے ہیں اور خود ان میں جنہیں تنگ معنوں میں اشتراکی کہنا چاہئے نہایت قابل لحاظ اختلافات موجود ہیں۔ بحیثیت ایک طاقت کے یورپ میں اشتراکیت کی ابتدا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مارکس سے ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ اس سے پہلے بھی انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں اشتراکی نظریے موجود تھے۔ یہ بھی سچ ہو کہ ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں فرانس میں اشتراک نے تھوڑے عرصے کے لئے ریاست میں خاصہ

اثر حاصل کر لیا تھا۔ لیکن مارکس سے پہلے جو اشتراکی ہوئے انکا رجحان عموماً خیالی خواب دیکھنے کیطرف تھا، چنانچہ یہ کوئی طاقتور یا پائدار سیاسی جماعت (پارٹی) نہ قایم کر سکے۔ یہ مارکس کا حصہ تھا کہ اُس نے انگلس کی مدد سے اشتراکی مسائل کا ایک مربوط مجموعہ تیار کیا جس میں اتنی سچائی تھی یا جو بظاہر اتنا معقول معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کی کثیر تعداد کے دماغوں پر حاوی ہو سکے اور نیز بین الملل اشتراکی تحریک کی بنیاد ڈالی جو پچھلے پچاس سال میں یورپ کے تمام ممالک میں برابر بڑھتی رہی ہے۔

مارکس کا مذہب سمجھنے کے لئے ضروری ہو کہ ان اثرات کے متعلق ہم کچھ واقفیت حاصل کریں جنہوں نے مارکس کے خیالات بننے میں مدد دی۔ یہ ۱۸۱۸ء میں جرمنی کے صوبہ رہائن کے ایک مقام تریوس میں پیدا ہوا۔ اسکا باپ ایک قانونی عہدیدار تھا اور نسلاً یہودی جس نے برائے نام عیسائیت قبول کر لی تھی۔ مارکس نے قانون، فلسفہ، معاشیات اور تاریخ کی تعلیم مختلف جرمن یونیورسٹیوں میں حاصل کی۔ فلسفہ میں اس نے ہیگل کے مذہب کا اثر لیا جو اس زمانہ میں معراج شہرت پر تھا اور ان مسائل کا کچھ نہ کچھ اثر تمام عمر اس کے خیال پر باقی رہا۔ ہیگل کی طرح اس نے بھی تاریخ میں ایک خیال کی نشو و نما دیکھی۔ اس نے تغیرات عالم کا تصور یوں قایم کیا کہ یہ گویا منطقی منازل کی ایک کڑی ہو جس میں ایک حالت انقلاب کے ذریعے ایسی دوسری حالت میں بدل جاتی ہو۔ جو اس کی ضد ہو۔ یہ ایک تخیل ہے جس نے اس کے خیالات کو ایک سخت تجرید کا رنگ دیدیا تھا اور بجائے ارتقاء کے انقلاب پر اعتماد۔ لیکن ہیگل کے زیادہ قطعی مسائل میں سے مارکس میں جوانی کے بعد کوئی بھی باقی نہ تھا۔ اسے لوگ نہایت ذہین طالب علم تسلیم کرتے تھے اور یہ بہ حیثیت پروفیسر یا سرکاری عہدیدار کے نہایت خوشحال زندگی بسر کر سکتا تھا، لیکن اس کی سیاسی دلچسپی اور اس کے

انتہا پسند خیالات نے اسے زیادہ دشوار گذار راستوں پر لا ڈالا۔ ۱۸۴۲ء ہی میں یہ ایک اخبار کا مدیر ہوگیا جسے اس کے انتہا پسند خیالات کی وجہ سے اگلے سال کے شروع ہی میں پروشیا کی حکومت نے بند کر دیا۔ چنانچہ مارکس نے پیرس کی راہ لی۔ یہاں یہ اشتراکی کی حیثیت سے مصروف کار ہوگیا اور اپنے فرانسیسی پیشروؤں[1] کے متعلق علم حاصل کرتا رہا۔ یہیں ۱۸۴۴ء میں انگلس سے اس کی وہ دوستی شروع ہوئی جو ساری عمر قائم رہی۔ انگلس اس زمانہ تک بسلسلہ کاروبار مانچسٹر میں تھا، اس نے یہاں انگریزی اشتراکیت سے واقفیت حاصل کی تھی اور بڑی حد تک اس کے مسائل کو قبول کیا[2]۔ ۱۸۴۵ء میں مارکس پیرس سے نکالا گیا اور انگلس کے ساتھ بروسیلز میں رہنے کے لئے گیا۔ یہاں اس نے "جرمن مزدوروں کی جمعیت" قائم کی اور ایک اخبار شائع کرنا شروع کیا جو اس جماعت کا آرگن تھا۔ بروسیلز کی کارگذاریوں کے سلسلہ میں پیرس کی جرمن اشتراکی لیگ کو اس سے واقفیت پیدا ہوئی اور اس لیگ نے ۱۸۴۷ء کے ختم پر اسے اور انگلس کو دعوت دی کہ انکے لئے ایک لائحہ عمل ترتیب دیں، جو جنوری ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ہے وہ مشہور "اشتراکی اعلان" جس میں پہلی مرتبہ مارکس کا نظام پیش کیا گیا۔ یہ بڑے

---

(۱) ان میں سے خاص فورئیے اور سان سیماں تھے جنھوں نے اشتراکی ریاستوں کے کچھ خیالی نقشے تعمیر کئے تھے۔ پرودھان کو جس سے مارکس کے کچھ بہت دوستانہ تعلقات نہ تھے بجائے ارتقائی اشتراک کے نراجیوں کا پیشرو سمجھنا چاہئے۔

(۲) مارکس اپنی کتاب "فلسفہ کا افلاس" (۱۸۴۷ء) میں انگریزی اشتراکیوں کا ذکر تعریف کے ساتھ کرتا ہے۔ خود اسکی طرح یہ بھی اپنے دلائل کو ریکارڈو کی نظریہ قدر پر قایم کرتے ہیں لیکن اس کا سا تبحر اور اس کی سی علمی وسعت نہیں رکھتے۔ ان میں ٹامس ہاجکن (۱۷۸۷-۱۸۶۹ء)

اسی وقت شائع ہوا۔ اگلے ہی مہینہ، فروری میں پیرس میں انقلاب برپا ہوا اور مارچ میں جرمنی تک پھیل گیا۔ انقلاب کے خوف سے برسلز کی حکومت نے مارکس کو بلجیم سے خارج کر دیا لیکن جرمنی انقلاب نے اس کے لئے خود اپنے ملک میں واپسی ممکن کر دی۔ جرمنی میں اس نے پھر ایک اخبار نکالا جس نے اسے پھر ارباب حکومت سے ٹکرایا اور جوں جوں انقلاب کا ردعمل زور پکڑتا گیا یہ مخالفت بھی بڑھتی گئی۔ جون ۱۸۴۹ء میں اسکا پرچہ بند کر کے اسے پروشیا سے خارج کر دیا گیا۔ یہ پیرس واپس گیا لیکن وہاں سے بھی نکالا گیا۔ چنانچہ یہ جا کر انگلستان میں مقیم ہوا، جو اس وقت حامیان حریت کا مامن بنا ہوا تھا، اور اشاعت تحریک کے سلسلہ میں جو تھوڑے تھوڑے زمانہ کے لئے یہ باہر گیا اس سے قطع نظر یہ اپنی موت یعنی ۱۸۸۳ء تک انگلستان ہی میں رہا۔ اس کے وقت کا زیادہ حصہ اپنی بڑی کتاب "سرمایہ" کی تالیف میں صرف ہوا۔ آخری زمانہ میں اسکا دوسرا اہم کام "مزدوروں کی بین الملل جمیعت" کے قیام اور توسیع پر مشتمل تھا ۱۸۶۴ء تا ۱۸۷۲ء اس کے وقت کا زیادہ حصہ "برٹش

کا نام لیا جا سکتا ہے جو پہلے بحری افسر تھا لیکن بحری نظم کے طریقوں پر ایک تنقیدی رسالہ لکھنے کی وجہ سے موقوف کر دیا گیا۔ اس کی تصنیف سے "سرمایہ داری کے خلاف محنت، دماغ" (۱۸۲۵ء) اور دوسری کتابیں ہیں۔ نیز ولیم ٹامس (۱۷۷۵-۱۸۳۳) مصنف کتاب "تحقیق بابتہ اصول تقسیم دولت جو انسانی خوشحالی کے لئے سب سے زیادہ معین ہوں" (۱۸۲۴ء) اور "محنت کا انعام" (۱۸۲۵)؛ اور پیری راون اسمون جس سے مارکس نے زیادہ تر اپنے خیالات لئے ہیں۔ غالباً ان سب سے زیادہ اہم رابرٹ اوون تھا

(۱) اس کی پہلی اور سب سے اہم جلد ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اور باقی دو جلدیں اس کے انتقال کے بعد ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۴ء میں

میوزیم" میں صرف ہوا جہاں یہ بڑے صبر کے ساتھ، نظام سرمایہ داری کے خلاف اپنی بے پناہ قرار داد جرم کے لئے مواد جمع کرتا تھا۔ لیکن بین الملی اشتراکی تحریک پر اس کا قابو برابر قایم رہا۔ نپولین کے بھائیوں کی طرح اکثر ملکوں میں اس کے داماد اس کے نائب تھے اور جو اندرونی مناقشے پیدا ہوتے تھے ان میں عموماً اسی کی مرضی غالب رہتی تھی۔

ہندوستان میں تنقید فن کا دور جدید

(۱)

فن اور تنقید فن

جس طرح زمین و آسمان ، ابر و باد و باراں ، شجر حجر بشر ، کرشمے ہیں قدرت و ذات خداوندی کے اسی طرح رنگینی شعر و رنگ آمیزی تصویر ، موج رقص شیریں اور جوے شیر فرہاد ، بتان آذر اور سبحۂ خلیل جلوے ہیں قدرت و ذات انسانی کے یہ دونوں یعنی ایک طرف بزبان انگریزی 'نیچر' اور دوسری طرف آرٹ ، تخلیقی پہلو ہیں ایک فرد مدرک ، ایک شخصیت کے ۔ ہم کو یہ پوری طرح سمجھ لینا چاہیے کیونکہ یورپ میں اُنیسویں صدی عیسوی کے آرٹ کی نیچر پرستی کے بعد جسے نسل انسانی کے فنی ارتقا کے دور اول کی تکمیل سمجھنا چاہیے ، جو فنی انقلاب اکسپرشنزم کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ہے اس کے پہلے ریلوں کے رفع دفع ہونے کے بعد آج ہم ٹھنڈے دل سے حال اور ماضی کے فنی کارناموں کا موازنہ کر سکتے ہیں ، اور اس موازنے سے ہم پر یہ راز فاش ہو جاتا ہے کہ جس وقت انسان اپنا منصب تخلیق صورت کھو بیٹھتا ہے اور محض نقالی فطرت یا اتباع طرز و نقوش پارینہ کو اپنا مسلک بنا لیتا ہے ، اس کی کوششوں پر لفظ آرٹ کا کسی صورت سے اطلاق باقی نہیں رہتا ۔ جذبات کے نقوش کو الفاظ رنگیں کا جامۂ صد آہنگ پہنانا ، اسی کا نام ہے شاعری اور جذبات کے پرتووں کی نقش و رنگ سے تنویر کر دینا اسی کا نام ہے مصوری ۔ جس طرح الفاظ کے ٹھنڈے بے جان موتیوں کو ردیف و قافیہ کی لڑیوں میں پرونے والے کو ہم شاعر نہیں بلکہ ناظم کہتے ہیں

اسی طرح مشاہدات فطرت کو کینوس یا کاغذ پر جیسے کا تیسا بنا دینے والے کو ہم تصویر ساز کہیں مصور نہیں کہہ سکتے۔ شاعری جزو پیغمبری اور پیغمبری جزو خدائی اگر ہے تو آفرینش کی بنا پر اور مصور پر اگر دعوائی خدائی کا الزام عاید کیا جاتا ہے تو یہ بھی آفرینش ہی کی بنا پر۔ فن غالب و فن مانی کی بنیادی نوعیت ایک ہے۔ یہ ایک بڑا ادبی عجوبہ ہے کہ شاعر کو تو مصور جذبات کہیں اور مصور کا مصور جذبات ہونے سے کوئی واسطہ نہ سمجھیں اور اسکی ایک کاریگر کی سی حیثیت قرار دیدیں جو گارے اینٹ کی چنائی کے بجائے رنگ آمیزی میں سرکھپایا کرے اور اپنی باریکی قلم کو معراج فن کا معیار ٹھہرائے۔ زمانہ حال کے مغربی نکتہ رس آرٹ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ "آرٹ اشکال پر اظہار کی تخلیق کا نام ہے" لیکن میں اس طوالت کی ضرورت نہیں خیال کرتا کیونکہ ہر وہ شکل جس کی واقعی تخلیق کیجائے اور جو محض مشاہدہ فطرت کی نقل نہ ہو وہ لابد مظہر ہوگی جذبات شخصی کے پس منظر کی۔ آرٹ یا فن سے مراد ہے تخلیق اشکال۔

لیکن ہر بنائی ہوئی شکل پر تخلیق فنی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ تخلیق فنی اس وقت ہوتی ہے جب انسان کسی شکل کو اصل میں اس شکل کی خاطر اور محض ضمناً افادی اغراض کی بنا پر بناتا ہے۔ جب انسان نے اپنا پہلا پیالہ بنایا ہوگا تو جو شکل اس نے اس پیالے کی بنائی اس کے دائرے اور اس کی ہیئت، اس کی ضروریات مادی پر مبنی نہ تھے بلکہ اس کے انفرادی ترنگ اور من کی موج کا نتیجہ تھے۔ میں خاص طور پر یہ کہنے سے احتراز کرتا ہوں کہ وہ اس کے حسِ لطیف اور اس کی ذوق جمال پر مبنی تھے۔ حسن ایک تصویر اضافی ہے اور کسی ایسے معیار کا متحمل نہیں جس کا ہر زمان و مکان پر اطلاق ہوسکے۔ فن کی تعریف حسن کے معیار سے کرنا ایک امر بے معنی ہے۔ مزید براں یہ جمالی نقطۂ نظر انسان کی تخلیقی امنگ اور صلاحیت پر ایسے قیود عاید کردیتا ہے جو اس

کی جدت و شدت اظہار کے لئے نہایت درجہ محدود کن ثابت ہوتے ہیں بلکہ بنا ہو جاتے ہیں فن کی بے بضاعتی اور اس کے جمود کی۔ مثلاً ہم یونانی بت تراشوں اور مغل اسکول کے مصوروں کو پیش کر سکتے ہیں جنکا معیار سراسر جمالی تھا۔ کس درجہ غیر محرک اور بے رس معلوم ہوتے ہیں انکے عمل چینی مصوروں کی آزاد قلمی اور ہندی بت تراشوں کی دیوانہ واری کے سامنے۔

اور جب انسان نے اپنا پہلا بت پرستش کے لئے تراشا تو اس کی شکل کسی مادی ضرورت کی پابند نہ تھی بلکہ اس کی اپنی انفرادی ترنگ کا مظہر تھی اور انہی انفرادی ترنگوں سے رفتہ رفتہ حسن کے ان معیاروں کا ارتقا ہوا ہے جو آج ہمارے پیش نظر ہیں اور انہیں انفرادی ترنگوں کی مجموعی قوت کی بنا پر آئے دن یہ معیار بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔

لہذا فن کا جمالی پہلو بھی اسی قدر عارضی ہے جتنا کہ اسکا اخلاقی پہلو اور ہرگز اس کا جوہر نہیں۔ فن، حسن اور اخلاق دونوں کی قیود سے بالاتر اور آزاد ہے اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے وہ جلوہ ہے انسان کی جذباتی کشمکشوں اور اس کی تخلیقی امنگوں کا۔ یہی کشمکش اور یہی امنگیں کہیں شعر اور ترنم بنکر "فردوس گوش" ہوتی ہیں تو کہیں تصویر اور کہیں رقص کی صورت میں "جنت نگاہ" کا اثر رکھتی ہیں۔ انہیں کشمکشوں اور امنگوں کا نتیجہ ہیں میلو کی زہرہ اور داونچی کی مونالیزا، نٹ راج شوا اور اجنتا کی کوہ نگاریاں، دہلی کی مسجد اور آگرے کا تاج، بیتھوون کی سمفونیاں اور موزارٹ کے آپیرے۔ حافظ و غالب کے اشعار اور رومی و اقبال کی مثنویاں۔

میں نے سطور بالا میں کوشش اس امر کی کی ہے کہ فن سے جو کچھ مراد ہے اس کو مختصراً بیان کر دوں اور اس نقطۂ نظر کو واضح کر دوں جو ہم کو فن کے سمجھنے اس کی تنقید کرنے اور اس سے لذت یاب ہونے میں غلط روی و ارزانی سے بچائے اور ہندوستان

کے موجودہ مسئلہ فن پر ایک رائے قائم کرنے میں ہماری رہبری کرے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ فن سے لذت یاب ہونے یا فن کے برتنے کے لئے کسی نقطہ نظر کا دانستہ وجود لازم ہے۔ فن اپنے ارتقا کے بالا ترزینوں پہ پہنچکر یعنی جہاں وہ صنّاعی سے ہٹکر ایک مستقل تمدنی شعبہ کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوتا ہے سراسر مرقع ہوتا ہے انسان کی زندگی کے جذباتی پہلو کا۔ چنانچہ انسان ذہنی نقطہ ہائے نظر اور نظریات فن سے جس قدر آزاد ہوگا اسی قدر اس کے فنی کارنامے پرزور اور بے لاگ ہونگے یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے ذہنی وعلمی نقطہ نظر دنیا پر غالب آتا گیا ہو ویسے ویسے فن کی شدت کیفی گھٹتی گئی ہے اور آج ہماری مجال نہیں کہ ہم فن کے پرانے کارناموں کا کیا بہ لحاظ وزن وجسامت اور کیا بہ لحاظ زور وشدت ایک آن مقابلہ کرسکیں۔ بلکہ فن سے واقعی لطف اندوز ہونے میں بھی ذہنی عنصر کا وجود ایک بڑی حد تک حائل رہتا ہے گو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمارے ادراک میں ایسی باریکی پیدا کردیتا ہو جو بذات خود لطف خاص سے خالی نہیں۔

لیکن ہمارا دور بیسویں صدی عیسوی کا دور ہے یعنی کیمرے اور سنیما کا دور اور ہوائی جہازوں نے تمدنی کنارہ کشی کے آخری امکانات کو مسمار کردیا ہے۔ ہم کو اس سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں اور اس میں بنی نوع انسان کی سراسر بہتری ہے لیکن اس خیال سے کہ ہم اپنے ہیرے جواہرات کو گالیوتیز کی رنگ برنگی چوڑیوں کے بدلے انکی غیر معمولیت سے متحیر ہو کر تبدیل نہ کرلیں جیسا کہ امریکہ کے وحشی باشندوں کے متعلق مشہور ہے۔ یا سمندر پار سے جو کچھ کوڑا کیڑا ببمبئی تک بہہ آوے اس کو عجائب روزگار ہی سے نہ سمجھیں ہم پر لازم ہے کہ ہم ذہنی عنصر کو استعمال کریں ہم پر لازم ہے کہ ہم تشریح کریں، چھان بین میں سر ماریں اور تفریق وترتیب سے کام لیں۔ کسی کارنامہ فن سے محظوظ یا متنفض ہوتے وقت اپنی دماغی کیفیت اور ساتھ

ہی ساتھ کاغذ پر جو نقش و رنگ ہیں انکی تشریح کریں۔ مختصراً یہ کہ ہم کو لازم ہے کہ ہم اپنے اندر تنقید کی صلاحیت بہم پہنچائیں۔

لیکن دراں حالیکہ آج اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہندوستان میں ایسے اصحاب فن موجود ہیں جنکا پلہ دنیا کے بڑے سے بڑے صاحب فن سے کسی صورت سے کم نہیں، کیا ہم اپنے یہاں صحیح معنوں میں نقاد فن کی ایک مثال بھی پیش کرسکتے ہیں؟ جو مضامین ہندوستان کے روزانہ اخباروں اور رسالوں میں فنی تنقید کے نام سے شائع ہوتے رہتے ہیں اور جن میں ہندوستان کے جلیل سے جلیل اور کم مایہ سے کم مایہ مصوروں کی کم و بیش ایک ہی جیسے الفاظ میں مدح سرائی کیجاتی ہے ان کو پڑھکر جو روحی صدمہ ہوتا ہے اس کا بیان عبث ہے اور اس کی ساری ذمہ داری صرف ہندوستانیوں پر عائد نہیں ہوتی۔ انکے معلمین فن یعنی انگریز جو ہندوستان میں فن اور معیار فن کی ٹکسال قائم کئے ہوئے ایک شان ہمہ دانی کے ساتھ جلوہ گستر ہیں بذات خود فن کے معاملہ میں فطرتاً حد درجہ کند حس واقع ہوئے ہیں۔ انگلستان میں مسٹر کلاسو بل ایک دل خوش کن استثنا رہی۔ (بلکہ یہاں تک ماننا پڑے گا کہ یورپ کے موجودہ نقادان فن میں انکا انداز بیان سب سے زیادہ صاف اور واضح ہوتا ہے اگو یہ کہدینا بھی ضروری ہے کہ انکی تنقید کی نشو و نما پیرس کے ارباب فن کے جمگھٹوں میں ہوئی) لیکن سویز کے اس طرف کا کیا رنگ ہے؟۔ جس عنوان سے وہ کسی آرٹسٹ کے عمل پر نکتہ چیں ہوتے ہیں وہ کمتر مستثنیات سے قطع نظر سراسر کھوکھلا اور مضحک ہوتا ہے اور اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ انکے اندر حس فن جو ایک نقاد سخن کے لئے ناگزیر ہے موجود نہیں۔ وہ مباحث فنی کے متعلق جو ایک لاطائل لفظی گورکھ دھندوں کی زبان قائم ہوگئی ہے کسی غریب کی تعریف یا کسی غریب کی مذمت میں صرف کرتے ہیں اور ہمیں اپنے ممدوح یا معتوب کے متعلق کوئی واضح

اصلاح مطلقاً نہیں دیتے ۔ نقاد کی ذمہ داریاں دوہری ہوتی ہیں ۔ اسکا فرض اولین
یہ ہوتا ہے کہ وہ عام افراد سے، جن میں تنقیدی صلاحیت اور حس فن کم ہوتی ہے فنی
کارناموں کو قریں تر کردے اور ان کارناموں سے جو کیفیات خود اس پر طاری ہوتی
ہیں خواہ بزبان حال خواہ بزبان قال دوسروں پر منتقل کردے، اور ان میں اچھے
برے کی تمیز کا جذبہ مشتعل کردے ۔ ضمناً وہ آرٹسٹ کے لئے بھی امداد کا باعث ہوتا ہے
اور یہ اس طرح کہ وہ اس کے کمزور پہلوؤں میں چٹکیاں لے لے کر اسے خواب غفلت سے
جگاتا ہے ۔ ممکن ہو کہ وہ اس کو اکثر آمادۂ بغاوت کردے لیکن نقاد آرٹسٹ کو جمود سے
محفوظ رکھتا ہے ۔

یہ صورت تو بہترین صورت اور نقاد کی یہ حیثیت بہترین حیثیت ہوگی لیکن
ایک بڑا خطرہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ساکھ جم جانے کے بعد نقاد فن سے دلال فن ہو کر
نہ رہ جائے ۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم کو بتلادے کہ کون کیا ہے، کہاں تک ہے، اور کیوں'
وہ آرٹسٹوں کو کیڑوں کے حیاتیاتی نمونوں کی طرح شیشوں میں بند کر کر کے ان پر ان کے
ناموں اور داموں کی چٹھیاں چپکانے لگتا ہے ۔ بجائے نقش و رنگ کے وہ سونے اور
چاندی کو معیار قرار دینے لگتا ہے اور آرٹ کے بازار پر اس طرح حاوی ہو جاتا ہے جس
طرح مسٹر مانٹیگو ایک زمانے میں چاندی کے بازار پر حاوی تھے یا شاید اب بھی ہوں ۔
یہ ہے در اصل وہ وبا جو آج کل یورپ میں عام ہو رہی ہے اور ہم کو اس سے بچنے کی
پوری کوشش کرنی چاہئے کیونکہ اسکا عہد مغلیہ کی سرپرستی فن سے بھی زیادہ
یہ اثر ہوتا ہے کہ آرٹسٹ ایک مزدور بنکر رہ جائے اور اس پر "حکم سرکار کا قلم دربار کا"
صادق آئے ۔ بہرحال جو کیفیت آجکل ہماری ہے ہندوستان میں وہ ناگفتہ بہ ہے اور
فن کی طرف سے ہمارا نقطۂ نظر کلیتاً غلط ہے ۔ عوام، جن میں ابتک فنی خودشناسی پیدا
نہیں ہوئی ہے، انکے دلوں کو تو انگریزی باتصویر پوسٹکارڈوں نے مسخر و تاراج

کرلیا ہے۔ میں یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ عوام سے میری مراد غریب ومفلس دہقانی نہیں کیونکہ آرٹ کے نقطۂ نظر سے بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اور یہ دہقانی ایک ہی صف میں نظر آئیں گے بلکہ عموماً دہقانی کی حسیات ان سے زیادہ تیز اور صحیح پائی جائینگی۔ اب رہے ایسے لوگ جو فن کا کچھ احساس رکھتے ہیں تو وہ عجیب عجیب مضحک خیالوں اور منصوبوں کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر فن کو ایک قومی معاملہ بناتے ہیں اکثر ان سے بھی بڑھکر اس کو ایک مذہبی معاملہ بنائے بیٹھے ہیں یعنی ایک طرح کا ہندو مسلم سوال۔ اجنتا ہندوں اور قوم پرستوں کا مسلک ہے تو تاج خلافتیوں کا منتہائے نظر۔ لیکن دونوں کے دونوں کرافٹ مارکٹ کے مبتذل ٹکے ٹکے والے یا تصویر پوسٹ کارڈوں پر دل وجان سے ریجھ جائیں اور اپنی بدمذاقی کا ذرا احساس نہ کریں۔ ایک طبقہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو اکثر امریکی سرپرستوں کی صلاح کے بموجب احتیاط کے پیرو ہوکر ہندوستان کے "خالص آرٹ" کی "خدمت" کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان حضرات سے کہوں گا کہ خدا کے لئے آپ اپنے اپنے کام سے لگئے اور ہندوستان غریب کے آرٹ اور اس کے مسئلے کو اس کے حال پر چھوڑئے۔ ان خیالات کو دماغ میں جگہ دیکر تصویریں اگلنی نہ شروع کردیجئے۔ تصویر بنائیے اور ضرور بنائیے لیکن جب، کہ جیسے کسی کے دل میں درد ہو اور اس سے چیخے بغیر نہ بنے، یا یوں کہ آپ کو کچھ کہنا ہے جو آپ کے خیال میں کسی اور نے ابتک نہیں کہا ہے، یا اس لئے بھی کہ پیٹ ہر شخص کے ساتھ ہے اور اسکا پالنا لابد، اور اپنی رنگ آمیزی اور تصویر سازی کے کرسب کے لئے ہیں لیکن خدارا آپ ملک وقوم یا بنی نوع انسان کی خدمت کے خیال سے قلم کو جنبش نہ دیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ان امریکی حضرات نے جو بے نقص سوٹ زیب تن کئے ہوئے کیل کانٹے سے بالکل درست، غریب فاقہ کش ہندوستان کو ایک مہینے اور اجنتا کو ایک دن میں نپٹانے کے لئے نئی دنیا سے آتے ہیں ہمارے لئے بہت کچھ باعث مضرت

ہے ہیں - ہندوستانی کم از کم اتنا تو ہے کہ اپنے فنی احساسات میں
ی سے کام لیتے ہیں اور خود کو دھوکے میں نہیں ڈالتے - میں کہیں بہتر سمجھتا
ہ مبتذل اور بد مذاق تصویروں کو دل سے لگائیں بجائے اس کے کہ وہ اجنٹا
ن کے سامنے کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ کے حال میں مبتلا ہوں اور خود فریب
ی کیفیات اپنے اوپر طاری کریں - میں نے ان جہانیاں جہاں گشت غولوں
یں برسوں دیکھا ہے اور ان سے خوب واقف ہوں - دنیا کے بہتر سے بہتر
موں کو دیکھتے وقت انکا رویہ قابل دید ہوتا ہے - "تحیر انگیز!" "رکس
نگیز!" ان میں سے ہر دیکھنے والا اور دیکھنے والی تھوڑے تھوڑے وقفہ
ز رہے گی - ساتھ ہی اس قسم کے اظہار خیال ہوتے رہتے ہیں کہ "یہ لاکھوں
بگا" اور "یہ کروروں میں خریدا گیا ہوگا" اکثر ایسے بھی خوش مذاق ہوتے
ہنے سے باز نہیں رہتے کہ امریکہ اگر چاہے تو یہ سب چیزیں خریدلے - اور وہ
رے گزرتے جاتے ہیں اور بیچارہ "گائڈ" جو انکے ساتھ ہوتا ہے ان کی
تا رہتا ہے اور آثار صنادید کی پرانی رٹی ہوئی داستان شروع سے آخر
حدیث کی طرح دہراتا ہے اور وہ بھی انکے ساتھ ایک کمرے سے دوسرے کمرے
برج سے دوسرے برج میں گزرتا جاتا ہے - وہ کچھ نہیں دیکھتے اور انکو
ی قدر کا حس نہیں ہوتا - میری اپنے ہم ملکوں سے دست بستہ یہ استدعا ہے
حضرات کو اپنا نمونہ نہ بنائیں - دلی میں رہکر تاج کو دیکھے بغیر اس کی ایک
سلے ہوئے مرجانا اچھا - لیکن تاج کو ڈھای کی طرح چھو کر چلے آنا نہیں اچھا -

ٹالسٹائے اور مشرق

(ماخوذ)

جس وقت ٹالسٹائے نے وفات پائی کسی کو مطلق گمان نہ تھا کہ اسکا تخیل کبھی اس دنیا میں اثر بھی کریگا۔ مگر اس نے بیج بو دیا تھا اور وہ موسم بہار کی بارش کا منتظر تھا۔ بادل آئے، پانی برسا، کھیتی سرسبز ہوئی اور اب فصل کاٹنے کا وقت ہے۔ ٹالسٹائے کی کشت امید کا ہرا ہونا ہندوستان کے کسان گاندھی کی عرقریزی پر موقوف تھا۔

نوع انسان کی تاریخ میں ایک بات نہایت حیرت انگیز ہے۔ آپ ساری تاریخ دیکھ جایئے جتنی تخیلی امیدیں ارباب فکر کے ذہن میں تھیں اور جن کا پورا ہونا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا سب کی سب ایک دن عملاً پوری ہوکر رہیں۔ بات یہ ہے کہ دنیا میں جب کوئی نیا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اسکا عکس یعنی ایک مخالف خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ ان دونوں میں باہم تصادم ہوتا ہے اور ذہن انسانی کے سمندر میں ایک طوفان و تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ اس طوفان کی لہروں سے زندگی کی کھیتی سیراب ہوتی ہے اور اس سے نئے نئے پودے اُگتے ہیں۔

۱۸۴۷ء میں جب ٹالسٹائے کی عمر اُنیس سال کی تھی اور وہ قازان کے شفاخانہ میں زیر علاج تھا اُسے ایک لاما سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بزرگ کسی ڈاکو کے ہاتھ سے زخمی ہوکر شفاخانے میں آئے تھے اور انہیں اتفاق سے ٹالسٹائے کے قریب ہی جگہ ملی تھی۔ ان کے فیض سے ٹالسٹائے کے دل میں حقیقت اور محبت کی چنگاری چمک اُٹھی۔ تیس سال تک دنیاداری کی راکھ میں یہ چنگاری دبی رہی اور اس کے بعد بھی اسے شعلہ جوالہ بننے کے لئے موافق ہوا نہ ملی۔

البتہ کوئی ساٹھ برس کے بعد ۱۹۰۸ء میں اس چنگاری سے ہندوستان کے ایک نوجوان گاندھی کے دل میں معرفت اور محبت کا شعلہ بھڑکا۔ گاندھی نے تکلیف اور مصیبت کی آندھیوں میں اس شعلہ کو نشو ونما دی یہاں تک کہ اس نے سارے ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا دی جس کی آنچ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ ٹالسٹائے کو مشرق سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ یہ تعلق اس درجہ اہم ہے کہ اگر ٹالسٹائے کی سیرت میں اس کا ذکر نہ کیا جائے تو وہ سیرت نامکمل رہجائے گی۔ ٹالسٹائے کے خیالات سائبیریا ریلوے کی طرح یورپ اور ایشیا کو ملاتے ہیں۔

ٹالسٹائے اور ایشیا کے تعلقات کے متعلق ہم کو اس کے شاگرد رشید پاؤل بیرزوکاف کی کتاب ٹالسٹائے اور مشرق میں بہت کافی مواد ملتا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹالسٹائے کو ابتدا ہی سے مشرق سے محبت تھی اور اس کا دل ہمیشہ دھر کھنچتا تھا۔ جب وہ ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت سے جامع قازان میں تعلیم پاتا تھا تو اُسے عربی اور ترکی زبان سیکھنے کا شوق تھا۔ وسط ایشیا کے قیام کے زمانے میں سے اسلامی تہذیب سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں س نے ابتدائی مدارس کے لئے جو کتابیں تصنیف کیں ان میں تقریبًا سارا مواد ہندوستان ور عرب کے قصوں اور کہانیوں سے لیا گیا تھا۔ جب ٹالسٹائے کو مذہب کی طرف توجہ ہوئی تو اُس نے یہ محسوس کیا کہ انسان کی تسکین اور نجات کے لئے محض انجیل ناکافی ہے۔ چنانچہ اس نے خالص مشرقی مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور یہ کوشش نے لگا کہ مشرقی مذاہب کے اصولوں کو یورپ کے لوگ بھی عقیدت اور احترام سے قبول کرلیں۔ چنانچہ اس نے ایک کتاب "تخیل العقلا" کے نام سے تالیف کی جس

میں اس نے انجیل کے حقائق چینی حکیم (   ) لے اوتسے کے کلام اور مہ
می کے خیالات کو جمع کر دیا۔ اس کا ابتدا سے یہ عقیدہ تھا کہ بنی نوع انسان کے
بڑے مذاہب کے اصول ایک ہی مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اُس نے اس مقصد
تمام مشرقی ممالک سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔

ٹالسٹائے کے تخیل سے زیادہ قریب چینیوں کا تخیل ہے لیکن چین ؟
اُس کے خیالات پر سب سے کم عمل ہوا ہے۔ ۱۸۸۴ء کے شروع میں ٹالسٹائے
کنفوشس اور لے اوتسے کی سیرت کا مطالعہ کیا ان میں سے وہ لے اوتسے کی ز
قدر کرتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں اسے دو معزز چینیوں سے خط وکتابت کرنے کا موقع
میں سے ایک کا نام سین ہوانگ ٹونگ اور دوسرے کا کوک ہوانگ مینگ:
جو خرالذکر پیکن کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور یورپ میں کافی شہرت رکھتا
انقلاب کے زمانہ میں وہ جلاوطن کر دیا گیا اور جاپان میں پناہ گزیں ہوا۔

ستمبر ۱۹۰۶ء میں ٹالسٹائے نے جو خط کوک ہوانگ مینگ کو لکھا اس میں ا
چینیوں کی بیحد تعریف کی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ کی قومیں ظلم اور فریب سے چ
حصے بخرے کرنا چاہتی تھیں اور چین نے انتہائی مہماں نوازی سے اُن کی جوع
کو تسکین دینے کے لئے اپنے ملک کو سفرۂ عام اور خوان یغما بنا دیا تھا۔ اس بات
ٹالسٹائے بہت خوش تھا اور وہ چینیوں کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ اس فیاضی پر ا
سے قائم رہیں۔ آخر میں فتح انہیں کی ہوگی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ٹالسٹائے کی
پوری ہوئی۔ مثلاً اُس زمانہ میں چین نے پورٹ آرتھر اور ڈالبی روس کو د
مگر آگے چلکر روس کو (جنگ روس و جاپان میں) اس کی بڑی زبردست قیمت
کرنا پڑی۔ اسی طرح کیوچیو جرمنی کے ہاتھ لگا تھا اور وہی ہائی وی برطانیہ کی
دستی کا شکار رہا تھا۔ کیوچیو کا حشر دنیا کو معلوم ہے وہی ہائی وی کا بھی انجام

ایک دن یہی انجام ہونا ہے۔

مگر چند سال بعد جب چینیوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ یورپ والوں کا مقابلہ انہیں کے ہتھیاروں سے کریں تو ٹالسٹائے کو بڑی بےچینی پیدا ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر چینی بھی رپ والوں کے متعدی مرض میں مبتلا ہو گئے تو نہ صرف چین کی روحانی ہلاکت کا باعث ہوگا بلکہ ساری دنیا کو نقصان پہنچے گا۔ اسکا خیال ہے کہ بنی نوع انسان کی زندگی میں ایک دن ضرور اصلاح ہوگی اور اس اصلاحی تحریک میں چین دنیا کی رہنمائی رے گا۔ چینیوں کے پاس ایک بڑی دولت ہے جسے وہ "ڈاؤ" یعنی حسن اخلاق کہتے ہیں۔ اُن میں کفایت شعاری، دیانت داری، نرمی، محنت اور استقلال کی صلتیں ہیں۔ اگر انہوں نے یہ چیزیں کھو دیں تو وہ کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ یورپ ا تقلید میں سیاسی اور صنعتی انقلاب کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ پرانا استبدادی نظام ستور باقی رہے۔ یورپ کی حالت زار چینیوں کے پیش نظر ہے :۔ غریبوں کی قابل رحم لت، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش، فوج کی بھرتی، جنگ کی تیاری ۔ آبادیوں کو لوٹنے کی پالیسی۔ کیا چین والے اس کی تقلید کریں گے؟ نہیں ہرگز نہیں دوسری طرف وہ اس پر بھی کبھی راضی نہ ہوں گے کہ یورپ والے انہیں پامال ڈالیں۔ ایسی صورت میں اُنکے لئے صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ روحانی ت سے کام لیں اور روح کے ناقابل شکست ہونے پر یقین رکھیں۔ انہیں اسس یدے اور اس قوت کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں استعمال کرنا ہئے۔ اگر وہ کرہ ارض کی طرح خاموشی سے اپنے مدار پر حرکت کرتے رہے تو یورپ ے دن مجبور ہوگا کہ ان کے سامنے ہتھیار ڈالدے۔ نوع انسان کی خیر و برکت چین روحانی پیشواؤں کے ان تین اصولوں میں پوشیدہ ہے، کنفیوشس کی "تواضع" اوتسے کے "نظم بے ضابطہ" اور بدھ کے "ایثار محبت" میں۔

یہ ہے ٹالسٹائے کی نصیحت چین کو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا چین نے اس نصیحت پر عمل کیا؟ ٹالسٹائے کا مکتوب الیہ کوک ہوانگ مینگ بہت تنگ خیال آدمی تھا۔ وہ شخصی حکومت کا حامی تھا اور اُسے ہر مرض کی دوا خیال کرتا تھا۔ وہ ناکامیاب ہوا اور ٹالسٹائے کے اصول کے مطابق اُسے ناکامیاب ہونا بھی چاہئے تھا۔ مگر چین کا موجودہ انقلاب بھی روسی حکیم کے راستے سے بہت دور ہے۔ یہ سوائے اس کے کہ تاریخ کے دفتر بے پایاں کا ایک ورق الٹ دے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ ٹالسٹائے کے خیالات چین کے ہزاروں برس کے فلسفے کے مطابق ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ چین ان خیالات کو اپنے لئے مشعل ہدایت نہ بنائے۔

جاپان کے متعلق ٹالسٹائے نے جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ جاپانی بہت بے چین طبیعت رکھتے ہیں اور ان میں نئے خیالات قبول کرنے کا مادہ بہت ہے۔ ایشیا کی قوموں میں سب سے پہلے (غالباً ۱۸۹۰ء میں یا اس کے کچھ پیشتر) جاپانیوں نے ٹالسٹائے سے تعلق پیدا کیا۔ مگر ٹالسٹائے کو ان کی روحانی ترقی کی صلاحیت میں بہت شبہ ہے۔ اس کے نزدیک یہ محبّ وطن اور فوجی قوت کی پرستش کرتے ہیں اور یورپ کی تہذیب سے مسحور ہوگئے ہیں۔ اس نے جاپان کے جتنے لوگوں سے خط وکتابت کی اُن سب کی طرف سے اُسے مایوسی ہوئی۔ ان میں سے جن لوگوں کو ٹالسٹائے کی پیروی کا دعوےٰ ہے ان کی بھی اصل میں یہ کوشش ہے کہ اُس کے اصولوں کی تاویل کرکے ان سب سے حب وطن کی حمایت کا کام لیں۔ مثلاً ایک نوجوان ۱۹۰۴ء میں ٹالسٹائے کی تصانیف کو پڑھ کر چلا اٹھتا ہے کہ ”حقیقت میں ٹالسٹائے ہمارا پیغمبر ہے“ مگر چند ہفتے بعد جب جاپان سین ٹاؤ میں روس کے بیڑے کو غرق کردیتا ہے تو یہی نوجوان حب وطن کی شراب سے متوالا ہوجاتا ہے۔ اور ٹالسٹائے کے بنیادی اصولوں کا مخالف۔

صرف چند جمہوری اشتراکی لیڈر جاپان میں ہیں جو ٹالسٹائے کی طرح جنگ کے
ن ہیں۔ مگر ان کے اور ٹالسٹائے کے خیالات میں مجموعی حیثیت سے بہت فرق ہے۔
ے نے ستمبر ۱۹۰۴ء میں روسی حکیم کو خط لکھا جس کے جواب میں اس نے ان کا شکریہ
یا اور جنگ کی مخالفت میں ان کی ہمنوائی کی مگر اس کے ساتھ ہی اشتراکیت کی
ب سے بھی اختلاف ظاہر کیا۔

مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جاپان پر ٹالسٹائے کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ ٹالسٹائے کی ہشتاد
سالگرہ کے موقع پر جو مجموعہ مضامین شائع ہوا اس میں ایک جاپانی کا مین چینگ
ی ایک مضمون تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ٹالسٹائے سے جاپان کے لوگ بہت متاثر ہوئے
اُس کی مذہبی تصانیف کی بدولت ۱۹۰۶ء۔ ۱۹۰۷ء میں نہ صرف جاپان کے عیسائیوں
بلکہ بدھ مذہب والوں میں بھی ایک اخلاقی انقلاب شروع ہوگیا۔ بدھ مذہب
سے ظاہری عبادات و رسوم پر زور دیتا چلا آتا تھا۔ مگر اب اس میں باطنیت
یک بھی شروع ہوئی۔ اب جاپان میں ہر طرف مذہبی احساس، مذہبی ضمیر کا چرچا ہونے لگا
یقت یہ ہے کہ اس قسم کی داخلیت بھی خطرے سے خالی نہیں۔ اس سے علاوہ قربانی اور
ن کے جذبات کے خود پسندی، خود غرضی، تعصب، مایوسی کے پیدا ہونے کا بھی امکان
بلکہ بعض اوقات خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ جاپان والے اس قدر جذبات
ت واقع ہوئے ہیں کہ اگر وہ ٹالسٹائے کے مذہب پر ایمان لائیں تو انکے لئے اس کا
نا بہت مشکل ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ کہیں المناک نتائج نہ پیدا ہوں۔ پھر بھی جاپان
ٹالسٹائے کے مریدوں کی چند چھوٹی چھوٹی جماعتیں کوبے کے آس پاس کاشتکاری
ہیں اور لوگوں کو حضرت عیسیٰ کا پیام محبت پہنچاتی ہیں۔ روسی حکیم کی یادگار میں
علمی انجمن بھی ہے جس کی طرف سے ایک ستر صفحے کا ماہوار رسالہ شائع ہوتا ہے۔

جاپان میں ٹالسٹائے کے پیرووں میں سب سے زیادہ قابل احترام ذات ایک

شخص کی ہے جس کا نام ڈانو وچینز ہے ۔ اُس نے ٹالسٹائے کو ایک عقیدت آمیز خط لکھا لیکن اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اس پیر روشن ضمیر کی زیارت کے لئے روانہ ہوگیا ۔ وہ روسی زبان بالکل نہیں جانتا تھا اور انگریزی بھی بہت کم ۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹالسٹائے کے گاؤں یاسنایہ تک پہنچا ۔ وہ وہاں صرف پانچ روز قیام کر کے جاپان واپس گیا مگر اس تھوڑے عرصے میں اس کے دل پر اُس کے مرشد کی زندگی ، بات چیت اور خصوصاً مسکراہٹ کا اتنا گہرا اثر پڑا جو آج تک باقی ہے اور غالباً تمام عمر باقی رہے گا ۔ ۱۹۰۸ء میں وہ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے " اگرچہ مجھے ٹالسٹائے سے ملے ہوئے سات سو تیس دن ہوگئے اور میں اس سے ہزارہا میل کے فاصلے پر ہوں لیکن اُن کی مسکراہٹ اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ آج کل میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہوں ۔ میرے ساتھ میری بیوی ہے اور ایک کتا ۔ ہم سب مل کر ایک مختصر سے مکان میں گزر کر لیتے ہیں ۔ میں نے کچھ ترکاری بو رکھی ہے اور اسکی کیاری میں جو گھاس بزانہ اُگ آتی ہے کھود کر پھینکتا رہتا ہوں ۔ میرا سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے اور یہ شغل مجھے بہت محبوب ہے ۔ اس میں میری اندرونی زندگی کی تصویر نظر آتی ہے ۔ بہت سے لوگوں کی حالت میری سی ہے مگر افسوس ہے کہ وہ اپنا سارا وقت مضمون لکھنے میں صرف کرتے ہیں اور عمل بالکل نہیں کرتے ۔"

روس کی رعایا میں مسلمانوں کی تعداد دو کروڑ کے قریب ہے ۔ اس لئے ٹالسٹائے کو اکثر مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ۔ جن دوستوں سے وہ خط و کتابت کیا کرتا تھا ان میں بھی مسلمانوں کی تعداد کم نہ تھی ۔ ۱۹۰۱ء میں جب ٹالسٹائے نے روس کے عیسائی کلیسا سے قطع تعلق کیا تو اس نے اپنے ملک کی اعلیٰ مذہبی کونسل کے نام ایک کھلا خط بھیجا ۔ اس میں توحید کی وہ بھی روح تھی جس نے تمام عالم اسلام کو ہلا دیا ۔ بہت سے مسلمان ٹالسٹائے کے دل و جان سے حامی ہوگئے ، روس کے باشکیریوں ، ہندوستان کے مسلمان

رہنماؤں اور استنبول کے سربرآوردہ مسلمانوں نے ٹالسٹائے کو خلوص اور محبت سے بھرے ہوئے خط لکھے جن کا مضمون یہ تھا کہ ٹالسٹائے کے خط میں موحدانہ جذبات دیکھ کر اُنکے دلوں پر اتنا اثر ہوا کہ اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ وہ سب اسے اپنا بھائی اور دل سے مسلمان سمجھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ زبان سے بھی اسلام کی حقانیت کا اقرار کرلے۔ قادیان ضلع گرداسپور سے کسی صاحب محمد صادق نامی نے بھی ایک خط لکھا جسے پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ انہوں نے بہت خلوص اور محبت کے ساتھ ٹالسٹائے کو یہ بتایا کہ اسلام میں ایک مجدد پیدا ہوئے ہیں جن کا نام حضرت مرزا غلام احمد ہے۔ ان بزرگ نے عیسائیوں کے باطل خیالات کی تردید میں یہ بھی لکھا کہ کشمیر میں یوزآسف یعنی عیسیٰ کی قبر کا انکشاف ہوا ہے۔

جن مسلمانوں نے ٹالسٹائے سے خط وکتابت کی ان میں سے اکثر حماقت اور مسخرے پن کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کی کوتاہ نظری، خودبینی اور خودستائی کو دیکھ کر ٹالسٹائے کو قرون وسطیٰ کے عیسائی یاد آتے تھے۔ مثلاً جب ٹالسٹائے اسلام کے ان مجدد پر ایمان نہیں لایا تو خط لکھنے والے بزرگ نے کئی بار اسے لکھا کہ انسان کے پاس خدا کا پیام تین طرح پہنچتا ہے بعض لوگ اپنے عقل وفہم سے ہدایت پاتے ہیں، بعض وحی اور الہام سے اور بعض تلوار کے زور سے۔

ٹالسٹائے ان لوگوں پر اعتراض نہیں کرتا کیونکہ اُس کے خیال میں حقیقت کے طالب کو نہ تو مختلف مذاہب کی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا چاہئے اور نہ اُنکے اختلافی مسائل پر بلکہ صرف اس نقطے کو تلاش کرنا چاہئے جو تمام مذاہب میں مشترک ہے چنانچہ اس نے ان قادیانی امام صاحب کو جنہیں اپنے مذہب کی برتری پر اس قدر ناز تھا صرف جواب دیا "ہر اس شخص پر جو سچی دینداری کے جذبات سے لبریز ہے فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کو لوگوں کے لئے نمونہ بنائے اور ایمانداری اور خلوص کے ساتھ نیکی کی تبلیغ

کرے۔ ہم سب کا مقصد ایک ہو اور وہ بھلائی اور نیکی کی زندگی بسر کرنا ہو"

ٹالسٹائے نے اسلام کی بہت تعریف کی ہے اور قرآن کے بہت سے معارف اُس کے دل کو تسکین دیتے ہیں لیکن اُسکا خیال ہے کہ عیسائیت کی طرح اسلام میں بھی بہت سی دور از کار باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اسلام کو قابل قبول اور سچا مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس میں سے بہت سے عقائد جو غلطی پر اور بہت سے جذبات جو تعصب پر مبنی ہیں نکال دینا پڑیں گے اور صرف وہ چیزیں رہ جائیں گی جو نیکی اور بھلائی کی جڑ ہیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے وہ اگر تمہیں میری باتیں بری لگیں تو معاف کر دو کیونکہ میں جب حق بات کہتا ہوں تو پوری کہتا ہوں۔ آدمی بات کہنے سے تو میرے نزدیک چپ رہنا بہتر ہے" مگر دوسری طرف ٹالسٹائے کو بعض روشن خیال اور وسیع النظر مسلمانوں سے بھی سابقہ پڑا۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں جب وہ روس کی عیسائی جماعت سے علیحدہ ہوا تو مصر کے مشہور مصلح اور رہنما مفتی محمد عبدہٗ نے اسے مبارکباد کا خط لکھا کہ اس کی ذات تمام طالبان حق کے لئے نمونہ ہو اور ان سب کی آنکھیں اس کے نقش قدم پر لگی ہوئی ہیں۔ تقریباً اسی مضمون کا خط ٹالسٹائے کو مرزا رضا خاں نے جو استنبول میں ایرانی قنصل کی حیثیت سے مقیم تھے لکھا تھا۔

لیکن سب سے زیادہ اثر ٹالسٹائے پر ایک بہائی کے خط کا ہوا۔ یہ جبریل سانی نام ایک شخص تھا جو عرب کا رہنے والا تھا۔ اُس نے پہلے مذہب عیسوی اختیار کیا اور پھر بہائی ہوگیا۔ اپنے خط میں اُس نے ٹالسٹائے کو اپنے عقائد کی تبدیلی کی داستان لکھی تھی جس کے جواب میں ٹالسٹائے نے لکھا کہ میں مدت سے بہائیت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا ہوں اور اس مبحث پر جتنی کتابیں مل سکتی ہیں قریب قریب سب میں نے جمع کر لی ہیں۔ مجھے یقین ہے بہائیت میں اخلاقی تربیت کی قوت ہو اور اس مذہب کو مشرق میں ترقی کا موقع ملیگا بلکہ مذہب عیسوی کی اندرونی کمزوری؟

سبب سے خیال ہوتا ہے کہ مذہب بہا اس کا قائم مقام ہو جائے تو تعجب نہیں۔
۱۹۰۸ء میں ٹالسٹائے کی ہشتاد سالہ سالگرہ کے موقع پر کلکتے کے ایک مسلمان
مداللہ نامی سہروردی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ٹالسٹائے کو مبارکباد
ں اور آسے یوگی کے لقب سے مخاطب کیا۔ انہوں نے لکھا کہ قرآن ٹالسٹائے کے
م تشدد کے عقیدے کا ہرگز مخالف نہیں ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح
سٹائے انجیل کا مطالعہ کرتا ہے یعنی باطل کی ظلمت میں نہیں بلکہ حق کی روشنی میں،
طرح قرآن کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ انہوں نے ٹالسٹائے کی تعریف میں کہا کہ وہ
مغرب کا نور ہے نہ مشرق کا بلکہ خدا کے انوار میں سے ایک نور ہے جو دنیا کی تاریکی
دور کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ ٹالسٹائے کا عدم تشدد کا
یدہ ہندوستان کے مہاتماؤں کی تعلیم کے ساتھ مل کر ایک نیا مذہب بنائے گا جس کی
یغ کے لئے ایک نیا ہادی پیدا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور وہ شخص پیدا
یا جو ہندوستان میں ٹالسٹائے کے فلسفے کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔

ہندوستان انیسویں صدی کے آخر میں بیدار ہو گیا۔ یورپ والے بالعموم اس
قت سے بیخبر ہیں۔ صرف چند علما جو سیاست اور ملک گیری سے واسطہ نہیں رکھتے
تابوں کے ایک ڈھیر کے درمیان اپنی زندگی گزار دیتے ہیں اس بیداری کا علم
تے ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کے خداداد جوہر
ہیں گے لیکن ۱۹۰۰ء میں یہ چمکے اور ایسے چمکے کہ دیکھنے والوں کی نظریں خیرہ ہو گئیں۔
ں زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ ریاضی ہو یا سائنس، شاعری ہو یا صنعت و حرفت
دوستان میں ترقی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ آریہ سماج کے قائم ہونے سے ویدانی فلسفے
دوبارہ زندہ ہونے کا امکان ہے اس کے علاوہ کیشب چندر سین نے برہمو سماج
بنیاد ڈالی ہے جس نے خدمت خلائق اور رفاہ عام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس میں

کیشب چندر نے مذہب کے عیسوی تخیل اور مشرقی تخیل کو ملانے کی کوشش کی ہو۔
ہندوستان کے مذہبی مصلحوں میں سے دو خاص امتیاز رکھتے ہیں ایک تو رام کرشن (۱۸۳۶ء تا ۱۸۸۶ء) اور دوسرے انکے لائق شاگرد سوامی ویویکانند (۱۸۶۳ء تا ۱۹۰۲ء) ان دونوں نے اپنے ہموطنوں میں صدیوں کے بعد پھر مذہبی روح پھونکی ہے۔
ٹالسٹائے جو ہر میدان میں حقیقت کی تلاش میں سرگرم رہتا تھا ان دونوں کی طرف سے بھی غافل نہیں رہا۔ ویدک میگزین کے اڈیٹر رام دیو نے اُسے سوامی ویویکانند کی تصانیف بھیجی تھیں اس نے ان سب کو پڑھا اور ۱۸۹۶ء سے برابر ان مضامین کا مطالعہ کررہا تھا جو سوامی جی کے قلم سے نکلتے تھے۔ اس کی نظر سے رام کرشن کے مقالات بھی گزرے۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ سوامی ویویکانند ۱۹۰۰ء میں یوروپ کی سیاحت کے دوران میں یاسنایا نہ جاسکے کہ ٹالسٹائے سے اوران سے عمر بھر میں ایک بار تو ملاقات ہو جاتی۔ راقم الحروف کا قصد تھا کہ پیرس میں جاکر اس مقدس مہان کی زیارت کرے مگر شومی قسمت سے موقع نہ ملا جس کی آج تک ندامت باقی ہے۔
وہ ہندوستانی جو قلب باصفا رکھتے ہیں ٹالسٹائے کو کرشن کا اوتار سمجھتے ہیں اور بہت سے لوگ اُسے مہاتما کہتے ہیں۔ دی نیو ریفارمر کے اڈیٹر گوپال چیٹی ٹالسٹائے کے پیرو ہیں۔ انہوں نے ٹالسٹائے کی ہشتاد سالہ سالگرہ کے موقع پر (۱۹۰۸ء میں) ایک مضمون لکھا جس میں ٹالسٹائے کو گوتم بدھ سے تشبیہ دی۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں "اگر ٹالسٹائے ہندوستان میں پیدا ہوتا تو لوگ اُسے اوتار سمجھ کر، پرش سمجھ کر، سری کرشن سمجھ کر اُس کا احترام کرتے"۔
مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ٹالسٹائے کو ہندوستان میں براہ راست جس جماعت سے سابقہ پڑا وہ سوراجیوں کی جماعت ہو۔ ۱۹۰۸ء میں سی آر داس نے جو آگے چل کر آزادی کی تحریک میں مہاتما گاندھی کے دست و بازو بن گئے ٹالسٹائے کو ایک خط لکھا جس

میں انہوں نے سچائی اور خلوص کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا اور ٹالسٹائے کے عدم مزاحمت کے نظریے پر نکتہ چینی کی اسی کے ساتھ انہوں نے ٹالسٹائے سے درخواست کی کہ ان کے رسالے "فری ہندوستان" کی قلمی اعانت کرے۔ اس کے جواب میں ٹالسٹائے نے ۱۴ دسمبر ۱۹۰۸ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں آس نے پہلی بار عدم مزاحمت اور محبت کا پیام ہندوستانیوں کے نام بھیجا۔ اس نے ہر جملے میں سری کرشن کے فلسفے کو مدنظر رکھا اور ہندوستانیوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی پرانی حکمت و دانش کو چھوڑ کر یوروپ کی تہذیب کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "توقع تھی کہ برہما بدھ اور کنفوشس کی قلمرو میں مغربی تہذیب کو کہیں جگہ نہ ملے گی یعنی چینی، جاپانی اور ہندی اپنے اپنے معلم کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔ اور چونکہ وہ تشدد کے حامیوں کی غلطی سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے وہ مسائل زندگی کے حل کرنے کے لئے آشتی اور محبت کی تدابیر اختیار کریں گے لیکن کیسی بدقسمتی ہے کہ دوسری قوموں کو ان کی غلطیوں سے متنبہ کرنے کے بعد مشرق کے رہنے والے مغربی تہذیب سے مسحور ہو گئے چنانچہ جاپان کا یہی حال ہے اور اسکا انجام ہرگز اچھا نہ ہوگا۔ چین اور ہندوستان کے بعض رہنماؤں کا بھی اس طرف رجحان ہو گیا ہے چنانچہ آپ نے ہندوستان کے سوراج کا ذکر کرتے ہوئے کسی رسالے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ غاصب کا مقابلہ کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے اور عدم مزاحمت سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہم کو سراسر نقصان"

"یہ کیوں، تم لوگ مذہبی آدمی ہو لیکن مغربی تہذیب سے مسحور ہو گئے ہو اور اپنی قوم کی قدیم رسم محبت کو توڑنا چاہتے ہو . . . . یوروپ کے لوگ جو پہلے مذہب کے غلام تھے اور اب سائنس کے بندے ہیں ہمیشہ سے تشدد کا خیال لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ وہ حق کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ تم نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ بھی تیاری نہ کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ انگریزوں نے ہندوستان پر اس لئے قبضہ

کر لیا کہ ہندوستان میں مقابلے کی قوت نہ تھی۔ مگر واقعہ اس کے برعکس ہے انگریزوں کو مقابلہ کرنے میں اس لئے آسانی ہوئی کہ ہندوستانی ابتدا سے انتہا تک اس عقیدے پر جمے رہے کہ تشدد ہی ہر منظم جماعت کی بنیاد اور اساس ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے ہندوستانی اپنے سرداروں کے مطیع بنے۔ اسی عقیدے کے سبب سے وہ آپس میں لڑتے ہیں، یورپ والوں سے لڑتے ہیں، انگریزوں سے لڑتے ہیں ..... ایک تجارتی کارخانہ جس میں تیس ہزار سے زیادہ افراد نہیں تھے بتیس کروڑ آدمیوں پر غالب آگیا۔ لیکن کیا انگریز اس شخص پر غالب آسکتے ہیں جسے اُن کی طرف رغبت نہ ہو؟ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ نہیں کیا بلکہ ہندوستانیوں نے ہندوستان کو انگریزوں کے سپرد کر دیا .... ہندوستان کی زندگی ماضی سے حال تک تشدد کے ماتحت گذر رہی ہے۔ ہندوستان دائمی محبت کے قانون کو سمجھنے سے قاصر ہے ... کتنے افسوس کی بات ہے کہ انسان کی عمر جہالت میں گزرتی ہے۔ جو چیز اس کے قبضے میں ہے اُسے وہ دنیا میں تلاش کرتا ہے کیونکہ اُسے علم نہیں کہ وہ اس کے پاس موجود ہے۔ واقعی جاہل کی حالت رحم کے قابل ہے "میں نے اسے (محبت کا) زیور دیا ہے اور یہ (محبت کا) زیور اُس کے پاس ہے مگر وہ اس سے بے خبر ہے" (سری کرشن)

"انسان کو صرف اس قانون، محبت پر عمل کرنا چاہئے جو اُس کے دل میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور صرف عدم مزاحمت اور عدم تشدد کے قانون کو پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ اس طرح نہ صرف کئی سو آدمی کئی ہزار آدمیوں پر غالب نہیں آسکتے بلکہ کئی لاکھ آدمی مل کر ایک آدمی کو مغلوب نہیں کر سکتے۔ بس تم یہ عہد کر لو کہ ہم کوئی گناہ نہیں کریں گے اور گنہگاروں کے ساتھ نہیں رہیں گے، قانون کو نہ توڑیں گے؛ خراج دینے سے انکار کرینگے، فوج میں نہیں داخل ہوں گے۔ پھر دنیا میں کوئی تم پر غلبہ نہ حاصل کر سکے گا"

اس طویل خط کے آخر میں ٹالسٹائے نے پھر سری کرشن کے چند جملے نقل کئے:

"بچو! چشم غفلت کھول کر دور تک دیکھو تمہیں ایک محبت سے معمور نئی دنیا نظر آئےگی یعنی فطری عالم جو میری خالص عقل سے بنا ہے یہی عالم حقیقی ہے۔ پس تمہیں اندازہ ہوگا اس کمال اور برتری کا جو محبت نے تمہیں عطا کی ہے اور تم پہچانوگے ان باتوں کو جن پر عمل کرنے کی تمہیں محبت نے ہدایت کی ہے۔

یہ کھلا خط جو ٹالسٹائے نے اصل میں سارے ہندوستانیوں کے نام لکھا تھا ایک نوجوان وکیل کے ہاتھ میں پڑا جو افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں رہتا تھا۔ یہ شخص جسے دنیا جانتا تھا گاندھی کہتی ہے اس خط کو پڑھ کر جوش مسرت سے اچھل پڑا۔ گاندھی نے غالباً ۱۹۱۰ء میں ٹالسٹائے کو خط لکھا جس میں انہوں نے یہ بتایا کہ وہ کس طرح دس سال سے ٹالسٹائے کی تعلیم کے مطابق اپنی قوم کی خدمت کر رہے ہیں اور اس بات کی اجازت چاہی کہ ٹالسٹائے نے جو خط سی۔ آر۔ داس کے نام لکھا تھا اس کا ترجمہ ہندوستانی میں شائع کر دیا جائے۔

ٹالسٹائے نے اس خط کا جو جواب دیا وہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے لکھا کہ "میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ظلم و ستم کے مقابلے میں نرمی اور آشتی کا اور غرور و تکبر کے مقابلے میں انکسار و محبت کا بول بالا ہو" اس کے بعد جب ٹالسٹائے نے گاندھی کی کتاب ہند سوراج پڑھی تو اسے اس مذہبی تحریک کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اُس نے گاندھی کو ایک خط میں لکھا کہ تمہارا عدم تشدد اور عدم مزاحمت نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے قابل قدر ہیں۔

ٹالسٹائے نے جب گاندھی کی سوانح عمری پڑھی تو اُسے بیحد خوشی ہوئی اور باوجودیکہ وہ اس زمانے میں سخت بیمار تھا مگر اس نے گاندھی کو کئی خط لکھے (مئی ۱۹۱۰ء) جب اسے کسی قدر صحت ہوئی تو اس نے (اپنے مرنے سے ایک مہینہ پہلے یعنی ۷ راکتوبر ۱۹۱۰ء کو) پھر گاندھی کو ایک خط لکھا جو عدم تشدد کے مذہب کے لئے انجیل کا حکم رکھتا ہے۔ یہ خط جو گویا ٹالسٹائے کا وصیت نامہ ہے جنوبی افریقہ میں "انڈین اوپینین" میں شائع ہوا۔ سچ پوچھئے

تو عدم تشدد کی پہلی کامیابی اس خط کی بدولت ہوئی ۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ادھر یہ خط شائع ہوا اور اُدھر ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ شروع ہوئی جس کے شعلے دیکھتے ہی دیکھتے تمام عالم میں پھیل گئے اور لاکھوں خدا کے بندے اس نفرت اور عداوت کی آگ میں جل کر بھسم ہوگئے ۔

مگر شکر ہے کہ یہ ہلاکت اور تباہی کے ہنگامے ختم ہوگئے ہیں ۔ خونخوار درندوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بند ہوگئی ہیں اور امن وامان کی بلبل یعنی گاندھی کی خوشگوار آواز صلح و آشتی کے ترانے سنا رہی ہے ۔ انسانی ہمدردی کا یہ نیا مقدس گیت بہت سے لوگوں کو پرانے گیت سے زیادہ شیریں اور زیادہ پر اثر معلوم ہوتا ہے ۔

عربی معاشرت پر ایرانی اثرات

یہ مضمون مشہور جرمن مستشرق فان اے کریمر کے ایک رسالے سے ماخوذ ہے جو
عنقریب بعض ضروری مضامین کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہو جائیگا۔

عراق و ایران کی تسخیر کے تھوڑے ہی دنوں بعد عرب ایرانی شہنشاہوں کی شان و شوکت اور انکے درباری آداب و مراسم اور تکلفات سے واقف ہو گئے تھے۔ اموی خلفانے بھی ان کی بہت کافی تقلید کی ہے۔ قرآن مجید کے امتناعی احکام کے باوجود دربار دمشق میں شراب نوشی کی رسم عام ہو گئی تھی۔ ابتدا میں یہ لوگ انگور کا ابلا ہوا رس (طلا) یا ایک یونانی شراب جس کا نام رساطون ہے (رساطون یونانی لفظ ہے) استعمال کرتے تھے۔ امویوں کے زوال کے بہت کافی زمانے کے بعد ایک مرتبہ بغداد میں بلور کا ایک بہت بڑا جام دکھایا گیا تھا جس میں خلیفہ ہشام کی بیوی ام حکیم صبوحی پیا کرتی تھی دربار بغداد میں بھی رومیوں کی شراب کی محفلوں کی طرح خوشی کے موقعوں پر میخواروں کو پھولوں کے ہار پہنائے جاتے تھے۔

بایں ہمہ بنو امیہ کے زمانے میں دربار کے آداب بہت زیادہ سخت نہیں تھے ہر شخص دربار میں آجا سکتا تھا اور خاص خاص لوگ یا تو خلیفہ کے پاس ہی دیوان یا کرسیوں اور گدوں پر بیٹھتے تھے۔ ایک درباری نے لکھا ہے کہ ایک روز جب کہ ابھی چاندنی راتیں تھیں اسے ولید ثانی کے دربار میں جانیکا اتفاق ہوا تو ایک بہت بڑے طشت میں اسکے سامنے شراب کے چند جام پیش کئے گئے اور جب اس نے یہ دریافت کیا کہ یہ شراب نوشی کا کونسا موقعہ ہے تو اسے بتایا گیا کہ یہ وہ شراب ہے جسے ایرانی ہفت گاہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کا دور سال کے ایک حصے میں برابر سات ہفتوں

تک قائم رہتا ہے۔ شام کی تفریحوں میں جب رقص سرود کی محفلیں قائم ہوتی تھیں خلفا قدیم ایرانی رسم کے مطابق پردے کی اوٹ میں بیٹھ جاتے تھے۔ یہ پردہ کمرے وسط میں لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ خلیفہ اہل دربار اور گانے والوں سے ممتاز ہو جائے۔ لیکن اس رسم پر تمام خلفا نے عمل نہیں کیا۔

سرود کا فن بے [illegible] بار دمشق میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی عربوں۔ ایرانیوں سے سیکھا تھا۔ شروع شروع کے بہترین گانے والے خواہ وہ مرد ہوں یا تو ایرانی تھے یا ایرانی اساتذہ کے شاگرد۔ حریم خلافت میں شب و روز عیش و عشرت کا چرچا رہتا تھا۔ ان لوگوں میں اور مسلمانوں کے اولین خلفا میں جو کسی طرح بھی عام لوگوں سے ممتاز نہیں رہتے تھے کس قدر فرق تھا۔ ولید ثانی ہر روز جواہرات سے نئے نئے طلائی ہار پہنا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک دور دراز صوبے کے عامل۔ عامل خرا نے ایک مرتبہ دربار خلافت سے شکایت کی کہ اس کے صوبے کی ساری مالگذاری کے باورچیخانے کے اخراجات کے لئے پوری نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ ایرانی لباس کا عام ہوگیا۔ چنانچہ یزید ابن مہلب نے ایک عرب کو اس جرم میں سزا بھی دی تھی۔ عربو کو ایرانی چیزوں سے خواہ مخواہ کا تعصب تھا ایک شخص نے اپنا چشم دید واقع بیان کی ہے:۔ اسمٰعیل ابن یسار ایرانی نژاد تھا لیکن اس کے آبا و اجدا دوسروں ہم کی طرح ایک عربی قبیلہ (تیم) کے مولا ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے یہ اسمٰعیل ہر ایرانی تعریف کیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں وہ عبداللہؓ ابن زبیر کی خلیفہ کا طرفدار تھا لیکن ا زوال پر اس نے امویوں کی قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ ایک مرتبہ اسے خلیفہ ہشام دربار میں حاضر ہونیکا موقع ملا ہشام اس وقت قصر رصافہ میں ایک مرمرین حوض کے کنارے بیٹھا تھا۔ اس نے اسمٰعیل سے کہا کوئی قصیدہ سناؤ۔ اس پر اسمٰعیل نے ا... اشعار پڑھنا شروع کئے جن میں اس نے اپنے ایرانی الاصل ہونے پر اظہار فخر کیا تھا

اسمٰعیل نے کہا :-

"مجھے اپنے آباؤ اجداد کی قسم ہیں وہ لکڑی نہیں ہوں جو لڑائی میں آسانی سے ٹوٹ جائے نہ وہ چشمہ ہوں جو خشک ہو جائے میں شریف قبیلے سے ہوں اور شان و شوکت میں کوئی مجھ سے بڑھ کر نہیں۔ میری زبان تلوار کی طرح تیز ہے اور اس سے میں اپنے قبیلے اور اپنے خاندان کی عزت کی حفاظت کرتا ہوں خواہ وہ کوئی تاجدار کیوں نہ ہوں۔ میرے آبا و اجداد اپنے زمانے کے بادشاہ تھے۔ وہ نہایت شائستہ، فیاض اور مہمان نواز تھے۔ وہ شہرت اور عزت میں اور اپنی فوج کی کثرت میں خسرو اور شاپور سے مشابہ تھے۔ وہ لڑائی میں شیروں کی طرح حملہ آور ہوتے تھے۔ انہوں نے ترکوں اور یونانیوں کو نیچا دکھایا۔ وہ بھاری بھاری زرہیں پہنکر چلتے تھے جس طرح بھوکے شیر نکلتے ہیں اور اگر تم پوچھو تو میں تمہیں بتاؤں کہ ہم اس نسل سے ہیں جو سب سے افضل ہے۔"

پہلے تو خلیفہ صبر و تحمل کے ساتھ اس کے اشعار سنتا رہا لیکن آخر کار مغلوب الغضب ہو کر کہنے لگا "اسے حوض میں پھینکدو" جو شیلے درباریوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور حوض میں پھینکدیا جس سے وہ بمشکل تمام ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ بالآخر خلیفہ نے اسے شام سے نکالدیا اور اسمٰعیل نے بھاگ کر عرب میں پناہ لی جہاں وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے آبا و اجداد کی شان میں مدح خوانی کرتا رہا۔

دولت امویہ کے انقراض کے بعد جب عباسی حکومت قائم ہوئی تو اہل ایران اور ایران کے ہمدردوں کے دن پھر گئے۔ عباسی خلفاء کے دربار اور ان کے دار السلطنت میں بہت کافی ایرانی موجود تھے۔ ان لوگوں کو قرب سلطانی ہی حاصل نہیں تھا بلکہ رفتہ رفتہ انکو بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر فائز کیا گیا جس سے انکی دولت و ثروت اور جاہ و اقتدار میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ برامکہ کے مشہور خا-

حال کون نہیں جانتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے زوال کی منحوس اور المناک ساعتوں تک نہایت مطلق العنانی کے ساتھ حکومت پر متصرف رہے۔ بڑی بڑی جھوں کی سرداری بھی ایرانیوں ہی کے حصے میں آتی تھی۔ خلیفہ ہادی کے زمانے میں ایک ایرانی جو اپنا سلسلۂ نسب ایرانی عمال کے ایک پرانے خاندان سے ملاتا تھا اور جو اسلام قبول کرلینے پر خلیفہ منصور کا مولا ہوگیا تھا خوزستان کا امیر عساکر مقرر ہوا اور اسے اختیار دیدیا گیا کہ وہ اس اہم صوبے کی مالگذاری بھی وصول کرلیا کرے۔

یہ باتیں قدیم عربی جماعت کو نہایت ناگوار گذرتی تھیں اور وہ لوگ اکثر صاف صاف اپنے جذبات کا اظہار کردیتے تھے۔ اس سلسلہ میں میں ایک ہجو کی طرف اشارہ کروں گا جو شروع عباسی عہد میں ایرانیوں کے خلاف لکھی گئی تھی اور جس سے عربی جذبات کی نہایت صحیح ترجمانی ہوتی ہے:۔

"خدا کو یہ نہیں منظور تھا کہ میں تمہیں اسی وقت سے جانتا جب تم گھاس کی منڈی میں بیٹھا کرتے تھے اور ابھی تمہاری خوش قسمتی کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ لیکن بمشکل ایک سال گذرنے پایا ہے کہ اب تم ریشم اور بانات کا لباس پہنے ادھر ادھر اکڑتے پھرتے ہو۔ ایک زمانہ تھا جب تمہاری عورتیں کنووں کے پاس بیٹھی دھوپ میں فاختاؤں کے ساتھ چلایا کرتی تھیں۔ خدا کی شان ہے کہ اب انکے بدن پر دنیا بھر کے ریشمی کپڑے نظر آتے ہیں۔ کیا انکو وہ زمانہ بھول گیا جب ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا وہ پہاڑیوں میں پتھر توڑا کرتی تھیں اور اپنے کرتے کے دامنوں میں گھاس کے بڑے بڑے گٹھے باندھ کر لایا کرتی تھیں۔ اب جوان کو مال و دولت نصیب ہوا تو وہ کس قدر بے شرمی سے جھوٹ بولتے ہیں اور کہتے ہیں ہم شریف ہیں، ہم دہقانوں کی اولاد ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی کمینے سے بھی پوچھا جائے کہ تم کون ہو تو نہایت غرور سے کہتا ہے

میں بہرام چوبیں کا بیٹا ہوں۔ میرا کون مقابلہ کر سکتا ہے، میں وہ ہوں جسے
کسریٰ نے مال و دولت عنایت کیا تھا اور اپنا وارث بنایا تھا۔"

ایرانیوں کے غرور پر اس سے زیادہ شدید حملہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

"دیکھو اب انہوں نے گدھوں کی بجائے اپنی نشستیں نہایت قیمتی ٹٹوؤں پر کس لی
ہیں اور تر کاری بوتے بوتے امرا و سلاطین کے محلوں میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ
عربوں سے نفرت کرتے ہیں اس لئے کہ ان کو خدا اور اس کے رسول سے
نفرت ہے۔"

لیکن اس اظہار غیظ و غضب کے باوجود جو سلب قوت اور زوال اقتدار کا ضروری
ر تھا۔ عربوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دربار خلافت میں ایرانی اثر بتدریج
تا گیا۔ یہاں تک کہ خلیفہ ہادی، ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں تو اس
انتہا ہو گئی۔ مامون کے اکثر وزرا ایرانی تھے یا ایرانی النسل۔ بغداد میں ایرانی وضع
ع اور ایرانی طرز معاشرت دن بدن مقبول ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے نوروز
جان اور رام قدیم ایرانی تیوہار بھی منانا شروع کر دئے۔ ارکان سلطنت ایرانی
س پہنتے تھے۔ چنانچہ دوسرے ہی عباسی خلیفہ کا حکم تھا کہ ملازمین حکومت قلانس
لمبی مخروطی سیاہ ٹوپیاں جو یورپ کی ٹاپ ہیٹ سے مشابہ تھیں) استعمال
ریں (۷۷۵ء - ۷۵۳م) دربار میں بھی ایرانی شہنشاہوں کے سے زرتار کپڑے
ے جاتے تھے اور یہ صرف خلفا کا حق تھا کہ اس لباس کو جسے چاہیں عنایت کریں
متوکل کے زمانے کا ایک سکہ ملا ہے جس میں خلیفہ ایرانی لباس پہنے نظر آتا ہے۔
چہ ابتدا میں بھی مسلمان تصویر سازی کے کچھ بہت زیادہ مخالف نہیں تھے لیکن
واقعہ سے یقین ہو جاتا ہے کہ دربار خلافت میں قدیم اسلامی تعصبات کا خاتمہ
چکا تھا اور یہ سب کچھ ساسانیوں کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ بغداد کے اعلیٰ طبقوں میں ایرانی

اثرات کے اس طرح سرایت کر جانے سے مذہبی زندگی میں بھی ایک نئے ہیجان اور ایک جدید انقلاب کے آثار پیدا ہوئے۔ عراق میں ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں تھی جنہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ان مذہبی عقائد کو اختیار کر لیا تھا جنہیں اسلام سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کچھ خاندانی اثر یا اجنبیوں سے میل جول کا نتیجہ تھا۔ عباسی عہد میں ان خیالات کو از سر نو تحریک ہوئی۔ بصرہ میں جو عہد خلافت کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ نہ صرف کثیر التعداد غیر عرب آبادی (جس میں ایرانی عنصر غالب تھا) موجود تھی بلکہ تجارتی تعلقات کی بدولت وہاں ہندی اثرات بھی پھیل رہے تھے۔ اسی شہر میں سب سے پہلے عقیدہ اختیار نے جس کی ابتدا دمشق میں ہوئی تھی ایک عقلی نظام دینیات کی شکل اختیار کی اور آگے چل کر مذہب اعتزال کے نام سے غیر معمولی وقعت حاصل کی۔ یہیں سب سے پہلے وہ آزاد خیال لوگ پیدا ہوئے جو رفتہ رفتہ اسلام سے بیگانہ ہوتے گئے اور یہیں سے مذہب سے بے اعتنائی کی وہ تحریک پیدا ہوئی جس سے آگے چلکر دربار خلافت بھی محفوظ نہیں رہا۔

ایثار کی فتح

تراوش قلم: میٹلڈا سیراؤ

(۱)

میٹلڈا سیراؤ (پیدائش ۱۸۵۶ء) ایطالیہ کے زنانہ اہل قلم کی صف اول میں شمار کی جاتی ہے۔
نے اپنے ملک کے سارے نسوانی طبقہ کے خلاف ایک شاہراہ زندگی اختیار کی۔ تیس سال کی،
ت مختلف شخصیتوں کے سوانح حیات پر رسائل و جرائد میں قلم فرسائی کرتی رہی۔

اس کے ابتدائی عہد کی تحریرات میں فرانسیسی حکمائے "واقعیت" (مثل زولا وغیرہ) کا رنگ علانیہ
ا ہے بیلزاک کی روح سے ارباب قلم میں شاید ہی کوئی اس قدر متأثر ہو جیسی کہ میٹلڈا ہے۔ بعد میں اس نے
ت انسانی کا مطالعہ و تجربہ پیش کرنے والے ناول نویسوں کا مذاق اختیار کیا اور اس کے بھی بعد وہ
ن جدیدہ کے مسلک سے تعلق رکھنے والی جماعت مصنفین کے زمرہ میں داخل ہو گئی۔ چنانچہ اس کا افسانہ
اسی رنگ کا آئینہ دار ہے۔ اس کا طرز تحریر کسی قدر مردانہ ہے۔ لیکن اس کے قصوں میں بلا کا جوش و
ہوتا ہے۔ اس کے ایک جدید افسانہ کی (ہیروئن) ایک امریکن عورت ہے لیکن وہ
مریکہ کے اس مذاق ادبی سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتی جس کا تقاضہ یہ ہے کہ "ہر قصہ کا خاتمہ
ت آمیز اور نیک انجام پر ہو۔ مگر اس افسانہ (ایثار کی فتح) میں اس نے اسی امریکن مذاق کا تتبع
ہے چنانچہ یہ قصہ اہل امریکہ کے نقطۂ نظر سے ایک "کامیڈی" ہے۔ اور خود مصنفہ کی زاویۂ
سے ایک "ٹریجیڈی"!

نینا اپنے کام سے سر نہ اٹھاتی تھی اور اس کی نرم و نازک انگلیاں بڑی چابکدستی سے
رک تھیں لیکن لولو ادھر ادھر کمرے میں ٹہل رہی تھی الماریوں میں رکھے ہوئے سامان
ہی تھی یا وہ پھر کسی میز کی دراز کو کھولتی اور بے معنی انداز سے اس کے اندر جھانکتی

تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس وقت اس کا جی کسی کام میں نہیں لگتا اور وہ بیتاب ہے کہ بسلسلۂ گفتگو شروع کرے۔ مگر ساتھ ہی اپنی بڑی بہن کے پُروقار انداز سے مرعوب بھی ہے۔ خیر اب وہ ایک گیت گنگنانے لگی۔ اُس نے ایک شعر پڑھا لیکن صوفیہ نے کوئی التفات نہ کیا۔ آخر تو لو کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور اب وہ پوری بیباکی سے ہمکلام ہونے پر مجبور ہو گئی۔ وہ اپنی بہن کے بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی اور پوچھا :-

"صوفیہ! تمہیں کچھ خبر ہے کہ اُستانی نے مجھے کیا کہا ہے ؟ !"

"یقیناً کوئی دلچسپ بات نہ کہی ہو گی"

"صوفیہ! یہ ایسا خشک سرد جواب ہے کہ اُس کو سنکر گرمی کے موسم میں بھی آدمی کی رگ رگ میں سردی سرایت کر جائے! میری کشمیری بہن! آخر یہ سردی اور سردمہری تم میں کہاں سے آ گئی ہے ؟"

"لولو تم ابھی تک بالکل بچہ ہو !"

"ہاں ایہی تو تم کو غلط فہمی ہے! میری پیاری بہن! میں بچہ نہیں ہوں! میری تو اب شادی ہونے والی ہے !"

"کیا کہا ؟ !"

"جی ہاں! یہی وہ غیر دلچسپ بات ہے جو جینیٹی نے مجھ سے کہی ہے !"

"کس قدر لغویات ہے! میں تمہاری گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر ہوں"

"اچھی بات ہے! تو اب میں تم کو ساری داستان ہی سنا دوں جس طرح ڈدا مانوئیس سُنا کرتے ہیں، لیکن حضور کے گوشگذار رہے کہ یہ ذرا طویل اور مسلسل تذکرہ ہوگا؛ لہذا میں سرکارعالیات مآب سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ پوری توجہ سے اُس کو سُننا بھی گوارا فرمائیں گی ؟"

"ہاں ہاں! لیکن جلدی کیجئے"

"میدان مریخ میں جس دن گھوڑ دوڑ ہوئی ہے اس دن اور وہ موقعہ اس داستانِ عشق

وقت اور محل ہے۔ آپ وہاں تشریف فرما تھیں۔ اس لئے کہ آپ تو حسب معمول اپنی کتابوں میں مستغرق تھیں!"

"اگر تم نے اِسی طرح قصّہ بیان کیا اور نفسِ مضمون کو چھوڑ کر ایسی ہی بیراہ روی اختیار کی تو میں ایک حرف آیندہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوں!"

"اجی آپ سُنیں تو! یہاں تو وہ حال ہو رہا ہے کہ:۔

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ اُستخواں سوزد

"اچھا اب آپ شروع بھی کریں گے یا نہیں؟"

"ارے صاحب ذرا دم تو لینے دیجئے! اچھا تو گھوڑ دوڑ میں ہم اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں پاؤ لولیوٹیو آیا اور ہمارے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کو پیش کیا۔ یہ رابرٹ انٹی فرینکو تھا۔ خیر رسمی صاحب سلامت اور طرفین سے بے معنی تکلف و تپاک کے بعد وہ لوگ عین ہماری پشت والی قطار میں بیٹھ گئے۔ ہمارے آپس میں دو چار ہی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا کہ گھوڑ دوڑ کے شروع ہونے کا سگنل ہوا۔ تم جانتی ہو کہ گارگن (گھوڑی) میری منظورِ نظر تھی، مجھے مطلق خبر نہ تھی کہ میرے حق میں وہ کس قدر بے مُروّت ثابت ہونے والی ہے! خیر۔ آدمی کو حیوانوں کی مُحسن کشی پر بھی صبر کرنا پڑتا ہے۔ الغرض دَوڑ شروع ہو گئی اور گھوڑے گرد و غبار کے بادل میں غرق ہو گئے۔"

میں یکبارگی چلّائی کہ "گارگن جیت گئی"۔

فرینکو نے کہا: "نہیں، بلکہ لارڈ لیو بلو (گھوڑا) جیتا!"

"میں اُس کی تردید پر کبیدہ خاطر ہوئی مگر وہ مُسکراتا رہا اور اسی جملہ کی تکرار کرتا رہا۔ آخر ہماری نوک جھونک اسی شرط پر ختم ہوئی کہ دیکھیں دونوں میں سے کون جیتتا ہے۔ کامل نصف گھنٹہ کی اُمید و بیم کے بعد مجھ کو معلوم ہوا کہ گارگن نے مجھے دھوکا دیا۔ میں ہاری اور رانٹی فرینکو جیتا۔ ذرا اس بات پر غور کرنا! اب میں اُس سے کہہ رہی ہوں کہ میں ابھی شرط کا روپیہ ادا کرتی ہوں،

اور وہ سرنگوں ہو کر آداب بجا لاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "کچھ مضائقہ نہیں، جلدی کیا ہے"۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اُس سے شیا جا پڑھتی ہوں اور ایک مستفسرانہ نگاہ اُس پر ڈالتی ہوں اور وہ بدستور سر خم کرتا ہے اور ایک معنی خیز تبسّم اس کے چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ بس بالکل تھیٹر کا سا معاملہ تھا! اب میں انتہائی اشتیاق تجسّس کی حالت میں ہوں ....

رابرٹو ایک جوان رعنا ہے، ۲۶ سال کی عمر ہو گی؛ اور آج صبح کا یہ واقعہ ہے کہ مانٹی فرنیکو جو میرے آیندہ خسر بننے والے ہیں دو گھنٹہ تک امّی کے ساتھ مصروفِ گفتگو رہے!"

"اچھا!" صوفیہ کے مُنہ سے نکلا۔

"جی! اَب تو لوگوں کے چہروں پر توجہ کی علامات نظر آتی ہیں! خیر! تو جن باتوں پر اُس ملاقات میں بحث ہوئی ہے اُن کی مجھ کو پوری اطلاع ملی ہے؛ مختصراً یہ کہ شادی کے جملہ مراتب اَب طے پا گئے ہیں، مگر ہاں ایک نہایت اہم جزوی امر کا تعیّن ابھی باقی ہے۔ یعنی یہ کہ میئر کے دفتر ("دار النکاح") میں اَب مجھے کس دن جانا ہے، اور آیا میں اُس دن خاکستری گون پہنوں گی یا قرمزی رنگ کا؟ اور ہاں اُس دن مجھ کو پھندنے دار ٹوپی پہننی چاہیئے یا بے پھندنے کی؟"

"تم تو ہَوا کے گھوڑے پر سوار ہو؟"

"ہَوا کا گھوڑا؟ بھلا یہ کیونکر؟ تمہیں کہو اَب کون سی رُکاوٹ باقی ہے؛ رابرٹو اور میں ایک دوسرے پر دیوانہ وار شیدا ہو جائیں گے؛ ہمارے والدین بھی اس رشتہ سے مطمئن ہیں"۔

"اور تم اِس طریقے سے ایک شخص سے شادی کر لو گی؟!" صوفیہ نے سوال کیا۔

"اِس طریقے کے کیا معنی ہیں؟ یہ تو بہت معنی خیز لفظ ہے!"

"یعنی یہی کہ بغیر اس کو جانے ہوئے اور بغیر اُس سے محبّت و اُلفت کے پینگ بڑھائے ہوئے!"

"مگر ایسا تو نہیں ہے، میں اس کو جانتی ہوں، میں نے اُس کو گھوڑدوڑ میں دیکھا،

پھر باہر ٹہلتی ہوئی بھی اُس سے ملی! باہمی شناسائی اِس حد تک بڑھ گئی ہے کہ مَیں اُس کی پرستش کرنے لگی ہوں! پرسوں کا ذکر ہے کہ محض اس بات پر کہ میری اُس کی مُلاقات نہ ہو سکی میں نے دوپہر کا کھانا نہ کھایا اور صرف تین پیالی چائے پر دن گزار دیا؛ اُس دن میں قریب تھا کہ خودکشی کر لیتی!"

"اور وہ!؟" صوفیہ نے پوچھا

"وہ؟ وہ بھی یقیناً مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے، پس معلوم ہوا کہ مجھ سے محبت بھی کرتا ہے" لولو نے جواب دیا اس جواب میں ایک فاتحانہ لہجہ تھا؛ مگر جب اُس نے دیکھا کہ اس بات پر صوفیہ کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے تو وہ اس ناعاقبت اندیشانہ انداز پر متاسف ہوئی، بہن کے سر پر جُھک کر اُس نے پیار سے پوچھا:

"کیوں بہن! کیا میرے مُنہ سے کوئی ناگوار بات نکلی؟"

"نہیں پیاری نہیں! تم ٹھیک کہتی ہو؛ جب کوئی عشق کرتا ہے تو شادی بھی کرتا ہے؛ لیکن جب محبت نہ ہو تو محبت پیدا تو نہیں کی جا سکتی!

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب + کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!"

یہ کہنے کے بعد صوفیہ کے مُنہ سے ایک آہ نکلی!

"بہن! یہ کیا کہا کہ "لگائے نہ لگے"؟ میں تم سے کہتی ہوں کہ اس آگ کا بھڑکانا آسان ہے، صوفیہ! لیکن تمہاری طرح جب کسی کے ابروؤں سے متانت ٹپکتی ہو، آنکھوں سے غم برستا ہو، اور ہونٹوں پر کبھی تبسم نہ پیدا ہوتا ہو! جب تمہاری طرح کوئی لڑکی جا کر کونے میں بیٹھ جائے اور وہاں مصروفِ غور و فکر ہو جائے، درآنحالیکہ دوسری لڑکیاں ناچتی کودتی اور ہنسی دل لگی کرتی پھر رہی ہوں۔ جبکہ تمہاری طرح کوئی ہر وقت پڑھا ہی کرے اور عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بجائے فلسفیانہ اور شاعرانہ خواب ہی دیکھا کرے! اور جبکہ تمہاری طرح کوئی لڑکی کم سنی ہی میں بڑے بوڑھوں کا سا متفکرانہ انداز اختیار کرلے، تو اُس وقت تو بلاشبہ یہ

مشکل ہے کہ کوئی اُس سے محبت کرے !"

صوفیہ نے اپنا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر آہستہ سے ایک ارتعاش پیدا ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے لب پر آہ ہے۔ لیکن وہ ضبط کرنا چاہتی ہے! یہ حالت دیکھکر لولو نے پوچھا:

"بہن! کیا میں نے تمہارے جذبات کو پھر مجروح کر دیا؟ .... یقین مانا کرو میں نے یہ ساری باتیں اس لئے کہی ہیں کہ لوگ تم سے بھی محبت کرنے لگیں، اور میں تمکو شانِ محبوبی میں دیکھوں! تمہارے گرد و پیش محبت و اُلفت کا حصار ہو اور میں تم کو ایک روز دُلہن بنا ہوا دیکھوں! ہاں! کیا خوب ہو کہ میری اور تمہاری شادی ایک ہی دن رچے!!"

"اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں! سنا لولو! میں بڑھاپے تک کنواری رہنا چاہتی ہوں!"

"نہیں میری دوشیزہ! میں اس کو کب گوارا کر سکوں گی! تم کیسی خراب آدمی ہو! خدا نے تم کو کیا عجیب الخلقت بنایا ہے! اگر رابرٹو واقعی کوئی اچھا آدمی ہے تو اُس کا ضرور کوئی کنوارا بھائی بھی ہونا چاہیئے، کاش ایسا ہی ہو!"

گفتگو یہیں تک پہونچی تھی کہ اُن کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ہَوا خوری کے لباس میں تھی۔

"کیا آپ پھرنے جا رہی ہیں، امّی؟" لولو نے پوچھا۔

"ہاں پیاری میں اس وقت مُنیم کے یہاں جا رہی ہوں"

"اوہو! مُنیم کے یہاں! تو معلوم ہوا کوئی کاروبار کا معاملہ ہے۔"

"بس لولو! تم کو جلد حقیقت معلوم ہو جائے گی! صوفیہ! تھوڑی دیر کے لئے تم میرے ساتھ چلو۔"

"ایں! کیا صوفیہ کو بھی کمبخت مُنیم کے ساتھ کوئی سابقہ پڑا کرتا ہے؟!"

"لولو! دیکھتی رہو، کہ تم کیسے تماشے دیکھو گی؟"

"بہت جلد امی! آپ خود دیکھ لیں گی"

لولو نے دروازہ کھولا تاکہ ماں اور بہن باہر نکل جائیں، اور پھر اُن کو دو دفعہ جھک کر سلام کیا۔ اور دبی زبان سے کہا "میڈیم میڈیمائسل!"

جب دونوں کمرے سے روانہ ہو گئے تو لولو نے دروازے پر سے ان کو پکارا۔ اور ایک غوغائی قہقہہ لگایا:

"ہاں ہاں! اپنی باتیں جاری رکھیئے، جاری رکھیئے! میں بھی جان بوجھ کر انجان بن جاؤں گی"



(۲)

بحیثیت مجموعی رابرٹ مانٹی فرینکو کوئی صاحب فکر آدمی نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس کو اپنی فکر و نظر کو نشو و نما دینے کا کوئی موقع ہی نہ ملا تھا۔ گھوڑوں کی سواری، ملاقاتیں اور دعوتیں ان ہی ہنگامہ آرائیوں میں اُس کے دن اُڑ جاتے تھے؛ اور اُس کی زندگی اب نہایت پُر لطف طریقے سے اُس کی حسین سہ جبین لولو کی آغوشِ اُلفت میں بسر ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسری کے کام بھی رابرٹ کو انجام دینے پڑتے تھے؛ یعنی وکلاء کے ساتھ اوقات مقرّرہ پر طے شدہ قرارداد کے مطابق مُلاقات کرنا۔ معاہدوں پر دستخط کرنا اور پُرانے قرضوں کی حساب فہمی وغیرہ وغیرہ۔ اور آئندہ متاہل زندگی کی تیاریوں اور شادی کی کوشش میں جو مسلسل دورے اُس کو کرنے پڑتے تھے۔ اُن کا تو کچھ ذکر ہی نہیں! بمشکل اُس کو آدھا گھنٹہ مطالعہ کے لئے ملتا ہوگا۔ یا کسی ہوٹل کے سامنے پندرہ منٹ چہلقدمی کے لئے! الغرض اس کو کبھی کسی نے اس حال میں نہ دیکھا کہ وہ غور و فکر میں محو ہو، نہ کبھی یہ سُنا کہ وہ کسی اجتماعی مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف فکر پایا گیا ہو۔ اُس کی زندگی کسی دردناک حادثہ سے آشنا نہ ہوئی تھی اور نہ اُس کی سیرت میں کوئی متضاد بات تھی بلکہ اس کے برعکس وہ ایک سیدھا سادھا سہ بادی مزاج کا آدمی تھا اور اُس کے

بہت سے ساتھی اُس کی اس اُفتادِ مزاج پر رشک کرتے تھے۔

لیکن آج دوپہر کو خلافِ معمول اُس کو اس رنگ سے دیکھا گیا کہ وہ اپنی آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی ہوئی تھی اور اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور مطالعہ کرنے کی حقیقی خواہش کے آثار اُس کے چہرہ پر نمایاں تھے! کتاب اگرچہ دلچسپ تھی لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کتاب کا پڑھنے والا ایک بے خودی و محویت کے عالم میں تھا واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کچھ اس سے بھی زیادہ تھی یعنی وہ کسیقدر مضطرو مضطرب بھی تھا! اُس کو ورق گردانی کا کوئی موقع نہ ملتا تھا اس لئے کہ دو تین سطریں پڑھنے کے بعد اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مطبوعہ حروف اپنی جگہ سے محو ہو گئے ہیں، اِدھر اُدھر اڑتے پھرتے ہیں، آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، اور پھر نظر سے بالکل غائب ہو جاتے ہیں! آج غیر شعوری طور سے رابرٹو کا دل ودماغ فکر و تخیل کی نئی اور غیر معلوم دنیا کی سیر کر رہا ہے!!

"والد اس نسبت سے مطمئن ہیں! میری سب چچیوں نے اپنی دعائیں بھیجی ہیں، لیکن میری رشتہ کی بہنیں خفا ہیں! اُدھر ہوٹل کے حلقۂ احباب میں جو میرے دوست آشنا ہیں وہ ایک معنی خیز انداز میں مجھ کو مبارکباد یں دے رہے ہیں! میرے قلبی دوست بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں یہ ساری باتیں پسندیدگی کے آثار ہیں اور فی الواقع شادی کی ایک "فضا" پیدا ہو گئی ہے۔ .... اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ لالو بہت حسین ہے! جس وقت وہ اپنی شوخ و شنگ آنکھیں مجھ پر ڈالتی ہے، ہاں جب وہ مصروفِ تبسم ناز ہوتی ہے اور اُس کے لب لعلین کی آڑ میں دُر دندان کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو بے اختیار میرے جی میں یہ بات آتی ہے کہ اُس کا پیارا سر اپنے ہاتھوں میں لے لوں، اور بار بار اُس کو چوموں! اُس کی سیرت بھی بہت خوب ہے! میں کہنا چاہیئے کہ وہ زریں مزاج رکھتی ہے، ہمیشہ خوش و خرم اور ہشاش بشاش رہتی ہے، بہت نیک نہاد ہے، ہنسی دل لگی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتی ہے، بہت ذہین اور حاضر جواب ہے۔

خوش فعلیوں اور شگفتہ طبیعوں سے لبریز ہے، اور کبھی مغموم و ملول نہیں ہوتی؛ غرض یہ کہ ہماری اُس کی خوب نبھے گی۔ مَیں پُر متانت انداز کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے تو اُس کے دیکھنے تک کی برداشت نہیں۔ بالخصوص اُن لوگوں میں جن سے مَیں مُحبّت کرنا چاہتا ہوں مجھکو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کے چہرے کے ایسے آثار کے پیچھے اندرونی رنج و غم ہوتا ہے جس سے میرا دل مطلقاً ناآشنا ہے، اور جس کا میرے پاس کوئی درماں نہیں۔ بلکہ مجھکو یوں کہنا چاہیئے کہ ایسے غم و اَلم کا مَیں غیر ارادی طور سے خود باعث بنجاتا ہوں! صوفیہ جو میری سالی بننے والی ہے اُس کی طبیعت کا یہی رنگ ہے۔ مجھے سرد مہرا ور جذبات سے خالی چہرے سے چڑ ہے۔ جب کبھی وہ میرے سامنے آجاتی ہے میرے ہوش و حواس گُم ہو جاتے ہیں۔ میرے ہونٹوں سے ہنسی کا فور ہو جاتی ہے؛ اُس وقت اگر موسمِ بہار کا شاندار آفتاب بھی ضیا پاشی کر رہا ہو تب بھی میرے لئے یہ سارا حَسین منظر ماہِ نومبر کا ایک سَرد و خشک اور بے رونق اور بے کیف دن بن جاتا ہے! اس وقت مجھے لو لو سے بھی خوش طبعی کرنے کی جُرات نہیں ہوتی! الغرض صوفیہ سارے جوش و مسرّت کی قاتل ہے!...................... ممکن ہے اُس نے وہ ناگوار اثر محسوس کیا ہو جو وہ مجھپر ڈالتی ہے کیونکہ جس وقت وہ مجھسے بات کرتی ہے تو آنکھیں چار نہیں کرتی۔ مجھ سے ہاتھ بھی نہیں ملاتی، اور اگر اُس کو مجھے کسی بات کا جواب ہی دینا ہوتا ہے تو وہ مختصر ترین الفاظ اختیار کرتی ہے۔ شاید وہ میری ناپسندیدگی کو جان گئی ہے، ممکن ہے میری روش سے شاکی بھی ہو!

"مگر لو لو کو دیکھو کہ ہمیشہ ہنستی رہتی ہے! وہ کتنی شوخ ہے! وہ کبھی مجھ سے متانت کا ایک کلمہ بھی نہیں کہتی، اور کبھی اس کو اس قسم کا لفظ مُنہ سے نکالنا بھی پڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بَن رہی ہے، اُسے یہ زبان ہی نہیں آتی"۔

"وہ مجھ سے مُحبّت کرتی ہے، مگر وہ مُحبّت نہیں جو دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی ہو، سچ تو یہ ہے کہ اس مُعاملہ میں میرے جذبات بھی مجنونانہ نہیں ہیں۔ اور یہ بات بہت اچھی ہے!

اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں کہوں گا کہ دو نظریوں پر میرا عقیدہ بالکل راسخ ہے: ایک یہ کہ جو مرد اور عورت آپس میں ہمسفر ہونا چاہتے ہیں اُن کو ہمسفر ہونا چاہیئے؛ دوسرے یہ کہ اُن کو اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز تیز و تند جذباتِ عشق سے نہ کرنا چاہیئے۔ یہی ہم دونوں کا معاملہ ہے! مَیں اور لولو آپس میں بہت ہی خوشی و خرمی کی زندگی بسر کریں گے؛ ہم اٹلی کا ایک چکر لگائیں گے لیکن عجلت کے ساتھ نہیں۔ چھوٹی چھوٹی منزلیں کریں گے اور ہر قسم کی لُطف و آسائش سے لذت لیں گے، جہاں چاہیں گے قیام کر دیں گے، اور بہت ہی حقیر اور غیر اہم چیزوں کو بھی بے دیکھے نہ چھوڑیں گے۔ اس طرح ہم اپنی سیر و سیاحت میں تین مہینے صرف کر دیں گے! مگر نہیں، یہ کافی نہ ہوگا! یوں کہنا چاہیئے کہ چار مہینے! مجھ کو اس بات سے خوشی ہوگی کہ مَیں لولو کو صوفیہ کی ماتمی صحبت سے تھوڑے دنوں کے لئے ہٹا لیجاؤں گا! لیکن میں کہتا ہوں کہ کیا یہ کوئی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ لڑکی (صوفیہ) اس سن و سال میں اس قدر حسین ہو! اُسکی عمر ۲۳ سال سے زیادہ نہ ہوگی، اور اس کا چہرہ حُسن کے نقش و نگار سے خالی نہیں ہے! واقعہ یہ ہے کہ اس کی آنکھیں بہت حسین ہیں اور سارا انداز تو ایسا ہے جیسا کہ ایک بادشاہ بیگم کا ہوتا ہے! اگر وہ اس درجہ خشک و پُروقار نہ ہوتی تو اُس میں دلفریبی اور باصرہ نوازی کے بہت سے سامان موجود تھے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اگر اس کا یہی رنگ رہا تو وہ بڑھاپے تک ناکتخدا ہی رہیگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کو کوئی اندرونی روحانی جانکاہ غم ہے! ممکن ہے اس پردے کے پیچھے کوئی داستانِ عشق چھپی ہوئی ہو! یعنی کسی "عشق ناکام" کا معاملہ! مجھ کو کتنا اشتیاق ہے کہ مجھے اُس کی اس غیر معمولی خاموشی اور بے خودی کا راز معلوم ہوتا! میں اور لولو ایکی مرتبہ جب اکیلے ہونگے تو میں اس معمّے کی بابت اس کا خیال معلوم کروں گا۔

ہاں میری لولو پھولوں کی بھی عاشق ہے، اپنے اس مذاق گلچینی سے اس نے مجھ کو اُسی شام کو مطلع کیا تھا جب مجھے اُس کے گھر جانے کا دوسرا موقع ملا تھا۔ اپنے نازک ہاتھوں سے وہ کس انداز سے پھولوں کو توڑتی ہے!! اور یہ پھول اُس کے ہونٹوں کے قریب جاکر کیسے رنگین ہو جاتے کی

دجہ سے کیسی غیر معلوم اور ناقابلِ شناخت ہوجاتے ہیں ! اور ہاں تھوڑی دیر کی خانہ براندازی
چمن کے بعد وہ کیسا پیچ و تاب کھاتی ہے کہ اور پھول اور کلیاں اَب توڑنے کو نہیں رہیں !
سچ مچ بڑی پیاری ہے ، بڑی ہی پیاری ہے ! ایک دن اُس نے چپکے سے میرے کان میں کہا،
کہ "جب بادل گرجتا ہے تو میرا جی لرز جاتا ہے اور میں دوڑ کر اپنا سر تکیوں میں چھپا لیتی ہوں"۔
اپنے مذاقِ لباس کے متعلق ذکر کرتے ہوئی اُس نے یہ بات بیان کی کہ "میں مدتوں سے ایک سیاہ مخمل
کے گون کا خواب دیکھ رہی ہوں کہ جس کے گلے اور آستینوں پر سفید جھالر لگی ہو ، پوشاک کے
معاملہ میں میرا یہ محبوب تخیل ہے"۔

"اُس نے مجھکو جتا دیا ہے کہ "میں رشک رقابت کا ایک قاتلانہ جذبہ رکھتی ہوں، ایسا
جیسکے لئے اہلِ اسپین ضرب المثل ہیں اور اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے میری خواہش یہ ہوتی
ہے کہ میں ایک چھوٹا سا زرکار دستہ کا خنجر خریدوں !"

"جس وقت ان الڑھوپنے کے طفلانہ خیالات پر وہ سرگرم گفتگو ہوتی ہے تو اُس وقت
بخشش کے قابل ہوتی ہے ! اور تو اور صوفیہ بھی بعض اوقات اُس کی باتیں سُنکر مُسکرانے پر،
مجبور ہو جاتی ہے ، اور پھر اُس وقت اس لڑکی کا چہرہ کتنا دلفریب ہو جاتا ہے ! لیکن صوفیہ!
ارے یہ صوفیہ ! اس کے قلب کی گہرائیوں کو کوئی کب پا سکے گا ؟ !"

یہاں پہونچکر اُس کے گھٹنوں پر رکھی ہوئی کتاب فرش پر گر پڑتی ہے ، اور یہ نوجوان
اس آواز سے چونک پڑتا ہے اور حیرت زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ گویا وہ خود اپنے کو پہچاننے سے قاصر ہے !

مگر یہ وہی ہمارا دوست رابرٹ مانٹی فرینکو ہے جو حسین تخیلات کے پرستان میں
اس وقت مصروفِ خواب ہو گیا ہے !

---

(۳)

جھٹپٹا یوں چھایا ہوا تھا جیسے آسمان سے بھوری راکھ برس رہی ہو ۔ صوفیہ کھڑکی میں

بیٹھی ہوئی سڑک کے ہجوم اور شور و غوغا کو دیکھ اور سُن رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب شہر کا چوک لوگوں کی چہل پہل سے بہت بارونق ہو جاتا ہے اور مجمع کے تصادم سے یہ جگہ کافی خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔ پیدل راہ گیروں اور گاڑیوں کی کثرت سے بازار میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ الغرض ایک مُسلسل زندہ سیلاب تھا جو اس راہ سے رواں تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں کسی خاص شخص کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یکبارگی اُس کے چہرے پر ایک سُرخ رنگ آگیا۔ اُس نے آہستہ سے اپنا سر جھکایا، اُس کے رخسارے زرد پڑ گئے اور پیچھے ہٹ کر وہ کمرے میں چلی آئی۔ ایک منٹ کے بعد لوتو آندھی پانی کی طرح آدھمکی، دروازوں کو دھڑ سے کھولا۔ کرسیوں اور میزوں کو اِدھر اُدھر پھینکا اور چشم زدن میں صوفیہ کے پاس کھڑی تھی۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں، ڈانا صوفیہ سینٹ انجیلو؟ غالباً پڑھ رہی ہو گی؟"

"جی ہاں پڑھ رہی تھی۔"

"لیکن تم نے اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر اس وقت سڑک کے منظر کا لطف اُٹھاتیں؟!"

"اور اگر یہ مقصدِ عالیہ میں حاصل بھی کر لیتی تو کیا ہو جاتا؟"

"ہیہات! ہیہات! ابھی میں تو اس وقت بالاخانہ پر البینا درزی کی منتظر تھی چنانچہ آج شام کو زیب تن کرنے کے لئے وہ میرا گون تیار کر کے لایا تھا جس کے دیکھنے میں میں مشغول تھی۔ اور اسی کام میں میں اتنی دیر وہاں رُکی رہی۔ انتظار و بےصبری سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا کیونکہ میں جلد از جلد یہاں حاضر ہونا چاہتی تھی۔ کل شام کو میں نے رابرٹو سے کہا تھا کہ اپنا خاکستری اُوور کوٹ پہن کر آئے، گاڑی میں بہت نفیس سامان اور گھوڑے پر اعلےٰ درجہ کا ساز ہو، اور ٹھیک ساڑھے چھ بجے سیر کو نکلنے کا انتظام کیا جائے۔ لوگ کیا جانیں کہ وہ میری فرمائش کی حرف بحرف تعمیل کریگا!"

"رابرٹو تو اسی ساز و سامان کے ساتھ ابھی اپنی گاڑی میں یہاں سے گذرا تھا اور وہ اسی رنگ کا اُوور کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔"

"خدا کی قسم ؟ !" لولو چلا اُٹھی، "کیا یہ واقعہ ہے ؟ تمہیں بھلا کس طرح معلوم ہُوا ؟ میں سمجھتی تھی کہ تم پڑھنے میں مشغول ہو گی !"

"میں کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی"

"اور تم نے رابرٹو کو پہچان لیا ؟ مگر تم تو کبھی اُس کی طرف دیکھتی بھی نہیں ! کیسی عجیب بات ہے ! ہاں بتاؤ تو کیا اُس نے تم کو سلام کیا تھا ؟"

"ہاں !"

"ہاں بہن بتا نا تو اُس نے اپنی ٹوپی کس طرح اُتاری تھی ؟"

"ٹوپی کس طرح اُتاری تھی ؟ !..................جس طرح ہمیشہ اُتارتا ہے ؟ !"

"اچھا تم نے بھی اُس کے سلام کا جواب دیا تھا ؟"

"جواب ؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں آداب تہذیب سے اس قدر عاری ہوں کہ کسی کے سلام کا جواب نہ دوں ؟ !"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم اُس کو دیکھ کر کچھ مُسکرائی بھی تھیں ؟"

"ہرگز نہیں ! ــــــ مگر میں وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتی، ممکن ہے کوئی اضطراری حرکت اس قسم کی ہو گئی ہو۔"

"تم اچھی آدمی نہیں ہو، صوفیہ ! بیچارا رابرٹو تو کل مجھ سے تمہارا بہت ذکر کرتا رہا۔"

"یہی ذکر کہ صوفیہ کوئی اچھی آدمی نہیں ہے ؟"

"جی نہیں، تمہاری خاموشی اور کم سخنی کی بابت پوچھتا تھا ؛ وہ کہتا تھا کہ تم دونوں بہنوں کی طبیعت میں یہ بُعد المشرقین کیوں ہے ؟ لیکن میں نے تمہاری نسبت ایک پورا نثریہ قصیدہ کہہ کر سُنا دیا ؛ میں نے اُس سے کہا کہ صوفیہ مجھ سے بدرجہا زیادہ اچھی لڑکی ہے۔ مجھ سے زیادہ محبت و اُلفت کے جذبات سے لبریز ہے۔ مجھ سے زیادہ شانِ محبوبی رکھتی ہے اور اس میں اگر کوئی عیب ہے تو یہی کہ وہ اپنے ان تمام صفاتِ پسندیدہ کو چھپانا چاہتی ہے ! صوفیہ

سچ کہتی ہوں۔ اُس نے انتہائی دلچسپی سے میری زبان سے تمہاری فطرت کی تفسیر سُنی! ہا!
آخر میں پھر اُس نے یہ پوچھا کہ صوفیہ آخر مجھ سے کیوں اس قدر دور دور رہتی ہے ؟"

"دور دور ؟"

"کم از کم اُس کے الفاظ یہی تھے اور تم خود ہی انصاف کرو کہ اُس نے کچھ غلط کہا :
ماشاءاللہ آپ اس سے کتنا خلوص اور محبت کا برتاؤ کرتی ہیں۔ لیکن میں نے تو اس معاملہ میں
بھی تمہاری وکالت کی۔ سچ پوچھو تو میں نے دنیا سازی اور ظاہر داری سے کام لیا، اس لئے
میں نے اُس سے کہا کہ صوفیہ تو تم کو بہت پسند کرتی ہے۔ اور تمہاری در پردہ بہت ہی
قدر شناس ہے!"

"لولو! تم بھی ایک ہی آفت کا پرکالہ ہو!"

"میں جانتی ہوں کہ یہ بات صحیح نہ تھی، لیکن میں تم سے پھر کہتی ہوں کہ رابرٹو تمہارا اتنا
قدرداں اور ثناخواں ہے کہ تمہارا اُس کے ساتھ یہ مغائرت کا سلوک بڑی بے دردی اور احسان
ناشناسی ہے!"

صوفیہ نے اپنی باہیں چھوٹی بہن کے گلے میں ڈالدیں اور اُس کے رُخساروں کو بوسہ دیا
لولو بھی لپٹ گئی، اور بڑے پیار اور چاؤ کے لہجہ میں کہا کہ بہن بتاؤ تو بیچارے رابرٹو کی جگہ
تمہارے دل میں کیوں نہیں ہے ؟"

یہ سُننا تھا کہ صوفیہ یکبارگی بہن کو چھوڑ کر پیچھے ہٹی، اور بُت بن کر رہ گئی!

"اچھا" لولو نے فوراً کہا، میں اب سمجھی، تم آج شام کی ہواخوری میں ہمارے ساتھ
جانا نہیں چاہتی ہو؟"

"نہیں، میں نے کچھ قسم تو کھائی نہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ میرے سر میں درد ہے؛
تم امی کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں ؟"

"میں تو روز ہی جاتی ہوں اور آج بھی جاؤں گی۔ میں اِس تفریح کا لُطف کیسے

چھوڑ سکتی ہوں ؟"

"کیا رابرٹ بھی تمہارے ساتھ جا رہا ہے ؟"

"نہیں وہ آج کلب جا رہا ہے ، جہاں اس وقت ڈائرکٹروں کا ایک مشورے کا جلسہ ہونے والا ہے۔ میں اس فرصت کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہوں۔ بعد میں بال میں جاؤں گی جہاں کل صبح تک مصروفِ رقص رہوں گی !"

"اور اگر کہیں اُس کو یہ معلوم ہو جائے ؟"

"اور بھی اچھا ہے ! اُس کو ابھی سے معلوم ہو جائیگا کہ میں اس معاملہ میں بالکل آزاد بے قید رہنا چاہتی ہوں ، یہ کہ اگر وہ مجھ پر کسی قسم کی بندشیں عائد کرنے کا خیال رکھتا ہو تو چھوڑ دے میں اس کو کبھی گوارا نہ کروں گی کہ اُس کی عادت بگاڑ دوں !"

"مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کو اُس سے بس برائے نام ہی محبت ہے ۔" صوفیہ نے کہا

"نہیں محبت تو بہت سخت ہے ، لیکن یہ محبت میں اپنے ہی نقطۂ نظر سے کرنی چاہتی ہوں۔ ہاں بہن اب مجھ کو جا کر جلدی جلدی کپڑے بدلنا ہے۔ اس میں بھی تو مجھ کو کم سے کم دو گھنٹے لگیں گے ۔"

صوفیہ کھڑی روانہ ہونے والی گاڑی کو دیکھ رہی ہے جس میں اُس کی ماں اور بہن سیر کو جا رہی ہیں ۔ وہ اب اکیلی رہ گئی ، بالکل یکہ و تنہا ۔ اور اُس کی خواہش بھی یہی تھی ! بچپن کے زمانہ میں جب کبھی کوئی اُس کو ستایا کرتا تھا تو اس وقت بھی اُس کا یہی معمول تھا کہ تنہائی میں جا کر رویا کرتی تھی ! یہ پرانی عادت اس میں آج بھی باقی تھی۔ اب وسیع ڈرائنگ روم (نشستگاہ) میں اُس کے سوا کوئی نہ تھا۔ کمرہ روشنی سے بقعۂ نور ہو رہا تھا۔ صوفیہ کے ہاتھ بے جس و حرکت تھے۔ اور اُس کا سر آرام کرسی کی پشت سے لگا ہوا تھا۔ اُس کے چہرہ پر دلدوز غم کا نقاب تھا جس میں ایک نہایت سخت اندرونی کشمکش کی جھلک نظر آ رہی تھی ! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بےکسی اور تنہائی کے عالم میں اس دردناک غم کے احساس نے اور بھی شدت اختیار کر لی ہے۔

امر واقعی کا ادراک جسے وہ عرصہ سے دبا رہی تھی۔ اس وقت ایک واضح اور خوفناک حق
آنکھوں کے سامنے تھا!

اتنے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ ہوئی اور صوفیہ چونک پڑی۔ کیا دیکھتی ہے
ہے! نووارد نے جب اس لڑکی کو کمرے میں اکیلا دیکھا تو وہ رُکا اور ٹھٹکا، لیکن یہ
خیال کرکے کہ گھر کے باقی لوگ دوسرے حصہ مکان میں ہوں گے وہ پھر آگے بڑھا۔
مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی!

"شام بخیر صوفیہ!"

"شام بخیر ————"

دونوں ایک کشمکش میں مبتلا تھے!

"خدایا! یہ لڑکی کس قدر ملول اور افسردہ رہا کرتی ہے!" رابرٹو نے اپنے دل میں
اس اثناء میں صوفیہ نے اپنے ہوش وحواس درست کر لئے تھے اور اس کے چہ
ایک مرتبہ پھر متانت و وقار کی تصویر تھے! آخرکار دونوں بیٹھ گئے، لیکن ایک دو
سے کسی قدر فاصلہ پر!

"آپ کی والدہ اچھی ہیں؟"

"جی ہاں، اچھی ہیں، شکریہ!"

"اور لولو؟"

"وہ بھی بالکل اچھی ہے"

اب پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ رابرٹو نے ایک عجیب جذبۂ مسرت محسوس کیا
تلخی کی بھی آمیزش تھی!

"تو لولو کسی کام میں ہے؟" اس نے پوچھا۔

صوفیہ کے دل میں ایک خفیف اضطراب پیدا ہوا جس کو اُس نے دبا دیا۔

"وہ امی کے ساتھ بال میں گئی ہوئی ہے۔" صوفیہ نے جواب دیا۔ ساتھ ہی اُس نے یہ محسوس کیا کہ رابرٹو اس پر مزید سوالات کرے گا۔

چونکہ اس وقت صوفیہ اتفاق سے بالکل تنہا تھی۔ اس لئے رابرٹو نے خیال کیا کہ یہ بڑی بے مروتی ہوگی اگر وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر اُس کے ساتھ باتیں نہ کرے۔ یہ خیال آتا تھا۔ کہ رابرٹو کے دل میں ایک ناقابل مزاحمت جذبہ پیدا ہوا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے۔ تاہم اُس نے اپنی نشست سے حرکت نہ کی۔

"میں اس وقت ادھر یوں نکل آیا کہ ہمارے کلب میں آج دوستوں کی کافی جمعیت نہ تھی اور حاضرین کی مطلوبہ تعداد فراہم نہ ہوئی۔" رابرٹو نے یہ بات اس انداز میں کہی کہ گویا وہ اپنی اس وقت کی مداخلت بے جا کے لئے معذرت پیش کر رہا ہے!

"لیکن لولو آپ کی تشریف آوری کی توقع نہ تھی، مجھے اس بات کا افسوس ہے" صوفیہ نے کہا رابرٹو نے فوراً قطع کلام کر کے کہا کہ "خیر کوئی بات نہیں ہے!"

مگر رابرٹو کے مُنہ سے یہ جملہ بہت بے پروائی سے نکلا جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اُسے لولو کی غیر حاضری سے کوئی خاص مایوسی ہوئی۔

"اور آپ تشریف نہ لے گئیں؟" اس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں میں تو نہیں گئی، آپ جانتے ہیں کہ میں "بال" کی ایسی دلدادہ نہیں ہوں۔"

"آپ کا خاص شوق تو شاید مطالعہ ہے؟"

"جی ہاں یہ مجھے بہت مرغوب ہے۔"

"لیکن اس مُسلسل کتب بینی سے آپ کی صحت کو تو نقصان نہ پہونچے گا؟" رابرٹو نے کہا۔

"جی نہیں میری آنکھیں کافی قوی ہیں!" یہ کہتے ہوئے صوفیہ نے ذرا تیز نظروں سے اُسے دیکھا۔

"کافی قوی ہیں، اور کافی حسین!" رابرٹو نے اپنے دل میں کہا۔ "مگر آہ ان میں کوئی جوش اور جذبہ نہیں ہے۔" صوفیہ سے، میرا مطلب یہ ہے کہ ——

"اخلاقی نقصان، شاید؟" صوفیہ نے اُس کی بات کاٹ کر کہا "مگر میں ایسا خیال نہیں کرتی، جس قسم کی کتابیں میرے مطالعہ میں رہتی ہیں اُن سے مجھ کو بہت سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔"

"تو کیا تم سکون قلب کی محتاج ہو؟!"

"ہم سب ہی اس آبِ حیات کے پیاسے ہیں!"

صوفیہ کی آواز عارفانہ متانت کے لہجے میں ڈوب گئی؛ رابرٹو کو اس میں بڑا لطف آیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس مزے سے وہ پہلی بار لذت اندوز ہو رہا ہے۔ آج وہ اُس پُراسرار عورت کی آنکھوں سے دوچار ہے جو ابھی تک اُس کے لئے مکتوب سربستہ کا حکم رکھتی تھی اور جو اس وقت اپنے ہر لفظ سے اور ہر ادا سے اپنی مخفی ہستی کے اوپر سے نقاب اُٹھا رہی تھی صوفیہ کا تکلف اور سرد مہری اس وقت رخصت ہو چکی تھی؛ وہ اس وقت ایسی از خود رفتہ تھی کہ اس کا وقار و تمکنت تھوڑی دیر کے لئے معطل ہو گیا تھا، چنانچہ گرمیٔ کلام اور ذوق گفتگو میں وہ بار بار رابرٹو کو نظر بھر بھر کے دیکھتی بھی تھی، کبھی کبھی مسکرا بھی دیتی تھی، اور اُس سے بالکل ایک دوستانہ انداز میں سرگرمِ گفتگو تھی! اس سے پہلے اُن کے باہمی تعلقات کس قسم کے تھے! اور اس وقت کیا رنگ نظر آ رہا تھا!!

"لیکن جب میں کوئی کتاب پڑھا کرتا ہوں"۔ رابرٹو نے کہا، "تو مجھ کو اس بات کی بیحد جستجو رہتی ہے کہ خود مصنف کی ہستی اور حقیقت کو معلوم کروں اور یہ پتہ لگاؤں کہ اس کی سیرت و سرشت کیسی ہے، آیا وہ بھی دُنیا کے علائق سود و زیاں میں حصہ دار رہا ہے، آیا اُس نے بھی عشق و عاشقی کی ہے، اور آیا وہ بھی ہجر و وصال کی لذت سے آشنا ہوا ہے ــــــــ"

"میرا خیال ہے کہ آپ کا یہ اصول تنقید غلط فہمی پر مبنی ہے؛ کتابیں لکھنے والے "جگ بیتی" سناتے ہیں۔ "آپ بیتی" نہیں کہتے!"

"اور یہ غالباً خودداری اور وقار کی بنا پر؟" رابرٹو نے رائے دی۔

"نہیں بلکہ رشک و رقابت سے" صوفیہ نے تصحیح کی، "جہاں تک میرا خیال ہے یہی بات بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کا رازِ عشق نہاں خانۂ دل سے نکل کر گوشِ اغیار تک پہونچے۔"

صوفیہ نے جس وقت یہ لفظ کہے اُس کی آواز میں کوئی تغیّر پیدا نہ ہوا، اُس کے چہرے پر صافگوئی کے آثار ہویدا تھے، اُس کا لہجہ بالکل معصومانہ اور مخلصانہ تھا۔ رابرٹو کو اس "حدیث دیگران" میں "سرِّ دلبران" کی جھلک نظر آتی تھی! رابرٹو کے لئے اب کوئی بات تعجب خیز نہ تھی، اور ہر چیز قدرتی اور توقع کے مطابق نظر آتی تھی؛ حتّٰی کہ اُس کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اس پُراسرار روح رکھنے والی لڑکی صوفیہ کے ساتھ اُس کی یہ شام کی صحبت بھی گویا ایک نوشتۂ تقدیر اور اَمرِ الٰہی تھا! جس وقت وہ جُدا ہوئے ہیں تو دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا گویا کہ وہ اس طرح سے مزید اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے کی روح کا بھید معلوم کرلیا ہے۔ رخصتی کے وقت صوفیہ نے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ رابرٹو نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے جُھک کر بوسہ دیا! اب اس افسانۂ ملاقات کا آخری لمحہ آگیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو خُداحافظ کہا۔"

جب صوفیہ کی موجودگی اور گفتگو کی طلسمی فضا ختم ہوگئی تو رابرٹو کا دل و دماغ ایک کشمکش میں مُبتلا ہوگیا۔ بہ یک وقت خوش و خرّم بھی تھا، اور ملول و غمگین بھی! وہ مرجانے والا تھا، لیکن ساتھ ہی ایک مژدۂ حیات بھی اُس کے کانوں میں پہونچ رہا تھا! دماغ بالکل کام نہ کرتا تھا کہ لوٗلو کے متعلق کیا رائے قایم کرے، اپنی حالت کو کیا سمجھے اور اپنے مستقبل کے بارے میں کس نتیجے پر پہونچے۔

صوفیہ بہت خوش ہے، بہت ہی خوش ہے! چنانچہ اسی غیر معمولی جذبۂ خوشی سے مغلوب ہوکر وہ زار و قطار رونے لگی اور اس عالم میں اُس کا سر پھر اپنے بستر کے تکیوں میں چھپ گیا تھا!

(۴)

تین مہینے گذر گئے ہیں اور لولو کی شادی برابر ملتوی ہوتی رہی ہے۔ لولو کی ماں جو اِس التوا و تاخیر کا راز سمجھنے سے قاصر تھی بار بار لولو کو تخلیہ میں لیجاتی اور اس گومگو کا سبب پوچھتی لیکن لولو ہمیشہ یہی جواب دیتی کہ:

"میں ابھی انتظار کرنا چاہتی ہوں! مجھ کو رابرٹو کے دل و دماغ سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے!"

واقعہ یہ ہے کہ اس لڑکی میں بھی غور و فکر کے آثار پیدا ہو گئے تھے! اُس کی زندگی میں بظاہر کوئی تغیر نہیں ہوا تھا' وہ پہلے کی طرح گایا کرتی تھی' ہنستی تھی، مذاق کرتی تھی لیکن وقتاً فوقتاً وہ اپنے ان زندہ دلانہ مشاغل کو ترک کر دیتی تھی اور اس اثناء میں اپنی بہن کی فطرت کا مُطالعہ کرتی! یا رابرٹو کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتی! لوگ اُسے اکثر اس حال میں دیکھتے کہ اُس کے ہونٹ بھچے ہوئے ہیں، اور بھوویں کھنچکر آپس میں مل گئی ہیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ اہم مسائل پر غور کر رہی ہے۔

پھر لولو ہونے والے واقعات کو دیکھتی، اُس کے گرد و پیش عجیب و غریب واردات پیش آرہی تھیں! رابرٹو میں اب وہ مادیت اور بشاشت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ متفکر، مغموم، زرد اور مضطرب الحال سا نظر آتا ہے! وہ بہت کم سخن ہو گیا ہے اور جو کچھ مختصر سی گفتگو کرتا بھی ہے تو اُس سے ایک بے خودی اور خود فراموشی ٹپکتی ہے! جن چیزوں سے اُس کو پہلے غیر معمولی دلچسپی تھی اَب اُن سے وہ کسی ذوق و التفات کا اظہار نہیں کرتا! کبھی کبھی بہت سخت جد و جہد کے بعد وہ اپنی اس غیر حالت پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے، اور وہی پچھلا رابرٹو بن جاتا ہے۔ لیکن یہ قلب ماہیت محض آنی ہوتی ہے اور چند لمحوں سے زیادہ باقی نہیں رہتی! وہ کبھی "بننے" کا عادی نہ تھا۔ اور اس قسم کی کوششوں میں ہمیشہ بُری طرح ناکامیاب ہوا کرتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اُس کے قلبی اضطراب

اور اُس کی روحانی کوفت کی غمازی، اُس کی آنکھیں کیا کرتی تھیں!

ہاں ان دنوں صوفیہ بھی کچھ بدلی بدلی سی نظر آتی تھی! یعنی ایک مضطرو مضطرب صوفیہ، جو کبھی جوشِ محبت میں اپنی بہن کو سینہ سے لگاتی اور کبھی کئی کئی گھنٹے اس حالت میں گذار دیتی کہ اس کو نہ دیکھتی، اور نہ دیکھنا کیا معنی اس سے گریزاں سی نظر آتی! اس کے چہرے پر شرم و حیا کی اضطراری کیفیت سُرخی بن کر جھلکتی اور مُعاً غائب ہو جاتی۔ اُس کی آنکھیں شعلہ افشانی کرتیں اس کی آواز کبھی گہری اور جوشیلی ہوتی، اور کبھی خشک و خشن! عالمِ جذب و جوش میں اُس کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ اُس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی؛ لولو آدھی رات کے وقت اُٹھتی، اور برہنہ پا صوفیہ کی خوابگاہ کے دروازہ پر کان لگا کر سنتی اور بہن کو بے چینی سے کروٹیں بدلتے اور روتے پاتی۔ لولو پوچھتی: "بہن کیسی طبیعت ہے؟" مگر ہمیشہ ایک ہی جواب تھا کہ "کچھ نہیں لولو!"

جب رابرٹو اور صوفیہ آپس میں ملتے اور اُن کی یہ مُلاقات بلا ناغہ روزانہ ہوتی، تو جو انقلاب دونوں کی مخلصے دل میں پیدا ہو گیا تھا وہ اُس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتا! گفتگو برائے نام ہی ہوتی؛ جوابات یا تو اضطراری انداز میں دئے جاتے یا وہ بالکل مبہم اور بے معنی سے ہوتے! عجب انوکھے طریقے سے وہ ایک دوسرے پر نظریں ڈالتے، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ ملاقات کی پوری پوری شامیں سکوتِ مطلق میں گذر جاتیں، اور کوئی ایک کلمہ بھی دونوں کی مہرِ خاموشی کو نہ توڑتا! لیکن ساتھ ہی دونوں ایک دوسرے کی حرکات و سکنات کے مطالعہ میں غرق پائے جاتے! وہ کبھی پہلو بہ پہلو نہ بیٹھتے، لیکن یہ ضرور دیکھنے میں آتا کہ جس کتاب کو صوفیہ کی اُنگلیوں نے مَس کر دیا ہوتا اُسکو رابرٹو کسی نہ کسی حیلہ سے ہاتھ میں اُٹھا لیا کرتا! بعض اوقات جب صوفیہ کمرے میں نہ آتی تو رابرٹو لمحہ بہ لمحہ مضطرب ہوتا جاتا اور بند دروازوں کی طرف رُخ کر کے فرضی سوالات کا ایک خود فراموشی کے لہجہ میں جواب دیا کرتا! کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ صوفیہ کو آئے ہوئے ابھی پانچ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ رابرٹو اپنی

ہیئت سنبھالتا اور چل دیتا! لڑکی روز بروز زرد پڑتی جاتی تھی، اور اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے! آخر کار اُس نے ارادہ کر لیا کہ کسی کو مُنہ نہ دکھائے گی۔ چنانچہ ہر روز کسی نہ کسی دن شام کے وقت وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتی جہاں وہ بے صبر و بے تاب رزاں و مرتعش نظر آتی، اور اپنی سوزشِ قلب سے سُلگا کرتی!

ایک دن شام کو لولو کمرے میں داخل ہوئی، اور اُس نے صوفیہ کو مخاطب کر کے کہا:

"کیا اس وقت میرے لئے ایک کام کرو گی؟"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"مجھ کو اس وقت ایک خط لکھنا ہے، مگر رابرٹو باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے؛ تم اتنا تیں کہ ذرا وہاں چلی جاتیں اور اُس کے پاس بیٹھتیں، کیوں جاؤ گی؟"

"لیکن میں ————"

"بہن کیا اس کمرے میں پڑی پڑی اپنے کو ہلاک کر لو گی؟! کیا میری اتنی سی بات نا لینے میں تم کو کوئی بڑی قربانی کرنی پڑے گی!"

"اچھا پھر تم جلدی چلی آؤ گی؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"مجھے تو بس چند سطریں لکھنے کے لئے چند منٹ چاہئیں"

صوفیہ نے باہر کی طرف رُخ پھیرا؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سخت آزمایش کے لئے اپنا جی کڑا کر رہی ہے! وہ اُٹھی لیکن دروازہ تک پہونچ کر ٹھہر گئی؛ رابرٹو باہر چبوترے پر اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا؛ آخر اُس نے ہمت کی اور قدم بڑھاتی ہوئی اُس کے پاس جا پہونچی۔

"لولو نے مجھے بھیجا ہے" اُس نے زیرِ لب آواز میں کہا۔

"مگر تم کو یہاں آنے میں اپنے آپ پہت جبر کرنا پڑا ہوگا!"

"جبر؟! - نہیں تو!"

صوفیہ کے سامنے [illegible]

چہرے کی ہیئت ایک خاص جذبہ نے بدل دی ہے!

"صوفیہ! میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟" رابرٹو بولا۔

"جی کچھ نہیں، آپ نے کیا کیا ہے؟ للّٰلہ! میری طرف ان نظروں سے نہ دیکھئے! میں التجا کرتی ہوں، ہاتھ جوڑ کے کہتی ہوں!"

"صوفیہ، تم جانتی ہو کہ تم میرا دل لے چکی ہو! بالکل لے چکی ہو!!"

"اُف چُپ رہو، رابرٹو، چُپ رہو! خدا کے لئے ایسا کلمہ مُنہ سے نہ نکالو! تم سوچتے نہیں کہ اگر لولو ہماری باتیں سُن پائے ________"

"مجھ کو لولو سے محبت نہیں! اب میں تمہارا دلدادہ ہوں!"

"آہ! یہ غدّاری! یہ بے وفائی!!"

"میں اِس جُرم کا مُعترف ہوں، لیکن اَب تو مَیں تمہارا عاشق ہوں! اچھّا اب میں جاؤں گا ________"

"خوب!" لولو کمرے کے دوسرے دروازے میں کھڑی ہوئی دور سے چلّائی، "خوب! آج تو تم دونوں میں صلح نامہ سا ہو گیا ہے!"

اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ صوفیہ بھاگی، اور اس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا! لیکن رابرٹو بالکل بے حس و حرکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا؛ اس کے سکوت و جمود کا یہ حال تھا کہ گویا وہ ایک سنگی مجسمہ ہے!

"رابرٹو!" لولو نے پکارا۔

"لولو"

"یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟!"

"کچھ نہیں؛ اب جاتا ہوں"

اور بغیر اُس کی اجازت وہ چل کھڑا ہوا! روانہ ہوتے وقت وہ یاس و دل شکستگی کی

ایک تصویر تھا! توتو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، وہ حیران کھڑی ہوئی تھی، اور خیالات میں مستغرق!

"اُف! میں یہاں اور وہ وہاں!" توتو کی زبان آہستہ سے متحرک ہوئی، لیکن اس افسانۂ عشق کا ماضی کتنا شاندار تھا! خیر، کچھ نہیں!

ہرچہ بادا باد حرفے چند میگویم بہ او　　　کار خود در عاشقی ایں بار یکسو می کنم!"

---

(۵)

"اور پس ان تمام قوی دلائل اور اہم مصالح کی بناء پر میں اب رابرٹ مانٹی فرینکو سے شادی نہیں کر سکتی" توتو نے آخر کار اپنی ماں سے کہہ دیا!

"یہ کس قدر نامعقول دلائل ہیں! بیٹی ذرا ان کے بھول پن پر تو غور کرو!" ماں نے اپنا سر ہلا کر کہا۔

"ماں! بس قصہ مختصر یہ ہے کہ میں آپ سے صاف صاف کھلی کھلی بات کہتی ہوں کہ رابرٹو کی ذات میں اب میری مسرت قلب کا کوئی سامان نہیں ہے۔ اور میں نے طے کر لیا ہے کہ اُس کے ساتھ ہرگز شادی نہ کروں گی!"

یہ باتیں صاف اور کھلی کھلی تو ضرور ہیں، لیکن ایک وہم وجنون سے زیادہ نہیں! تم جانتی ہو کہ رابرٹو تم سے محبت کرتا ہے"

"خیر اگر وہ مجھ سے محبت بھی کرتا ہے تو اُس کی

طبیعت کو ہو گا قلق چند روز　　　سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائیگی!"

"لیکن تم اس بات کو بھول جاؤ گی کہ تمہارے اور اس کے درمیان قول وقرار ہو چکے ہیں؟!"

"ہم اپنے قول وقرار کو واپس لے لیں گے، اب وہ زمانہ نہیں کہ لوگ جبراً شادی

کرنے پر مجبور کئے جائیں!"

"دنیا کیا کہے گی؟!"

"اماں! ذرا اس "دنیا" کی تعریف تو کرنا!"

"یہی سب لوگ!"

"مجھے بتائیے کہ یہ "لوگ صاحب" کون بزرگ ہیں؟! مجھے ان کی خدمت میں اب تک نیاز حاصل نہیں ہوا! میں ان "حضرت لوگ" کی اتنی مرہونِ منت نہیں ہوں کہ اُن کی خاطر ہی ساری زندگی کو تلخ کر لوں!"

"کس قدر آتش کا پرکالہ ہو! لیکن اب مجھے بتاؤ کہ رابرٹو سے میں کس طرح معاملہ طے کروں؟ میں اُس سے کہوں تو کیا کہوں؟"

"جو چاہیئے کہہ دیجئے، آپ کو اختیار ہے، آپ میری ماں ہیں!"

"آہ! کیا یہ میرا فرض ہے کہ تم نے جو اندھے پنے سے غلطیاں کی ہیں اُن کا خمیازہ میں بھگتوں؟! افسوس کیسی رسوائی ہو گی!"

"میں رسوائی کی رسومات کو نہیں مانتی؛ بہتر ہے کہ آپ اس سے یہ بات مہذب طریقے سے نرمی کے ساتھ کہہ دیں، میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ اُس سے میری برائی بھی کر سکتی ہیں اُن سے کہیئے کہ لولو ایک شکی طبیعت کی خفیف الحرکات اور طفلانہ مزاج لڑکی ہے؛ مدد کیجئے کہ بحیثیت بیوی کے وہ بہت بُری ثابت ہو گی؛ کہیئے کہ اُس میں قطعاً متانت نہیں ہے، نیز یہ کہ وہ شان وقار سے بالکل خالی ہے اور یہ کہ لولو کی بہن ——————"

"لولو کی بہن؟! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے!"

"اجی! آپ بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتی ہیں؛ فی الحال رابرٹو اور صوفیہ ایک دوسرے سے بے تعلق سے ہیں. لیکن اگر ان کی راہ و رسم اور جاری رہی اور وہ ایک دوسرے کے اخلاق سے زیادہ واقف ہوئے تو پھر انہیں ایک دوسرے سے وحشت نہ رہے گی. وہ

ایک وہ میرے گے قدردان اور مداح ہو جائیں گے، اور پھر ———— کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوگا؟! اور آپ کی بھی تعریف ہوگی کہ کتنی اچھی ماں تھی جس نے آخر بڑی ہی لڑکی کو پہلے بیاہا!"

"سچ کہتی ہو! ————"

"اور میں بھی بے شوہر کے نہ رہوں گی اور ابھی اس کے لئے کون جلدی ہے؟ میں بمشکل اٹھارہ برس کی ہوں گی۔ ابھی تو چند روز تک میں تفریح کرنا چاہتی ہوں، ابھی کچھ دنوں ناچوں گی کودوں گی۔ اور اپنی پیاری ننھی سی ماں کے ساتھ اپنی جوانی کا لطف اٹھاؤں گی!"

"تم بھی آفت ہو آفت!" ماں نے کہا اور یکبارگی محبت سے مغلوب ہو کر لولو کو گلے سے لگا لیا۔

"شکر ہے کہ آپ میرے نقطۂ نظر کو سمجھ گئیں! اچھا اب یہ ناملائم خبر ملائمت و خوبصورتی کے ساتھ رابرٹو کو پہونچا دیجئے۔ لیکن یہ کہئے کہ ہم اب بھی آپس میں دوست رہیں گے، اگر رابرٹو اور صوفیہ ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو جائیں تو ان کو ہونے دیجئے۔ جو چیز مقدر ہو چکی ہے اس کو کون روک سکتا ہے؟

"لیکن نٹ کھٹ لڑکی! تجھے یقین ہے کہ معاملات صلح و آشتی کے ساتھ ہمارے حسب مرضی ہی طے پا جائیں گے، اور کوئی مشکل پیش نہ آئے گی؟ تم جانتی ہو کہ میں جھگڑے سے کتنا بھاگتی ہوں؟"

"میری پیاری ماں! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں اور آپکی بدعقیدگی کا کیا علاج کروں؟ آپ تو سینٹ ٹامس سے بھی زیادہ منکرانہ دماغ رکھتی ہیں! ہاں مجھکو جو وسیع تجربہ ان معاملات میں حاصل ہے اس کی بناء پر میں کہہ سکتی ہوں کہ کوئی بدنامی کی صورت پیش نہ آئے گی۔ رابرٹو ایک شریف آدمی ہے اور وہ کبھی مجھ سے یہ تقاضا نہ کرے گا کہ میں بغیر محبت کئے اُس سے شادی کروں!"

"جو چیز مجھ کو ناممکن نظر آتی ہے وہ تصوف کا معاملہ ہے ______"

"اماں، کوئی چیز ناممکن چیزوں سے زیادہ ممکن نہیں!" لولو نے بڑی عالمانہ شان متانت سے کہا۔

"پیاری لولو! ایک ہی وقت میں اتنے فلسفیانہ ملفوظات کا ڈھیر نہ لگا دو! بس اتنا ہی بہت ہے! ہم کو یہ سارے پیچیدہ معاملے مستقبل پر چھوڑ دینا چاہئیں شاید وقت ہی ہماری بگڑی کو بنا سکتا ہے۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہو اس میں تو کلام نہیں کہ تمہارا دماغ صحیح نہیں ہے!"

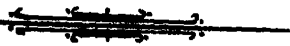
"ہاں میں بہت وہمی ہوں ______"

"وہمی تو کیا، مگر یہ تمہاری خامکاری ہے، اور قوت فیصلہ کی غلطی"

"نہیں نہیں، میں پرلے درجہ کی وہم پرست ہوں۔ آپ جو کچھ فرمائیں مجھے قبول ہے مجھکو وعظ و پند سنائیے تنبیہ کیجئے۔ میں ان سب باتوں کی مستحق ہوں، ہاں ہاں! کہئیے، ل کیوں گئیں؟ میں تو منتظر ہوں، کیا آپ کے پاس اب کچھ اور کہنے کو نہیں؟"

"پیاری آؤ۔ مجھے ایک بار پیار کرنے دو اور پھر جا کر سو رہو! شب بخیر!"

"شکریہ اماں، شب بخیر"



(۶)

"خیر چلو اچھا ہے" لولو کی ماں نے اپنے دل میں کہا، "لولو ابھی کم سن بھی ہے اور آئے دن ان کم سن لڑکے لڑکیوں کی شادیوں کا انجام دیکھتے رہتے ہیں۔ خدا ہم کو ان ہولناک نتائج سے بچائے رکھے! ہاں مصلحت یہی ہے!"

"واہ وا!" لولو نے چونک کر اپنے دل میں کہا" واہ میں نے کس حکمت عملی سے

تُلکی سفیر بن سکتی ہوں! کتنی زبردست کامیابی ہے! کامرانیٔ عشق کی طرح! لیکن یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس فتح کا سہرا لو لو ہی کے سر ہے!"

لولو بہن کے کمرے کے دروازہ پر کھڑی ہے اور اندر کی آوازوں کو سن رہی ہے! وہ بار بار دلدوز آہوں کو سنتی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ صوفیہ ضبط فغاں کی جدوجہد کر رہی ہے! آہ غریب صوفیہ دل شکستہ ہو گئی اور اس نے اپنا اطمینان قلب کھو دیا! -

"سو جاؤ بہن صوفیہ سو جاؤ" لولو نے آہستہ سے بڑے پیار کے لہجے میں کہا اور یہ الفاظ منہ سے نکالتے ہوئے اس نے دروازے کے قفل کو چوم لیا۔ گویا کہ وہ اپنی مصیبت زدہ بہن کی پیشانی کو بوسہ دے رہی ہو! "اپنے دل مضطر کو تسلی دو۔ اور کچھ سو لو۔ آج شام کو میں نے تمہارے لئے کچھ کیا ہے!"

اور اس کے بعد یہ فراخ دل لڑکی خود بھی جا کر سو رہی اور اس اطمینان نے اسکو لوری دی کہ اس نے اپنی بہن کے دردِ دل کے درماں کے لئے کچھ کر دیا ہے!

وقت نے، قدیم مہربان وقت نے ہاں اس وقت نے جو حکمت سرمدی کا حامل ہے۔ آخر یہ مہم سر کر لی، اور ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ لولو نے اپنے دل سے پوچھا کہ آیا یہ بن بیاہی بہن جو دلہن کی سہیلی بنی ہے اس موقع پر آسمانی ریشم کا گون زیب تن کرے گی۔ یا بادامی رنگ کی سیدھی سادی پوشاک پہنے گی! اس نے رابرٹو سے پوچھا کہ کیا وہ اس تقریب میں بہت سے بتاشے لائیگا اور پھر صوفیہ سے درخواست کی کہ کیا وہ عاریتہً اس کو اپنا کشیدہ کار دستی رومال دیدے گی جو اپنی شاعرانہ باریکی و لطافت میں بس ایک لکہ ابر کی طرح ہے جس کو بادِ نسیم اڑائے لئے جا رہی ہو! رابرٹو اور صوفیہ جان گئے تھے کہ اس لڑکی کے دل میں کتنی وسعت پیدا ہو گئی ہے اس کی ان شگفتہ طبعی و رلاابالی پن کی باتوں پر ہنستے تھے۔ لولو دونوں کی محبوب اور عزیز تھی اور وہ اس کو اپنے لئے ایک فرشتۂ غیب سمجھتے تھے!

"میرا عرصہ سے یہ عقیدہ ہے" رابرٹو مانٹی فرینکو نے سلسلۂ کلام میں جبکہ وہ اپنی شادی کے مسئلہ پر بحث کر رہا تھا، کہا "کہ میاں بیوی کو متضاد طبیعتوں کا ہونا چاہیئے اس لئے کہ انتہائی نقاط آپس میں مس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے متبائن اوصاف کو محسوس کر سکیں گے۔ آپس میں ملیں گے، اور دونوں اجزاء سے ایک مکمل واحد چیز بنائیں گے! لیکن برعکس اس کے یکساں مذاق رکھنے والا جوڑا مثل متوازی خطوط کے ہوتا ہے: وہ بے شک پہلو بہ پہلو چلتے ہیں لیکن کبھی ملتے نہیں بالخصوص عشق و محبت کی نشو و نما کے لئے یہ اختلاف طبائع بہت کارآمد ہے۔ ہاں اب میرا یہی نظریہ ہے اور میں اب اسی کی تلقین کیا کرتا ہوں!"



غزل

از مولانا آزاد سبحانی

اس ضعف کا کیا کہنا بخشے جو توانائی — اس یاس کے میں صدقہ دی جسنے شکیبائی
ہے مذہب الفت کا آئین جداگانہ — سرمستی ہے ہشیاری نادانی ہے دانائی
عشاق کا سرمایہ، ناطاقتی و پیری — سرمایۂ معشوقاں رعنائی و زیبائی
ہر دم یہ ہنگامے ہر صبح یہ فریادیں — اور اسپہ ہی حضرت کو دعوائے شکیبائی
ہر قید سے بے قیدی، ہر وضع سے بے وضعی — رکھنا ہے یہی مشرب بننا ہے جو شیدائی
عاشق کو ہر اک جلوہ بس جلوۂ جانانہ — مجنوں کی نگاہوں میں ہر جلوہ تھا لیلائی
ہم عاشق صادق ہیں ہم ننگ کے دشمن ہیں — ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں بدنامی و رسوائی
ہر شمع ہے پروانہ ہر ہوش ہے دیوانہ — کیا طرفہ تماشا ہے یہ انجمن آرائی
کوئی نہیں جز تیرے، تو اور تیری شانیں — عارف کی نظر میں ہے یہ معنئ یکتائی
وہ جلوہ نما ہر جا، میں جلوہ طلب ہر جا — ہر جگہ میسر ہے اُن کی مری یکجائی
ہر صبح کے شکوے بھی ہر جور پہ طعنے بھی — کس مُنہ سے پھر اپنے کو کہتا ہے تمنائی
اِک بندۂ عاجز کی فریاد نہیں سنتا — سچ کہنا مرے دارا، کیا ہے یہی دارائی

سبحانئ وحشی کو معذور رکھے خلقت
دیوانہ ہے دیوانہ، سودائی ہے سودائی

ولہٗ

کوئی ایسا ہے جسے کہیے کہ یہ باہوش ہے — جو بھی ہے اس بزم میں وہ سر بسر مدہوش ہے
ساری مے میخانۂ عالم کی ہو جاتی ہے صرف — بیشک اس میخانہ میں کوئی بڑا مے نوش ہے

یہ سبق دیتا ہے دریا کو سمندر کا خروش
جس میں جتنا مادّہ ہے اتنا وہ پُر جوش ہے

یہ وہ مے خانہ ہے جسکی ہائے و ہو ہے دائمی
دل کے غم خانہ میں ہر دم شغل نوشا نوش ہے

دل کی اس افسردگی پر کھا نہ دھوکا اے حریف
شعلہ ہی تو ہے اگرچہ شعلۂ خاموش ہے

قتل ہوتے ہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے حسینؑ
وائے اس دنیا پہ جب مسلم بھی ناحق کوش ہے

رحم کے قابل ہے تیرا حالِ زار اے مردِ عشق
بار ہے کونین کا اور تیرا نازک دوش ہے

اس کے رنج و غم کا پیمانہ ہی کیا جانچے کوئی
یہ مریضِ عشق جو آٹھوں پہر بیہوش ہے

محویت میں ہو چکا ہوں ساری دنیا سے الگ
التفاتِ یار میں ہوں اور تری آغوش ہے

دیکھتی ہے لغزشیں اور پردہ در ہوتی نہیں
وہ نگاہِ رحم دیکھو کتنی لغزش پوش ہے

دل سے بالکل محو کر دے دوش کو ماضی پرست
فکرِ فردا کر کہ بے انجام ذکرِ دوش ہے

ہو بھی تو دلکش کوئی نغمہ بیانِ وپند کا
رندِ مستغرق کا تو ہر رونگٹا اک گوش ہے

کس کو ساغر میں ملی ہے اور کس کو اوک میں
اس ذرا سے فرق پر کیوں میکشو یہ جوش ہے

کوئی کیف اس دہر کا لُطفِ بقا رکھتا نہیں
جو ہے یاں صرفِ فنا ہے نیش ہے یا نوش ہے

کاٹتا ہے زندگی سبحانی اب اس وضع سے
سر بکف، زنجیر در پا، و کفن بر دوش ہے

غزل

از حضرت دردؔ ۔ کاکوری

رواں ہیں اشک اور ہر دم کلیجہ منہ کو آتا ہے
الٰہی خیر ہو دل کی یہ آخر ماجرا کیا ہے

ورق حسرت کا ہے دست الم میں دل غمگیں
نہ وہ بزم شبانہ ہے نہ وہ ذوق تمنا ہے

رواں ہیں اشک، چہرہ پر اداسی، پھول ہاتھوں میں
الٰہی کون پھر فاتحہ مدفن پہ آیا ہے

خبر دیتا ہے ہر دم جاذبہ موج نفس کا
کہ پھر مہجور قطرے کیلئے بیتاب دریا ہے

سر محفل دلوں میں پھونک دی ہے آگ سی جس نے
یہ سوز دل ہے یا ساز جگر کا اک ترانا ہے

ترے صدقہ نہ پنہاں ہو ابھی اے جلوۂ پنہاں
ترے قرباں ابھی تجھکو کہاں جی بھر کے دیکھا ہے

جگر میں ٹیس، لب پر آہ، اشک آنکھوں میں، دل زخمی
ہمارا قلب، یا اک محشر انگیز تمنا ہے

کہیں روز ازل حسن ازل کو دیکھ پایا تھا
سبب یہ ہے جو ہر دم دردؔ دل اپنا تڑپتا ہے

ولہ

باز بکوئے من گذر، کرد کہ کرد یار کرد
باز بسوئے من نظر، کرد کہ کرد یار کرد

باز ز تیغ غمزہ ہا، کشت کہ کشت یار کشت
ظلم و ستم بریں جگر، کرد کہ کرد یار کرد

باز لبوئے بسملاں، دید کہ دید یار دید
باز بخستگاں نظر، کرد کہ کرد یار کرد

برق جمال بر دلم، ریخت کہ ریخت یار ریخت
باز ز عشق شور و شر، کرد کہ کرد یار کرد

دعوت جذب بیخودی، داد کہ داد یار داد
بیخود و مست و بے خبر، کرد کہ کرد یار کرد

سوز و گداز و دردؔ دل، داد کہ داد یار داد
باز ز ناز یک نظر، کرد کہ کرد یار کرد

تنقید و تبصرہ

کتب :-

ہندوستان کے معاشرتی حالات - اسلام اور غیر اسلام
اسلام اور غلامی - مختصر تاریخ گجرات

ہندوستان کے معاشرتی حالات | مجموعۂ خطبات علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب۔ شائع کردہ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد، قیمت عہر

پچھلے برس ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کی دعوت پر جناب عبداللہ یوسف علیصاحب نے ہندوستان کے ازمنہ متوسطہ کے معاشرتی اور اقتصادی حالات پر متعدد خطبات دیے تھے جن کو اب ہندوستانی اکاڈیمی نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ عبداللہ یوسف علی صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ تاریخ اور معاشیات انکے خاص مضامین ہیں۔ جو لوگ تاریخ ہند سے ذوق رکھتے ہیں وہ ان خطبات کو نہایت دلچسپ اور مفید پائیں گے۔ طلبہ کو خصوصیت کے ساتھ ان سے استفادہ کرنا چاہئے۔

پہلے خطبے میں عبداللہ یوسف علیصاحب نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ادوار قائم کئے ہیں اور پھر ازمنہ متوسطہ کے تین حصے قرار دیکر دوسرے تیسرے اور چوتھے خطبات میں یکے بعد دیگرے ساتویں صدی دسویں اور گیارہویں صدی اور چودھویں صدی عیسوی (اس لئے کہ ازمنہ متوسطہ کے یہی تین حصے ہیں) کے معاشرتی اور اقتصادی کوائف پر نہایت دلچسپ انداز میں نظر ڈالی ہے۔ عبداللہ یوسف علی صاحب کے یہ خطبات معلومات کا ایک بے بہا گنجینہ ہیں

اور جو لوگ ان سے مدد لیکر اپنے مطالعہ کو وسعت دینے کی کوشش کرینگے۔ انکے علم میں یقیناً قابل قدر اضافہ ہوگا۔ اس لئے کہ جناب عبداللہ یوسف علی صاحب نے ہماری توجہ جن مسائل کیطرف منعطف کرائی ہے وہی در اصل تاریخ کی جان ہیں۔ ہماری زبان میں حرب وسنین کے متعلق تو غالباً بہت کافی کتابیں موجود ہوں گی لیکن ایک رسالے کی شدید ضرورت تھی جس کے مطالعہ سے علم دوست طبقہ تاریخ ہند کے اصلی مسائل کیطرف توجہ کرتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جناب عبداللہ یوسف علیصاحب کے ان قابل قدر خطبات نے اس ضرورت کو بوجہ احسن پورا کر دیا ہے۔ ابتدا میں تمہید کے طور پر انہوں نے کتابت وطباعت کی بحث چھیڑتے ہوئے حامیان اردو کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ٹائپ سے بے اعتنائی نہ برتیں بلکہ جہانتک ہوسکے اسے "حسین وجمیل" بنانے کی کوشش کریں۔ ہماری رائے میں انکا یہ مشورہ نہایت مفید ہے۔

اسلام اور غیر مسلم اسلام اور غلامی	از محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی۔ قیمت ۸ر اور ۳ر ملنے کا پتہ:۔ مسلم بکڈپو پھلواری شریف (پٹنہ)

یہ دو نہایت ہی مفید رسالے ہیں جن میں مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے ان الزامات کی تردید کی ہے کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عمل میں آئی یا یہ کہ اسلام نے غلامی کو جائز ٹھہرایا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ان دونوں رسالوں کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب نے اپنا مطلب بڑی خوبی سے ادا کیا ہے اور جابجا قرآن پاک، احادیث اور مسلم اور غیر مسلم مورخین کے بیانات اپنے دعوے کی تائید میں پیش کئے ہیں۔

مختصر تاریخ گجرات	مصنفہ سید ابو ظفر صاحب ندوی پروفیسر جہاودیالے۔ مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ۔ مصنف سے جہاودیالے احمدآباد (گجرات) کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

یہ تاریخ گجرات پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں ابو ظفر ندوی صاحب پروفیسر

مہاد ویاسے نے بچوں کی واقفیت کے لئے راجگان و سلاطین گجرات کے مختصر حالات جمع کر دیئے ہیں آخر میں تحریک ترک موالات اور کسی قدر انگریزی عہد کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب بچوں کے لئے کچھ بہت زیادہ مفید نہیں اس لئے کہ محض واقعات اور سنین کے مطالعہ سے بچوں کے دماغ پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑتا۔ بہتر ہوتا اگر کتاب کو زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کیجاتی۔

رسائل و اخبار :۔

ادبی دنیا - کامیابی - جدت - دولت کونین - موٹر کار - مومن

ادبی دنیا لاہور ماہوار باتصویر رسالہ زیر نگرانی سر عبدالقادر۔ چیف ایڈیٹر تاجور صاحب نجیب آبادی۔ ایڈیٹر حنیف صاحب ہاشمی۔ تقطیع ۲۰×۳۰ حجم تقریباً نوسے صفحے۔ کاغذ اچھا لکھائی چھپائی اوسط درجے کی سرورق بہت خوشنما سالانہ چندہ مع محصول ڈاک ۱۲ؔ
بڑی خوشی کی بات ہے لاہور سے ایک اور قابل قدر ادبی رسالہ نکلا ہے۔ اس کے دو نمبر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلامت مذاق اور تنوع مضامین کے لحاظ سے دوسرے رسالوں سے سبقت لیجائے گا۔ اس قیمت میں بڑے سائز پر عمدہ مضامین کے نوے صفحے شائقین ادب کے لئے ایک ایسی نعمت ہے جسے وہ یقیناً ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اس رسالے میں اور کئی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے رسالوں سے ممتاز کرتی ہیں تصویروں کے انتخاب میں خوش مذاقی سے کام لیا جاتا ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں سے چیدہ ادبی ٹکڑوں کا ترجمہ شائع ہوتا ہے۔ آخر میں ایک فرہنگ ہوتی ہے جس میں مشکل الفاظ کے معنی دئے جاتے ہیں۔

ہم اس رسالے کی ادارت کو چند مخلصانہ مشورے دینا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ

کہ رسالے کا سائز اتنا بڑا نہ رکھا جائے۔ اس سے دیکھنے والے مرعوب تو ضرور ہوتے ہیں مگر مانوس نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ دوسری زبانوں سے جو ترجمے دیے جاتے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں تک محدود نہ ہوں بلکہ مکمل قصے یا مضامین ہوں جن سے اس زبان کی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے۔ یہ ضرورت نہیں کہ ہر پرچے میں تمام دنیا کی زبانوں سے ترجمے موجود ہوں۔ باری باری سے تین چار زبانوں کے ترجمے چھاپے جا سکتے ہیں۔ آخر میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ ارباب ادارت کو زبان کے معاملے میں زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ زبان کی خوبی ادب کی جان ہے۔

کامیابی دہلی | ماہوار رسالہ زیر ادارت ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۴۸ صفحے۔ لکھائی چھپائی نفیس کاغذ عمدہ سرورق بہت خوشنما قیمت سالانہ ۶ر

یہ اپنے طرز کا بالکل نیا رسالہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں عزم و استقلال، کسب حلال کا شوق اور کامیابی کا ولولہ پیدا کیا جائے۔ مضامین کا انتخاب اور ترتیب قابل داد ہے۔ بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اصلاحی مضامین خشک نہیں ہیں بلکہ زبان کی سلاست اور روانی نے انہیں شگفتہ بنا دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب جیسے ادیب کی نگرانی میں یہ رسالہ اونچے ادبی معیار پر قائم رہے گا۔

جو دو پرچے اب تک نکلے ہیں ان میں مضامین زیادہ تر ادبی ہیں یا اصلاحی۔ غالباً آئندہ پرچوں میں ایسے مضامین بھی شائع ہونگے جن سے تجارت، زراعت اور دوسرے پیشوں میں کامیابی کے ذرائع معلوم ہوں۔ کامیابی کا ترانہ سنانے کے ساتھ کامیابی کی راہ دکھانا بھی ضروری ہے

روزنامہ جدت | چیف اڈیٹر سید شبیر حسن صاحب قتیلؔ۔ ملنے کا پتہ۔ روزنامہ جدت لکھنؤ لکھائی چھپائی متوسط۔ کاغذ بھی متوسط۔ بڑا سائز۔ چندہ سالانہ لعہ ر ششماہی صہ فی پرچہ ۱ر

کسی ملک میں آجکل کثرت سے اخبارات کا شائع ہونا اس کے مہذب اور تعلیم یافتہ

ہونگی سب سے بڑی دلیل ہے اس لحاظ سے ہمارے ملک میں جس کثرت سے اخبارات
شائع ہوں اسی قدر ہماری نیکنامی ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت روزنامہ جدت کا دوسرا نمبر ہے۔ کاغذ اور صفحات کے
لحاظ سے اس کی ایک پیسہ قیمت بہت ہی کم ہے۔ اودھ کے باشندوں کے لئے یہ نایاب موقع
ہے کہ کم سے کم قیمت میں ایک روزنامہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

مضامین کی ترتیب اور زبان بھی خاصی ہے لیکن ایک اخبار کا جہاں یہ فرض ہو
کہ وہ اپنی ظاہری زیبائش کو قائم رکھے۔ اپنی باطنی خوبیوں کو بھی برقرار رکھنا چاہئے۔
شاید جدت اس آخری خوبی کو اس نمبر میں قائم نہیں رکھ سکا۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے
کہ جدت کو جانبدارانہ جذبات سے علٰحدہ رہکر خدمت قوم کرنا چاہئے

دولت کونین | اڈیٹر جناب مفتی محمد نعیم صاحب فاضل دیوبند۔ ملنے کا پتہ لودھیانہ (پنجاب)
سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت سالانہ ۲ؕ/ فی پرچہ ۴/

یہ ایک مذہبی رسالہ ہے۔ اس میں کثرت سے وہی مضامین درج ہوتے ہیں۔ جن
سے مسلمانوں کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ خاص خاص مہینوں کی مناسبت سے ان
کی خصوصیات اور انکے متعلق احکامات بھی درج کئے جاتے ہیں۔ مفتی صاحب موصوف
ایک اسلامی درسگاہ کے مہتمم بھی ہیں۔ اس لئے اس رسالے کے اجرا سے غالباً ان کا
مقصد یہ بھی ہوگا کہ اس درسگاہ سے لوگوں کو روشناس کرایا جائے۔

موٹر کار | اڈیٹر عبدالرحیم صاحب۔ چندہ سالانہ رؤسا سے ۵؍ عوام۔ طلبہ اور موٹر
ڈرائیوروں سے ۳؍۔ سائز چھوٹا۔ ملنے کا پتہ۔ اڈیٹر موٹر کار گورکھپور (یو۔پی)

رسالہ موٹر کار کی تیسری کا نمبر ۲-۲۶ ہمارے سامنے ہیں۔ اس کا مقصد مشینوں
کے متعلق عموماً اور موٹر کار اور موٹر سائیکل کے متعلق خصوصاً معلومات فراہم کرنا ہے۔
نام کے پڑھنے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس میں سارے مضامین موٹر ہی کے متعلق

ہونگے لیکن ایسا نہیں ہی۔ دلچسپی کے لئے غزلیات اور ادبی مضامین بھی درج کئے جاتے ہیں۔ ایک ایسے شہر سے جو ادب اردو کے لئے مشہور نہ ہوایسے مختلف اور مجتمع المقاصد رسالہ کا نکلنا قابل مبارکباد ہے۔

رسالہ مومن | اڈیٹر مولوی حافظ وحی الدین احمد۔ ملنے کا پتہ اڈیٹر رسالہ مومن۔ منگل بازار ہزاری باغ (بہار) سالانہ چندہ ؏ ممالک غیر سے ؏ فی پرچہ ۳/

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے بھی اب ایسی زبان کیطرف توجہ کی ہے جو تقریبًا انہیں کی ہے

رسالہ مومن اس کا کافی ثبوت ہے۔ یہ رسالہ ہندی رسم الخط میں شائع ہوتا ہے اس میں مضامین بہت سادے اور مذہبی رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کو خاص طور پر مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کو ضرور خریدیں۔ بشرطیکہ وہ ہندی سمجھ لیتے ہوں۔

شذرات

جامعہ کا یہ نمبر مئی کے نمبر کے بعد چند ہی روز کے وقفہ سے شائع ہو رہا ہے
امید ہے کہ انشاء اللہ اگست کے مہینے میں بھی اسی طرح دو نمبر شائع ہوں گے۔
اور رسالہ اپنے معمولی وقت پر آ جائے گا۔

جب سے رسالہ کی اشاعت مقررہ وقت سے پیچھے ہو گئی ہے قارئین کرام مسلسل شکایت اور تقاضے کے خطوط لکھ رہے ہیں۔ اس سے ہمیں شرمندگی بھی ہے اور خوشی بھی۔ شرمندگی تو ظاہر ہے کہ اپنے قصور پر ہے مگر خوشی اس بات کی ہے کہ ہمارے رسالے کے پڑھنے والے اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور اگر کسی نمبر کے پہونچنے میں دیر ہو تو پہلے انتظار۔ اور پھر شکایت اور تقاضا کرتے ہیں۔ بظاہر یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر ادارت جامعہ کے خیال میں بہت غنیمت ہے۔ کہ جامعہ کے سے خشک رسالے سے کچھ حضرات تو دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس رسالے کی کوشش ابتدا ہی سے یہ ہے کہ جتنے مضامین پیش کئے جائیں، وہ علمی شان، ادبی لطف اور سلامت مذاق سے خالی نہ ہوں۔ اس کے علاوہ بلند تر اخلاقی اور مذہبی مقاصد بھی پیش نظر ہیں۔ اگرچہ ابھی کل مضامین اُس معیار تک نہیں پہونچے جو مدیران جامعہ اور مُرتبیان جامعہ نے قایم کیا ہے پھر بھی عام سطح سے رسالہ ضرور اونچا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی اشاعت محدود ہے اور اس کے قدردان کم ہیں۔ لیکن ہمیں اس کمی کا افسوس نہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ رسالے کے پڑھنے والے حضرات وہی ہوں جو معیار کے بلند ہونے کی شکایت نہیں بلکہ بلند تر ہونے کی تاکید کریں۔

ہمارے موقر ہمعصر رسالہ "کامیابی" کے جولائی نمبر میں مکرمی ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے جامعہ ملیہ کے کارکنوں کو بہت مفید مشورہ دیا ہے۔ صحیح مشورہ بڑی قیمتی چیز ہے خصوصاً جب مشورہ دینے والے کا دل خلوص اور ہمدردی سے لبریز ہو۔ ممدوح کی رائے یہ ہے کہ جامعہ والے شہر سے دور کسی گاؤں میں ایک بستی بسائیں، جہاں جامعہ کے بچوں اور اُستادوں کے علاوہ بچوں کے والدین بھی رہ سکیں اور جامعہ کے کارکنوں کے ساتھ اس تعلیمی تجربے میں شریک ہوں جو وہ کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جامعہ کے لوگوں کے پیش نظر جو نصب العین ہے یعنی وہ تعلیم جو زندگی کی صحیح تفسیر ہو وہ تربیت جو عقیدے اور عمل پر مبنی ہو وہ سادگی جو رہبانیت کی حد تک نہ پہونچے وہ مذہبیت جس میں تنگ خیالی اور تعصب کی بو نہ ہو وہ روشن خیالی جو لامذہبی اور بے اصولی سے پاک ہو، وہ حُبِ وطن جو اسلام کی وسعت نظر کے منافی نہ ہو وہ قوم پرستی جو خدا پرستی سے نہ روکتی ہو اس کے حاصل کرنے کے لئے یقیناً موجودہ "تہذیب و تمدن" کی فضا سے باہر رہنا ضروری ہے۔ یہ فضا نفرت، عداوت، بغض و حسد، شک و شبہہ، پست خیالی اور پست ہمتی کی زہریلی ہواؤں سے مسموم ہو رہی ہے۔ اس سے دور رہنا ہماری صحت کے لئے بلکہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ جامعہ کے کارکنوں کے دل میں بہت دنوں سے یہ ارادہ ہے۔ اور وہ دہلی کے قرب و جوار میں مناسب جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ مدیر "کامیابی" کے یہ الفاظ انھیں اپنے خیال میں اور پختہ اور اپنے ارادے میں اور مستقل کر دیں گے۔

مگر اکثر مفید اور اہم تجاویز کی طرح اس تجویز کے ساتھ بھی بہت سے خطرات

وابستہ ہیں جن سے بچنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمام تعلیمی اور اصلاحی کاموں کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ پوری قوم کی زندگی کو سدھاریں۔ اگر اصلاح کی کوشش کرنے والے ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ آبادی سے دور جابسیں تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان کا رشتۂ تعلق ہیئت اجتماعی سے منقطع نہ ہو جائے۔ اور اگر تعلق باقی بھی رہے مگر صرف اتنا کہ وہ کشمکش زندگی سے الگ بیٹھے تحریروں اور کتابوں کے ذریعہ اصلاحی تدابیر بتایا کریں تو اس سے کچھ زیادہ کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں جہاں تک ممکن ہو، عملی حصہ لیں اور اپنے بھائیوں کے دوش بدوش ساری کڑیاں جھیلیں۔ جو شخص حیات قومی کی کشتی کو منجدھار سے نکالنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ کنارے پر کھڑا ملاحوں کو ہدایتیں دیتا رہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ کشتی میں رہ کر کشتی والوں کو تسکین دے۔ ملاحوں کا ہاتھ بٹائے اور ان کی ہمت بڑھائے۔

اگر یہ مقصد آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے تو تعلیمی اور علمی مقاصد کیلئے گوشہ نشینی میں کوئی ہرج نہیں۔ تعلیم کے لئے بچوں کو عام زندگی کے شور و شر سے بچا کر ایک گوشۂ عافیت میں رکھنا ایسا ہی جیسے باغبان چھوٹے پودوں کو طوفان اور باد کی زد سے باہر کسی گرم خانہ میں یا محفوظ کیاریوں میں رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ یہ حفاظت عارضی ہے ایک دن ان پودوں کو سورج کی گرمی۔ آندھی کی تیزی اور پانی کے طوفان کا مقابلہ کرنا ہے لیکن اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جب ان کی جڑوں میں زندگی کا رس دوڑ جائے گا اور مضبوطی واستحکام پیدا ہو جائے گا تو وہ عناصر کے حملوں کی تاب نہ لاسکیں گے اور وہ اس کا خیال رکھتا ہے کہ جیسے جیسے اُن کی نشو ونما مکمل ہوتی جائے وہ انھیں آہستہ آہستہ ان قوتوں کی مقاومت کی مشق کراتا جائے

جن سے انھیں عمر بھر کا سابقہ ہے۔

اگر جامعہ ملیہ والے اپنی تجویز پر جسے مدیر کامیابی کی تائید حاصل ہے عمل کریں تو انھیں ان سب باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ "بے ہمہ اور باہمہ" کی راہ صرف صوفیوں ہی کے لئے دشوار گزار نہیں بلکہ ہر سالک زندگی کو اس کی صعوبت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن بے اس کٹھن مرحلے سے گزرے چارہ بھی نہیں ہے۔

جنوبی جرمنی کے شہر میونک میں ایک نیم سیاسی اور نیم علمی ادارہ جرمن اکاڈمی کے نام سے قائم ہوا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے قومی ادب کو ترقی دے، غیر ممالک کو جرمنی کی علمی خدمات سے آگاہ کرے اور بین الاقوامی سیاسی مباحث میں جرمنی کی قلمی حمایت کرے۔ اس اکادمی نے ابھی حال میں تین وظائف کا اعلان کیا تھا جو ان ہندوستانی طالب علموں کو دئے جائیں گے جنھیں ہندوستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد میونک یونیورسٹی میں طب، انجنیری، اور کیمیا یا طبعیات میں ریسرچ کرنے کا شوق ہو۔

یہ غالباً پہلا وظیفہ ہے جو کسی یورپ کی یونیورسٹی نے ہندوستانی طالبعلموں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جرمن اکادمی کو جیسا اس نے اعلان کیا ہے ہندوستانیوں کی مہماں نوازی کا احسان اُتارنا ہے جو انہوں نے میونک یونیورسٹی کے چند طالب علموں کے ساتھ برتی تھی لیکن پھر بھی ہمارا یہ فرض ہے کہ اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کریں۔ غریب ہندوستانیوں کو کون اس قابل سمجھتا ہے کہ ان کی حقیر خدمات کا معاوضہ دے۔

اخباروں میں روز یہ خبر آرہی ہے کہ روس اور چین کے تعلقات بہت کشیدہ
ادران دونوں میں عنقریب جنگ شروع ہونے والی ہے بلکہ باوجود باقاعدہ
نا جنگ نہ ہوتے کے ایک آدھ معرکہ ہو بھی چکا ہے ان خبروں سے ان سب
ں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے جو سمجھتے ہیں کہ روس خلوص کے ساتھ ایشیائی قوموں
زادی اور ترقی کا حامی ہے اور بغیر اپنی کسی غرض کے ان کی مدد کرنے کو موجود ہے۔

کچھ دن پہلے جب چین کے قوم پرستوں کی جماعت جنوبی حصہ ملک پر قبضہ
نے کے بعد شمالی مستبدوں سے سرگرم پیکار تھی تو روس نے ایثار کے لمبے چوڑے
ں کے ساتھ ان کی مدد کا وعدہ کیا اور کچھ تھوڑی بہت مدد کی بھی لیکن بہت
س ایثار کی حقیقت کھل گئی اور معلوم ہو گیا کہ روسی جو مددگار بن کر آئے تھے
بنکر رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ غریب قوم پرستوں کو ایک وقت میں دو دشمنوں
تعدد دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف تو شمالی مستبد حکومت کا دوسری
بالشویکوں اور ان سادہ لوح یا بدنیت چینیوں کا جو ان کے اثر میں تھے اور
طرف دول یورپ کا جو خفیہ سازشوں کا جال پھیلا رہی تھیں۔ خدا نے ان کی مدد
رچینی قوم ان اندرونی اور بیرونی دشمنوں پر غالب آئی۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے
ں کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا ہے بلکہ اسے پھر ان دشمنوں سے ایک ساتھ یا
علیحدہ مقابلہ کرنا ہوگا۔

جو لوگ یورپ کی سیاسی تاریخ سے واقف ہیں انھیں روس کے قول و فعل
اختلاف دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ یورپ میں مدتوں سے یہ قاعدہ چلا
ے کہ کسی ملک کے نظام حکومت کی اندرونی تبدیلیوں سے سیاست خارجہ میں

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرانس میں جب وہ عظیم الشان انقلاب ہوا جس نے تمام دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور صدیوں کی جمی ہوئی شاہی حکومت کو چند دنوں میں نیست و نابود کر کے جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی تو کیا اس کی بیرونی سیاسی پالیسی بدل گئی؟ تاریخ سے پوچھئے تو وہ کہے گی ہرگز نہیں۔ فرانس کی زمین کی بھوک اور قوت کی ہوس نہ صرف نپولین کے زمانہ میں بلکہ نپولین کے بعد بھی بدستور باقی رہی اور آج تک باقی ہے۔ اسی طرح روس کے جو ارادے اور حوصلے ہمیشہ سے چلے آرہے ہیں ان میں اشتراکی انقلاب سے کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ اور زیادتی ہوگئی ہے۔ کیونکہ روس کی فوجی طاقت اب پہلے سے بہت زیادہ ہے روس کا دانت چین، ہندوستان، ایران، ٹرکی پر جیسے پہلے تھا اب بھی ہے۔

ایشیا والوں کو خصوصاً ہندوستانیوں کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قوموں کے اندر مختلف جماعتوں میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن غیر قوموں کے مقابلے میں انہیں اپنی عصبیت قایم رکھنا پڑتی ہے اور اسی پر ان کی زندگی منحصر ہے۔ روس کی بالشویک حکومت ہو یا انگلستان کی لیبر حکومت کسی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے ملک کے مفاد کو پس پشت ڈالکر کسی اصول یا کسی نصب العین کی حمایت میں ایشیا کی کمزور قوموں کا ساتھ دے گی بڑی نادانی ہے۔ بالفرض محال اگر کسی ملک کی حکمراں جماعت اس ایثار پر آمادہ بھی ہو جائے تو عام قوم اُس جماعت کو ایک دن بھی برسر حکومت نہ رہنے دیگی۔
